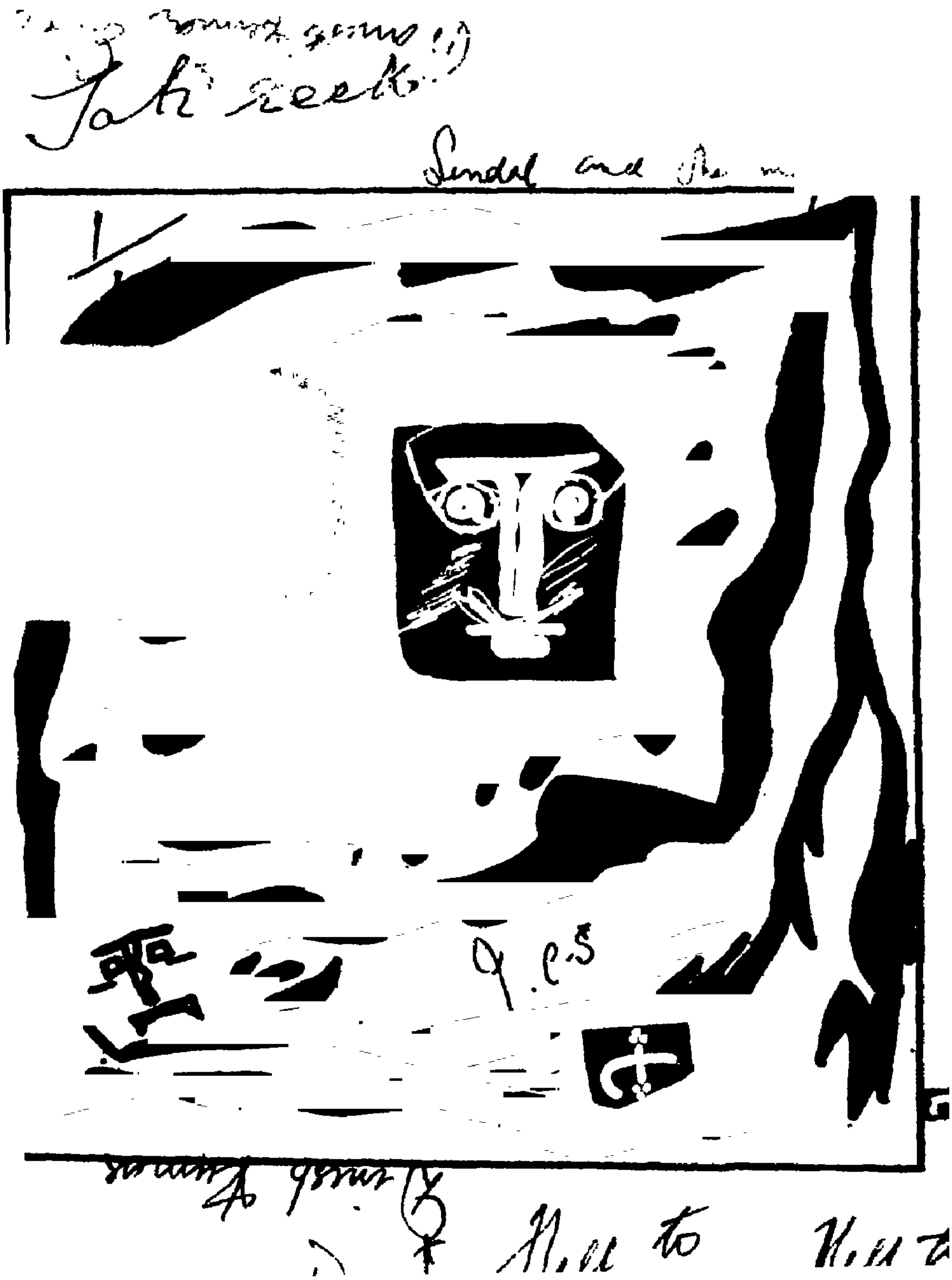


مری لو بلند نہ ہو سکی
مرے سر پہ بوجھ تھا شام کا

یہ احساس آج کے بہت سے ذہین افراد کا مقدر ہے اور بے چارگی بے بسی اور تنہائی کی وہ کیفیت، جسے بعض لوگ نئی نسل کی پہچان سمجھنے لگے ہیں اسی احساس کی پیدا کردہ ہے۔ مظفر حنفی یہاں راضی برضا نہیں اور وہ اس احساس کی گرفت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں:

سرچشمۂ نشاط ہے زخمی پرند کو
کچنار کی کلی پہ لچکتی ہوئی کرن
ناسازگاریوں میں مظفر تری غزل
کہرے کے بیچ آنکھ جھپکتی ہوئی کرن

مظفر حنفی کو زبان پر بڑی قدرت ہے وہ بیان کے بنے بنائے اسالیب سے کام نہیں لیتے اور غزلیہ شاعری کے مروج ذخیرۂ الفاظ سے بھی دامن بچاتے ہیں اس کے باوجود ان کے اشعار میں بڑی روانی ہے اور کہیں غرابت کا احساس نہیں ہوتا نئی نئی زمینوں کی تلاش بھی انھوں نے کی ہے اور بحروں کا تنوع بھی ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری ابہام سے دور ہے اور یہ ان کے آہنگ کا قدرتی تقاضا ہے۔

مظفر حنفی بسیار گو ہیں لیکن وہ کہیں خود کو دہراتے نظر نہیں آتے جو ان کی طباعی کی دلیل ہے۔ "دیپک راگ" کی غزلوں میں ان کے فن کا کینوس بھی پھیلتا نظر آتا ہے۔

"دیپک راگ" میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں بھی شامل ہیں اور ترتیب میں انھیں اولیت دی گئی ہے لیکن میری رائے میں مظفر حنفی غزلوں میں زیادہ کامیاب ہیں۔ ان کی رباعیوں کے چاروں مصرعے تاثر کے لحاظ سے یکساں ہوتے ہیں۔ اچھی رباعی کی تعریف یہ سمجھی گئی ہے کہ پہلے تین مصرعے ابتدائیہ کا کام دیں اور اصل نکتہ آخری مصرعے میں پوری شدتِ تاثر کے ساتھ سامنے آئے۔

"دیپک راگ" میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو مظفر حنفی کے عمومی رنگ سے میل نہیں کھاتے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

اسے بھی دیکھ لیتی ہے اُسے بھی دیکھ لیتی ہے
گل و گلزار اسے ہے ٹوٹی ہوئی بس ایک لڑکی ہے

قطع نظر اس سے کہ یہ شعر شاعر کے اصل رنگ کا حامل نہیں اس میں اور بھی کوئی خوبی نظر نہیں آتی اس طرح کے اشعار غزلوں سے حذف کر دیے جاتے تو مناسب تھا۔

کتاب سلیقے سے چھپی ہے۔ ناشر: نیشنل اکاڈمی، دہلی
قیمت چھ روپے

——— مخمور سعیدی

یادوں کے سایے

دلی اور بیرونِ دلی کے ادبی حلقے، بالخصوص مشاعروں کے باذوق سامعین ممتاز میرزا صاحبہ کے نام اور ان کے رنگِ کلام سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ ان شاعرات میں ہیں جو محض تفننِ طبع کے لیے شعر نہیں کہتیں بلکہ جنھوں نے شاعری کو بطور فن اپنایا ہے۔ وہ اردو اور فارسی ادب کا اچھا مطالعہ رکھتی ہیں اور کئی برس سے خانۂ فرہنگی ایران دلی میں سفارت خانۂ ایران کا ایک شعبہ ہیں فارسی زبان و ادب کی معلمہ ہیں۔ ایران کا ثقافتی دورہ بھی کر چکی ہیں جہاں فارسی زبان پر ان کی قدرت اور ایرانی تہذیب و ثقافت سے ان کی آگاہی کا کئی اخبارات و رسائل نے تحریری اعتراف کیا ——— "یادوں کے سایے" ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے جو نیا ساہتیہ پبلیکیشنز، نئی دلی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے کہا ہے ممتاز میرزا صاحبہ کی شاعری کا قوی ترین محرک ماضی کی وہ یادیں ہیں جن سے وہ کبھی دامن نہ چھڑا سکیں، کتاب کا نام بھی یہی اشارہ کر رہا ہے۔ یوسف حسین خاں صاحب رقمطراز ہیں:

"ممتاز میرزا نے اپنے اس غزلوں کے مجموعے کا نام "یادوں کے سایے" رکھا ہے جو نہ صرف شاعرانہ ہے بلکہ ان کے کلام کی خصوصیت کی غمازی کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان کی غزلوں میں جو تحت شعوری اور جذباتی محرک کام کرتے ہیں ان میں یادیں سب سے زیادہ شدید اور دور رس ہیں۔ ویسے اور دوسرے جذبات



کیا ایل آئی سی سے رقم ایک طویل عرصہ بعد ہی ملتی ہے؟
غلط! ہم دکھائیں گے کہ کس طرح آپ،
آپ کی بیوی اور بچے جلد از جلد
فائدہ حاصل کر سکتے ہیں.
جانکاری کیلئے. ایل آئی سی کی
"واپسی رقم" (میعاد بندی معیاری بیمہ) پالیسی دیکھئے.
خوشحالی اور سلامتی
فرض کیجیے کہ آپ کی عمر ۳۰ سال ہے اور آپ نے
۲۰ سال کے لئے ۱۵۰۰۰ روپیوں کی "واپسی رقم" والی
پالیسی لی ہے تو آپ کو ہر ماہ صرف
۷۵٫۲۰ روپیے ادا کرنے پڑیں گے اور آپ کو حسب ذیل
طریقے سے رقم ملتی رہیگی.
۳۰۰۰ روپیے ۱۰ سال بعد
۳۰۰۰ روپیے اس کے ۵ سال بعد
۱۴۲۸۰ روپیے مزید ۵ سال بعد
یعنی کل ۲۰۰۰۰ روپیے
1976
1986
1991
1996
100
اگر بیمہ لینے والا اس ۲۰ سال کے دوران چل بسے تو اس
کے خاندان والوں کو ۱۵۰۰۰ روپیے مل جائیں گے جو
پہلے ہی حاصل کئے گئے قسطوں کے علاوہ ہوں گے.
بونس آج کل کی شرح کے مطابق شامل کیا گیا ہے.
یہ تو ایک مثال ہے. ویسے آپ اپنی حیثیت کے مطابق کم
یا زیادہ رقم کی بیمہ پالیسی لے سکتے ہیں.
اپنی ضرورت کے وقت رقم لیجئے
پالیسی چالو رہنے کے دوران آپ اپنی موجودہ ضروریات جیسے
لکھائی پڑھائی سگائی اور شادی بیاہ،
یاترا، بیماری وغیرہ کی تکمیل کر سکتے ہیں
آپ جو بیمہ ادا کرتے ہیں ان
پر انکم ٹیکس کی رعایت
بھی ملتی ہے.
ان میں سے کوئی بھی پالیسی "تنخواہ سے بچاؤ" اسکیم کے تحت لے
لیجئے. یہ اسکیم آپ کے دفتر میں لاگو ہوگی. اسکے تحت آپ کے
مالکین پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ وہ آپ کی جانب سے
پریمیم ادا کریں اور ایسے پریمیم کی رقم عام ماہانہ پریمیم کے مقابلہ
میں کم ہوتی ہے.
لائف انشورنس
کارپوریشن
آف انڈیا
DCA/LIC/2A UR
بیمہ زندگی. سلامتی کے لئے بے مثال ہے.

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک دہلی

جلد ۲۳ شمارہ ۱

اپریل ۱۹۷۵ء

ادارۂ تحریر

پریم چوپڑا

سالانہ قیمت: دس روپے فی کاپی: ایک روپیہ

غیر ممالک سے

سالانہ: بتیس شلنگ فی کاپی: تین شلنگ

پرنٹر پبلیشر اور پروپرائیٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس دہلی

مقام اشاعت

۹۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی

مقالات و مضامین:

افسانے:

منظومات:

سرورق: کمار پاشی

Regd. No. D (D) 118   Phone : 271649   March 1976

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 646/57

TAHREEK

سرمایہ لگانے کا محفوظ طریقہ جس سے آپ کو ٹیکس بھی کم ادا کرنے پڑیں گے

7 جنوری 1975ء کو بھارت سرکار نے ایک خاص آرڈیننس جاری کیا جس کے تحت صرف یونٹوں سے ہونے والی 2000 روپے تک کی آمدنی پر انکم ٹیکس بالکل نہیں لگے گا۔ یہ رعایت یونٹوں اور سرمایہ لگانے کے دوسرے مخصوص طریقوں سے ہونے والی 3000 روپے تک کی آمدنی پر موجودہ رعایت کے علاوہ ہوگی۔

ٹیکس کی نئی رعایت کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ 23,500 روپے کے یونٹ خریدیں تو آپ کو ان سے باقاعدہ آمدنی ہوتی رہے گی جس پر انکم ٹیکس بھی نہیں لگے گا۔

یہ رعایت 76-1975ء کے تشخیصی سال کے سلسلے میں 1.4.74 سے 31.3.75 تک کی مدت کے لئے داخل کئے جانے والے ٹیکس ریٹرن کے لئے عمل میں آئے گی۔

یونٹ خریدنا، سرمایہ لگانے کا ایک محفوظ طریقہ ہے اور باقاعدہ آمدنی کا وسیلہ بھی۔ اس کے علاوہ آپ جب چاہیں اپنے یونٹ، یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کے پاس واپس بیچ بھی سکتے ہیں۔

دیر نہ کریں
ابھی یونٹ
خرید لیں



درخواستوں کے فارم ان پتوں پر مل سکتے ہیں:-

یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا

- 45 ویر نارمیان روڈ، بمبئی 400 023
- 8- کونسل ہاؤس اسٹریٹ، کلکتہ 700 001
- ریزرو بنک بلڈنگ، فورٹ گلیسز
ساؤتھ بیچ روڈ
مدراس 600 001
- ریزرو بنک بلڈنگ
6- پارلیمنٹ اسٹریٹ
نئی دہلی 110 001

گوپال متل

اشیائے خوردنی میں ملاوٹ اور سوویٹ لابی

سوویٹ لابی ہندوستان میں یہ پروپیگنڈہ کرتی نہیں تھکتی اگر نجی کاروبار کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے اور ملک کی جملہ اقتصادی سرگرمیاں حکومت براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لے تو اقتصادی بدعنوانیاں مثلاً اشیائے خوردنی میں ملاوٹ وغیرہ از خود ختم ہو جائیں گی۔

اشیائے خوردنی میں ملاوٹ اور دوسری اقتصادی بدعنوانیاں ندوستان میں واقعی موجود ہیں اور ان کے انسداد کی ہر ممکن کوشش نی چاہیئے۔ مجرموں کے خلاف کڑی انتظامی کارروائی بھی ہونی چاہیئے اور جرموں کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لیے مناسب پروپیگنڈہ بھی۔ لیکن ان عنوانیوں کا جو علاج سوویٹ لابی بتاتی ہے وہ صحیح نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ بدعنوانیاں سوویٹ روس میں موجود نہ ہوتیں جہاں نجی کاروبار ادجود نہیں۔ اور جملہ اقتصادی سرگرمیوں پر حکومت کی اجارہ داری ہے۔ حال یہ ہے کہ وہاں اشیائے خوردنی میں ملاوٹ اتنی عام ہے د اسکول کے بچوں کی خوراک بھی ملاوٹ سے بچ نہیں پاتی۔

اپنی بات کے ثبوت میں ہم سوویٹ روس کے سرکاری جریدے پراودا" کی ۱۳ر اکتوبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت سے ایک اقتباس پیش رتے ہیں۔ یہ ایک قاری کا خط ہے جو "پراودا" کی ۶ر اکتوبر کی اشاعت یں شائع شدہ ایک مضمون کا ردّ عمل ہے۔ مراسلہ نگار لکھتا ہے کہ:

"عام استعمال کی چیزوں میں قیمتی اجزا کی مقدار کو گھٹا کر اور گھٹیا اجزا کی مقدار کو بڑھا کر بددیانت لوگ بڑے بڑے منافع کما رہے ہیں۔ وہ بیف اسٹیک میں گوشت کی مقدار گھٹا دیتے ہیں بسکٹ ے انڈوں کی مقدار گھٹا دیتے ہیں اور اونی کپڑوں میں اون کی مقدار ۔۔ اس طرح ریاست اور عوام دونوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ میرے خصوصی توجہ کا مرکز صحت عامہ ہے۔

اسکولی بچوں کی صحت کے نگراں افسر کئی بار دیکھتے ہیں ں کو جو غذا ملتی ہے ان میں کچھ اجزا بہت زیادہ ہوتے ہیں ند کچھ بہت کم۔ وہ کئی بار غذائیت کی کمی کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ صحیح الفاظ ڈکیتی اور فریب دہی ہیں۔ گزشتہ برس کئی اسکولوں کی کینٹینوں میں غذائیت کی کمی کا مسئلہ سامنے آیا۔ غذا میں صحت بخش اجزا کم ہوتے تھے۔ اسکولی۔۔۔ بچے ایسے شوربوں کو لینے سے انکاری تھے، جن میں نمک پانی اور اس قسم کے دوسرے ارذال اور بے قیمت عناصر کی بہتات ہوتی تھی۔

نمک کے بے جا استعمال سے کھانے اپنی لذت کھو بیٹھتے ہیں۔ کینٹینوں میں انھیں کوئی نہیں کھاتا لہٰذا انھیں عام دوکانوں پر بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی حساب وغیرہ نہیں رکھا جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس سے ریاست کو بہت نقصان پہنچتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ ایسے کھانے صحت کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں۔ نمک کے بے جا استعمال سے نسیں سخت ہو جاتی ہیں۔ اور پیاس بہت بڑھ جاتی ہے جو صحت کے لیے ضرر رساں ہے۔"

اس خط پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ اس قسم کے خط اور بھی کئی لوگوں نے بھیجے ہیں لیکن متعلقہ محکموں نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ ایڈیٹر نے خوراک کی صنعت اور تجارت کی وزارتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ جو سوال اٹھائے گئے ہیں ان پر وہ اپنے ردّ عمل کا اظہار کریں۔

کامریڈوں کو بشرطیکہ انھوں نے اپنے ضمیر کو مکمل طور پر سوویٹ روس کے پاس رہن نہ کر دیا ہو، چاہیے کہ وہ صورت حال جاننے کے لیے صرف ان سوویٹ جریدوں کا مطالعہ نہ کیا کریں جو خالصتہً غیر ملکوں میں تقسیم کے لیے شائع ہوتے ہیں۔ اندرون روس شائع اور تقسیم ہونے والے جرائد میں تمام تر احتساب کے باوجود ایسی اطلاعات شائع ہو جاتی ہیں جو سوویٹ روس کی وہ خوب صورت تصویر پیش نہیں کرتیں جو غیر ملکوں میں تقسیم ہونے والے روسی جریدوں میں نظر آتی ہے۔

●●

گوپال متل

کیا روس واقعی ہمارا معتمد ترین ساتھی ہے؟

عین اس وقت جب سوویٹ لابی ہندوستانیوں کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ سوویٹ روس ہمارا واحد معتمد ساتھی ہے اور پاکستان کے مقابلے میں تو اس کی ہمدردیاں خاص طور پر ہمارے ساتھ ہیں۔ سوویٹ آفیشل جریدے "سوویٹ سکایا رشیا" نے ایک ایسا مضمون شائع کر دیا ہے جس میں ریاستی کنٹرول کے تحت پاکستان کی صنعتی ترقی کی توصیف ہے، اس کی زرعی اصلاحو کو سراہا گیا ہے اور سوویٹ روس اور پاکستان میں بڑھتے ہوئے تعاون کا ستائشی انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ سوویٹ وزیر دفاع اے۔ اے۔ گریچکو کے حالیہ دورۂ ہند کے دوران انھیں بالواسطہ طور پر بھی پاکستان کی تنقید پر آمادہ نہ کیا جا سکا۔

سوویٹ اقتصادی مدد اور اس کے ساتھ تجارتی مراسم کے سلسلے میں بھی سوویٹ لابی جو خوش فہمیاں پھیلا رہی ہے، ان کا کوئی جواز نہیں۔ مصر نے جس کے ساتھ سوویٹ روس کے اقتصادی مراسم ہم سے بھی زیادہ گہرے تھے۔ لہٰذا ز اس خرابیِ بسیار یہ سبق سیکھا ہے کہ یہ مراسم اس کے لیے فائدہ بخش نہیں تھے۔

مصر کی مایوسی کا تازہ ثبوت یہ ہے کہ ۱۰ر فروری ۷۵ء کے روزنامہ "الجمہوریہ" کی اطلاع کے مطابق مصر نے 'ٹوپولیف ۱۵۴' ہوائی جہازوں کا، سوویٹ روس کے ساتھ اپنا دو سال پرانا سودا ختم کر دیا ہے اور سات جہازوں کا فلیٹ سوویٹ روس کو لوٹا دیا ہے۔ مصر نے کئی بار شکایت کی تھی کہ سوویٹ مدد سے چلنے والے اقتصادی منصوبوں کے لیے سوویٹ روس جو سامان بھیجتا ہے اور جو مہارتیں مہیا کرتا ہے، ان میں کئی خامیاں ہیں اور اصلاحِ احوال پر مصر کو ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔

مصر کی قومی ایرلائن کے خرید کردہ روسی جہازوں کی اڑان جولائی ۷۴ء سے موقوف ہے کیوں کہ ایک روسی طیارہ آزمائشی اڑان کے دوران فضا میں پھٹ گیا تھا۔ اور جہاز کا عملہ جس میں دو مصری اور چار روسی تھے۔ ہلاک ہو گیا تھا۔ ہفت روزہ "الیوم" کا بیان ہے کہ مصری ہوابازی ماہرین کے اس سودے کے خلاف تھے کیوں کہ روسی طیارے میں کئی نقائص تھے جو طیارے کی سلامتی کو خطرے میں ڈال سکتے تھے۔ شہری ہوابازی کے محکمے نے اس اعتراض کو درست قرار دیا۔ محکمہ نے سودے کی تنسیخ کا ہی مشورہ نہیں دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اس کی وجہ سے مصر کا جو نقصان ہوا ہے اس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔

مارچ ۱۹۷۴ء میں جب سوویٹ وزیر خارجہ مسٹر گرومیکو مصر گئے تھے تو مصری وزیر اعظم ڈاکٹر عبدالعزیز حجازی نے ان فیکٹریوں کی شکایت کی تھی جو مصر نے روس اور اس کے حلیفوں سے حاصل کی تھیں۔ لبنانی اخبار "الانوار" کا کہنا ہے کہ گفتگو کے دوران گرومیکو نے یہ ذکر چھیڑا کہ مصر میں پبلک سیکٹر کمزور پڑ رہا ہے۔ تو ڈاکٹر حجازی نے زور دیا کہ ایسی "کئی فیکٹریاں جو ہم نے سوشلسٹ ملکوں سے حاصل کی ہیں، پوری طرح کام نہیں کر رہی۔ اس کی وجہ کچھ تو پرزوں کی کمیابی ہے، کچھ خام مواد کی کمی اور کچھ ٹیکنیکل خامیوں کی موجودگی۔"

مصر کی مایوسی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ سوویٹ روس مصر میں تیل کی جو تلاش کر رہا تھا وہ ناکام رہی۔ ۱۹۶۸ء کے ایک معاہدے کی رو سے سوویٹ روس لیبیا کی سرحد سے ملحق مصری علاقے میں تیل کی کھوج کر رہا تھا۔ ستمبر ۷۳ء میں روس نے اعلان کر دیا کہ وہ تیل کی کھوج میں ناکام رہا ہے اور اب مزید کوشش نہیں کی جائے گی۔ کل ۱۰ کنویں کھودے گئے تھے جن پر مصر کو ۲۳ ملین رقم خرچ کرنی پڑی (باقی صفحہ ۲۹ پر)

گوپال متل

ایں گلِ دیگر شگفت

گذشتہ شمارے میں اپنے مضمون "کانگریس کی داخلی تخریب کا کمیونسٹ منصوبہ" میں میں نے لکھا تھا کہ سوویٹ روس صرف حکمران پارٹی میں کمیونسٹوں کے نفوذ پر ہی اکتفا نہیں کرتا۔ مصر میں روسیوں کا معتمد ترین آدمی مصر کی انٹلی جنیس کا افسرِ اعلیٰ سامی شرف تھا۔

تازہ اخباری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ مصر والا کھیل سوویٹ یونین نے ہندوستان میں بھی شروع کر دیا ہے۔ حکمران پارٹی میں نفوذ کے بعد اب وہ سروسز میں اپنے جاسوس پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ ان اطلاعات کے مطابق ہندوستانی ایئر فورس کے دو افسروں کو کورٹ مارشل نے جاسوسی کے الزام میں سزا دی ہے۔ یہ دونوں افسر روسیوں کو ایسی اطلاعات بہم پہنچا رہے تھے جن کا تعلق صیغۂ راز سے تھا۔ انٹلی جنس افسروں نے انھیں اور روسیوں کو کیرالا کے ایک ساحلی ہوٹل میں رنگے ہاتھوں پکڑا جب وہ اپنی خدمات کے عوض روسیوں سے بھاری رقمیں وصول کر رہے تھے۔

ہندی کے ایک اردو دوست ادیب کا انتقال

یہ خبر افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ ۲۵ مارچ کی صبح کو ہندی کے مشہور شاعر اور ادیب جناب ادم پرکاش دیپک کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔

دیپک صاحب خود ہندی میں لکھتے تھے لیکن اردو کے بھی مخلص ہمدردوں میں تھے۔ ایک زمانے میں وہ ڈاکٹر لوہیا سے متاثر ہو کر سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن جب ڈاکٹر لوہیا نے اردو مخالفت شروع کی تو ان میں اختلافات پیدا ہو گئے اور دیپک صاحب نے ان اختلافات کو چھپایا نہیں۔ آخر میں دیپک صاحب عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور اپنا پورا وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ میرے ساتھ ان کے گھریلو مراسم تھے۔ اور ان کی موت کا غم میرا ذاتی غم ہے۔

کوشن موہن

پوجا اور واسنا

طریقِ عصمت فروشی و جادۂ ہوس کی بنا ہے مذہب
اسی نے انساں کی آرزوئے نشاط کو تیز تر کیا ہے
قدیم یونانی معبدوں میں شباب اور حسن کی پرستش تھی کیف گستر
سرور و عشرت تھی مقصدِ زندگی سراسر
کہ دیویوں دیوتاؤں کی خوشی دل کی خاطر
ملن جواں جسموں کا بڑھاتا تھا روز و شب معبدوں کی رونق
عوام کے سامنے پجاری، کنواریوں سے مباشرت کرتے تھے
عبادت کا یہ طریقہ بھی کیا عجب تھا
یہ رسم تہواروں میں ادا کرتے تھے پجاری
جو کھول کے دل چڑھاوا دیتا تھا دیوتا کو
اُسی پجاری کو خوبصورت ترین کنواری کے وصل سے فیض یاب
ہونے کا حق پہنچتا۔
سفید معبد گھنے درختوں میں، ساحلوں پر بنے ہوئے تھے
کہ دور دیشوں سے لوٹنے والے شوخ تجار اور جہازی
جوان معابد کے یاتری تھے۔
ملن کی لذت کا روپ دھاریں، تھکن اتاریں
ہر ایک معبد میں حسن کی دیوی کی سجیلی ننگی مورتی استقبال کرتی
تھی اہلِ دل کا۔

ملن سے پہلے
وہ خوبصورت پجارنوں، دیوداسیوں کو
رجھاتے تھے اپنے مال و زر سے
یہی نہیں تھا
حسین پجاری بھی ان معابد میں لطفِ ہم جنسیت کی خاطر تھے
جلوہ ساماں
کہ اہلِ یونان تھے اس جنوں سے بھی گلبداماں
ہماری پوجا میں واسناؤں نے گھر کیا ہے
قدیم مذہب نے آرزوئے نشاط کو تیز تر کیا ہے۔

عروج زیدی

ہدتو مصلحت اندیشی ہے وہ کیوں بولے
دل ہی وار پہ اعلانِ حق کو لب کھولے
یم حسن کے پردے اٹھائے جاتے ہیں
. وقت وہ ہے کہ انسان داغ دل دھولے
.کہہ کے شمع سحر نے بھی ساتھ چھوڑ دیا
م رات کا جاگا ہوا ہے اب سو لے
ئیں نہیں جو مری الجھنوں سے دل چسپی
ماری یاد ہی میری شریکِ غم ہولے
بان چپ رہے، کردار سامنے آ جائے
رشاد ہ لطفِ تکلم کہ زندگی بولے
بیب شرط ہے آدابِ گفتگو کی ق

ں سے پہلے ہر اک لفظ کو زباں تولے
ہزار حیف جسے دیکھ کر میں جیتا ہوں
ہی سکون کے لمحوں میں زہر غم گھولے
رنج! وسعتِ ظرفِ بشر، خدا کی پناہ
، حیات پکارے تو آدمی بولے

باقی

کیا دھند چھا رہی ہے کہ تو چپ ہے اداس بھی
اک لمحے کا حساب نہیں تیرے پاس بھی
اِن مٹیوں پہ نقش ہے کس کے قدم کا زہر
اب دور دور تک نہیں پیلی سی گھاس بھی
اے دوست مت دکھا کوئی تصویر ہولناک
میرے لیے بہت ہے ذرا سا ہراس بھی!
اچھا کہ اب کوئی نہیں میرا شریکِ جام
پی لوں گا زہر بھی میں بجھا لوں گا پیاس بھی
اک بوند میرے خون کی اڑتی تھی طرف طرف
اب سارے خاکداں میں چمک سی ہے پاس بھی
کیا دودھ منظری سا دکھائی دیا کہ پھر
خوش آ سکا نہ لمحۂ خندہ حواس بھی

پھر اپنے اپنے راستوں سے ہم نہ لوٹ پائے
سچ نکلا میرا ڈر بھی تمہارا قیاس بھی!
کل تک نہ انتہا مری بے ہم صدا کی تھی
اب بن کے رہ گیا ہوں سراپا سپاس بھی
باقی شکن شکن سا تمہارا دل بھی ہے
کچھ پارہ پارہ سا ہے تمہارا لباس بھی!

مخمور سعیدی

چل پڑے ہیں تو کہیں جاکے ٹھہرنا ہوگا
یہ تماشا بھی کسی دن ہمیں کرنا ہوگا
پانو رکھ خواب کے زینے پہ اس احساس کیساتھ
اس بلندی سے بہت جلد اترنا ہوگا
ریت کا ڈھیر تھے ہم، سوچ رکھا تھا ہم نے
جب ہوا تیز چلے گی تو بکھرنا ہوگا
ہر نئے موڑ پہ یہ سوچ قدم روکے گی
جانے اب کون سی راہوں سے گزرنا ہوگا
لے کے اس پار، نہ جائے گی جدا راہ کوئی
بھیڑ کے ساتھ ہی دلدل میں اترنا ہوگا
آج بڑھتی ہوئی لہروں پہ رواں ہے کشتی
کل اسے ڈوبتے ساحل پہ ٹھہرنا ہوگا
زندگی خود ہی اک آزار ہے جسم و جاں کا
جینے والوں کو اسی روگ میں مرنا ہوگا
قاتلِ شہر کے مخبر در و دیوار بھی ہیں
اب ستمگر اسے کہتے ہوئے ڈرنا ہوگا
آئے ہو اس کی عدالت میں تو مخمور تمھیں
اب کسی جرم کا اقرار تو کرنا ہوگا

مصور سبزواری

دِن ڈوبے گا آنکھوں میں تو جھیلوں سے ڈرے گا
بن جائینگے کہسار تو ٹیلوں سے ڈرے گا
تنگ اپنے پہ ہو جائیگا مردار بدن کا
آفاق میں اڑتی ہوئی چیلوں سے ڈرے گا
گر جائے گا تھک کر پس دیوار تجسس
دل سرحد انجام سے میلوں سے ڈرے گا
تادیر سماعت کے کھنڈر بجتے رہیں گے
ماضی کے وہ رقاص قبیلوں سے ڈرے گا
جدت کا معمار ہے وہ شخص کسی دن
اونچی ہوئی سر سے تو فصیلوں سے ڈرے گا
خاکستر جاں لیکے اڑا ہوں میں مصور
وہ مجھ سے ہواؤں کے وسیلوں سے ڈرے گا

محسن زیدی

کیا آگ ہے جس میں جل رہا ہوں
لاوے کی طرح ابل رہا ہوں
ضم ہونے کو پھر سمندروں میں
ساحل پہ مچل مچل رہا ہوں
جاؤں گا کہاں میں خاکداں سے
اک اپنا مکاں بدل رہا ہوں
ہو کر بھی چراغ بزم شاہاں
گمنام لحد پہ جل رہا ہوں
منزل کا نہیں کوئی تصور
انجان ڈگر پہ چل رہا ہوں
دنیا نے بدل لیے ہیں پہلو
میں اپنی جگہ اٹل رہا ہوں
محسن کوئی ساتھ دے تو جانوں
میں نوک سناں پہ چل رہا ہوں

عارف نقشبندی

جسے کبھی زخم ہو اس بات کا میں دریا ہوں
بجھائے پیاس کو میری میں جلتا صحرا ہوں
ہزار سیل حوادث میں، موج طوفاں میں
زمانہ دیکھ چکا ہے مجھے، میں زندہ ہوں
لگائے کون گلے؟ کون مجھ کو ٹھکرائے؟
میں سنگ راہ بنا اس لیے ہی بیٹھا ہوں
تو فہم و عظمت انساں کو یوں ذلیل نہ کر
یہ کیا سوال ہے صدیوں سے کون ہوں کیا ہوں
تم آزمانے کو توڑو تو یہ خیال رہے
مجھے نہ جوڑ سکو گے میں دل کا شیشہ ہوں
مرے وجود سے عارف نظام عالم ہے
غلط یہ بات ہے بایا ہوں اور دھوکا ہوں

مالک رام

خطوطِ غالب کی ترتیبِ نو

خطوطِ غالب کے سلسلے میں مالک رام صاحب کا وضاحتی بیان "ہماری زبان" کے شکریہ کے ساتھ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے
مالک رام صاحب کو تسلیم ہے کہ خطوطِ غالب پر مرتب کی حیثیت سے مولوی مہیش پرشاد کا نام ہونا چاہیے تھا اور مرتب ثانی کی حیثیت سے مالک رام صاحب کا نام۔ تحریک کا مطالبہ اس سے زیادہ نہیں تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ حق بہ حق دار رسید۔

ان کا بیان ہے کہ انھوں نے یورپ سے واپسی کے بعد جب خطوطِ غالب کا نیا ایڈیشن دیکھا تو انھیں تعجب ہوا کہ اس پر صرف ان کا نام تھا۔ ہمیں تعجب اس بات پر ہے کہ وہ اس کے بعد اپنی مرتب کردہ کتابوں میں خطوطِ غالب کا حوالہ صرف اپنی تالیف کی حیثیت سے دیتے رہے۔

خطوطِ غالب پر تبصرہ جنوری ۱۹۶۹ء کے تحریک میں شائع ہوا تھا۔ اس کے چھپتے ہی انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور کا خط ہمیں موصول ہوا جس میں انھوں نے کشادہ دلی سے اعتراف کیا کہ ہمارا اعتراض صحیح ہے اور کتاب کے آیندہ ایڈیشن میں تلافی کر دی جائے گی۔ تعجب ہے کہ مالک رام صاحب نے اپنے تعجب میں اردو قارئین کو شریک نہیں کیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تعجب کا یہ اظہار اب وہ صرف اس لیے کر رہے ہوں کہ پانی سر تک پہنچنے لگا تھا۔

جناب آفاق حسین آفاق کی تالیف نادراتِ غالب سے غالب کے خطوط بلا اجازت لے لینے کا جواز وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ ان خطوط پر کسی کا کاپی رائٹ نہیں تھا اور اس بارے میں انھوں نے وکیل سے بھی مشورہ کر لیا تھا۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ مالک رام صاحب صرف قانونی پاداش کے خوف سے ہی درست رویہ اختیار کر سکتے ہیں؟

معلوم ہوتا ہے کہ مالک رام صاحب نے اپنا عذرنامہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کے خط کی اشاعت سے پہلے مرتب کیا ہے ورنہ اپنے مرتب کردہ ایڈیشن کو یا تو کارنامہ قرار نہ دیتے یا صدیقی مرحوم کے ان فقروں کے بارے میں اظہارِ خیال ضرور کرتے۔

"..... اب جو کتاب چھپ کر آئی اور ایک نسخہ مجھے ملا تو کیا لکھوں کہ مجھ پر کیا بیت گئی۔ ظاہر تو جیسا کچھ ہے، سب پر عیاں ہے، باطن اس سے کہیں زیادہ خراب اور مسخ۔ خط غلط، متن غلط، انشا غلط، املا غلط، نہ صحت کا لحاظ، نہ ماخذ کا پتہ۔ حواشی میں تخفیفات موجود، البتہ ان کی حیثیت طلسمات کی سی ہو کر رہ گئی۔ جو وضاحتیں کتاب کے ہندوستانی اکیڈیمی والے ایڈیشن میں میرے معروضات کے ذریعہ ہوئی تھیں وہ یک قلم خارج۔ اب اس طلسم کو کھولے تو کون اور کھلے تو کیوں کر۔ ظاہر ا پڑھنے والے اندھیرے میں بھٹکتے رہیں گے....."

مالک رام صاحب نے اپنے احباب کو مندرجۂ ذیل وصیت بھی کی ہے:

"میں عمر اور صحت کے جس مرحلے پر ہوں اس کے پیش نظر نہیں چاہتا کہ مجھے پھر اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت پیش آئے۔ بلکہ اسی لیے میں نے ذرا تفصیل سے لکھا ہے لہٰذا مناسب خیال کرتا ہوں کہ اپنے احباب کو ایک وصیت کر دوں:
یہ دنیا چند روزہ ہے۔ انھیں چاہیے کہ وقتی اور عارضی گرم بازاری کے لیے یا نفسانیت کے تحت وہ کوئی ایسی بات نہ کہیں، نہ کوئی ایسا کام کریں جس سے آیندہ نسل کے اخلاق اور کردار کی تشکیل پر کوئی ناخوشگوار اثر پڑے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اس سے اجتناب لازم ہے[1]..."

خوب ہوتا اگر وہ اس میں یہ اضافہ بھی کر دیتے: من نہ کردم شما حذر بکنید

گوپال متل

---

[1] خط کشیدہ فقرے کی عجوبگی کہیں جذباتی کشمکش کی غماز تو نہیں۔

یہ ۱۹۵۵ء کے شروع کی بات ہے۔ قاضی عبدالغفار مرحوم ان دنوں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ ایک دن ان کا خط ملا کہ ایک ضروری کام ہے، اگر علی گڑھ آسکیں تو آجائیے۔ میری ان سے ۱۹۵۲ء سے یاد اللہ تھی اور وہ مجھ پر کرم فرماتے تھے۔ جیسا کہ احباب کو معلوم ہوگا، وہ اپنی زندگی کے آخری دو تین برس خاصے بیمار رہے۔ ان ایام میں بھی ان کی طبیعت بہت خراب تھی۔ بہرحال میں دو تین دن بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

جب میں ان کے پاس پہنچا ہوں، تو بے چارے نحیف و نزار بستر پر دراز تھے۔ میرے دریافت کرنے پر فرمایا کہ ہم انجمن کی طرف سے مہیش پرشاد مرحوم کی کتابیں اور کاغذات خریدنا چاہتے ہیں۔ اسی میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ عبدالستار صدیقی صاحب نے ان کی بیٹیوں (اور دامادوں) کو بات پر آمادہ کر لیا ہے۔ اور سب چیزیں ہمارے دیکھنے کو بھیج دی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اندر سے صندوق منگوایا اور میرے حوالے کرتے ہوئے اس کے محتویات کو بنظر غائر دیکھنے کی فرمائش کی۔

تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس صندوق میں منجملہ چند مطبوعہ کتابوں، بعض یادداشتوں وغیرہ کے 'خطوط غالب' کی پہلی جلد کا ایک مطبوعہ نسخہ اور دوسری جلد کا قلمی مسودہ بھی تھے۔ میرے پوچھنے پر فرمایا کہ عبدالستار صدیقی صاحب نے ہندوستانی اکیڈمی (الہ آباد) سے اجازت لے لی ہے کہ ہم نہ صرف 'خطوط غالب' کی پہلی جلد دوبارہ چھاپنے کے مجاز ہوں گے۔ بلکہ اکیڈمی نے کہا ہے کہ وہ اب دوسری جلد چھاپنا ہی نہیں چاہتے، اس لیے اگر ہم اسے بھی چھاپیں گے، تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

میں نے انھیں مشورہ دیا کہ مطبوعات میں تو کوئی چیز قابل لحاظ نہیں۔ البتہ اگر 'خطوط غالب' کی دونوں جلدوں کے شائع کرنے کی اجازت آپ کو مل رہی ہے، تو مطلوبہ رقم میں یہ سودا برا نہیں۔ اس پر انھوں نے روپیہ صدیقی صاحب مرحوم کی خدمت میں بھجوا دیا۔ اور معاملہ ختم ہوگیا۔

قاضی عبدالغفار اس کے بعد سال بھر کے اندر ہی جنوری ۱۹۵۶ء میں رحلت کر گئے اور ان کی جگہ پروفیسر آل احمد سرور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

میں پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ۱۹۵۶ء کے اواخر میں یا ۱۹۵۷ء کے شروع میں مجھے دو خط ملے، ایک پروفیسر آل احمد سرور کا اور دوسرا — عبدالستار صدیقی مرحوم کا۔ دونوں کا مضمون واحد تھا کہ صدیقی صاحب علی گڑھ آرہے ہیں۔ اگر میں بھی انھیں ایام میں وہاں آجاؤں تو کچھ مشورہ منظور ہے۔ اس پر میں تاریخ مقررہ پر وہاں گیا۔ ہم لوگ انجمن کے دفتر میں جمع ہوگئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ 'خطوط غالب' کی دوسری جلد چھاپی جائے۔ میں نے کہا کہ پہلی جلد ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی اور اب کہیں دستیاب نہیں ہوتی بہتر ہوگا کہ پہلے اسے چھاپا جائے۔ اور اس کے بعد دوسری جلد چھاپی جائے۔ صدیقی مرحوم نے مجھ سے اتفاق کیا اور فیصلہ ہوا کہ اول پہلی جلد ہی دوبارہ شائع ہو، ہاں، دوسری جلد بھی بلا تاخیر اس کے بعد شائع کر دی جائے تاکہ لوگوں کو دونوں جلدیں کم و بیش ایک ساتھ مہیا ہو سکیں۔

جس زمانے میں یہ پہلی جلد شائع ہوئی ہے، میں مصر میں مقیم تھا۔ جناب مہیش پرشاد مرحوم نے اس کا ایک نسخہ تحفۃً میرے پاس بھی بھیجا۔ میں نے مطالعے کے دوران میں محسوس کیا کہ اس میں کچھ اسقام رہ گئے ہیں۔ اس پر میں نے ایک مفصل خط ان کی خدمت میں لکھا، جس میں ان غلطیوں کی نشاندہی کی۔ مرحوم نے وہ خط صدیقی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ اب جو طے ہوا کہ خطوط غالب کی دونوں جلدیں شائع ہوں، تو صدیقی صاحب نے فرمایا کہ انھیں آپ مرتب کر دیجیے۔ اور پہلی جلد کے تو اسقام بھی آپ کی نظر میں ہیں۔ اس دن پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ میرا خط مہیش پرشاد مرحوم نے صدیقی صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔ اس سے میں نے یہ مزید استنباط کیا کہ صدیقی صاحب نے نہ صرف میرا خط دیکھا ہے، بلکہ وہ میرے اعتراضات سے بھی متفق ہیں۔ قصہ کوتاہ، میں نے دونوں جلدیں مرتب کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

میں اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ پہلی جلد کی از سر نو ترتیب کا کام بھی کرتا رہا۔ پھر جناب سرور صاحب کے کہنے پر اس کی کتابت بھی یہیں دلی میں کرائی۔ یہ کام ۱۹۵۷ء کے آخر تک مکمل ہوگیا تھا۔ اتنے میں میرے ہندوستان سے پھر باہر جانے کا فیصلہ ہوگیا، اور میں اپریل ۱۹۵۸ء میں سفر پر روانہ ہوگیا۔ روانگی سے پہلے میں نے کتابت شدہ کاپیاں سرور صاحب کی

خدمت میں بھجوا دیں۔ میرا خیال تھا کہ جب طباعت کی منزل آئے گی، میں اس کے لیے دیباچہ لکھ کر بھیج دوں گا، جو کتاب کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ نہ جانے کیوں کتاب کی اشاعت میں تاخیر ہوتی گئی اور مجھے کچھ نہ معلوم ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔

میں یورپ سے چھ برس بعد اپریل ۱۹۶۴ء میں وطن واپس آیا۔ اب کے بعض نجی مجبوریوں کے باعث میں بحری جہاز سے آیا تھا۔ قیام بمبئی کے دوران میں ایک دن مکتبۂ جامعہ کی مقامی شاخ پر جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں میں نے پہلی مرتبہ مطبوعہ نسخہ (خطوط غالب) دیکھا۔ اس پر صرف میرا نام چھپا تھا۔ اس پر مجھے تعجب ہوا۔ جب میں دلی پہنچا تو میں نے سرور صاحب کی خدمت میں لکھا کہ جہاں کتاب کی اشاعت میں چھ برس کی تاخیر ہو چکی تھی، اگر کچھ اور انتظار کر لیا گیا ہوتا تو میں اس پر دیباچہ لکھ دیتا۔ دوسرے یہ غلطی ہوئی ہے کہ مرتب کی حیثیت سے صرف میرا نام چھپا ہے۔ صحیح یہ ہوتا کہ پہلے مہیش پرشاد مرحوم کا نام ہوتا اور ان کے بعد میرا مرتب ثانی کی حیثیت سے۔ سرور صاحب نے جواب دیا کہ اب تو چھپ گیا۔ انشاء اللہ طبع ثانی میں دونوں نام دے دیے جائیں گے۔

میرے کام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جناب مہیش پرشاد مرحوم کی اصلی کتاب میں، جو ٹائپ میں چھپی تھی، خطوں کا متن (۲۷) سطری مسطر پر (۴۰۸) صفحات کو محیط ہے، اور اس میں (۴۵۲) خط ہیں۔ طبع ثانی میں کتاب نستعلیق میں چھپی ہے۔ اس کے ہر صفحے میں بھی (۲۷) سطریں ہیں۔ لیکن نستعلیق کی گنجائش کی رعایت کے باوجود اس کی ضخامت (۴۴۸) صفحات کی ہے۔ اور اس میں (۵۲۸) خطوط ہیں۔ دونوں نسخوں میں خطوط کا نمبر شمار ساتھ کے ساتھ چھپا ہے اور اس کے معلوم کرنے میں کسی کو دشواری پیش نہیں آ سکتی۔

میرا خیال تھا کہ اگر کوئی صاحب تھوڑی سی تحقیق یا تجسس سے کام لیں گے تو آسانی سے وہ یہ اختلافات معلوم کر لیں گے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ ہم میں سے بیشتر لوگ خود غور و فکر نہیں کرتے، دوسروں کے کہنے پر آمنّا و صدّقنا کہتے ہی میں عافیت دیکھتے ہیں۔ سچ کہا ہے اقبال نے ؎

حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

بہرحال مندرجۂ صدر کوائف سے معلوم ہوگا کہ میری مرتب کردہ کتاب منشی مہیش پرشاد مرحوم کی کتاب سے کس حد تک مختلف ہے۔ تاہم اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہے کہ منشی صاحب مرحوم کے شائع کردہ تمام خطوط اس میں شامل ہیں۔

یہ اضافہ کیسے ہوا؟ اور میں نے کام کس نہج پر کیا؟

بات یہ ہے کہ اس دوران میں غالب کے خطوط بنام منشی نبی بخش حقیر 'نادراتِ غالب' کے عنوان سے پاکستان میں چھپ گئے تھے۔ چوں کہ اتفاق سے یہ 'خطوطِ غالب' کی پہلی جلد ہی سے متعلق تھے۔ میں نے انھیں بھی مرتب کر کے شاملِ کتاب کر لیا۔ چند غیر مطبوعہ خطوط خود میرے پاس تھے۔ انھیں بھی مناسب مقام پر داخل کیا۔ مطبوعہ نسخہ میں بعض خطوط غلط نام سے چھپ گئے تھے۔ انھیں اصلی مکتوب الیہ کے نام کے خطوں میں ڈال دیا۔ جن خطوں کے بارے میں تاریخ کی تصحیح ہو سکی ان کا مقام بدل دیا۔

غرض وہ تمام کام جو عام طور پر "ترتیب" کی ذیل میں آتا ہے۔ میں نے کیا۔

اب میں ایک اصولی بات کرنا چاہتا ہوں۔

کہا گیا ہے کہ میں نے 'نادراتِ غالب' مرتبہ جناب آفاق حسین آفاق سے منشی نبی بخش حقیر والے خط "سرقہ" کر کے اپنے مرتبہ نسخے میں شامل کر لیے ہیں۔ کیا واقعی یہ "سرقہ" ہے؟

اگرچہ خود میرے دل میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ لیکن میں نے مزید احتیاط کی خاطر انھیں شاملِ کتاب کرنے سے پہلے ایک وکیل صاحب سے مشورہ کیا۔ جب انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ اس میں کوئی قانونی یا اخلاقی اعتراض نہیں۔ ان خطوط پر کسی کا 'کاپی رائٹ' نہیں تو میں نے انھیں نئے ایڈیشن میں شامل کر لیا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں نہ اس کا حوالہ دے سکا، نہ آفاق صاحب کا شکریہ ادا کر سکا۔ لیکن اس کے لیے بھی میں قصوروار نہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، مجھے دیباچہ وغیرہ لکھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پھر اگر میں نے اقرار نہیں کیا، تو کیا کہیں انکار کیا ہے؟

اس سلسلے میں ایک بنیادی بات یاد رکھنے کی ہے۔ اگر کسی کے پاس غالبؔ کا کچھ غیر مطبوعہ کلام نظم و نثر ہے، تو وہ جب تک چاہے، اسے سینت رکھے اور شائع نہ کرے۔ اس طرح اسے ایک قیمتی متاع کے 'تملک و تصرف' کی تسکین حاصل رہے گی، اور کوئی اسے مجبور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اسے کیوں شائع نہیں کرتا! لیکن اگر ایک مرتبہ وہ اسے منظر عام پر لے آتا ہے، تو اس کے بعد وہ چیز خوانِ نعیما بن جائے گی اب جو چاہے اسے شائع کرلے، یا کسی اور طرح استعمال کرے۔ اسی اصول کا 'نادرات غالبؔ' پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ جب تک یہ خطوط جناب آفاق حسین آفاقی کی تحویل میں تھے، وہ ان کے واحد مالک تھے لیکن جب انھوں نے ایک مرتبہ انھیں کتابی شکل میں شائع کردیا تو اس کے بعد وہ کسی شخص کو ان کے استعمال سے یا انھیں دوبارہ شائع کرنے سے نہیں روک سکتے ان کے یا ان کے دوستوں کے دل میں معاملے کی صورت حال معلوم نہ ہونے کے باعث کچھ غلط فہمی سی ہے۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ منشی مہیش پرشاد مرحوم نے کیا کیا تھا؟ 'خطوط غالبؔ' کے مشمولہ خطوط اس سے پہلے اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں چھپے ہوئے موجود تھے۔ انھوں نے ایک مقررہ اصول کے تحت وہاں سے بعض مکتوب الیہم کے نام کے خط پہلی جلد کے لیے انتخاب کیے، پھر ان اصحاب کے پسماندگان اور احباب کے خاندانوں سے رابطہ قائم کرکے کچھ اور خط حاصل کیے، اور ان سب کو جناب عبدالستار صدیقی مرحوم کے حوالے کردیا۔ صدیقی صاحب نے ان پر حواشی لکھے اور یہ مجموعہ 'خطوط غالبؔ' کے نئے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوگیا۔ گویا یہی پہلے کے شائع شدہ خطوط کچھ اضافے کے ساتھ نئی کتاب بن گئے۔

میرزا محمد عسکری نے بھی "اردوئے معلیٰ" اور عود ہندی کے خطوط میں سے ایک اور نظر سے انتخاب کیا، انھیں اپنے مقدمے کے ساتھ کسی اضافے کے بغیر جوں کا توں' ادبی خطوط غالب' کے عنوان سے شائع کردیا۔ آئے دن لوگ اپنے انتخابات میں کسی نہ کسی شکل میں ان خطوں کو استعمال کرتے رہتے ہیں۔

کیا یہ سب اصحاب 'سرقے' کے مرتکب ہوتے ہیں؟

غرض، غالب کے کلام نظم و نثر پر کسی کا کاپی رائٹ نہیں۔ جو چاہے، اسے چھاپ لے۔ ہندوستان کے بیسیوں ناشروں نے اس کا دیوان اور خطوط شائع کیے ہیں۔ کیا انھوں نے کسی سے اجازت لی ہے؟ ہاں، اس میں اتنی احتیاط کی ضرورت ہے کہ اگر کسی نے دیوان یا خطوط چھاپتے وقت اس کے ساتھ کوئی مقدمہ یا دیباچہ، شرح یا تبصرہ بھی شائع کیا ہے، یا اس کے ساتھ حواشی وغیرہ لکھے ہیں، تو آپ انھیں لکھنے والے کی اجازت کے بغیر اپنے اڈیشن میں شامل نہیں کرسکتے۔ جہاں تک متن کا سوال ہے یہ کسی کی ملک نہیں ہے، اس کے شائع کرنے میں ہر کوئی آزاد ہے۔ اگر وہ پہلی کتاب پر کوئی اضافہ نہیں کرتا بلکہ صرف اتنا ہی متن دوبارہ چھاپتا ہے تو بھی قانوناً یا اخلاقاً اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ کچھ اور مواد بھی جمع کرکے اس میں شامل کرتا ہے تو پھر یہ کتاب ہی نئی ہے، وہ چاہے تو کتاب کا نام بھی نیا رکھ لے۔

اور یہ اصول خود غالب کا قائم کردہ ہے۔ انھوں نے قاطع برہان، ۱۸۶۲ء میں شائع کی۔ پھر اس میں کچھ فوائد کا اضافہ کیا اور اسی کتاب کو دوبارہ، ۱۸۶۵ء میں درفش کاویانی کے نام سے شائع کردیا۔ دونوں میں کوئی ۵۰ - ۶۰ صفحات کا فرق ہے۔

میں نے مولانا غلام رسول مہر پر اعتراض کیا تھا کہ انھیں اپنی کتاب کا 'خطوط غالب' نام نہ رکھنا چاہیے تھا کیوں کہ لوگوں کو حوالہ دیتے وقت التباس ہوگا۔ انھوں نے منشی مہیش پرشاد کی کتاب کے تمام خطوط (ان کی اغلاط سمیت) اپنے ہاں لے لیے تھے۔ لیکن میں نے اس پر اعتراض نہیں کیا، کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ منشی مہیش پرشاد مرحوم کی ملکیت نہیں تھے۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ غالبؔ کے سب سے زیادہ خطوط تفتہ کے نام ہیں۔ کل کوئی شخص انھیں 'خطوط غالبؔ' میں سے الگ کرکے من و عن چھاپ لے، البتہ منشی صاحب مرحوم کے حواشی چھوڑ دے، اور چاہے تو خود شروع میں دیباچہ وغیرہ شامل کردے یا اپنے تازہ حواشی کا اضافہ کرے تو کیا آپ کہیں گے کہ اس نے منشی صاحب مرحوم کے خلاف کوئی بات کی ہے! یا ان کے مال پر غاصبانہ قبضہ کرلیا ہے!

القصہ، 'خطوط غالبؔ' کا جو اڈیشن میرے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں جتنا اضافہ ہے اس کے پیش نظر یہ بالکل نئی کتاب

(باقی صفحہ پر)

رفعت سروش

مریض

اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور پوری قوت سے اچھال دیا۔ پتھر فضا اور جا کر گرا۔ پھر وہ اپنے ہی پھینکے ہوئے پتھر کو ٹھکراتا ہوا اور آگے بڑھ گیا — دیوار پر لگے پوسٹر پر کسی بڑے آدمی کی تصویر اس کا منھ چڑا رہی تھی — اس نے حقارت سے اس انجانے بڑے آدمی کو گالی دی اور پوسٹر پر تھوک دیا — جیب میں ٹھنسے ہوئے ایک اخبار کو پرزے پرزے کر کے سڑک پر پھینک دیا — اور پھر ایک بڑے اخبار کی بلڈنگ پر پیشاب کرنے لگا — پیشاب کر کے شاید اسے کچھ سکون ملا اور وہ گنگنانے لگا۔

رات کے دس بج رہے تھے اور بہادر شاہ ظفر روڈ پر سناٹا تھا بس اسی کی طرح اکا دکا راہگیر بس کے انتظار میں ادھر ادھر کھڑے تھے — ایک بس آئی اور وہ گنگناتا ہوا بس کی طرف لپکا اور بغیر نمبر پوچھے بس میں چڑھ گیا — بس میں چڑھ کر اس نے ایک بار پھر سڑک پر تھوکا۔ اور ایک موٹی سی گالی اگل دی۔

"ٹکٹ" — بس کنڈکٹر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا — اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا — مگر ہاتھ جیب سے نکل کر اس کی ران کو سہلانے لگا — اس نے پھر گالی دی اور غرایا — "اس کی ..... یہ سالی گرہ کٹوں اور جیب کتروں کی دنیا — سالوں نے گھس گھس کر کے تو آج دو مہینے بعد پچاس روپے دیئے تھے کسی حرامزادے نے وہ بھی صاف کر دیئے۔ اس کی ..... "

"بابوجی! ٹکٹ نہ لینا ہو تو اتر جائیے۔ آگے کناٹ پلیس پر چیکنگ ہوگی۔"

"ارے تو پہلے کیوں نہیں کہا۔ ہمیں کناٹ پلیس نہیں، آر۔ کے۔ پورم جانا ہے — یہ بس غلط ہے — اسے روکو۔"

"بس غلط نہیں ہے — آپ غلط چڑھے ہیں — خیر، آپ اتر جائیے۔"

بس کنڈکٹر نے شرافت کا ثبوت دیا اور وہ بغیر گالی دیئے بس سے اتر گیا — اور پھر کٹی ہوئی جیب میں ہاتھ ڈال کر نیم عریاں فلم ایکٹرسوں کے پوسٹروں کو گھورنے لگا۔

"پچاس روپے۔" — اس نے پھر تھوکا — "پچاس روپے سالے کے کن کام آئیں گے۔ ان کفن چوروں کے — دنیا بھر کا مال غصب کر کے ہم جیسوں کی محنت سے اپنے اخبار کی اتنی اونچی بلڈنگ کھڑی کرنے والے لیڈروں نے ہزاروں احسان جتا کر اور دسیوں چکر کٹوا کر آج پچاس روپے دیئے تھے — وہ بھی ان کا خصم جیب سے کاٹ کر لے گیا — بہت تیری — اس نے پھر موٹی سی گالی دی — بلغم اس کے گلے میں اٹک گیا۔ اس وقت اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔

وہ ایک بے لاگ اور منھ پھٹ انسان تھا۔ نوکری کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ فری لانسنگ کر کے — الم غلم لکھ کر وہ اپنا پیٹ پالتا تھا۔ مگر اس کے قلم میں زور تھا تحریر میں روانی تھی اس لیئے اسے اتنا کام مل جاتا تھا کہ وہ اپنے قلم کے ذریعہ اپنا پیٹ پال سکے۔ لیکن اخباروں اور رسالوں کے مالک اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ خاطر خواہ کام کرا کے اونی پونی اجرت دیتے — اور خوب پریشان کر کے — تاکہ اس کا بھاؤ چڑھنے نہ پائے اور وہ ان کے ٹکڑوں پر پلنے کے سوا کچھ اور نہ کر سکے۔

بڑے بڑے اخباروں کا بزنس کنٹرول کرنے والوں کو ایڈیٹروں کی لگام اپنے ہاتھوں میں رکھنے کے گر بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اور وہ بازار میں بکنے والی جنس کی قیمت کی طرح رائٹروں کی محنت کی قیمت کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہیں — وہ اسی بے بسی کا شکار تھا۔ اور خودداری کا مریض تھا اس لیے اسی وقت کراہتا تھا جب اس کی ضرورت حد سے زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ اور اس وقت بھی وہ چاہتا تھا کہ دوسرے بغیر کچھ کہے اس کی ضرورت کو سمجھ لیں — مگر یہ دوسرے

اس کی اس حماقت پر دل ہی دل میں ہنستے تھے اور دانستہ اس کا مطلب سمجھنے سے گریز کرتے تھے۔ آخر وہ بلبلا اٹھتا تھا اور اپنے مزاج کا توازن کھو کر گالیوں پر اتر آتا تھا۔ تب کہیں بھیک کے ٹکڑوں کی طرح اس کی محنت کی ادنیٰ پونی اجرت ملتی تھی۔ آج بھی وہ اسی منزل سے گزر کر ایک نادہند سے پچاس روپے حاصل کر کے اپنے دل کا غبار نکال رہا تھا۔ مگر جب کسی نے وہ بھیک بھی اس کی جیب سے اچک لی تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے ۔۔۔ سوائے اس کے کہ گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالے ۔۔۔ مگر کچھ دیر بہادر شاہ ظفر روڈ پر گشت کرنے کے بعد اسے احساس ہونے لگا کہ یوں کام نہیں چلے گا۔ آج دن بھر کی تگ و دو کے بعد اور کئی لوگوں سے "تقاضا کی مٹھ بھیڑ" کے بعد یہ پچاس روپے اسے حاصل ہوئے تھے۔

آج اسے روپوں کی اشد ضرورت تھی۔ اس کی بیوی کب سے بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی ہوگی کیوں کہ اس سے پاس پڑوس کی دو عورتیں آج کے وعدے کے مطابق اپنا قرض مانگنے آئی ہوں گی۔ بھوکا تو وہ رہ سکتا ہے ۔۔۔ بہت بار ایسا ہوا ہے۔ مگر وہ یا اس کی بیوی کسی کی بات سنے، اسے کوئی وعدہ خلاف کہے یہ اسے گوارا نہ تھا۔ در اصل احساس کی یہ نزاکت ہی اسے در در لیے پھرتی تھی۔ وہ صاحب قلم تھا اس کے قلم میں روانی تھی۔ لیکن وہ سیاہ کو سفید۔ اور جھوٹ کو سچ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ جب کہ کچھ اخبار والے یہ جانتے تھے کہ اس کے قلم میں جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی بھی قوت ہے۔ اور اس کے قلم کے اس جوہر کی خاطر اسے کئی بار فراخدلانہ پیش کش کر چکے تھے ۔۔۔ مگر وہ ہر بار اس پیشکش کو ٹھکرا چکا تھا اور اسے ضمیر فروشی سمجھتا تھا۔ وہ اپنے لاابالی پن کے باوجود آدرش وادی تھا۔ وہی لکھتا تھا جو اس کے ضمیر کی آواز ہوتی تھی۔

مگر کچھ دنوں سے اس کی سچائی سخت امتحان سے گزر رہی تھی۔ کاغذ کی کمی اور گرانی کے باعث ان اخباروں کی حالت زار تھی۔ جو اس کے جوہر قلم کے قدر دان تھے۔ اور اپنے ذہنی معیار سے گرنے کے لیے وہ تیار نہ تھا۔

لیکن اب کرے تو کیا۔ بمشکل تمام حاصل کیے ہوئے پچاس روپے اس کی جیب سے نکل چکے تھے اور وہ رات کے سناٹے میں بے بس بہادر شاہ ظفر روڈ پر کھڑا تھا۔ اس کی بیوی اور ساتھ ہی قرضخواہ عورتیں گھر بیٹھی اس کی جان کو رو رہی ہوں گی ۔۔۔ اس نے پھر موٹی سی گالی دی ۔۔۔ اور گلے میں پھنسا ہوا بلغم نیچے سڑک پر تھوک دیا۔ سڑک پر اونچی بلڈنگ کی کھڑکی سے لہرا کر اترتی ہوئی روشنی اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا ۔۔۔ روشنی اس اخبار کے دفتر کی تھی جس کے مالک نے اس کے قلم کو خریدنے کے لیے زیادہ قیمت دینے کی پیش کش کی تھی ۔۔۔ وہ منہ اٹھائے اس کھڑکی کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے ایک موٹی سی گالی دی۔ اپنے آپ کو ۔۔۔ ہنسا ۔۔۔ ایک احمق اور پاگل کی طرح ۔۔۔ زور سے تھوکا ۔۔۔ اور پھر تیزی سے اس روشنی کے چھلاوے کو پکڑنے کے لیے اخبار کے دفتر کے زینہ پر چڑھنے لگا۔

بقیہ: خطوط غالب کی ترتیب نو

ہے لیکن چوں کہ میں اسے صرف اپنے نام سے نہیں شائع کرنا چاہتا تھا اور منشی صاحب مرحوم کے کام کا اعتراف اپنا فرض خیال کرتا تھا۔ بالخصوص جب کہ ان کی کتاب کے حواشی بھی ساتھ شائع ہو رہے تھے۔ اس لیے صحیح بات یہ ہوتی کہ ان کا نام اول چھپتا اور میرا اس کے بعد۔ اگر ناشر نے ایسا نہیں کیا، تو یہ میری اجازت یا استصواب رائے سے نہیں ہوا۔ اور یہ میرے منشا کے بھی خلاف ہے بھلا اس کے لیے میں کیوں کر ذمہ دار گردانا جا سکتا ہوں ؟

میں عمر اور صحت کے جس مرحلے پر ہوں اس کے پیش نظر نہیں چاہتا کہ مجھے پھر اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت پیش آئے۔ بلکہ اسی لیے یہ خط ذرا تفصیل سے لکھا ہے۔ لہٰذا مناسب خیال کرتا ہوں کہ اپنے احباب کو ایک وصیت کر دوں۔

یہ دنیا چند روزہ ہے۔ انھیں چاہیے کہ وقتی اور عارضی گرم بازاری کے لیے یا نفسانیت کے تحت وہ کوئی ایسی بات نہ کہیں نہ کوئی ایسا کام کریں جس سے آیندہ نسل کے اخلاق اور کردار کی تشکیل پر کوئی ناخوشگوار اثر پڑے۔ یہ بڑی ذمہ داری ہے۔ اور اس سے اجتناب لازم ہے۔

●●

نور تقی نور

چمن میں اب کے برس یہ عجیب منظر ہے
کسی کے ہاتھ میں گل ہیں کسی کے خنجر ہے
تو کون ہے مری دنیا اُجاڑنے والا
ستم ظریف مرے ہاتھ میں مقدر ہے
کچھ اور عرض کروں گا تو آپ رو دیں گے
یہی بہت ہے کہ اب میرا حال بہتر ہے
کٹی حیات سفر میں، مگر یہیں پہنچے
تمہارا شہر ہی گیا اس زمیں کا محور ہے
ابھی یہ ظرف کہاں خاک میں کہ جذب کرے
یہ میرا اشک نہیں، روشنی کا پتھر ہے
جدھر نگاہ اٹھا دوں برس پڑیں بادل
مرے خیال میں وہ گیسو معطر ہے
سوال یہ ہے کہ جنت بنی تو کیسے بنی
تمام حسن تو تیری گلی کے اندر ہے
سیاہ راتیں رہی ہیں مری عزیز اے نور
مجھے نہ چھوڑ کہ بڑا زہر میرے اندر ہے

کرشن مراری

زخم یادوں کے جب مسکرانے لگے
تار پھر ٹوٹ کر جھنجھنانے لگے
ان گنت حادثوں کا ہوا سامنا
خود کو ہم جو کبھی آزمانے لگے
سحر کرتی گئی شوخ چتون تری
قرب کے حوصلے گنگنانے لگے
چھا گئیں گلشنوں میں بہاریں نئی
طائرِ خوشنوا چہچہانے لگے
تیری ہی شوخ نظروں کا تھا سامنا
جب کبھی سوچ میں ڈوب جانے لگے
بے وفائی کا شکوہ کیا جب کبھی
سامنے بیٹھ کر مسکرانے لگے

ان گنت منزلیں۔ ان گنت راستے
ان گنت حادثے، دل لبھانے لگے

محمد احمد رمز

کہاں ڈھونڈے گا اب کوئی مرا نام و نشاں مجھ میں
ہوا جاتا ہے سب کچھ لمحہ لمحہ رائیگاں مجھ میں
کہاں تک ساتھ دیگی خاک کی پیوندکاری بھی
شکستہ ہو گئی ہے کس قدر دیوارِ جاں مجھ میں
مکان و لامکاں کریں خلا کی طرح گھیرے ہوں
سمٹ آئے ہیں جیسے یہ زمین و آسماں مجھ میں
کوئی طوفانِ خاک و باد اڑا لے جائے اس کو بھی
کھنچا ہے بے ضرورت اک حصارِ استخواں مجھ میں
حدِ احساس تک بڑھتی چلی جاتی ہے تاریکی
پریشاں ہے بہت بجھتے چراغوں کا دھواں مجھ میں
میں اُس کو قتل کر کے کس قدر شرمندہ ہوں اُس سے
وہ اپنی جان دیکر ہو گیا ہے جاوداں مجھ میں

یوسف جمال

مشورہ

جانی پہچانی تہذیب کے نام پر
حبس بے جا سے گھٹتی ہوئی سانسوں کا
مل کے نوحہ پڑھیں
یعنی دم توڑتی   خواہشوں کے مقابر سے لپٹی ہوئی منجمد آرزوؤں کا
ماتم کریں
اور ــــــ پھر
جلتی پھرتی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر
پاگلوں کی طرح سے ہنسیں
(قہقہہ مار کر)

خواب کی قیمت

ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوا
پھر بکھر کر میرے جسم میں چبھ گئیں کرچیاں
خواب میں کانچ کا گھر بنانے کی قیمت چکانی پڑی

کھوٹا سکہ

میں کہ تھا ایک سکے کی مانند
ڈھلتا اور بٹتا گیا ریزگاری کے انداز میں
مل گیا خاک میں میرا سارا وقار

تنہا تماپوری

ادھورا کنہیا

مگر.... اس ریت کا تم کیا کرو گے؟!
جو بڑی بے حس ہے
سارے نقش پی کر سو گئی ہے
نقش:
جن کو کتنی ہی صدیوں نے سونپا اپنا سارا
زہر و امرت....
اور یہ سب نقش میری گوپیاں ہیں
میں کنہیا ہوں ادھورا
مجھ کو میری گوپیاں دو
بانسری پھر جاگ اٹھے گی
پھر سے گوکل میں بہاریں لوٹ آئیں گی
مگر.....
اُس ریت کا تم کیا کرو گے
جو بڑی بے حس ہے
سارے نقش پی کر سو گئی ہے

احتشام اختر

میں سن نہیں سکتا

زندگی
بس کی قطار کے عشق کی طرح
سطحی سہی لیکن
بے کیف نہیں
زندگی دلکش ہے
شہر کے ہنگاموں کی طرح
میں ہنگاموں کا دلدادہ ہوں
خموشی سے نفرت ہے مجھے
کہ میں خاموشی میں
بیتے کل کی ٹِک ٹِک
گھڑی کی طرح
سن نہیں سکتا

خلش دہلوی

میری لاش

روبرو میرے
میری لاش!
کتنا پرکیف اور دلکش منظر ہے
حیات کے تقاضے اور ان کا احترام
خاندانی روایات کی زنجیروں میں قید
ایک شکستہ زندگی
اور اس پہ اتنا بھاری بوجھ
پھر بھی کہلاتا ہوں
پرندے کی مانند آزاد
— ایک ایسا پرندہ
جس کے پر نوچ لیے گئے ہوں
اس کے برعکس میری لاش
ہر طرح سے آزاد
شانِ بے نیازی سے
تخیلی فضا میں اونچے اونچے سایہ دار درختوں سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی
بکھیرتی ہوئی! عجب سحر انگیز موسیقی
مسکراتی ہوئی، دور عرش پر
روایتی تقاضوں سے آزاد
اور پھر ساحل پہ لہروں کو چومتی ہوئی
بیچ سمندر میں
سفینوں سے! ننھی ننھی کشتیوں سے
خوفناک طوفان سے ملتی ہوئی گلے
میرے سامنے
میری ہی بے بسی پہ
قہقہے لگاتی ہوئی
روبرو میرے خاموش پڑی ہے
اور میں
خیالات کا ایک ہجوم سینے میں سمیٹے اشک بار ہوں
دھندلے دھندلے سے مناظر
ٹوٹی بکھری شکستہ صورتیں
میلے اداس چہرے
میرے ماضی، حال اور مستقبل کے
رفیق دوست ہمدرد دمساز اور ہمنفس
رستے ہوئے اشکوں کی ڈوری سے لپٹے ہوئے
مضمحل ہوئے جاتے ہیں
بجھے جاتے ہیں
اور پھر وہی قہقہے میری لاش کے
کانوں سے ٹکرا کر میرے
پاش پاش ہوئے جاتے ہیں

شمسی طہرانی

فارسی کے ممتاز شاعر
فرّخی

غزنوی عہد کے شعرا میں فرخی ایک اہم حیثیت کا مالک ہے اس کا پورا نام ابوالحسن علی بن جولوغ ہے۔ وہ سیستان کا رہنے والا تھا۔ ایک شعر میں اس نے اپنے وطن کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

من قیاس از سیستان دارم کہ آن شہر من است
وز پئ خویشان ز شہر خویشتن دارم خبر

فرخی کو قدرت نے ذوق لطیف. فطری صلاحیت اور دل کش آواز سے نوازا تھا۔ وہ چنگ بھی بجاتا تھا۔ قصیدہ بہت اچھا کہتا تھا اور اس فن میں اس نے ایک خاص طرز ایجاد کی ہے۔ فرخی نے قصائد کے علاوہ غزلیں، قطعے، اور ترجیع بند اور رباعیاں بھی کہی ہیں اس کے دیوان میں نو ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ اس کے ہمعصروں اور بعد کے شعرا نے اس کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے عنصری نے جو اس کا ہمعصر ہے دل کھول کر اس کی مدح کی ہے۔ اسی طرح رشید وطواط وغیرہ نے اس کی مدح کی ہے۔

محمود کے دربار میں آنے سے پہلے فرخی سیستان میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ پھر چغانی دربار سے وابستہ ہوگیا۔ اس زمانے میں ابوالمظفر احمد بن محمد امیر چغانیان کی داد و دہش کا بڑا شہرہ تھا فرخی نے جب یہ سنا تو وہ ایک کارواں کے ساتھ ہوگیا۔ چغانیان پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر اپنے گھوڑوں کو داغ دینے کے لیے گیا ہوا ہے فرخی نے اپنا قصیدہ جو وہ کہہ کر لایا تھا۔ امیر ابوالمظفر کے پیش کار خواجہ عمید اسعد کے سامنے پیش کیا۔ خواجہ اپنے ساتھ داغ گاہ لے گیا اور ضمناً اس سے خواہش کی کہ وہ داغ گاہ کے متعلق کچھ اشعار کہے . . . . فرخی نے اسی رات داغ گاہ کا وہ مشہور قصیدہ لکھا جو ذیل کے مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

تا پرند نیلگوں بر روی پوشد مرغ زار
پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار

دوسرے روز اس نے امیر کے سامنے یہ قصیدہ پڑھا۔ امیر شعر شناس تھا۔ اس قصیدے پر اسے بڑی حیرت اور مسرت ہوئی اس نے شاعر کو صلہ اور انعام سے سرفراز کیا۔

فرخی کے حالات میں یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ سلطان محمود کے دربار سے اس کا تعلق کس زمانے سے ہوا ہے؛ کیونکہ اس کی اہمیت غزنوی دربار سے وابستہ ہوکر ہی نمایاں ہوئی ہے۔ اس کے دیوان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دربار غزنی کے بہت سے امرا کی مدح کی ہے۔

قصائد فرخی کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شاعر کا تعلق زیادہ تر امیر یوسف ابن ناصرالدین، امیر ابواحمد محمد اور خود سلطان محمود سے رہا ہے۔ لیکن اول الذکر امیر یوسف سے اس کو خاص تعلق تھا سلطانی دربار میں رسائی حاصل کرنے سے قبل وہ امیر یوسف کے درباریوں میں شامل ہوگیا تھا۔ اس وقت تک وہ گم نام اور اجنبی تھا۔ رفتہ رفتہ اسے سلطان محمود کے دربار میں مقام حاصل ہوگیا۔ اور اس نے بہت زیادہ دولت حاصل کرلی۔

فرخی کے کلام میں سلاست و روانی ہے۔ اس کا کلام سعدی کی طرح سہل ممتنع کی حیثیت رکھتا ہے۔ صاحب مجمع الفصحا لکھتا ہے "حکیم فرخی را در شاعری طرز خوش مرغوب است و تغزلات شیریں عاشقانہ مسرت انگیز دارد سخن وی سہل ممتنع است۔ وی در دیار مدیح گویان زمانہ، خود چنانست کہ سعدی در غزل گویان" — حقیقت بھی یہی ہے کہ فصاحت و سلاست اس کا خاص حصہ ہے اور پھر اس پر زور طبیعت نے قصائد کو اور موثر بنا دیا ہے۔

فرخی کا ایک اور وصف فطرت نگاری ہے۔ عنصری کی طرح فرخی نے بھی زیادہ تر قصیدے ہی کہے ہیں۔ اور انھیں اس نے قدرتی

مناظر سے شروع کیا ہے۔ اس کے قصیدوں میں جابجا بہار کی زیبائی نوروز کی تراوٹ ابر و باد کی کیفیتیں اور مے و معشوق کا ذکر ملتا ہے فرخی سے پہلے تشبیب کے مضامین میں کسی شاعر نے لطیف تغزل سے کام نہیں لیا۔ فرخی ہی اس انداز کا موجد ہے۔

صورت نگاری بھی فرخی کی خصوصیات میں ہے کہ جب کسی چیز کی تعریف یا کسی واقعہ کی حالت اور کیفیت بیان کرتا ہے تو اس کا اصل سماں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔ فرخی نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی۔ اس سے پہلے بھی یہ صنف موجود تھی لیکن سیکڑوں گونا گوں واقعات کو نہایت بے تکلفی اور برجستگی سے ادا کر کے اس نے واقعہ نگاری کی ایک شاہراہ قائم کر دی اور آنے والوں کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ اکثر قصیدوں میں فتوحات کے حالات لکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک مورخ بے کم و کاست ٹھیک ٹھیک حالات لکھتا جا رہا ہے۔

فرخی سے پہلے مرثیے بہت کم پائے جاتے تھے اور جس قدر تھے معمولی درجے کے تھے۔ لیکن فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا وہ نہ صرف پُر درد اور پُر تاثیر ہے بلکہ اس فن کے تمام اصول و آئین اس سے قائم ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کے مرثیے کی روشنی میں مرثیہ نگاری کے اصول و آئین قائم ہوئے۔ اور مرثیہ نگاری آگے بڑھی۔

فرخی سے پہلے فارسی شاعری میں ترجیع بند کا بھی کوئی تصور نہ تھا۔ یہ فرخی ہی نے فارسی شاعری کو ترجیع بند سے روشناس کرایا۔

صنائع شاعری میں ایک چیز تلمیح ہے۔ یعنی کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا، فرخی اس صنعت کا استعمال نہایت خوبی سے کرتا ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت آدم نے جب بہشت میں گیہوں کھا لیا تو ان کے بدن کے کپڑے خود بخود اتر گئے اور وہ بالکل برہنہ ہو گئے فرخی نے اس واقعہ سے خزاں کی تعریف میں مضمون پیدا کیا ہے ؎

مگر درخت شگوفہ گناہ آدم کرد
کہ از لباس چو آدم ہمی شود عریاں

فرخی کے کلام میں اکثر تاریخی واقعات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ سلطان محمود کا ندیم خاص تھا اور ہندوستان کے کئی سفروں میں اس کے ساتھ رہا تھا۔ سلطان کے معرکوں اور فتوحات کے بعد اس نے جو قصیدے لکھے ہیں ان میں ان کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس لیے یہ قصائد تاریخی واقعات، تاریخی ناموں اور تاریخی مقاموں کی آگاہی کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور تاریخ نگاری میں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

فرخی کے کلام میں اس کے عہد کے تمدن و تہذیب کے واضح نقوش بھی ملتے ہیں۔ وہ مجالس سلطانی کا ذکر کرتا ہے اور ان تمام اجزاء کو بیان کرتا ہے جن سے یہ مجالس ترتیب دی جاتی تھیں۔ نوروز اور مہرگان کے جشنوں کا حال لکھتا ہے۔ اسی طرح اس نے ابوالمظفر چغانی کی داغ گاہ کا حال لکھا ہے اور اس میں لفظ داغ گاہ کے اجمال کی پوری تفصیل موجود ہے۔

فرخی ہمیشہ محمود کے معرکوں میں اس کے ساتھ رہا ہے۔ اس لیے ہندوستان بھی آیا ہے۔ اس کے کلام میں اس دور کے دوسرے تمام شعراء سے زیادہ ہندوستان کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے یہاں ہندوستان سے متعلق جو بیانات ملتے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم فتح قنوج کالنجر کا واقعہ ہے۔ مہم قنوج سے پہلے کے کارناموں کا فرخی کے یہاں کوئی ذکر نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرخی سلطان محمود کے دربار میں ۴۰۹ھ سے کچھ پہلے جو مہم قنوج کا سال ہے پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے قبل کے واقعات اس کے ہاں نہیں ملتے۔

فرخی کے کلام میں بہت سے ہندی الاصل الفاظ بھی آئے ہیں جن میں سے چند کا ذکر درج ذیل ہے۔

"شل" بمعنی سیل: ؎

بگونہ شل افغانیاں دو بیرہ و تیز
چو دستہ دستہ بہم تیرہائے بے سوفار

فرخی نے ہماری "کھاٹ" کو کتنا بلند پایہ دیا ہے ؎

خلافت جدا کرد جیپال لیال را
زکٹ" ہائی زرین وشاہانہ نیلور

فرہنگ نامہ تو اس میں ہے: "کت تخت ہندوان باشد میان بافتہ۔

فرخی کے یہاں "والا" (اسم فاعل) بھی موجود ہے ؎

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

ہاجرہ شکور

نقطۂ نظر!

پہلا

میں اس وقت بالکل خالی الذہن اور غیر جانب دار ہو کر سوچ رہی ہوں کہ آخر میں تم سے ناراض کیوں نہیں ہوں؟ بات دراصل اتنی ہے کہ ہر چیز کی انتہا بری ہوتی ہے خواہ وہ انصاف پسندی ہی کیوں نہ ہو — میری انصاف پسندی نے مجھ سے شکایت کا حق بھی چھین لیا ہے۔ میں تمہاری دلی کشمکش کو چپ چاپ بیٹھے سے دیکھ رہی ہوں اور تم پر ترس کھا رہی ہوں۔ اسی لیے جب اس مسئلہ کو انصاف کی ترازو پر تولتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے تم نے جو کچھ کیا اچھا ہی کیا۔ میں جانتی ہوں کہ اگر میں نے شکایت کی ہوتی تو تم خوش ہوتے۔ اگر میں اپنی کوئی کمزوری دکھا سکتی تو تمہارے دل کا خلا پُر ہو جاتا۔ یہی احساس ہمارے تمہارے درمیان دیوار بن گیا۔ نہ میں کبھی ایک معمولی سی گرہستن بن سکی نہ تم کبھی ایک عام سے شوہر ہو سکے۔ تمہارا یہ احساس غلط بھی نہ تھا۔ عمر، عقل، تعلیم اور تجربہ! ہر چیز میں، میں تم سے آگے تھی۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ تم میرے اسٹوڈنٹ رہ چکے تھے۔ تم سے میری شادی بھی ایک حادثہ تھی۔ دراصل ذمن کی بیوفائی سے میں بالکل چور چور ہو گئی تھی۔ ویسے وہ بیوفائی تھی بھی نہیں! اس نے مجھ سے کبھی پیمانِ وفا نہیں باندھا۔ اگر یہ بے وفائی ہوتی تو میں اسے الزام دے کر دل ٹھنڈا کر سکتی۔ ذمن کو اس نظر سے دیکھنا میری غلطی تھی۔ اور ایسی فاش غلطی کہ میں سر تاپا ندامت میں ڈوب گئی تھی۔ اور میرا سارا اعتماد اور بھرم جاتا رہا۔ ذمن میرا پرانا ساتھی تھا۔ ہمارے طالب علمی کے دن ایک ساتھ گذرے۔ اس لیے ذہنی ارتقاء بھی ایک سا ہوا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر ہی روایتی پریم کہانیوں کا جی بھر کر مضحکہ اڑایا۔ جب ہم کلاس فیلو تھے تو ان لوگوں کو تختۂ مشق بناتے جو کلاس کی لڑکیوں کے پیچھے بھاگا کرتے۔ اس طرح کے لوگ بھی تھے جو لڑکیوں کو کتابیں اور نوٹس دیا کرتے صرف "تھینک یو" کی بیش بہا دولت لوٹنے کے لیے۔ میں اور ذمن دونوں ہی کھلی ہوئی آزاد فضا کے پروردہ تھے اس لیے اس گھٹی ہوئی ذہنیت کو نشانہ بنا لیتے۔ تعلیم کے بعد ہم ایک کالج میں لیکچرر ہو گئے۔ مضمون بھی ایک ہی تھا نفسیات — اس لیے ہمیشہ ہی ملنے جلنے کا موقع ملتا رہتا۔ لوگ شاید ہمارے بارے میں قیاس آرائیاں بھی کرتے ہوں گے۔ یہ مجھے پتہ نہیں۔ لیکن ہم دونوں ان سب باتوں سے بے پروا تھے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب دھیرے دھیرے ذہنی مطابقت نے دل کی لگی کا روپ اختیار کر لیا۔ یہ بھی حالات اور واقعات کی ایک ستم ظریفی ہوئی۔ اس میں ذمن کا کوئی قصور نہیں میں خود بھی اسے حق بجانب سمجھتی ہوں۔ جب ذمن نے اپنی شادی کا کارڈ روانہ کر دیا تو ہر چند وہ کوئی اچانک ہونے والا حادثہ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی میرا عجیب عالم تھا۔ نارمل رہنے کی کوشش میں دل میں اٹھنے والا کڑوا کسیلا دھواں گھٹ رہا تھا۔ اس کی کڑواہٹ سے آنکھیں رہ رہ کر نم ہو رہی تھیں۔ میں اسٹاف روم میں رہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کیوں کہ لیکچرر کی پوسٹ پر پہنچ کر ہماری کمزوریوں کا اظہار مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ اسی عالم میں میں نے دیکھا کہ میرا ایک اسٹوڈنٹ دروازہ پر کھڑا اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا ہے۔ اس نے کئی دن سے میرا کچھ وقت لے رکھا تھا۔ میں نے بچے کھچے وقار کی دھجیاں سمیٹ کر شائستگی کے ساتھ اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

—"میڈم! آپ شاید کچھ پریشان ہیں" میرے سب سے عزیز اسٹوڈنٹ نے کہا۔ میں نے ایک پھیکی سی لیکن رسمی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ میرا یہ عزیز اسٹوڈنٹ جو عمر میں مجھ سے تقریباً پانچ سال چھوٹا تھا میری ذات سے والہانہ عقیدت رکھتا تھا۔ یہ تم ہی تھے کپل۔ اس زمانے میں تم ایک نوخیز نوجوان تھے بہت سیدھے اور صاف دل۔ اس زمانے میں تم کس طرح میرے فین، میرے مداح ہوا کرتے تھے۔ تم ایک ماورائی اور لاہوتی شے سمجھ کر میری پرستش کیا کرتے تھے۔ وہ ایک عجیب سی گھڑی تھی میرے دل کے شکستہ ریزے اس دروازے پر بکھرے پڑے تھے جہاں سے ذمن گزر گیا تھا۔

اچانک تم اسی دروازے پر آکھڑے ہوئے۔ اندر آنے کی اجازت طلب کرتے۔ شاید تمھاری والہانہ عقیدت نے میرے ذہنی کرب کو کم کردیا۔ یا یہ ایک نامعلوم سا احساس انتقام تھا کہ میں ذہن سے پہلے ہی شادی کرکے گھر بسا لینا چاہتی تھی۔

اس کے بعد میں نے جان بوجھ کر ایسے مواقع فراہم کیے کہ تمھاری جبلیت تمھارے احترام اور ہیرو ورشپ پر حاوی ہوسکے۔ بہرحال یہ زندگی کی نیرنگی ہے کہ ہر طرح اپنے جلوے دکھاتی ہے۔ ہر جذبے کی طرح چاہت کا بھی آغاز اور انتہا ہوتی ہے۔ یہ مجھے جلد ہی محسوس ہوگیا کہ جو چاہت عقیدت سے شروع ہو وہ تکلف اور دوری کا پردہ چاک ہونے پر پرزہ پرزہ ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ اس وقت محبوب پرستش کی نہیں بلکہ برتنے کی چیز بن جاتی ہے۔

یہ انجام تو دراصل اسی وقت دکھائی دے گیا تھا جب ہم اور تم شادی کے بعد رجسٹرار کے آفس سے باہر نکلے۔ میرے منہ میں کڑواہٹ گھل رہی تھی۔ اور اپنی گہری سرخ ساڑی سے دھوپ کے پرتو میں آنکھیں جل رہی تھیں۔ کچھ عجیب جھینپ اور کھسیاہٹ کا عالم تھا میں اس وقت بالکل تنہا ہونا چاہتی تھی۔ لیکن بغیر نہ کرسکے باوجود کئی اسٹوڈنٹس اور ساتھی جمع ہوکر مبارک باد دے رہے تھے۔ ذمی بھی ان میں شامل تھا۔ میں اپنے آپ کو سخت احمق محسوس کر رہی تھی۔

تمھارے ساتھ قربت کے لمحات میں میں کبھی بھی احساس جرم کو دل سے نہ نکال سکی۔ یہ خیال ہمیشہ رہا کہ میں نے غلط کیا ہے۔ تمھاری معصومیت اور عقیدت کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے اب جب کہ سات سال سے ہم لوگ ایک غیر متوازن پہیوں کی گاڑی ڈھو رہے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ تم نے نیلم کو پسند کرلیا ہے۔ میں نے تمھیں آزاد کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ویسے بھی تم مجھے چھوڑ ہی دیتے۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ صورت حال بہت خوب صورتی سے نبٹائی جائے یہ بھی سوچتی ہوں کہ جو غلطی ہوگئی اس کا بوجھ آگے تک گھسیٹنا بے کار ہوگا۔

دوسرا

میں جانتا ہوں کہ میرا نیلم سے شادی کرنے کا فیصلہ رباب سے چھپا نہ رہا ہوگا۔ رباب! جس کو میں ایک عرصے تک مس نظیری کہتا رہا، پھر سے مس نظیری ہوجائے گی۔ وہ چار سال تک میری لیکچرر رہ چکی ہیں۔ میں انھیں عرصے تک میڈم کہہ کر خطاب کرتا رہا ہوں۔ میں انہیں کتنا چاہتا تھا۔ ان کی دیوانہ وار پرستش کیا کرتا تھا میں گھنٹوں کالج کے گیٹ کے قریب والے لان میں بیٹھا رہتا کہ کب مس نظیری آئیں۔ ان کا انداز خرام دیکھ سکوں۔ وہی نامعلوم سی مسکراہٹ دیکھ سکوں جو نظر ملتے ہی واضح ہوجاتی تھی۔ رباب نظیری بہت ہی خوب صورت تھیں۔ اور اب بھی ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کا حسن چمپئی رنگ، عنابی ہونٹوں اور دلربا جسم کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ان کا کتاب پڑھنے کا انداز جوڑے بارڈر کی طرح دار سوتی ساڑھیاں گردن پر ڈھلکا سا جوڑا، پڑھاتے پڑھاتے ماتھے پر ایک سلوٹ کا نمایاں ہوجانا، گردن کی خفیف سی حرکت پر ہلتی ہوئی بڑی بڑی سنہری بالیاں یہ سب ہی اتنے مسحور کن تھے کہ بس میں تکتا رہ جاتا۔ ان کے لیکچر کے لیے میں تیار ہوکر جاتا کہ نئے نئے سوال پوچھ سکوں اسٹاف روم میں جاکر بحث کرسکوں۔ ساتھ ہی ان کی نظر میں چڑھ سکوں۔ لیکن یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کبھی میری بیوی بن سکیں گی۔

میرے گھر میں کوئی عورت تھی ہی نہیں اسی لیے میں کلاس کی لڑکیوں سے بھی بہت گھبراتا تھا۔ صرف رباب ہی تھیں جن کو قریب سے دیکھنے کا اس طرح موقع ملا۔ دن بھر ان کے تصور میں غرق رہتا اور رات میں بھی ان کے سپنے دیکھتا۔ ان کے عجیب عجیب روپ نظر آتے لیکن محبوبہ کا کبھی نہیں۔ شاید میں نے یہ روپ غیر شعوری طور پر سوچا ہوگا۔ نہیں تو میں اس طرح اپنا انداز فکر کیوں بدل دیتا۔ وہ بھی ہمیشہ سے ہی مجھے سب طالب علموں سے زیادہ پسند کرتی تھیں۔ میں ہمیشہ نفسیات ہی پڑھتا۔ جب کلاس میں ان کے پوچھے گئے سوالوں کا جواب کوئی نہ دے سکتا تو میں بالکل صحیح جواب دے کر سب کو حیران کردیتا۔ ایک عجیب سی مربیانہ مسکراہٹ کی روشنی ان کے چہرے پر بکھر جاتی۔ جی چاہتا بس وہ ہوں اور میں ہوں اور ساری زندگی اسی طرح کلاس روم میں گزر جائے۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، کب اور کس طرح ان کی

مسکراہٹ میں لگاوٹ آگئی، میں اکثر اسٹاف روم کے بجائے ان کے گھر جانے لگا۔ کب میں نے پہلی بار ان کا ہاتھ تھاما۔ اور کس طرح آنکھوں سے لگایا۔ کن الفاظ میں شادی کی درخواست کی ؟ میں سمجھتا ہوں کہ اگر انھوں نے میری لنگڑی گفتگو کو حوصلہ افزائی کی بیساکھی نہ دی ہوتی تو میں کبھی حرف مطلب ادا نہ کر سکتا۔

مذہب کی تو میرے لیے کوئی اہمیت تھی ہی نہیں اگر ہم دونوں کا مذہب مختلف نہ بھی ہوتا تو بھی میں شادی کے لیے باجے گاجے اور برات کے بدلے سیدھی سادی کورٹ میرج ہی پسند کرتا بہرحال جو ہونا تھا وہ بہت سیدھے سادے ڈھنگ سے ہو گیا۔ میں اس طرح خوش تھا جیسے بچے کو چاند کے عکس کے بدلے اصلی چاند مل جائے وہ ہستی جس کی جھلکیوں کے لیے میں بے تاب رہتا تھا۔ سدا میرے ساتھ رہے گی۔ یہ سوچ سوچ کر میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔

میرا تو کوئی گھر تھا ہی نہیں۔ میں ایک MESS میں رہتا تھا۔ شادی کے بعد میں ان کی عالی شان کوٹھی میں اٹھ آیا۔ ان کے ماں باپ بہت کچھ چھوڑ گئے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی بہن ہاسٹل میں رہ کر پڑھ رہے تھے اور وہ گھر میں نوکروں کے ساتھ اکیلی رہتی تھیں۔

ایم۔اے۔ پاس کرتے ہی میں نے شادی کر لی۔ اور نوکری دو ماہ بعد ملی۔ یہ دو سال اس طرح گزرے کہ میں گھر میں ان کے آنے کا انتظار کرتا رہتا۔ وہ دس بجے جا کر عموماً دو بجے آ جاتیں۔ ہم دونوں بہت خوش تھے مجھے کبھی یاد نہ آتا کہ میں اکیس سال کا ہوں اور وہ چھبیس سال کی۔ مجھے نوکری رباب کے ہی ذریعہ ملی۔ جب مجھے پہلی بار تنخواہ ملی تو میں ان کے لیے کریم کلر کی سرخ بارڈر والی ساڑھی لایا وہ بہت خوش ہوئیں اور مہربان سی مسکراہٹ سے بولیں ۔
"پہلی تنخواہ مبارک ہو! یہ کیا فضول خرچی کی"

پتہ نہیں اس وقت اچانک کیا ہوا تنخواہ کا لفافہ ہاتھ میں ڈنک مارتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ پانچ سال سے کما رہی ہیں۔ ایسی نہ جانے کتنی ساڑھیاں انھوں نے خریدی ہوں گی۔ ان کے پاس کیا کچھ نہیں ہوگا۔ اور ایک میں ہوں دنیا کے میلے میں ایک حیرت زدہ بچے کی طرح ان کی انگلی پکڑے گھوم رہا ہوں۔ کاش اس وقت انھوں نے اس سرپرستانہ مسکراہٹ کے بدلے محبوبانہ ہنسی کی جھنکار نہ سنائی ہوتی اور وہ ساڑھی پہن کر دکھائی ہوتی!

یوں ہی ہزاروں چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں۔ گھر گرہستی کا خرچ وہی کرتی تھیں۔ میری نوکری معمولی سی تھی انھیں کے رسوخ سے لگی تھی۔ اور تنخواہ بھی ان کی تنخواہ سے بہت کم۔ بس اسی طرح کی کم مائیگی کا احساس میرے دل کو اپنی مٹھی میں لیے رہتا۔ میں اس گھر میں مہمان کی طرح رہتا۔ نہ کسی بات پر ضد کر سکتا نہ ان سے الجھ سکتا۔

اگر ہمارے بچے ہوتے تو ممکن تھا کہ حالات دوسرے ہوتے یا یہ بھی ممکن تھا کہ بچے صورت حال کو بد سے بدتر بنا دیتے اچانک میری ملاقات نیلم سے ہو گئی۔ ویسے اس ملاقات میں میری مرضی شامل نہیں تھی وہ میرے دفتر میں ٹائپسٹ تھی ملاقات تو ہوتی تھی۔ وہ بہت ہی شرمیلی اور خاموش طبیعت کی لڑکی تھی۔ "یس سر" کے سوا اس کی زبان سے اور کچھ بھی نہ نکلتا۔ اگر اس کی غلطی پر اسے ڈانٹا جاتا تو آنکھیں فوراً ڈبڈبا جاتیں۔ اکثر میں اسے ڈانٹ کر اس کے سہم جانے سے لطف اندوز ہوتا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ کام کی ذرا سی تعریف اور حوصلہ افزائی کے جواب سے اس کی آنکھوں کی چمک کے خاموش شکریہ کو وصول کرنا بھی پرلطف ہوتا ہے کام کے بعد میں اس کے لباس کی تعریف تک پہنچا۔ پھر ایک دن ایسا آیا۔ کہ اس کی قابل تعریف فگر کی تعریف کر بیٹھا۔ شرم اور گھبراہٹ کے جذبے سے وہ پسینہ پسینہ ہو گئی مگر اس نے برا نہیں مانا۔ ایک آدھ بار رباب آفس آئیں تو انھوں نے نیلم کو بنظر غور دیکھا۔ ڈکٹیشن کے سلسلہ میں ایک آدھ بار نیلم کو کوٹھی پر بلایا۔ بعد میں تو میرے اس کے ساتھ گھومنے کی خبریں رباب تک ضرور پہنچی ہوں گی لیکن کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہوا۔ وہ تو اس دن بھی اسی طرح پرسکون رہیں جب میں نے طلاق کی بات کہی۔ انھوں نے اسے دل جمعی سے سنا۔ اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اثبات میں جواب دے دیا۔ انھوں نے کبھی مجھے دیوتا یا بھگوان تو کیا اپنے برابر کا انسان بھی نہیں سمجھا۔ انھوں نے اس خبر کو اس تاثر سے سنا جیسے کوئی لڑکا اپنی ماں سے اپنی گرہستی الگ بسانے کی اجازت لیتا ہے۔

لیکن ان کی اس بلند ظرفی کے باوجود بھی میں مطمئن نہیں ہوں میں ان کی زندگی سے کھیلا ہوں۔ ورنہ اب تک وہ کوئی بہتر ساتھی منتخب کر چکی ہوتیں۔

بتیسرا

کپل سریواستوا صاحب سے شادی کا فیصلہ کر کے میں خوش اور مطمئن تو ہوں لیکن دل میں ایک کسک سی ہے۔ ان کی بیگم رباب سریواستوا کے سلسلے میں کس قدر خوب صورت باوقار اور بلند ہمتی ہیں وہ۔ بات چیت میں مٹھاس ہے۔ آنکھوں میں ممتا اور چال ڈھال میں وہ شاہانہ پن ہے کہ بس نظر قدموں سے اوپر نہ اٹھ سکے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ دونوں الگ ہو جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں، شریمتی رباب نے خاموشی سے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ مجھے ان کی اس اعلیٰ ظرفی نے اور بھی متاثر کیا۔ سریواستو صاحب بھی اندر ہی اندر پگھل رہے ہیں لیکن وہ مجھے چھوڑ نہیں سکتے نہ ہی میں ان کے بغیر زندہ رہ سکتی ہوں۔ وہ اس قدر وجیہہ اور خوب صورت ہیں کہ میں اپنا دل کس طرح سنبھال کر رکھ سکتی تھی۔ وہ بھی ایک معمہ ہیں۔ دولت، رتبہ، شان، پری جیسی بیوی کیا نہیں ہے ان کے پاس۔ انھیں اپنی بیگم کی کیا بات پسند نہیں آئی یہ میں نہیں سمجھ سکی۔ میرا دل ڈرتا ہے کہ رباب جیسی دیوی کی اگر وہ قدر نہیں کر سکے تو میرا کیا حشر کریں گے۔

میں تو ایک معمولی گھرانے کی معمولی سی لڑکی ہوں۔ ہم گیارہ بہن بھائی ہیں۔ پتاجی سیکنڈ کلاس آفیسر ہیں۔ رہن سہن بھی متوسط سے کچھ نیچا ہی ہے۔ ہائر سیکنڈری کے بعد میں نے ٹائپنگ کا کورس کیا اور نوکری کر لی۔ ساتھ ہی میں بی۔ اے۔ کی تیاری بھی کرتی گئی۔ بی اے کرتے ہی میں اسٹینو ہو گئی۔ گھر کو سہارا لگ رہا تھا اور ماں باپ بر کی تلاش میں تھے کہ کپل صاحب مل گئے ایسی مردانگی، نرمی اور گرمی اور ساتھ ہی حق جتانے کا دل آویز انداز اتنا بے ساختہ کہ خواہ مخواہ ہی مجھے ان کے عظیم ہونے اپنے کم مایہ ہونے کا احساس ہونے لگتا۔ ویسے بھی وہ مجھ سے کافی بڑے ہیں۔ شاید دس سال اسی لیے وہ اتنا رعب جماتے ہیں۔ اور ان کے رعب جمانے کا انداز کتنا پیار بھرا لگتا ہے؛

کاش کہ رباب کا نام ہی بیچ میں نہ آیا ہوتا۔ اب یہ احساس ہمیشہ ساتھ رہے گا کہ میں نے انھیں زندگی بھر کے لیے بے گھر کر دیا۔ حالانکہ وہ اب بھی مجھ سے اتنے ہی پیار سے ملتی ہیں۔ کاش ان کی جتنی ممتا میرے حصہ میں بھی آئی ہوتی۔ اس گھر میں جا تو رہی ہوں لیکن یہ کھٹک، اور غلطی کا احساس جہیز کی طرح ساتھ جائے گا۔

بقیہ: فارسی کے ممتاز شاعر

نخچیروالان این مملکت را
شاگرد باشد افزوں زبہرام

"شمن" بھی ایک ہندوستانی لفظ ہے۔ بمعنی بت پرست۔
فرخی نے اسے اس طرح استعمال کیا ہے ؎

اندیشۂ رعیت چنداں کہ او کند
اندیشۂ وثن نہ ہمانا کند شمن
زائراں را مثل بنا زبرد
چون شمن در بہار پیش وثن

ایک اور مقام پر بھی یہ لفظ ملتا ہے ؎

باغ بت خانہ گشت و گلبن بت
بادہ خواران گل پرست سمن

فکھن بمعنی روزۂ ہندواں:

خوان او دائم بزائر و برمہمان
در حزین باشد حقا کہ کند فکھن

چندن بمعنی صندل؛

ہم زرہ روم سفری چین رود برگیر
از چمن و باغ چین نہالۂ چندن

فرخی کے یہاں جوز ہندی" (ناریل) اور "پوپل" (چھالیا) کا بھی ذکر آیا ہے ؎

در او درختان چون جوز ہندی و پوپل
کہ ہر درخت بہ سالی دہر مسکر بر

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے سنائیؒ (متوفی ۵۴۵ھ) پر لکھتے ہوئے کہا ہے کہ "میدہ" بھی ہندوستانی لفظ ہے۔ یہ لفظ سنائیؒ سے بہت پہلے فرخی کے یہاں ہم کو ملتا ہے ؎

ہر کہ بغزنین دیدہ باشد در سپاہاں کے بود
ہر کہ تازہ میدہ بیند چون خورد نان جوین

بقیہ: شناسا

جسے دیکھ کر میرا دل خوشی سے پھولا نہیں سما رہا ہے، میرے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ پہلے یہ میرے پڑوس میں رہا کرتا تھا۔ سال بھر ہوا ایک دن ـــ کسی بات پر میری اور اس کی لڑائی ہو گئی تھی اور لڑائی اتنی بڑھی تھی کہ نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی تھی۔ اس نے مجھے بہت مارا تھا اور میرے بائیں ہاتھ کی ہڈی توڑ ڈالی تھی جس کے نتیجے میں مجھے پندرہ دن تک ہسپتال میں رہنا پڑا تھا۔ اور چالیس دن تک ہاتھ پر پلاسٹر کا بوجھ اٹھائے ضرور پھرنا پڑا تھا۔ لیکن اس وقت اس شخص کو دیکھ کر میرے دل میں نفرت کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہوا بلکہ خوشی ہوئی ہے انتہا اور بے کراں خوشی ـــ میرا دشمن، مگر اجنبیوں کے دیش میں ایک شناسا۔ ●●

بقیہ: پرچھائیوں کے شہر میں

تمہارے بھائی کی قبر پر چڑھا دوں گا۔"

میگی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں اب اجازت دیجیے۔ میری ڈیوٹی کا وقت ہو رہا ہے کبھی کبھار خط لکھتے رہیے گا۔"

میں نے اٹھ کر میگی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا ـــ

"گڈ بائی میگی" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا کر چوم لیا میگی چلی گئی۔

میں نے بھی اپنے رومال میں لرزتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے جذب کر لیے اور اپنا سامان ٹھیک کرنے چلا گیا۔

(بنگلہ سے ترجمہ) ●●

رونق جہاں زیدی

پتھر

کالے کالے نقطوں اور لکیروں کا ڈھیر
پتھروں کی بستی میں
چکاچوندا اجالا
پہاڑ ٹوٹتے ہیں
لہروں کا بسیرا
درختوں کی چوٹیوں پر ہے
طوفان
(شاید) پتھروں کو تہوں کی سیر کرائے

چکرویوہ

زندگی کی ٹوٹی سی بنچ پر
چادر سے منھ ڈھانپے
میرا وجود
نیند کی آغوش میں ہے
ہر روز ٹوٹتی نیند میں دیکھتی ہوں
ایک اور دن
تھکان سے چور
زرد سورج کے پیچھے
منھ چھپائے چلا جا رہا ہے
اور پھر گہری نیند کا غلبہ
آخری زرد سورج
انتظار کا چکرویوہ توڑے گا

مختار شمیم

کرفیو

کرفیو کے سائے ہیں
اونگھتے ہوئے لمحے
دن بجھے بجھے سے ہیں
سرد سرد راتیں ہیں
شہر کی فصیلوں پر
خامشی کا پہرا ہے
خوف کے دریچوں سے جھانکتا ہے سناٹا
ہر مکان سہما سا ہے
کس قدر اندھیرا ہے روشنی نہیں ملتی
ڈھونڈتے ہیں یارو زندگی نہیں ملتی

منور امروہی

سیاسی کینسر

اور....
پھر وہ اژدہا
جس کی اک پھنکار سے
بستی کی بستی
جل گئی.....
کیسے جانے کتنے ہی معصوم انسانوں کا خوں
اک حسیں عورت کی
ننھی چھاتیوں سے
دودھ پی کر
سو گیا

صلاح الدین نیّر

اعزاز ہے یہ چشمِ خریدار کے لیے
ہم بک رہے ہیں رونقِ بازار کے لیے
بیٹھے ہیں اپنی راہ کا پتھر ہٹا تو لوں
سوچوں گا پھر میں سایۂ دیوار کے لیے
خاموش سی نگاہوں نے کیا کچھ نہیں کیا
کچھ بھی نہیں بچا لبِ اظہار کے لیے
وہ آرزوئیں جن کا کوئی نام بھی نہیں
کب سے ترس رہی ہیں ترے پیار کے لیے
کانٹوں کے بدلے آپ کے ہاتھوں میں پھول ہیں
کیا لائے آپ مجھ سے گنہگار کے لیے
رستے میں مل گئیں ہمیں آباد بستیاں
زخموں کا شہر ہے کسی فنکار کے لیے
نیّر میں اپنے پاؤں کی زنجیر توڑ کر
آیا ہوں اپنے یارِ طرحدار کے لیے

فرحت کیفی

یاد کی وادیاں سُلگنے لگیں
درد کی بستیاں پگھلنے لگیں
کیسی سازش ہے یہ کیسا موسم ہے
آگ پُروائیاں اُگلنے لگیں
جب بھی فصلِ بہار یاد آئی
پھول کی پتیاں بکھرنے لگیں
بن گیا درسِ زندگی طوفاں
باڑھ میں کشتیاں اترنے لگیں
راستوں نے ہی پھیر لیں آنکھیں
منزلیں رخ کہاں بدلنے لگیں
اک اشارہ سے فرحت کیفی
پیار کی گتھیاں سلجھنے لگیں

شکیل احمد عاصم

غم سے نجات پانے میں ساغر میں جا گرا
خندق سے بچ گیا تھا سمندر میں جا گرا
کتنے ہی خواب دفن ہیں ماضی کی قبر میں
وہ حادثہ ہوں جو پسِ منظر میں جا گرا
تھک کر حسین حال کا اُڑتا ہوا پرند
ماضی کے ہولناک سمندر میں جا گرا
تاریکیاں سمیٹ کے اپنے جہان کی
پُرنور وادیِ مہ و اختر میں جا گرا
عاصم جب اپنے دور کا آیا مجھے خیال
بے ساختہ میں عرصۂ محشر میں جا گرا

سید حبیب

اک بے وفا سے دل جو لگایا بُرا کیا
اپنا جہان آپ لُٹایا بُرا کیا
تجھ سے تو یہ امید نہ تھی اہلِ درد کو
ہنسنے نہ پائے تھے کہ رُلایا بُرا کیا
اب زندگی میں کوئی مسرت نہیں رہی
خود اپنے دل میں درد بسایا بُرا کیا
بے تاب ہو کے کہتا ہے دل بار بار اب
اک بے وفا کو اپنا بنایا بُرا کیا

شبیر علی خاں شکیب

نظام رامپوری پر شاد عارفی کی تحقیقات

شاد عارفی مرحوم کے کلام اور نثری کاوشوں پر مشتمل ایک کتاب "نثر و غزلدستہ" کے نام سے ان کے لائق شاگرد مظفر حنفی صاحب نے ترتیب دے کر شائع کی ہے۔ اس میں ایک مضمون "نظام رامپوری کے بارے میں بھی ہے۔ اس میں بعض باتیں ایسی نظر پڑیں جو درست نہیں میں نے ضروری سمجھا کہ ان کی نشاندہی کر دی جائے تاکہ ہند و پاک میں نظام رامپوری پر جو لوگ تحقیقی کام کر رہے ہیں یا ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں وہ شاد صاحب کی ادبی حیثیت سے متاثر ہو کر ان کی "تحقیقات" سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ اس کا امکان اس وجہ سے بھی ہے کہ موصوف نے دعویٰ کیا ہے کہ نظام کے سلسلے میں انھوں نے پندرہ سال کی مدت میں جو "تحقیق و تلاش" کی ہے اور قدر رشتہ نے جو ان کی مدد کی ہے وہ کسی دوسرے کو میسر نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں وہ نظام کے ہم وطن بھی تھے۔

شاد صاحب کے مزاج میں بلا کی شدت تھی۔ وہ اکثر سنی سنائی باتوں پر بآسانی یقین کر لیتے تھے۔ جیسا کہ ان کے مکاتیب سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کسی بدخواہ یا شریر شخص نے کسی دوست کے خلاف کوئی بے سر و پا بات کہہ دی تو وہ انتہائی سادہ لوحی سے اس پر یقین کر لیتے۔ اتنے ناراض ہو جاتے کہ دعا سلام تک بند۔ اور جب وہ دوست اپنی صفائی پیش کرتا تو اتنی ہی آسانی سے صاف ہو جاتے اور پھر اس اتہام لگانے والے سے اسی شدت سے ناراض ہو جاتے۔ ان کے مزاج کی اس کمزوری سے لوگ واقف ہو گئے تھے۔

یہی صورت حال ان کے یہاں تحقیق اور علمی امور میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ اگر کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں کسی شخص سے کوئی چٹکلہ یا واقعہ سن لیتے اور اس میں انھیں کوئی اچھوتا پن یا طنز کا پہلو نظر آتا تو بے تامل اسے تسلیم کر لیتے۔ اور پھر اس بات کو پورے وثوق کے ساتھ تحقیقی انداز میں بیان کرتے ہوئے منبعا تحریر میں بھی لے آتے۔

چنانچہ ان کا سب سے دلچسپ انکشاف مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں ہے کہ وہ رامپوری تھے۔ یہیں پیدا ہوئے یہیں تعلیم پائی۔ لکھتے ہیں:

"یہاں کا مدرستہ العالیہ ایک مستند مدرسہ تھا ..... ہمارے مولانا آزاد نے بھی یہیں تعلیم پائی جس کو انھوں نے جامعہ ازہر سے استعارہ کر لیا تھا۔ بات کا رخ آگیا کہ اب مجھے تفصیل میں جانا پڑے گا۔ مولانا آزاد کے والد اور دادا وغیرہ سب رام پور کے کھاتے پیتے "دھنیے" تھے ــــ روئی دھننے والے۔ مگر تجارت نے انھیں اس پیشے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ یہ لوگ اور ان کے خاندان کے افراد اب بھی تھانہ منڈی رام پور میں موجود ہیں۔ یہ تھانہ روز میری نانی کے دادا سے منسوب ہے اس لیے میرے کئی رشتہ دار آج بھی وہاں رہتے ہیں اور مولانا آزاد کے تمام عزیزوں سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ مولانا آزاد کے والد جو مدرستہ العالیہ کے تعلیم یافتہ مولوی تھے انھوں نے ایک بیوہ عرب عورت سے یہیں رام پور میں شادی کر لی تھی۔ اسی سے مولانا آزاد پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے۔ یہیں تعلیم پائی۔ چوں کہ مولانا میں احساس کمتری کافی تھا۔ اس لیے انھوں نے ہمیشہ اس کمزور پہلو کو بچایا اور کہیں بھی صاف طور سے یہ نہیں کہا کہ وہ کہاں پیدا ہوئے تھے۔ آپ ان کی خود نوشت کو (؟) بھی سوانح عمری اٹھا کر دیکھیں تو اپنی والدہ کے بارے میں بڑے گول مال الفاظ استعمال کریں گے اور باپ کے بارے میں صاف اڑا جائیں گے کہ کون تھے، اور کیا تھے؟ اور کہاں تھے۔"

(ایک تھا شاعر/۵۵۶)

یہ تھا شاد صاحب کا مزاج تحقیق۔ لوگوں نے ان کی اس تحقیق کو ان کی ناراضگی یا مولانا آزاد سے کبیدہ خاطری پر محمول کیا اور مولانا کو دھوکا دینے پر تیار ہو گئے رامپوری۔ اس لیے ان کی تحقیقات کو بڑی احتیاط سے پڑھنا ضروری ہے۔

اب میں شاد صاحب کے مضمون "نظام رام پوری" میں تحریر بعض ان باتوں کو جو درست نہیں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ شاد صاحب نے نظام کا سنہ پیدائش ۱۲۴۹ھ لکھا ہے۔ لیکن ... انتخاب یادگار ... پر نظام کا انتقال ... سال ہونا لکھا ہے۔ اس حساب ... سال پیدائش ہوتا ہے جو مطابق ... ۱۲۱۵ھ یعنی نظام کے انتقال کے ایک سال بعد کیل کو پہنچا تھا۔ ایک ایسی ہی غلطی کلیات نظام مرتبہ ... علی خاں فائق شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور میں بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی نظام کی پیدائش ۱۸۱۹ء میں دکھائی ہے۔ جو ۱۲۳۵ھ کے مطابق ہوتی ہے۔ دونوں حضرات نے اس بارے میں کوئی حوالہ یا سند نہیں دی ہے۔ اس لیے امیر مینائی جیسے واقف حال اور ہمعصر کے دیے ہوئے سنہ پیدائش کو ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔

۲۔ نظام کی قبر کے بارے میں اس مضمون میں عجیب انکشاف کیا ہے۔ یعنی نظام کا انتقال کے بعد علی نور صاحب کے احاطے میں دفن ... کا اظہار شاد صاحب نے اپنے ایک دوسرے مضمون "جو سر اور رام پور" میں بھی کیا ہے۔

"میری تحقیق میں وہ آج بھی علی نور صاحب کے احاطے میں کہیں دفن ہیں۔ مگر غالباً یہ برادران ریاست انھیں شاہ احمد علی خاں کے مزار میں بتاتے ہیں مگر تعین لحد میں تامل سے کام لے رہے ہیں"
(ن۔غ۔ دستہ/۹۲)

خدا جانے شاد صاحب نے علی نور صاحب کے احاطے میں دفن ہونے والی روایت کس سے سن لی۔ ورنہ آج تک نظام کی قبر کے بارے میں کبھی کسی نے شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ وہ مسلمہ طور پر اپنے پیر و مرشد میاں احمد علی شاہ آنند[1] (م ۱۲۸۲ھ) کے مزار کے پائنتی دفن ہیں۔ یہ مزار کوچہ بھاگ مل متصل مسٹن گنج رام پور میں واقع ہے انتخاب یادگار/ص ۳۸۶ میں بھی یہی لکھا ہے۔

لیکن شاد صاحب نے اپنے اس خیال کی ایک دوسری جگہ خود ہی تردید کر دی ہے۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب بنام خان امانت کمال، مدیر روزنامہ ناظم (ایک تھا شاعر/ص ۵۵۷) میں لکھتے ہیں:

(رامپور والوں نے) "میاں نظام شاہ کے مزار پر لوح تک نہیں لگائی۔ سرہانے تاریخ وفات کا پتہ نہیں۔ سنا ہے کہ اب تو وہ مزار جو میاں احمد علی شاہ صاحب کے مزار کے سائبان کے نیچے تھا زمین دوز یا سطح دوست (؟) ہو چکا ہے۔"

یعنی انھوں نے نظام کے مزار کو میاں احمد علی شاہ صاحب کے مزار کے احاطے میں تسلیم کر لیا۔ جہاں تک لوح مزار کا سوال ہے یہ شکایت بھی درست نہیں۔ نظام کی قبر پر صاف اور واضح الفاظ میں لوح پر افضل الشعرا حضرت محمود رام پوری (م ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء) شاگرد داغ کا نتیجۂ فکر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کندہ ہے:

کسی کی دوست نہیں ہے یہ دشمن جاں حیف
فضول ہے جو کوئی دل لگائے دنیا سے
یہ ذی کمال کو تو دیکھ ہی نہیں سکتی
خدا پناہ میں رکھے بلائے دنیا سے
غضب کی بات ہے افسوس دیکھ اے محمود
میاں نظام گئے ہائے ہائے دنیا سے
۱۲۸۹ھ

چوں کہ شاد صاحب یہ دکھانا چاہتے تھے کہ اہل رامپور تو "مردہ پرست" بھی نہیں کجا زندہ شاعروں کے جشن منانے کا سوال — لیکن ان کے اُن اشعار سے جو انھوں نے اپنے ایک دوسرے مضمون "نثر منظوم" (ن۔غ۔ دستہ/۸۶) میں لکھے ہیں لوح مزار کا ہونا ثابت ہے۔ لکھتے ہیں۔

"آج گمنامی کے پردے میں ہیں وہ حضرت نظام
جن کا خطبوں میں بصد عزت لیا جاتا ہے نام
لوح تربت پر لکھے الفاظ کالے پڑ گئے
گچ کو استرکاری مرقد کے لالے پڑ گئے
بکریاں ہر روز آتی ہیں طواف قبر کو
چڑیاں چونچوں میں لے آتے ہیں کوے نذر کو"

۳۔ نظامؔ کی قبر کے عدم تعین کے ضمن میں شادؔ صاحب نے قائمؔ چاند پوری کی قبر کے بارے میں بھی اپنی مخصوص رائے کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"قائمؔ چاند پوری رام پور میں دفن ہیں...
مگر یہ نہیں معلوم کہ ان کی قبر کون سی ہے۔ اور کس قبرستان میں ہے۔" (ن۔غ۔دستہ/۹۲)

قائمؔ کی قبر بھی مسلمہ طور پر محلہ مدرسہ کہنہ رام پور میں اپنے شاگرد نواب محمد یار خاں امیرؔ (م ۱۱۸۸ھ) برادر اصغر نواب فیض اللہ خاں بہادر والیِ رام پور (م ۱۲۰۸ھ) کے مقبرے کے احاطے میں ہے۔ جیسا کہ انتخاب یادگار میں بھی مذکور ہے (ترجمہ قائمؔ انتخاب یادگار/۳۰۱) دوسرے تذکروں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

۴۔ شادؔ صاحب نے نظامؔ کی شاگردی کے بارے میں بڑے وثوق سے لکھا ہے:

"میں نے جس قدر وقت سید نظام شاہ کی زندگی پر لکھنے پر صرف کیا ہے۔ اور جہاں جہاں قدرت نے خلاف توقع وہ اسباب فراہم کر دیے ہیں جو سید نظام شاہ پر لکھتے وقت کسی کو نصیب نہ ہوں ....
یہ تو آپ جانتے ہوں گے سید نظام حضرت بیمارؔ شاگردِ حضرت مومنؔ کے شاگرد تھے۔ بعد میں صوفی علی احمد شاہ صاحب سے اصلاح لینے لگے۔"

(ن۔غ۔دستہ/۷۱)

بیمارؔ کو مومنؔ کا شاگرد لکھنا درست نہیں۔ بیمارؔ (م ۱۲۷۱ھ) ابتدا میں مشتاقؔ کے شاگرد ہوئے تھے۔ جب نواب محمد سعید خاں ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں رامپور کے نواب ہوئے تو وہ بھی بلائے جانے پر یہیں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے اور استاد غفلت (م ۱۲۵۹ھ) شاگردِ قدرت اللہ شوقؔ کے شاگرد ہوئے۔ مومنؔ کی شاگردی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غالباً شادؔ صاحب نے تسکینؔ دہلوی (م ۱۲۶۸ھ) کے دھوکے میں ایسا لکھ دیا۔ وہ مومنؔ کے شاگرد تھے۔ اور اسی زمانے میں نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کی دعوت پر رامپور آ گئے تھے اور یہیں وفات پائی۔

شادؔ صاحب نے نظامؔ کے صرف دو استادوں یعنی بیمارؔ اور صوفی علی احمد شاہ کا ذکر کیا ہے۔ موخرالذکر کا صحیح نام میاں احمد علی شاہ تھا۔ وہ نظام کو نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کا شاگرد تسلیم نہیں کرتے۔ اور اپنی رائے کی تائید میں عبدالشکور صاحب مولف "انتخاب کلام نظام" کا سہارا لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"عبدالشکور صاحب نے نظام رام پوری کے نام سے جو مجموعہ شائع کر دیا ہے اس میں موصوف نے یہ بات مان لی ہے کہ نظام رامپوری کا ناظم... یعنی نواب یوسف علی خاں کا شاگرد ہونا محل نظر ہے۔"

(ن۔غ۔د/۴۷)

لیکن امیر مینائیؒ انتخاب یادگار/ص ۴۰۶ پر نظام کے ترجمے میں لکھتے ہیں:۔

"نظام ..... نواب محمد یوسف علی خاں بہادر ناظمؔ ... کے شاگرد رشید ہیں شیخ علی بخش بیمار اور اپنے پیر و مرشد میاں احمد علی مرحوم احمد تخلص سے بھی مستفید ہیں۔"

ظاہر ہے کہ اس بارے میں امیر مینائیؒ سے زیادہ اور کون واقف حال ہو سکتا ہے۔ وہ نظام کے ہمعصر اور شاعر دربار تھے۔ نظام کے انتقال کے ایک سال بعد ہی انتخاب یادگار کی تکمیل ہوئی ہے۔ یہ تذکرہ نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کی ایما سے لکھا گیا تھا اور برابر اُن کے ملاحظے سے گزرتا رہا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسے محض رئیس وقت کی خوشنودی قرار دے کر نظر انداز کر دیا جائے۔ نظام کی موجودہ شہرت کے پیش نظر کلب علی خاں فائقؔ اپنے مرتبہ کلیات کے دیباچے (ص ۶۶) میں اپنے قیاسات محض کو واقعہ قرار دینے کے انداز میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"... اس لیے نظام بھی ولی عہد (ناظمؔ) کے دربار میں پہنچے۔ نظامؔ اور وہ ہم طرحی غزلیں کہنے لگے۔ ولی عہد ریاست کے حکموں کے سربراہ تھے۔ اس لیے ہر ایک کو ان کی ناز برداری ضروری تھی۔ وہ نظام کی غزل کے سلسلے میں جو رائے دیتے نظام بجا اور درست کہتے۔ اسی بنا پر امیر مینائیؒ نے بہ ایمائے

نواب کلب علی خاں والی رام پور یہ لکھا کہ نظام ناظم کے شاگرد تھے۔"

آگے (صفحہ ۶۷) مزید زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں

"نظام نے ناظم کی فرمایش پر غزلیں کہیں اور ان سے داد حاصل کی۔ لیکن رئیس کی استادی کا شرف حاصل کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس لیے شاگردی کو غنیمت سمجھا۔"

جہاں تک نظام اور ناظم کی استادی شاگردی کا سوال ہے بظاہر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن ایک لحاظ سے اس کو نظرانداز کر دینا بھی مستحسن فعل نہیں معلوم ہوتا۔ کسی امر واقعہ کو محض تسکین ذہنی کی خاطر توڑ مروڑ کے پیش کر دینا بددیانتی کے مترادف ہے۔ شخصیت پرستی اور بغض للّٰہی دونوں افراط و تفریط کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بالعموم سلاطین و نوابین تحصیل علم اور اکتساب فنون میں خاص محنت و ریاضت نہیں کرتے۔ اور غاشیہ برداران ریاست انکی جا و بے جا مدح و ستایش کر کے علم و فضل کا سہرا بھی ان کے سر باندھ دیتے ہیں۔ لیکن کیا نواب یوسف علی خاں بھی ان فرمانرواؤں کی صف میں آتے ہیں یا وہ اس سے باہر ہیں؟ اس کے لیے نواب یوسف علی خاں کی زندگی پر ایک سرسری سی نظر ڈالنا ضروری ہے۔

نواب یوسف علی خاں کے دادا نواب غلام محمد خاں — (م ۱۲۳۸ھ) خلف نواب فیض اللہ خاں (م ۱۲۰۸ھ) جو اپنے بڑے بھائی نواب محمد علی خاں (م ۱۲۰۹ھ) کے قتل ہو جانے کے بعد رام پور کے نواب ہوئے تھے اودھ اور انگریزی افواج سے دوجوڑہ کی جنگ میں شکست پا کر ۱۲۰۹ھ ہی میں اپنے بھتیجے نواب احمد علی خاں رند کے حق میں ریاست سے دست بردار ہو گئے۔ اور ہمیشہ کے لیے رامپور کو خیرباد کہہ گئے۔ ان کے خاندان کے افراد بھی لکھنؤ وغیرہ میں رہنے لگے۔ محمد سعید خاں، غلام محمد خاں کے بڑے صاحبزادے اس وقت کم عمر تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت شاہزادوں کے برخلاف شریف زادوں کے انداز میں ہوئی۔ مرزا قتیل جیسے عالموں سے علوم حاصل کیے اور حکیم احمد علی صاحب سے طب پڑھی چنانچہ وہ عالم اور اچھے طبیب تھے۔ کمپنی نے ان کی اہلیت سے متاثر ہو کر ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ عطا کیا۔ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں جب نواب احمد علی خاں کا انتقال ہو گیا اور اولاد نرینہ نہ ہونے کی بنا پر انگریزوں نے محمد سعید خاں کو رام پور کا نواب تسلیم کیا تو وہ بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ محمد سعید خاں نے اپنے بڑے لڑکے یوسف علی خاں کی تعلیم و تربیت پر بھی کافی زور دیا تھا۔ ناظم کا قیام دہلی میں تھا۔ انھوں نے مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے علوم عربیہ و حکمیہ حاصل کیے اور ملا غیاث الدین (مؤلف غیاث اللغات) سے فارسی پڑھی۔ شاعری کا فطری ذوق رکھتے تھے اس پر دہلی کی ادبی سوسائٹی کا اثر، مومن دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ باپ بیٹے کے ذہن میں بھی یہ خیال نہ گزرا ہوگا کہ قدرت ان کو اسی ریاست کا نواب بنانے والی ہے جس کا داخلہ ان پر ممنوع تھا۔

۱۸۴۰ء میں نواب محمد سعید خاں جب نواب ہو کر رامپور آئے تو انھوں نے یوسف علی خاں کو بحیثیت ولی عہد ریاست بلا لیا۔ اس وقت ناظم کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ کلب علی خاں ان کے فرزند اکبر اس وقت ۶ برس کے تھے۔ ناظم نے ولی عہد ہو جانے کے بعد شاعری کے شوق کو ختم نہیں کیا بلکہ معاشی فراغت حاصل ہو جانے کی بنا پر زیادہ دلچسپی لی۔ چنانچہ بیمار شاگرد مصحفی و غفلت، تسکین دہلوی شاگرد مومن وغیرہ بھی ان کے بلانے پر رامپور آ گئے۔ آئے دن طرحی مشاعرے ہوتے جس میں وہ خود غزلیں کہتے۔ مقامی اور بیرونی شعرا حصہ لیتے۔ نظام کی عمر اس وقت ۱۷ سال ہوگی۔ اپنے والد سید احمد شاہ صاحب کے انتقال کے بعد حسب دستور ریاست وہ کم عمری ہی میں اپنے والد کی جگہ سواروں میں ملازم ہو گئے تھے۔ نظام کو بھی شعر و شاعری کا شوق تھا۔ ناظم کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ ایسی صورت میں نظام نے اگر ناظم کی شاگردی اختیار کر لی تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ اس میں ولی عہد کی خوشنودی طبع کے خیال کے علاوہ ناظم کی اہلیت و صلاحیت کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا اس وقت ناظم نظام سے ۸ برس عمر میں بڑے ہونے کے علاوہ مومن کی شاگردی اور دہلی کی ادبی محفلوں سے جلا پا کر نظام سے برتر ہو چکے تھے۔ انتخاب یادگار میں نظام کے علاوہ ان کے

دو دیگر شاگردوں کا ذکر بھی ہے۔ ان میں ایک صاحبزادہ مہدی علی خاں تحیق (م ۱۲۸۹ھ) خلف صاحبزادہ حفیظ اللہ خاں تھے جو ناظم کے چچازاد بھائی بھی تھے۔ دوسرے صاحبزادہ سعید اللہ خاں آلم (م ۱۲۸۲ھ) خلف صاحبزادہ امداد اللہ خاں تاب نبیرۂ نواب نصراللہ خاں سلطان تھے۔ میری رائے میں ناظم کا کسی عام شہری نوجوان کو جو اس کے یہاں سواروں میں ملازم ہو اپنی شاگردی سے فائز نا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی نظر میں مستقبل کا نظام تھا۔ مذکورہ بالا صاحبزادگان یعنی تحیق و آلم بھی اس وقت لڑکے تھے لیکن ناظم کے قریبی عزیز تھے۔

اسی ضمن میں اگر نظام کے کلام پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ان کے یہاں تین رنگ کا کلام ملتا ہے۔ اوّل وہ حصہ کلام جو رام پور میں قائم کے سلسلے کے شعرا کے رنگ میں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نظام نے ہوش سنبھالا اور شاعری شروع کی تو اسی رنگ میں کہا ہوگا۔ یہ ان کی ابتدائی عمر کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی ناہمواری، متروکات کا بے تکلف استعمال۔ قدیم مضامین کا سپاٹ اظہار۔ مثلاً یہ غزلیات:

دلا خیال نہ کر اُس سے آشنائی کا
اٹھا سکے گا نہ صدمہ شب جدائی کا

اگر خود نما وہ خود آرا نہ ہوتا
یہ نیرنگِ قدرت ہویدا نہ ہوتا

آپ ہو سکتے ہیں خفا مجھ سے
میں خفا ہوں یہ حوصلا ہی نہیں

رنج سہنے کو پھر ہے جی میں نظام
دل کسے دیویں دل رہا ہی نہیں

تو ہو غیر سے پھر دل میں اپنے خود ہی کیجیے
ہوا تھا ہم سے کیا کیا عہد و پیماں آپ کا پہلے

چونکہ نظام اپنی زندگی میں اپنی کلیات ترتیب نہ دے پائے اس لیے انھیں نظرِ ثانی کا موقع نہ مل سکا۔ جیسا اور جو کچھ کلام ان کے انتقال کے بعد دستیاب ہوا جمع کر لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہر دور کا کلام اصل صورت میں مل جاتا ہے۔

دوسرے دور کے کلام میں بیّن فرق نظر آتا ہے۔ تراش خراش، ندرت بیان اور صفائی بیان کے ساتھ ساتھ سوز و گداز اور بھرپور تغزل ملتا ہے ؎

ہم سے نہیں بنی ہے تو دشمن سے نبھ چکی
صد شکر اُس کا عہد ہی ناپائیدار ہے

پھر باتیں تمھاری میں سنوں حضرت ناصح
یہ کہہ دو کہ تم نے اسے دیکھا تو نہیں ہے

یوں ہم کو نہ دل سے تم بھلاؤ
دیکھو کبھی یاد آئیں گے ہم

وہ مجھ کو نظام کیوں مناتے
کیا جانیے یہ بھی کیا محل تھا

کیا پہلے تین اشعار میں مومن کے شاگرد ناظم کا رنگ صاف طور پر نہیں جھلک رہا ہے؟ رام پور کے شعری ماحول میں ۱۲۷۴ء کے بعد سے ناظم کی آمد کی وجہ سے زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ اب تک جو رنگِ سخن تھا وہ قائم اور شاگردانِ قائم کی کوششوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن ناظم اور دیگر شاگردانِ مومن مثلاً صاحبزادہ عنایت علی خاں عنایت، تسکین دہلوی، عبداللہ خاں تمکین صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب، صاحبزادہ عبدالوہاب خاں سرورش، حشمت علی خاں موجد نے آئے دن کے طرحی مشاعروں میں حصہ لے کر مومن کے رنگِ تغزل سے مقامی شعرا کو روشناس کیا اور وہ قدرتی طور پر اس سے متاثر ہوئے۔ بالخصوص نوجوان شعرا جن میں نظام بھی شامل تھے۔ انھیں کے ساتھ بیمار شاگردِ مصحفی و غفلت اپنے مخصوص پرسوز لہجے میں اس محفل میں نمودار ہوئے اور انھوں نے بھی لوگوں کو اپنے رنگ سے متاثر کیا۔ چنانچہ نظام ابتدا میں ناظم کے شاگرد ہوئے۔ لیکن بعد میں جب ناظم کی مصروفیات بڑھ گئیں تو بیمار سے اصلاح لینے لگے۔

نظام کا بہترین کلام ان غزلیات میں ملتا ہے جو مذکورہ بالا دو ادوار کے بعد انھوں نے کہی ہیں اور جسے وہ "عالیہ" شاعری کہتے ہیں۔ اس میں معاملہ بندی، ادا نگاری، زبان و بیان پر قدرت، مکالمہ کا انداز سبھی کچھ ہے۔ اور یہ ان کا خاص رنگ ہے جس کے باعث وہ مشہور رہیں۔ نظام کو اس رنگ کی طرف

ان کے تیسرے استاد اور پیرو مرشد میاں احمد علی شاہ احمدؔ نے توجہ دلائی۔ در اصل یہ رنگ جرأت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ خود شاہ صاحب جعفر علی حسرتؔ کے رنگ کو پسند فرماتے تھے۔ نظامؔ کے چند شعر بطور نمونہ دیے جاتے ہیں:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ
دینا وہ اُس کا ساغرِ مے یاد ہے نظامؔ
منھ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ
اس کا وہ نیچی نیچی نگاہوں سے دیکھنا
اور یہ بھی دیکھنا یہ مجھے دیکھتا نہ ہو

معترضین کا یہ کہنا کہ امیر مینائی نے خلافِ واقعہ نواب کلب علی خاں کی خوشنودی کی خاطر نظامؔ کو ناظمؔ کا شاگرد رشید لکھ دیا۔ اس بنا پر بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ خود نواب کلب علی خاں کا ایک بھی شاگرد انتخاب یادگار میں نہیں ملتا۔

نظامؔ کے استادوں کے ذکر میں اس امر کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ متذکرہ بالا تین استادوں کے علاوہ ان کے چوتھے استاد مرزا غالبؔ بھی تھے۔ حال ہی میں اس کا انکشاف جناب اکبر علی خاں صاحب عرشی زادہ نے رضا لائبریری رامپور میں نظامؔ کے مسودات پر بعض اصلاحات کو دیکھ کر کیا ہے۔ ان کی رائے میں ان اصلاحوں کی تحریر مرزا غالبؔ کے ہاتھ کی ہے اس سلسلے میں عرشی زادہ کا ایک مضمون جلد شائع ہونیوالا ہے۔

میری رائے میں ایسا ہونا بعید از امکان بھی نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ جب خود نواب یوسف علی خاں نے غالبؔ سے متاثر ہو کر ان کی شاگردی کو باعث افتخار سمجھا۔ تو رامپور کے متعدد شعرا نے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ انتخاب یادگار میں غالبؔ کے مندرجہ ذیل رامپوری شاگردوں کا ذکر ملتا ہے

۱۔ ناظمؔ ۲۔ صاحبزادہ عبدالوہاب خاں سرخوشؔ ۳۔ صاحبزادہ فدا علی خاں فداؔ ۴۔ حکیم مظہر احسن صاحب احسنؔ ۵۔ فتحیاب خاں انجمؔ ۶۔ شہاب الدین خاں شہابؔ ۷۔ میاں خورشید احمد خورشیدؔ ۸۔ سید افتخار الدین مغلوبؔ

۵۔ شاد صاحب لکھتے ہیں:

"سید قیصر شاہ میاں جو نظامؔ شاہ کے ساتویں لڑکے تھے (ان سے پہلے چھ لڑکوں کا انتقال ان کے سامنے ہی ہو گیا تھا) اور اپنی والدہ کے ساتھ پیلا تالاب پر رہتے تھے۔" (ان۔غ۔دستہ/۴۷)

سید قیصر شاہ میاں ساتویں نہیں بلکہ نویں لڑکے تھے۔ ان سے پہلے آٹھ لڑکے مر چکے تھے۔ جیسا کہ وہ اپنے قصیدے میں کہتے ہیں:

فرزند جو ہوا مرا دو تین سال کا
ہاتھوں ہی ہاتھ اور نے لیا اس کو بڑھا کے ہاتھ
آنکھوں کے رنج ایسے سہے ہیں کہ کیا کہوں
کوٹھے پہ دوں بیٹے کو کوا بنا کے ہاتھ
اب ایک ہے کہ دودھ میسر نہیں اسے
کہتا ہے کچھ اشاروں سے ہر دم اٹھا کے ہاتھ
(قصیدہ در مدح نواب کلب علی خاں)

یہی بات مجھے نظامؔ کے صاحبزادے سید قیصر شاہ میاں نے بھی بتائی تھی۔ جب میں نظامؔ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ۱۹۴۲ء کے قریب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اسی موقع پر انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کے پیدا ہونے کے بعد ان کی والدہ نظامؔ کی مالی پریشانی کی بنا پر میکے چلی آئی تھیں اور جب نظامؔ کا انتقال ہوا تو وہ تین برس کے تھے۔ اس حساب سے سید قیصر شاہ میاں ۱۲۸۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

۶۔ نظامؔ کی ادا بندی اور معاملہ نگاری والی شاعری کے بارے میں شاد صاحب لکھتے ہیں:

"جوانی میں اپنے والد سید احمد شاہ کی جگہ سوار میں نوکر ہوئے تھے۔ مگر اپنے لاابالی پن اور صوفیانہ روش اور شاعرانہ مزاج کی بنا پر یہ نوکری چھوڑ دی تھی۔ تنگدستی کی وجہ سے بیوی عموماً پریشان رہتی تھی اور ایک لڑکے کی ماں بن چکی تھی اس لیے فاقے کرتے کرتے تنگ آ کر اپنے گھر بیٹھ رہی۔ اور سید نظام شاہ صوفی منش حضرات کی صحبت میں گذارتے رہے۔ بیوی کی

ٹکڑا نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے ۲۴ فروری ۱۹۵۹ء کو اسلامیہ کالج لاہور میں کی تھی۔ اس تقریر میں کہا گیا ہے کہ "تحریک کے ایڈیٹر گوپال متل جو اردو کے بڑے حامی ہیں لکھتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی ۲۵ برس میں بھارت میں اردو کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔" مولوی صاحب کو غالباً تسامح ہوا۔ جیسا کہ قارئین تحریک کو علم ہے میرا موقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اگر اردو والوں نے اپنی زبان کے تحفظ اور فروغ کے لیے سرگرم کوشش نہیں کی تو یہ زبان مٹ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس بات اور اس بات میں جو مولوی صاحب نے مجھ سے منسوب کی ہے، فرق ہے۔

——— گوپال متل

نخلستان

"نخلستان" راجستھان ساہتیہ اکادمی کا سہ ماہی اردو جریدہ ہے۔ کچھ برس سے اس کی اشاعت معرضِ التوا میں تھی۔ اکادمی کے نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر راجندر شرما اور ان کے رفقا، اردو والوں کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کی کوشش سے اس جریدے کا دوبارہ اجرا عمل میں آیا۔ زیرِ نظر شمارہ اس کے دورِ ثانی کا پہلا شمارہ ہے جو عبد الباسط صاحب کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔

جیسا کہ اداریے میں کہا گیا ہے اس جریدے کا بنیادی مقصد راجستھان کی فضا کو اردو کے لیے سازگار بنانا اور وہاں کے اہلِ قلم کی کاوشوں کو منظرِ عام پر لانا ہے۔ راجستھان میں نشر و اشاعت کے وسائل کم ہیں اور وہاں کے شاعر اور ادیب اس کمی کے شکوہ گزار بھی رہتے ہیں اس لیے یہ جریدہ اگر باقاعدگی سے شائع ہوتا رہے تو اس کمی کی کسی نہ کسی حد تک تلافی کر سکتا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ اس رسالے نے کسی خاص مکتبِ فکر سے خود کو وابستہ نہیں کیا ہے اور زیرِ نظر شمارے میں راجستھان کے سبھی ادبی حلقوں کی نمائندگی کی کوشش کی ہے۔ یہ فیصلہ پڑھنے والے کر سکیں گے کہ ادب کے عصری میلانات سے آگاہی کا ثبوت کون کس حد تک فراہم کر سکا ہے۔ رسالے میں بیرونِ راجستھان کے اہلِ قلم کی نگارشات بھی شامل کی گئی ہیں اور ان میں بھی مختلف ادبی رویے رکھنے والے لوگ ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔

مضامین میں ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی کا مضمون "راجستھان سے مرزا غالب کا تعلق" خصوصیت سے توجہ طلب ہے۔ مضمون میں انھوں نے ایسے تمام معلومہ شواہد یکجا کر دیے ہیں جن سے راجستھان کی مختلف ریاستوں سے غالب کا تعلق ظاہر ہوتا ہے، ایسے لوگوں کے مختصر حالات بھی دیے ہیں جن کے ساتھ غالب کے شخصی مراسم رہے ہیں۔

ڈاکٹر فضلِ امام راجستھان یونیورسٹی جے پور میں اردو کے استاد ہیں اور اچھی تنقیدی نظر رکھتے ہیں لیکن مجاز پر ان کا مضمون پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجاز کی شاعری کو اپنے طور پر سمجھنے کی انھوں نے کوشش نہیں کی اور وہ ان مفروضوں پر ایمان لائے ہوئے ہیں جو بے اساس ہیں لیکن ایک زمانے میں ترقی پسند تنقید میں مروج رہے ہیں۔ مجاز ایک اوسط درجے کے رومانی شاعر سے زیادہ کچھ نہ تھے اور انقلاب کا تصور بھی ان کے ہاں رومانی دھندلکوں میں لپٹا ہوا ہے۔ فضلِ امام صاحب بھی مجاز کو رومانی شاعر کہتے ہیں لیکن انھیں "سماجی شعور" سے بہرہ ور شاعر قرار دیتے ہوئے اردو کے سب سے بڑے رومانی شاعر اختر شیرانی سے زیادہ اہم شاعر ٹھہراتے ہیں جو ان کی نظر میں اس سماجی شعور سے محروم ہیں جس سے مجاز بہرہ ور تھے۔ یہ محض واہمہ ہے۔ فضل امام صاحب نے مجاز کے کلام سے مثالیں دینے کی ضرورت نہیں سمجھی لیکن ترقی پسند ناقدین ان کے "سماجی شعور" کا ذکر کرتے ہوئے ان کی دو نظموں کا حوالہ عام طور پر دیتے ہیں: آوارہ اور سرمایہ داری۔ "آوارہ" مجاز کی اچھی نظموں میں ہے لیکن اس کی اساس اس سماجی شعور پر نہیں جو ترقی پسند تنقید کی ایک مخصوص اصطلاح ہے، بلکہ یہ نظم ایک ایسے نوجوان کی شدید جذباتی کیفیات کا اظہار ہے جو بھری دنیا میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ سرمایہ داری مجاز کی ناکام ترین نظم ہے جس میں وہ اپنا ڈکشن تک قائم نہیں رکھ سکے ہیں، وجہ صاف ہے کہ اس نظم کو شاعر کی داخلی شخصیت سے کوئی علاقہ نہیں اور یہ محض کسی بیرونی دباؤ کے تحت لکھی گئی ہے۔ (باقی صفحہ ۴۲ پر)

وہ بت جواب ملے بھی تو ہم کیا ملیں نظامؔ
اب لو لگی ہوئی ہے ہماری خدا کے ساتھ

یاں کسے غم ہے جو گریہ نے اثر چھوڑ دیا
ہم نے وہ شغل ہی اسے دیدۂ تر چھوڑ دیا

میکشی چھوڑے تو برسیں ہوئیں پر اب بھی نظامؔ
دل بھر آئے جو رہے سامنے بوتل آ کے

۷۔ نظامؔ کی معاشی حالت کے بارے میں شاد صاحب نے لکھا ہے :" تین صاحبزادگان وقتیکہ سودا سلف خریدنے پر وقتی ملازم تھے۔ ان سے جو کچھ مل جاتا صبر و شکر کے ساتھ اس پر قناعت کر لیتے تھے۔" (ن۔غ۔ دستہ/۷۲) وقتی ملازمت اور سودا سلف خریدتے ہونے کا ذکر کرتے شاد صاحب نے اہل رام پور اور نواب رامپور کی ناقدر دانی پر طنز کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظامؔ کی مالی پریشانی کا اظہار ان کی منظوم عرضداشتوں اور قصاید میں ملتا ہے۔ لیکن سواروں کی ملازمت کے علاوہ اہل خاندان ان کا احترام کرتے تھے اور کچھ سلوک بھی کرتے تھے۔ اس بات کی تائید خاندان کی ایک معمر خاتون اختر زمانی بیگم اہلیہ صاحبزادہ کلب حسن خاں خورشید کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ ان کا انتقال ۱۹۵۰ میں بہ عمر ۸۰ سال ہوا۔ یعنی نظام کے انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً دس سال کی تھی۔ وہ ان کا ذکر انتہائی عزت و احترام کے ساتھ کرتی تھیں۔ اور بتاتی تھیں کہ میاں نظامؔ شاہ ان کے دادا اور دادا کے بھائیوں کا ماہانہ وثیقہ جو ریاست سے مقرر تھا وصول کرنے کے لیے مختار خاص مقرر تھے۔ ان صاحبزادگان وقت کے نام (۱) صاحبزادہ اشرف علی خاں اشرفؔ شاگرد غفلتؔ و کرمؔ (۲) صاحب زادہ شجاعت علی خاں شجاعتؔ شاگرد طالبؔ شہرتی اور (۳) صاحبزادہ کرامت علی خاں کرامتؔ شاگرد کرمؔ تھے۔ ان سب کا ذکر انتخاب یادگار میں ہے۔ تینوں نواب قاسم علی خاں خلف اصغر نواب فیض اللہ خاں بہادر والیِ رام پور کے لڑکے تھے۔ ان کے مکانات قلعہ کے قریب ہی تھے۔ حسب قاعدہ اس مختاری کا نظامؔ کو معاوضہ ملتا تھا۔ وہ یہ بھی بتاتی تھیں کہ آخر عمر میں نظامؔ ان کے دادا کے مردانہ حصے میں ایک کوٹھری میں رہنے لگے تھے۔ کھانا بھی دادا وغیرہ کے ساتھ کھاتے تھے۔

۸۔ نظامؔ کے اس مشہور مطلع سے

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

کے سلسلے میں اپنی پندرہ سالہ "تحقیق و تلاش" کے اعتماد پر شاد صاحب نے دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ "پہلا مصرعہ نواب کلب علی خاں بہادر نے جلسہ رائے کے کسی منظر سے متاثر ہو کر نظم کیا اور باہر آ کر شعرائے دربار سے اس مصرعہ پر گرہ کی فرمائش کی۔ اپنے اپنے رنگ میں سبھی نے زور مارا مگر مصرعہ کا اتفاقی رخ کسی کی گرہ برداشت نہ کر سکا۔ چوں کہ یہ مصرعہ نظامؔ کے ڈھب کا تھا۔ انھوں نے کہا سے

دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

مصرعہ دست و گریباں ہو گیا تھا۔ اس لیے نواب صاحب نے اظہار خوشنودی کے طور پر اپنا مصرعہ یہ کہہ کر نظام رامپوری کو عطا کر دیا کہ یہ مصرعہ بھی تم لے لو۔ اور حضرت نظامؔ نے بھی کوئی کمی نہیں کی...... اور پھر اس مطلع پر پوری غزل کہہ دی" (ن۔غ۔ دستہ/۶۷)

دراصل فارسی اور اردو کے متعدد عمدہ اشعار سے متعلق کچھ اس قسم کے افسانے مشہور ہیں۔ اور اپنے چٹخارے اور دلچسپی کی بنا پر لوگوں میں مقبول ہو گئے ہیں۔ ان کی صداقت کے بارے میں کسی دستاویزی یا معتبر روایت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ شادؔ صاحب نے اس قصے کے راوی کا نام حافظ پھندو عرف پنڈت ساکن محلہ کٹ کوٹیا رامپور لکھا ہے۔ جنھوں نے خود کو نظامؔ کا دوست اور معتقد ثابت کیا تھا۔ بقول شاد صاحب حافظ پھندو ہی وہ شخص تھے جنھوں نے سب سے پہلے اس راز کو لوگوں پر فاش کیا تھا۔ گویا اس قصے کے مصنف یہ حافظ پھندو ہی تھے۔ شاد صاحب نے بغیر اس بات پر غور کیے کہ نظامؔ کا کوئی دوست واقعہ کے بیان کرتے وقت زندہ بھی ہو سکتا ہے یا نہیں انتہائی سادگی سے اسے صحیح تسلیم کر لیا۔ شاد صاحب کا مذکورہ بالا مضمون اولاً (نظام رامپوری) رسالہ نقوش لاہور کے شخصیات نمبر (۱۹۵۵) میں شائع ہوا ہے۔ اور اسی کے لیے لکھا گیا تھا۔ شاد صاحب کی ملاقات حافظ پھندو سے خود ان کے بیان کے بموجب اس مضمون کے لکھنے کے عین قبل ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے ۱۹۵۵ء

میں نظام کے انتقال (۱۸۷۲ء) کو ۴۳ برس ہو چکے تھے۔ اگر اس مدت میں حافظ پھندو کی ۵۵ عمر بھی جوڑی جائے تو نظام کے دوست کی حیثیت سے ۱۸۷۲ء میں ہونا چاہیئے جو ۳۰۔۴۰ سال سے کیا کم ہوگی تو مجموعہ ۱۱۳ تا ۱۲۳ سال ہوتا ہے۔ غرضکہ یہ حافظ پھندو داستان گو تو ہو سکتا ہے معتبر اور چشم دید راوی نہیں ہو سکتا۔

اور جب شاد صاحب کو یہ یقین ہو گیا کہ مصرعۂ اولیٰ نظام کا نہیں بلکہ نواب کلب علی خاں نواب کا ہے تو فوراً ان کی رگ طنز پھڑک اٹھی اور انھوں نے اسے "ملوک الکلام" قرار دے دیا۔ اور جوانی میں جس مطلع کو سن کر بے حد متاثر ہوئے تھے اب اس کے مصرعہ اولیٰ کے ردیف و قافیہ، زوائد نظر آنے لگے۔ وہ لکھتے ہیں:

"(انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے) — مضمون ادا ہو چکا — (اٹھا کے ہاتھ) چھلانگ لگا کر دور جا کھڑا ہوا" (ف۔غ۔ دستہ/۶۸)

اسی کو اعتراض برائے اعتراض کہتے ہیں۔

میری ناچیز رائے میں یہ دونوں مصرعے نظام ہی کے ہیں اور مصرعۂ اولیٰ میں کوئی سقم نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے "انگڑائی" کے فعل کو سمجھ لیا جائے۔ انگڑائی لیتے وقت ہاتھ نیچے سے اٹھا کر سر کے اوپر لے جاتے ہیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کر کے اعصابی زور سے گرفت کو سخت کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انگڑائی مکمل ہوتی ہے اور اس سے وہ سستی دور ہوتی ہے جس کا تقاضا انگڑائی ہوتی ہے۔ محض سر کے اوپر ہاتھ اٹھانے کو نہیں کہتے۔ نظام نے محبوب کو ایک ایسے عالم میں دکھایا ہے کہ انگڑائی لینے کی غرض سے ابھی اس نے ہاتھوں کو اوپر اٹھایا ہی تھا کہ اچانک اس کی نظر عاشق پر پڑی اور اس نے بغیر انگڑائی لیے ہوئے ہاتھوں کو نیچے چھوڑ دیا — یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ نظام کے یہاں محبوب مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔ ظاہر ہے کہ انگڑائی کے وقت جو نسوانی ابھار پیدا ہوتا ہے اس کی نمائش کسی مرد کے سامنے جائز نہیں۔ یہی سبب ہے کہ محبوب نے فوراً ہاتھ کھینچ لئے ہیں۔ لیکن یوں ہی نہیں چھوڑے — "مسکرا کے" چھوڑے ہیں۔ اس مسکرانے کے لفظ میں شاعر نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ نظام اسی ادا بندی کے لیے مشہور ہیں۔ اس لحاظ سے "اٹھا کے ہاتھ" غیر ضروری نہیں بلکہ "وضاحتی" طور پر ہے۔

شاد صاحب نے حافظ پھندو کی روایت کو تسلیم کرنے سے پیشتر اس امر پر بھی غور نہیں کیا کہ نواب کلب علی خاں برسر عام شعرائے دربار کا امتحان لیتے ہیں۔ اور شعرائے دربار بھی کون؟ جن میں ان کے استاد امیر مینائی کے استاد، اسیر لکھنوی، جلال، برق، بحر، قلق، تسیر، داغ وغیرہ جیسے اساتذۂ لکھنؤ و دہلی شامل تھے۔ یہ سب عاجز رہتے ہیں یا ان کے مصرعوں کو کمتر سمجھا جاتا ہے اور نظام بازی جیت لیتے ہیں۔ اتنے عظیم کارنامے پر داد و دہش کرنے والا نواب کوئی انعام نہیں دیتا بلکہ اپنا کہا ہوا مصرعہ عطا کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔

نظام کی یہ غزل اسی زمین میں کہے گئے ایک قصیدے کی تشبیب ہے جو نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہے۔ لیکن اسے غزل کے طور پر غزلیات میں شامل کر دیا گیا۔ اور بقیہ قصیدہ الگ رکھا گیا ہے۔ کلیات نظام (مطبوعہ شمس المطابع مراد آباد) میں ص ۱۵۸ پر اس قصیدہ کا آغاز اسی غزل کے مطلع سے ہوتا ہے۔[۲۴]

۹۔ شاد صاحب نے اسی مضمون میں ایک دوسری عجیب روایت نظام کے انتقال کے بعد ان کے کلام کی چوری کے بارے میں بیان کی ہے۔ اور اس جرم کے مرتکب امیر مینائی بتائے گئے ہیں۔ ایک صاحب امتیاز کھنڈارا ڈرائنگ ماسٹر جو مشہور ماہر موسیقی استاد وزیر خاں مرحوم کے بھائی فدا علی صاحب تحصیلدار کے لڑکے ہیں۔ شاد صاحب کا فوٹو لینے آئے تا کہ ان کا اسکیچ تیار ہو سکے۔ اسی ملاقات میں انھوں نے اپنے مرحوم والد کے حوالے سے یہ روایت بیان کی۔ شاد صاحب نے ان سے خوش ہو کر اس محتاج ثبوت اور محیر العقول روایت کو اپنے مضمون میں نمایاں طور پر بیان کر دیا۔ لکھتے ہیں:

"ہاں تو کھنڈارا کے والد (فدا علی صاحب مرحوم) کا بیان ہے کہ جب میاں نظام کا انتقال ہوا تو امیر احمد صاحب مینائی نے آ کر نظام صاحب کے مسکونہ مکان میں حکومت کی طرف سے ایک اور قفل ڈال دیا۔ اور سوئم کے دن امیر مینائی نے ہی یہ مکان کھولا۔ غزلیات کے مسودے اور کچھ اشعار جو

مکان کی دیواروں پر کوئلے سے لکھے تھے۔ نوٹ کیے اور ان کو سائر چلے گئے۔ پلنگ پیڑھی ان کی بیوی کو بھجوا دی...۔ موصوف (کھنڈارا) نے یہاں ایک عجیب و غریب بات کہی۔ یعنی ماسٹر کھنڈارا صاحب کے والد کا خیال تھا کہ وہ اشعار جو امیر مینائی کے کلام میں نہیں چھپتے۔ یہ وہی اشعار ہیں جو وہ نظام شاہ کے مکان سے اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔" (ن۔غ۔دستہ/۴۷ تا ۷۰)

اگرچہ شاد صاحب نے اسی مضمون میں آگے چل کر اس بدگمانی کو درست نہیں مانا ہے۔ لیکن طاہرہ اختر کے ایک مضمون "شاد عارفی" سے جو نقوش لاہور کے شخصیت نمبر حصہ دوم (۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاد صاحب اپنے ۱۹۵۵ء میں لکھے ہوئے مضمون کے برخلاف بعد کو خود بھی امیر مینائی کو سارقِ کلامِ نظام سمجھتے تھے۔ طاہرہ اختر اپنے مضمون (شاد عارفی/ ص ۱۱۳۵) میں لکھتی ہیں۔

"کچھ دن ہوئے لڈن ماموں (شاد عارفی) سے امیر مینائی کے ایک شعر کا مطلب پوچھ رہی تھی۔ مطلب بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ شعر امیر مینائی کا نہیں بلکہ نظام رام پوری کا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے ایسی دلیلیں پیش کیں جن سے ان کی بات کو تقویت پہنچتی تھی۔ ایک دن کہنے لگے نظام کے کلام کا سرقہ ہوا ہے۔ پرانے لوگوں سے پوچھ تاچھ کر رہا ہوں۔ پھر ثابت کروں گا کہ نظام کا بہت سا کلام امیر مینائی کے کلام میں شامل ہو گیا ہے۔"

غالباً ان کا یہ موعودہ مضمون نہیں لکھا جا سکا۔ اگر لکھا گیا ہوتا تو کافی ہنگامہ خیز ثابت ہوتا۔ کیوں کہ امیر مینائی جیسے استاد وقت، جید عالم، مفتی عدالت پر اس قسم کا الزام لگا دینا تاریخ ادب میں کوئی معمولی واقعہ نہ ہوتا۔ اب ماسٹر کھنڈارا صاحب کے والد کی چشم دید روایت کو بھی پرکھ لیا جائے۔ کیوں کہ یہی بنیاد ہے اس تمام مسئلے کی۔ اپنے والد فدا علی صاحب کے بارے میں کھنڈارا صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ گھیر ستی میں رہتے تھے۔ جہاں نظام کا آبائی مسکونہ مکان بھی تھا۔ اسی میں نظام کا انتقال ہوا۔ پہلے تو یہی بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ نظام کا آبائی مکان انتقال کے وقت ان کی ملکیت میں تھا۔ کیوں کہ نظام خود اپنے ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں

ایسے پڑے ہیں صَرف تولوکے موت کے
رہنے کا بھی مکان بکا میرزا کے ہاتھ

یعنی یہ مکان انتقال سے کئی سال پیشتر بک چکا تھا۔ بیوی میکے میں چلی گئی تھیں۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں نظام صاحبزادگان اشرف علی خاں وغیرہ کے مردانے حصے میں رہنے لگے تھے۔ ایسی صورت میں آبائی مکان میں انتقال ہونے کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ اس مکان میں "پلنگ پیڑھی" تھی جو ان کی بیوی کو بھیجی جاتی۔ اس کے علاوہ امیر مینائی جب سرکار کی طرف سے آئے تو فدا علی صاحب کے علاوہ اس وقت مکان میں نظام کے عزیز اور محلے کے دیگر افراد بھی حسب قاعدہ موجود ہوں گے۔ ایسی صورت میں امیر مینائی نے اگر دیواروں سے کچھ اشعار نقل کیے بھی ہوں تو انھیں دوسرے لوگوں نے بھی پڑھا ہوگا۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ ان اشعار کو انھوں نے اپنے کلام میں شامل کر لیا۔ جب کہ یہ بھی خطرہ تھا کہ نظام ان اشعار کو لوگوں کو پہلے سنا چکے ہوں اور وہ انھوں نے لکھ لیے ہوں۔ یا ان کے حافظے میں محفوظ ہوں۔ چنانچہ ایسا کلام جو ان کے مسودات میں نہ تھا بعد کو لوگوں سے ملا بھی۔ رہی امیر مینائی کے کلام میں ایسے اشعار کی موجودگی جو ان کے عام رنگ سے میل نہیں کھاتے اس کا سبب سرقے کے بجائے ان کا رامپور کے شعرا سے متاثر ہونا بھی تو ہو سکتا ہے۔ جس طرح داغ کے رنگ میں رامپور آکر تبدیلی پیدا ہوئی اسی طرح امیر مینائی اور جلال لکھنوی نے یہاں کا اثر قبول کیا اور ان کے کلام میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی میں نے اس موضوع پر اپنی زیر تصنیف ادبی تاریخ "رامپور کا دبستانِ شاعری" میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

اس مضمون کے خاتمے پر ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں آیا کہ اگر شاد صاحب اس وقت زندہ ہوتے اور میں ان سے مل کر ان امور کی طرف توجہ دلاتا تو بہت ممکن ہے کہ وہ خود صفائی سے اعتراف کر لیتے اور اس قسم کا مضمون میرے بجائے ان کی طرف سے شائع ہوتا۔ یہی ان کا مزاج تھا اور ایک جگہ انھوں نے کس جرات سے خود اپنے بارے میں لکھا ہے۔

"سب سے پہلے مجھے اپنی کوتاہ قلمی کا اقرار لازمی ہے۔ جس کے ذیل میں کئی تفصیلی باتیں اجمال کی نذر ہو گئی ہیں۔ کئی اچھے شعروں پر روا روی کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے۔ نثر پر تو کافی عدم توجہی کا گمان گذرتا ہے اور یہ گمان یقین کی حد تک درست ہے۔ کیوں کہ میں نے جن حالات میں یہ مطالعے لکھے ہیں یا لکھ رہا ہوں ان کے اندر حد درجہ زوار اتار چڑھاؤ ہیں کہ کسی بھی مجھ ایسے علیل آدمی کے لیے ناقابل برداشت ہیں۔ اطمینان اور فرصت، جو مطالعے کے لیے نہایت اہم ہیں ان کا فقدان ادبی توازن باقی نہیں رہنے دیتا۔" (مطالعے۔ حملہ اپنے پہ بھی... نثر و غزل دستہ/۱۰۴)

---

[1] میاں احمد علی شاہ احمد خلف مصری خاں خلیفہ و شاگرد امام الدین خاں (اور علوم عربی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اردو فارسی دونوں میں شاعری کرتے تھے۔ دیوان یا مجموعۂ کلام کا تو پتہ نہیں چلتا البتہ ایک مثنوی فارسی "محلِ منور" (تصنیف ۱۲۶۳ھ) جس کا ایک مخطوطہ مخزونہ آزاد لائبریری علی گڑھ میں اور ایک تصنیف "ناصر نامہ" کے نام سے مخزونہ سلیمانیہ پٹنہ یونیورسٹی کا پتہ چلتا ہے یہ نسخہ نظام نے نقل کیا ہے۔ احمد جعفر علی حسرت کے رنگ سے متاثر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے ہی نظام کو ادا بندی اور معاملہ نگاری کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ۲۹ شوال ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی (انتخاب یادگار/۹۔ سلاطین رامپور/۲۶، معاصر تذکرہ منی جہاں ۱۹۴۳ء)

[2] انتخاب یادگار/۲۸۷ [3] ایضاً/۲۱ [4] ایضاً/۲۳۳۔ [5] ایضاً/۱۰۳ [6] کلیات نظام از فائق/۶۷ تا ۷۹

[7] مطبوعہ نسخہ میں یہ مصرعہ یوں ہے ؎

ہم نے تو شغل بھی اے دیدۂ تر چھوڑ دیا

لیکن میں نے اپنے خاندانی نسخے میں جس طرح پڑھا تھا اسے بہتر سمجھ کے لکھ دیا ہے

[8] کلیات نظام از فائق/حاشیہ ص ۷۸

بقیہ کیا روس واقعی ہمارا معتمد ساتھی......

"الحدیث" کے بیان کے مطابق مصریوں کو اس سلسلے میں سوویٹ روس سے چار خاص شکایتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ ماہرین نے اندھا دھند کھدائی کی۔ دوسری یہ کہ پرانی مشینری استعمال کی گئی جو صحرائی خطوں کی بجائے سرد علاقوں کے لیے موزوں تھی تیسری یہ کہ سوویٹ بیوروکریٹک انتظام اتنا سخت تھا کہ اس سے کام میں رکاوٹ پڑتی تھی۔ چوتھی یہ کہ فالتو پرزوں کی کمی تھی اور پرزے روس سے منگانے میں بہت ہی زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔

وطن دوستی کا تقاضا ہے کہ سوویٹ لابی کے پروپیگنڈے اور سوویٹ روس کے بلند بانگ دعاوی پر بھروسا کرنے سے پہلے مصر کے تلخ تجربات اور حالیہ واقعات کو ضرور پیش نظر رکھا جائے۔

نعیمہ جعفری

شناسا

روشنیوں کے اس شہر میں، میں اس طرح گھوم رہا ہوں جیسے شیش محل میں کتا گھومتا ہے۔ یہ جگمگاتا ہوا حسین شہر جس کا شمار ملک کے خوب صورت شہروں میں ہوتا ہے۔ جسے دیکھنے کے لیئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ ہاں یہ شہر مجھے کیوں اتنا خوفناک اتنا پراسرار لگ رہا ہے، کتنا حسین لیکن کتنا اجنبی۔ یہ فلک بوس عمارتیں، یہ شیشے کا بازار، یہ بھاگتی ہوئی کاریں، زمین کا سینہ چھلنی کرتے ہوئے ٹرک، کسی محبوبہ کی طرح اپنے طلب گاروں پر نگاہ غلط انداز ڈال کر گزر جانے والی بسیں، ملک کے اکثریتی طبقے کی نمائندہ بائیکلیں اور زندگی کی اس بھیڑ میں موت سے ہراساں پیدل چلتی ہوئی ٹانگیں کتنی گہما گہمی ہے۔ زندگی کتنی عجلت کے ساتھ رواں دواں ہے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہے۔

چاروں طرف، یہاں سے وہاں تک چہروں کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔ خوب صورت چہرے، بدصورت چہرے، خوش حال چہرے بھوک سے تڑپتے ہوئے مفلس چہرے، کلبوں میں رقص کرتے ہوئے کریہہ چہرے اور فٹ پاتھوں پر سردی سے تھر تھراتے ہوئے معصوم چہرے، مسکراتے ہوئے چہرے اور اداس، زندگی سے بیزار چہرے۔ لیکن یہ سب چہرے میرے لیے اجنبی ہیں کسی چہرے میں شناسائی کی جھلک نظر نہیں آتی، اپنا پن نظر نہیں آتا۔ اس اجنبی شہر کی ہر شے اجنبی ہے۔ انسانوں کے اس سمندر میں، میں ایک حقیر سے تنکے کی طرح اِدھر سے اُدھر بھٹکتا پھر رہا ہوں بے مقصد اور بے وجہ کسی منزل کے تعین کے بغیر۔ کہاں جاؤں کدھر جاؤں ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

میرے قدم خود بخود ایک عمارت کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ اس عمارت کے ہال میں قدم رکھتے ہوئے مجھے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ شاید کوئی کافی ہاؤس ہے یہاں ہال میں چکراتی ہوئی کافی کی مانوس سی خوشبو اجنبیت کے احساس کو کم کر رہی ہے۔ میں کنارے کی میز کا انتخاب کرتا ہوں اور بیٹھ جاتا ہوں۔ میں کچھ ہلکا پن محسوس ہوتا ہے۔ میں نہایت انہماک کے ساتھ ہر اور موٹے ہونٹوں کو لپ اسٹک کی تہہ میں چھپانے کی کامیاب اور ناکام کوششوں کا جائزہ لیتا ہوں اور بے حد خلوص کے میک اپ کے انبار کے نیچے بے رونق جلد پر پڑی ہوئی جھریاں تلاش کرتا ہوں۔ یکایک تنہائی کا احساس پھر پوری شدت کے ساتھ میرے ذہن پر حملہ کرتا ہے۔ فضا میں بھٹکتی ہوئی کافی کی بو نہ جانے کہاں چلی جاتی ہے۔ بجتی ہوئی کھنکتی ہوئی ہنسی بھدے اور بے سرے قہقہے، سریلی چیخیں سب اجنبی لگنے لگتے ہیں مرکری ٹیوب کی دودھیا روشنی آنکھوں کو اور بڑھا دیتی ہے کافی ہاؤس کا بیرا نہ جانے کب سے میرے پاس کھڑا ہے۔

"کافی فار فور" (COFFEE FOR FOUR) میں اس طرح چیخ کر کہتا ہوں جیسے وہ بیرا بہرا بھی ہو۔ وہ میری طرف ایسے دیکھتا ہے جیسے میں نے اپنے گدھے ہونے کا اعلان کیا ہو لیکن میں اس کی نگاہوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ ساری میز کافی کے پیالوں سے بھر دوں۔ میرے اِرد گرد کافی کی تلخ تلخ بو بکھر جائے۔ کچھ تو اجنبیت کا احساس کم ہو۔

میں خالی نظروں سے ہال کا جائزہ لیتا ہوں۔ دفعتاً ہال کے مغربی گوشے میں میری نگاہ ٹھٹھک کے رہ جاتی ہے۔ میرے ہونٹ پھیل جاتے ہیں۔ شاید میں مسکرا رہا ہوں۔ مسکراہٹ جس کا تصور ہی اس شہر میں آ کر فنا ہو گیا تھا۔ میری مسکراہٹ بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ میری باچھیں کانوں سے جا ملتی ہیں اور میرا دل چاہتا ہے کہ ہنسوں، جی بھر کے ہنسوں، قہقہے لگاؤں۔ چاہے یہاں موجود لوگ مجھے پاگل سمجھنے لگیں۔ ہاں واقعی، میں اتنا ہی خوش ہو گیا ہوں کہ اگر کوئی مجھے پاگل سمجھے تو مجھے غم نہ ہوگا۔ ہال کے مغربی گوشے میں بیٹھے ہوئے اس شخص سے

باقی صفحہ ۳۴ پر

خالد رحیم

ین کہ ہم سے ہماری ہر خوشی لے جائیگی
ذکرِ سنگِ تعلق، زندگی سے لے جائیگی

دن سُورج کو بھی ہوگی ہماری جستجو
لمر دل سے ہمیں بھی روشنی لے جائیگی

ن کے چہرے پہ اُگا کر اک سنہرا آفتاب
ت اپنے ساتھ اپنی تیرگی لے جائیگی

دن میرے ہی ہاتھوں کی لکیروں تک مجھے
خبر تھی خواہشوں کی سادگی لے جائیگی

تھ میں لے جاؤں گا، ناکامیاں، محرومیاں
مجھے گمنامیوں میں بے بسی لے جائیگی

کتنے زرد چہرے دیکھنے میں آئیں گے
تنی جو کھٹوں تک یہ گلی لے جائیگی

چلا خالد پھر اپنے ساتھ اپنی تشنگی
رنسرابوں تک اُسے یہ چاندنی لے جائیگی

طرب میرٹھی

سبھی تھے اپنے نہ گھر میں کوئی پرایا تھا
وہ کس نے پھینکا تھا پتھر جو مجھ پہ آیا تھا

سفر تمام ہوا اپنا دھوپ میں چلتے
نہ دُور تک کوئی آنچل نہ کوئی سایا تھا

کسی کا چہرہ دل و ذہن کر گیا روشن
مرے خیال میں سورج ابھر کے آیا تھا

کچھ اور بڑھنے لگی محفلوں کی تنہائی
مجھے بتاؤ کہ یہ شہر کیوں بسایا تھا

اداسیوں کے تلاطم تھے اس کے سینے میں
جس آدمی نے ابھی قہقہہ لگایا تھا

نہیں تھا سہل طربؔ ساحلِ خوشی ملنا
ہیں پار کر کے سمندر غموں کا آیا تھا

شاہ حسین

عفّت نظر سے، دل سے وفا لے گئی ہوا
کیسے سہانے خواب چرا لے گئی ہوا

تاریک راستوں میں دیئے تو جلائے تھے
ہر راستے سے لے کے اجالے گئی ہوا

سنگین مرحلے تھے خیالوں کی راہ میں
محسوس یہ ہوا کہ اڑا لے گئی ہوا

مستانہ وار سوئے بیابان و ریگ زار
کیوں خوشبوؤں میں خود کو بسا لے گئی ہوا

ملتے نہیں کواڑ، جھروکے خموش ہیں
سناٹا چھا گیا ہے، یہ کیا لے گئی ہوا

ساحل سلطان پوری

اِک شخص جو خلوص کا پیکر بنا رہا
وہ میری آستین کا خنجر بنا رہا

ہر لمحہ میرے ساتھ رہی میری بے بسی
کہنے کو کوئی میرا مقدر بنا رہا

اس کے لیے میں جاگتی آنکھوں کا خواب تھا
میرے لیے وہ دُور کا منظر بنا رہا

میں اپنی خواہشوں کے اندھیروں میں مر گیا
وہ صبحِ زندگی کا پیمبر بنا رہا

ہونٹوں پہ آ کے ٹوٹ گئی دل کی ہر صدا
وہ بے نیاز درد تھا پتھر بنا رہا

ساحلؔ نے زندگی سے کچھ ایسے نباہ کی
ٹوٹے ہوئے جہاز کا لنگر بنا رہا

رابرٹ برج
عزیز کاشمیری

میں تمہیں جانے نہ دوں گا

میں تمہیں جانے نہ دوں گا
مہینہ بھر کی ساری محبت
کیا یونہی ختم ہو جائے گی ؟
اسے سمویا جا سکتا ہے
ایک مختصر بوسے میں
میں تمہیں جانے نہ دوں گا
آفتاب عالمتاب کو دیکھو !
اسکی رفتار روکی جا سکتی ہے ؟
جھوٹوں کو روشنی میں لانے کے لیے ؟
میں تمہیں جانے نہ دوں گا
تپتے موسم میں آسمان پر
ہجوم کیے ستاروں نے
اپنی لاکھوں آنکھوں سے
بہت قریب سے ہمیں جھانکا ہے
ایسے میں کیسے جانے دوں ؟
میں تمہیں جانے نہ دوں گا
کیا نہ کی ہم نے بارہا
بدلتے چاند کی تحقیر
جواب دیر سے چڑھتا — اور
جلد ڈوب جاتا ہے
پھر کیسے تمہیں جانے دوں ؟
میں تمہیں جانے نہ دوں گا
تم کہتی ہو الوداع !
پر سوچو ذرا
جکڑ رکھا ہے میں نے تمہیں
باہوں میں کتنی گرم جوشی سے !
میں تمہیں جانے نہ دوں گا۔
ہرگز ہرگز جانے نہ دوں گا

رابرٹ گرینی
عزیز کاشمیری

چرواہن کا نغمہ

اُف! محبت کیا ہے ؟ ایک حسین شے
ایک گڈریے کے لیے جیسے بادشاہت
بلکہ اس سے بڑھ کر
شاہوں کی ذمہ داریاں، تاج سے وابستہ ہوتی ہیں
ایسے ہی فرائض محبت کا منہ چڑاتے ہیں
ملک جب ایسے جذبے سے سرشار ہو
کسی عورت کو پھر گڈریے کی محبت سے انکار ہو ؟
ریوڑ کے ساتھ وہ شام کو گھر آتا ہے
جیسے ایک بادشاہ خوشیاں مناتا ہے
بلکہ اس سے بھی زیادہ
شاہوں کو رعایا کے حقوق کی فکر لاحق رہتی ہے
اور بے فکر گڈریے سامنے آگ کے گاتے ہیں
گھاس پھوس کے بستر پر میٹھی نیند وہ سو جاتا ہے
جیسے نرم گداز گدیلوں پر بادشاہ رات گذارتا ہے
بلکہ اس سے بھی زیادہ بہتر
غم و افکار بادشاہ کی نیند اڑائے جاتے ہیں
جب کہ تھکے چرواہے نیند میں مست خراٹے بھرتے ہیں
یوں ہی خوشیاں مناتے چرواہے وہ سال گذارتا ہے
جیسے بادشاہ ہر اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کرتا ہے
بلکہ اس سے بھی زیادہ
شاہوں کو حرب و ضرب اور جنگوں کا سامنا رہتا ہے
جب کہ گڈریے زمین پر ہنستے گاتے
محبت کی پینگیں اڑاتے ہیں
ملک جب ایسے جذبے سے سرشار ہو
کس عورت کو پھر گڈریے کی محبت سے انکار ہو ؟

ولیم شیکسپیئر
عزیز کاشمیری

بست ۲۰ سالہ شیریں

پیاری !
کہاں گھومتی پھرتی ہو
ٹھہرو! سنو۔ پاس آؤ
تیرا عاشق آتا ہے
جو تیرے لیے ہولے اور زور سے
گاتا اور گنگناتا ہے

زیادہ نہ پھرو
حسین دوشیزہ !
محبوب ملتے ہی سفر
تمام ہو جاتا ہے
ہر ذی فہم بخوبی جانتا ہے
محبت کیا ہے ؟
آخرت میں نہیں، اسی زندگی میں
قہقہے خوشی کے رقصاں ہیں
کون جانے
پردۂ غیب سے کیا ظہور ہو
تاخیر میں دھرا ہی کیا ہے ؟
تو پھر آؤ
میری باہوں میں جھول جاؤ
بست سالہ شیریں !
جوانی باقی نہیں رہنے کی !

بیرونیات کا رمکوجی

شیام بادکپودی

پرچھائیوں کے شہر میں

لندن میں ہنگبگ ریستوراں ہیں۔ یہ ۱۹۷۲ء کا واقعہ ہے جب میں نیشنل گیلری میں تصویریں دیکھ رہا تھا۔ چلتے چلتے تھکاوٹ محسوس ہوئی اس وقت ایک بجا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو سامنے سینٹ مارٹن میں ایک ریستوران نظر آیا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا۔ اس وقت ریستوران میں چند آدمی تھے۔ کچھ میز پر بیٹھے تھے، کچھ کاؤنٹر پر۔ میں بھی ایک کونے میں جاکر بیٹھ گیا۔ ویٹرس آئی۔ میں نے مینو دیکھ کر کھانے کا آرڈر دیا۔ وہ "تھینک یو" کہہ کر کھانا لانے چلی گئی۔ میں نے آس پاس کی میزوں پر نظر دوڑائی تو سامنے والی میز پر ایک لڑکی نظر آئی۔ سیدھی سادی اسکرٹ میں ملبوث کسی غریب گھرانے سے لگتی تھی۔ وہ میری طرف بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں وہاں کے لیے اجنبی تھا اور میری شکل وصورت سے صاف ظاہر تھا کہ باہر سے آیا ہوں۔

میں کن انکھیوں سے دیکھنے لگا کہ اسے پتہ نہ چلے۔ اس نے کھانا ختم کرکے ویٹرس کو بل لانے کے لیے کہا۔ جب وہ بل لے کر آئی تو پیسے چکاکر اٹھ کھڑی ہوئی ....

.... وہ چلتے جاتے کچھ سوچ کر اچانک، ویٹرس کی طرف مڑی اور بولی۔ "ایک بات تو بتاؤ؟"

"یس مس؟"

"سامنے والی ٹیبل پر جو شخص بیٹھا ہے، کیا یہ انڈین ہے؟"

"پتہ نہیں۔ مگر باتوں سے کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیا یہ روزانہ یہاں آتے ہیں؟"

"نہیں تو۔"

اس کے بعد وہ بغیر اور کچھ پوچھے سینڈل کی آواز کرتی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ویٹرس کو اشارے سے بلایا۔ اور پوچھا —

"وہ کیا پوچھ رہی تھی؟"

"آپ کے بارے میں" وہ مسکرائی۔

"کیا —؟"

"یہی کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ اور کیا روزانہ آتے ہیں"

"یہ لڑکی شاید روزانہ لنچ کے لیے آتی ہوگی۔" میں نے اظہار خیال کیا۔

"بس صرف ہفتے کو لنچ کے لیے آتی ہے۔"

"کیوں صرف ہفتے کو کیوں؟"

"شاید مصروفیت ہوتی ہوگی۔ یا مالی حالت اچھی نہ ہو۔"

"کیا کام کرتی ہے؟"

"شاید کسی دوکان میں سیلز گرل ہے۔"

میرے لیے اتنا کافی تھا۔ میں نے بل چکایا اور ریستوران سے باہر نکل آیا۔

وہ لڑکی میرے ذہن سے چپک سی گئی۔ اس کا کردار بڑا پراسرار تھا۔ مجھے تجسس اس لیے ہوا کہ وہ میرے بارے میں جاننے کے لیے اس قدر پریشان کیوں تھی۔ شکل سے تو بھولی بھالی، غریب لگتی تھی۔

پیر کے روز میں سویرے ہی نکل گیا۔ سارا دن سینٹ مارٹن لین میں پھرتا رہا۔ اسٹینڈ پر بھی ڈھونڈا مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔ بعض دوکانوں میں بلا ضرورت بھی گھسا۔ اگرچہ مجھے کچھ بھی خریدنا نہ تھا۔ مگر اس کی کھوج میں زبردستی کالر کا بٹن، رومال، نکٹائی، صابن وغیرہ خریدتا رہا۔ کیوں کہ لندن کی دوکانوں میں بلا ضرورت گھسنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود وہ نہ ملی۔ آخر تھک ہار کر میں نے ہفتے کا دن چنا۔ کیوں کہ وہ اس روز ریستوران میں آتی تھی۔

سنیچر کو جب میں ریستوران میں داخل ہوا تو وہ پہلے ہی سے ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ وہ ریستوران "سبزی کے پکوان" کے لیے مشہور تھا۔

میں سیدھا اس کی ٹیبل پر چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔ میں کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

"گڈ آفٹر نون سر — کیا آپ انڈین ہیں؟ معاف کیجئے گا کیا آپ کو سبزی زیادہ پسند ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"میں نے سنا ہے کہ انڈین زیادہ تر سبزی پسند کرتے ہیں؟"

"تم انڈیا کے بارے میں اتنا کیوں پوچھتی ہو؟"

"میرا بڑا بھائی بھی انڈین فوج میں ملازم ہے۔"

"میں حقیقتاً سبزی زیادہ پسند نہیں کرتا۔ مگر کبھی کبھار کھا لیتا ہوں۔"

وہ لڑکی یہ سن کر مایوس ہوگئی۔

پتہ چلا کہ اس کے بڑے بھائی کے سوا کوئی مرد "گارجین" نہیں ہے۔ وہ یتیم ہے۔ میں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ پھر میں نے پوچھا۔ "تمہاری بھائی سے خط و کتابت نہیں ہوتی؟"

"عرصہ سے کوئی خط نہیں آیا۔ اس لیے ماں بہت پریشان ہے لوگوں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ ہندوستان سانپ، شیر اور بخار سے بھرا پڑا ہے۔ اس لیے ماں بیٹے کے لیے سخت فکرمند ہے۔ اچھا کیا واقعی انڈیا سانپ، شیر اور بخار سے بھرا پڑا ہے؟"

میں ہنسا، پھر بولا۔ "اگر ایسا ہوتا تو لوگ وہاں کیسے بستے۔" اس کے بعد لڑکی قدرے افسوس کا سانس لے کر بولی "ماں کہتی ہے کہ اگر کسی ہندوستانی سے ملاقات ہو جائے تو اس سے ہندوستان کی بابت تفصیل سے معلوم کرنا۔"

یہ کہہ کر وہ عاجزی کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اس کے دل کی بات سمجھ گیا۔ مجھے اپنے گھر میں اپنی ماں کے پاس لے جانے کی درخواست کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ میری بھی خواہش ہوئی کہ ایک بار اس کی ماں سے ملوں۔

میں نے اس لڑکی سے کہا — "میں ایک بار تمہارے گھر ہو آؤں۔ تمہاری ماں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

میری یہ درخواست سن کر خوشی کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "کیا ابھی چلئے گا؟"

"بڑے شوق سے۔ اگر آپ کے کام کا حرج نہ ہو تو۔"

"بالکل نہیں۔ دوپہر میں مجھے کوئی کام نہیں ہوتا۔" خوشی سے لڑکی کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں ریستوران سے نکلے اور راستے میں میں نے پوچھا۔

"کیا میں تمہارا نام معلوم کر سکتا ہوں؟"

"میرا نام ایلس مارگریٹ کلیفورٹ ہے۔"

میں نے مذاقاً کہا — "او ہو۔ کیا تم ہی ایلس ان ونڈر لینڈ ہو —؟"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "یہ کیا بلا ہے؟"

میں گھبرا گیا۔ میرا خیال تھا کہ ایسی کوئی انگریز لڑکی نہ ہوگی جس نے ایلس ان ونڈر لینڈ نامی کتاب کا تذکرہ نہ سنا ہو۔ میں نے کہا —

"یہ بہت ہی عمدہ کتاب ہے۔ کیا تم نے نہیں پڑھی؟"

"نہیں۔ میں نے نہیں پڑھی"

"اگر تمہاری امی نے اجازت دی تو وہ کتاب تمہیں تحفتاً دے سکتا ہوں۔"

ہم لوگ بات چیت کرتے کرتے سینٹ مارٹن چرچ کے بغل سے اسٹینڈ کراس کے نزدیک پہنچ گئے۔ اسٹینڈ سے بے شمار دو منزلہ بسیں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ کاریں بھی بھری ہوئی تھیں۔ ٹیلیگراف آفس کے نزدیک فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر میں نے کہا "آؤ۔ ہم لوگ یہاں ویسٹ منسٹر بس کا انتظار کریں۔"

لڑکی نے کہا — "پیدل چلنے میں آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں نہیں بالکل نہیں۔ لیکن تمہیں تکلیف ہوگی۔"

"نہیں میں روزانہ پیدل ہی گھر جاتی ہوں۔"

وہ کہاں کام کرتی ہے؟ اب پوچھنے کا موقع ملا تھا۔ انگریزی رواج کے مطابق یہ طریقہ موثر نہیں۔ لیکن پھر بھی آدمی پوچھتا ہے، جیسے ٹرین پر سوار ہو کر مسافر سے پوچھا جاتا ہے کہ جناب آپ کہاں جا رہے ہیں؟ یہ انداز تخاطب بھی معیوب ہے۔ البتہ "کیا بہت دور جانا ہے؟" پوچھا جانا قابل اعتراض نہیں۔ مسافر کی مرضی ہوئی تو بتا دے گا کہ میں فلاں جگہ تک جاؤں گا۔

میں نے بھی کچھ اسی طرح پوچھا۔ "کیا تم اکثر اس طرف آتی ہو؟"

"میں سول سروس اسٹور میں ٹائپسٹ کا کام کرتی ہوں —

روزانہ شام کو واپسی ہوتی ہے ۔ آج ہفتہ ہے اس لیے مجھے جلدی چھٹی ہو گئی ۔"

میں نے اس سے کہا "چلو اسٹینڈ سے نہ جا کر امبینکمنٹ سے ہی چلیں ۔ بھیڑ بھی کم ہے ۔"

اس کا ہاتھ پکڑ کر بے حد ہوشیاری سے میں نے راستہ طے کیا ۔

دریائے ٹیمز کی شمالی طرف سے امبینکمنٹ سڑک گئی تھی ۔ میں نے چلتے چلتے کہا ۔ "کیا تم برابر اسی راستے سے جایا کرتی ہو ؟"

"نہیں ۔ اس راستے میں بھیڑ کم ہے ۔ لیکن یہاں سے جو لوگ بس پر سوار ہوتے ہیں گندے ہوتے ہیں ۔ اس لیے میں اسٹینڈرڈ اور ہائیڈ پارک سے ہی گھر واپس آتی ہوں ۔

میں دل ہی دل میں اس معصوم غریب لڑکی سے ہار مان گیا ۔ میں پہلے بھی کئی بار انگریز قوم کی خودداری ظاہرداری دیکھ چکا تھا ۔ نہ جانے ہندوستان میں کتنے ہی لوگ ہیں جن کے خواب و خیال میں لندن شہر جنت کی طرح جگمگا رہا ہے ۔ دراصل ان کے سامنے زندگی کا صرف ایک رخ ہوتا ہے ۔ لندن آنے پہ ان کی آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں ۔ یہاں بھی افلاس ہے بھوک ہے ، بیماری ہے —— دراصل ہم سراب کے پیچھے بھاگتے ہیں —— اس وقت تک ہم لوگ ویسٹ منسٹر برج تک پہنچ چکے تھے ۔ میں نے کہا " میں تمھیں ایلس کہہ کر یا مس کلیفورڈ کہہ کر پکاروں ؟"

وہ مسکرائی اور بولی ۔ " میں اب تک اتنی بڑی تو نہیں ہوئی کہ میری رائے لینا مناسب ہو ۔ آپ جو مناسب سمجھیں مجھے کہہ سکتے ہیں ۔ ویسے مجھے "میگی" کہہ کر پکارتے ہیں ۔"

"کیا تم بڑی ہونے کے لیے پریشان ہو ۔"

"ہاں ۔"

"لیکن کیوں ؟"

" بڑی ہو کر میں زیادہ کام کر سکوں گی اور پیسے بھی زیادہ پا سکوں گی ۔ میری ماں بوڑھی ہو چکی ہے ۔"

" تم جو کام کرتی ہو کیا تم اس سے مطمئن نہیں ہو ؟"

" نہیں ۔ میرا موجودہ کام مشین کی طرح ہے ۔ جب کہ میں اپنی ذہنی کاوشوں کو بروئے کار لانا چاہتی ہوں ۔ جیسا کہ سکریٹری کا کام ہے ۔"

ہاؤس آف پارلیمنٹ کے نزدیک پولیس پہرہ دے رہی تھی اس کے جنوب کی طرف ویسٹ منسٹر برج پار کر کے ہم لوگ لیمبتھ میں آ گئے یہ غریبوں کی بستی تھی —— میگی بولی ۔ " اگر میں کبھی سکریٹری بن سکی تو اپنی ماں کو لے کر کہیں دور چلی جاؤں گی ۔"

غریبوں کی بستی میں سے ہم گزر رہے تھے ۔ میں نے پوچھا ۔ " تمھارا پہلا نام نظر انداز کر کے دوسرے نام سے "نک نیم" کیوں بنایا گیا ۔ ؟"

میگی نے کہا ۔ "میری ماں کا نام ایلس ہے ۔ اس لیے میرے والد میرے دوسرے نام کو مختصر کر کے بلاتے تھے ۔"

"تمھارے والد میگی کہتے تھے یا میکسی ؟"

"جب پیار سے بلاتے تھے تو میکسی —— لیکن آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں ؟"

میں نے رازدارانہ انداز میں کہا —— " ہاں ہاں —— ہم لوگ ہندوستانی ہیں نا ۔ ہم لوگ جادو ٹونا ۔ بھوت پریت اور مستقبل کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں ۔"

لڑکی نے کہا ۔ " یہ میں نے بھی سنا ہے ۔"

میں متعجب ہو کر بولا ۔ " کیا سنا ہے ؟"

" میں نے سنا ہے کہ ہندوستان میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو حیرت انگیز صلاحیت کے مالک ہیں ۔ انھیں ہم لوگ " یوگی " کہتے ہیں ۔ لیکن آپ تو یوگی نہیں ہیں ؟"

" تمھیں کیسے معلوم کہ میں یوگی نہیں "

" جو لوگ یوگی ہوتے ہیں ۔ وہ گوشت نہیں کھاتے ۔"

" او ۔ ! اسی لیے تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں سبزی پسند کرتا ہوں یا نہیں ۔"

لڑکی جواب دینے کی بجائے مسکرانے لگی ۔ آہستہ آہستہ ہم لوگ ایک چھوٹے سے کاٹیج کے قریب پہنچ گئے ۔ میگی نے جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھولا ۔ اندر داخل ہو کر بولی "آئیے ۔"

میگی نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر لیا ۔ سیڑھی کے پاس جا کر اس نے آواز دی —— " ماں تم کہاں ہو ——"

نیچے سے آواز آئی۔ "میں کچن میں ہوں میری بچی۔"

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لندن کی شاہراہیں زمین سے اونچی ہوتی ہیں۔ اور باورچی خانہ ہمیشہ سڑکوں سے نیچے ہوتا ہے ماں کی آواز سن کر میگی نے کہا — "کہیں آپ نے برا تو نہیں منایا؟"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے چلو۔"

میں سیڑھی سے لڑکی کے ساتھ باورچی خانہ میں آگیا میگی نے دروازے کے قریب جاکر کہا: "ماں ایک ہندوستانی آپ سے ملنے آیا ہے۔"

اس نے پوچھا: "کون ہے وہ؟"

میں میگی کے پیچھے پیچھے اندر پہنچ گیا۔ لڑکی نے مجھے متعارف کرایا۔ مسز کلیفورٹ نے کہا — "معاف کیجئے گا میرا ہاتھ ٹھیک نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھا کر دکھایا جس میں میدہ لگا ہوا تھا۔ اس نے کہا — "آج ہفتہ ہے اس لیے میں کیک بنا رہی ہوں۔ شام کو کوئی یہ کیک خرید لے جائے گا۔ پھر یہ رات میں راستہ میں فروخت کیا جائے گا۔ ہم لوگ اسی طرح زندگی کے دن گزارتے ہیں۔"

اس غریب بستی میں ہفتہ کی رات خوش گوار ہوا کرتی ہے۔ ہفتے کو ہر امیر اور غریب اپنی اپنی اوقات کے مطابق لطف اندوز ہوتا ہے۔

ڈریسر پر کیک تیار کرنے کا سامان میدہ، چربی، کشمش انڈا وغیرہ پڑا ہوا تھا۔ ٹین پر تازہ بنا ہوا کیک کا نمونہ رکھا تھا۔ مسز کلیفورٹ نے کہا: "غریب آدمی کے باورچی خانہ میں بیٹھنا آپ کے شایان شان نہیں — میرا کام بس ختم ہونے ہی والا ہے — بیٹی میگی تم انھیں لے جاکر کمرے میں بٹھاؤ — میں ابھی آتی ہوں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آپ تو کیک بہت اچھا بنا لیتی ہیں۔"

مسز کلیفورٹ نے ہنس کر میرا شکریہ ادا کیا۔ میگی نے کہا — "ماں ٹافی بہت عمدہ بناتی ہے۔ کیا آپ کھائیے گا۔" میگی نے ایک ڈبے سے کچھ ٹافیاں نکال کر مجھے دیں۔ میں نے کھا کر بے حد تعریف کی۔

مسز کلیفورٹ نے کیک تیار کرتے کرتے کہا "ہندوستان کیسا ملک ہے جناب؟"

"بہت ہی حسین۔"

"یہ سرزمین زندگی گذارنے کے لیے ٹھیک ہے؟"

"کیوں نہیں۔ وہاں کروڑوں لوگ شاد و آباد ہیں۔ مگر اس ملک کی طرح اتنا سرد نہیں ہے۔"

"سنا ہے کہ وہاں سانپ اور شیر افراط سے ہوتے ہیں۔ کیا یہ جنگلی جانور انسان کو نقصان نہیں پہنچاتے گا؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "ان باتوں پر ذرہ برابر بھی یقین نہ کریں سانپ، شیر جنگل میں ہوتے ہیں۔ اگر اتفاق سے بھولے بھٹکے کبھی آبادی میں آجائیں تو ان کی شامت آجاتی ہے۔"

"اور بخار؟"

"ہاں بخار ہندوستان میں کہیں کہیں بہت زیادہ ہے لیکن ہر وقت نہیں رہتا۔"

"میرا لڑکا پنجاب میں ہے۔ وہ وہاں سپاہی ہے۔ پنجاب کس جگہ ہے جناب؟"

"پنجاب بہت ہی اچھی جگہ ہے۔ وہاں بخار بہت ہی کم ہے۔ اور صحت بھی اچھی رہتی ہے۔"

مسز کلیفورٹ نے کہا۔ "یہ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔"

کیک کی تیاری کا کام ختم ہوگیا۔ انھوں نے اپنی لڑکی سے کہا: "میگی تم انھیں لے کر اوپر جاؤ۔ میں ہاتھ منھ دھو کر چائے لے کر اوپر آتی ہوں۔"

آگے آگے میگی، پیچھے پیچھے میں۔ ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ کمرے میں فرنیچر بہت کم تھا اور وہ بھی نہایت سستا میز کے پاس جو قالین بچھا تھا بہت ہی پرانا ہو چکا تھا۔ بلکہ جگہ جگہ سے پھٹ بھی گیا تھا لیکن تھا بالکل صاف۔

میگی نے پردہ اٹھایا اور کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ بک شیلف میں چند کتابیں تھیں۔ میں ان سے دل بہلانے لگا مسز کلیفورٹ چائے کا ٹرے لیے حاضر ہوئیں۔ اب ان کے جسم سے باورچی خانہ کا لباس اتر چکا تھا۔ چائے پینے کے دوران میں ہندوستان کی کہانی سنانے لگا۔

مسز کلیفورٹ نے اپنے لڑکے کا ایک فوٹو دکھایا۔ یہ تصویر

انھوں نے ہندوستان جانے سے پہلے اتاری تھی ان کے لڑکے کا نام فرانسس یا فرینک تھا۔

میگی نے تصویروں کی ایک کتاب نکالی۔ یہ اس کے بھائی نے میگی کی سالگرہ کے لیے بھیجی تھی۔ اس میں شملہ کی پہاڑیوں پر بڑی بڑی بلڈنگیں اور حسن تھا۔ اندرونی صفحہ پر لکھا تھا۔

"میگی کے لیے اس کی سالگرہ پر اس کے پیارے بھائی فرینک کی طرف سے۔"

مسز کلیفورٹ نے کہا۔ "میگی وہ جو انگوٹھی تھی انھیں دکھاؤ نا۔"

میں نے کہا: "کیا تمھارے بھائی نے بھیجی ہے؟ کہاں ہے وہ انگوٹھی؟ ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔"

میگی نے کہا — "وہ ایک جادو کی انگوٹھی ہے۔ ایک یوگی نے وہ انگوٹھی فرینک کو دی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے وہ انگوٹھی نکالی اور مجھ سے پوچھا۔ "کیا آپ اس سے ماضی اور مستقبل کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟"

انگوٹھی میں ایک پتھر لگا ہوا تھا۔ میں ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھنے لگا۔

مسز کلیفورٹ نے کہا — "جب فرینک نے اسے بھیجا تھا تو اس وقت لکھا تھا۔ اس پتھر میں بغور دیکھ کر اس آدمی کے بارے میں سوچنے سے سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ یوگی نے فرانک کو یہی بات بتائی تھی۔ عرصے سے فرینک کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اس لیے میں نے اور میگی نے بہت غور سے اس کی پتھر کی طرف دیکھا۔ مگر کوئی فایدہ نہیں ہوا۔ آپ ایک بار ذرا دیکھئے تو؟ آپ ہندوستانی ہیں۔ شاید کامیاب ہو جائیں۔"

میں نے دیکھا کہ ضعیف الاعتقادی صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیتل کی ایک حقیر سی انگوٹھی تھی اس کے درمیان معمولی سا شیشہ لگا ہوا تھا۔ لیکن یہ بات اس کی ماں اور بہن کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ ان کا اعتقاد تھا کہ فرینک نے بہت دور خوابوں کی سرزمین سے ایک عجیب و غریب چیز بھیجی ہے۔ میں بھلا ان کے اعتقاد کو ٹھیس کیسے پہنچا سکتا تھا۔

مسز کلیفورٹ اور میگی کی بے تابی دیکھ کر میں نے وہ انگوٹھی ہاتھ میں لے لی۔ کانچ کی طرف بہت غور سے دیکھنے لگا۔ آخرکار میں نے کہا — "مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

ماں بیٹی دونوں کو بے حد دکھ ہوا۔ اس کے بعد میں نے باتوں کا رخ موڑنے کے لیے کہا: "وہ جو وائلن ہے۔ کیا تمھارا ہے میگی؟"

مسز کلیفورٹ نے کہا: "میگی بہت عمدہ بجاتی ہے کوئی اچھی سی دھن بجا کر سنا دو نا میگی۔"

میگی نے بظاہر خفگی سے کہا — "او نہیں ماں۔"

میں نے کہا — "میگی ذرا بجاؤ نا مجھے وائلن بے حد پسند ہے۔ میرے ملک میں میری بھی ایک بہن ہے۔ وہ بھی تمھاری جتنی ہوگی۔ وہ بھی مجھے وائلن بجا کر سناتی تھی۔"

میگی نے کہا — "میں بالکل اناڑی ہوں۔ ذرا بھی اچھا نہیں بجاتی۔"

آخرکار میرے بار بار اصرار پر وہ بجانے کے لیے تیار ہو گئی اس نے کہا: "میں اب تک ماہر نہیں ہوئی ہوں۔"

"کیا میں فرمائش کر سکتا ہوں — تب تم اپنا میوزک کیس لیتی آؤ — کیا ہے اس میں — مجھے دیکھنے دو۔"

میگی نے ایک کالے پرانے چمڑے کا بہت پرانا میوزک کیس کھول کر مجھے دیا۔ اور وہ وائلن پر دھن سنانے لگی۔ ساز ختم ہونے کے بعد میں نے میگی کا شکریہ ادا کیا۔ مسز کلیفورٹ نے کہا: "میگی کو اچھی تربیت نہیں ملی۔ جو کچھ بھی سیکھا ہے اپنی مرضی اور لگن سے۔ اگر کبھی ہمارے دن پھرے تو میں اس کا یہ شوق ضرور پورا کروں گی۔"

"آپ نے کبھی اوپیرا دیکھا ہے؟" میگی نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے نہیں دیکھا۔"

مسز کلیفورٹ نے کہا — "تم کسی روز آنا پھر تمھارے ساتھ تھیٹر دیکھنے جائیں گے ان دنوں وہاں "مرچنٹ آف وینس" ہو رہا ہے۔"

شام ہو چکی تھی۔ میں ان سے رخصت ہوا۔ سوموار کو میں "لائی سی" گیا۔ بکنگ آفس سے دریافت کیا۔ آئندہ ہفتے کے میٹنی شو سے اپر سرکل کے تین ٹکٹ مانگے۔

"نہیں جناب! آئندہ دو ہفتوں تک کے ٹکٹ بک ہو چکے ہیں۔"

"تیسرے ہفتے کا؟"

"ہاں ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک چارٹ نکالا۔ اوپر سرکل کی بہت سی سیٹیں بک ہو چکی تھیں۔ میں بارہ شلنگ میں تین ٹکٹیں لیکر چلا آیا۔

تین مہینے گزر گئے۔ اس درمیان میں میگی کے ہمراہ کئی بار اس کی والدہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ اسی اثناء میں ایک دن میگی کے ساتھ چڑیا گھر بھی گیا۔ وہاں انڈین رانبہ نامی ہاتھی پر میگی نے دوسرے لڑکوں کے ساتھ سواری بھی کی۔ اس وقت تک اسے بھائی کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ مسز کلیفورڈ کی درخواست پر ایک دن انڈیا آفس میں جا کر خبر لی۔ فرینک کا رجمنٹ محاذ پر مصروف کار تھا۔ یہ سنکر مسز کلیفورڈ قدرے پریشان ہوئی۔

ایک صبح میگی کا ارسال کردہ پوسٹ کارڈ ملا۔ لکھا تھا...

"میری ماں سخت بیمار ہے۔ ایک ہفتہ سے کام پر بھی نہ جا سکی۔ اگر آپ ایک بار ہمارے گھر آنے کی تکلیف گوارہ کریں تو مہربانی ہوگی۔"

میں جس فیملی کے ساتھ رہتا تھا ان لوگوں کو میگی اور اس کی والدہ کے بارے میں بتا چکا تھا۔ آج ناشتہ کی میز پر میں نے اس کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

مادام نے کہا "جب تم ان لوگوں کے پاس جانے لگو کچھ رقم ساتھ رکھ لینا۔ وہ لڑکی ایک ہفتے سے کام پر نہیں گئی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ اسے تنخواہ نہیں ملی ہوگی۔ اور شاید وہ لوگ تنگدستی میں زندگی گذار رہے ہوں۔"

ناشتے کے بعد کچھ رقم جیب میں رکھی اور ریل بیٹھ روانہ ہوا۔ مکان پر پہنچتے ہی دروازہ کھٹکھٹایا۔ میگی نے فوراً دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر یوسی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھیں دھنس گئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولی "ماں سخت بیمار ہے۔ ابھی ابھی سوئی ہے۔ فرینک کی خیریت کی اطلاع نہ ملنے کی وجہ سے فکر اور تردد بڑھ گیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے اسی لیے بیماری زیادہ بڑھ گئی ہے۔ شاید وہ نہ بچ سکے۔"

میں نے میگی کو دلاسا دیا۔ اپنے رومال سے اس کے آنسو خشک کیے۔ میگی نے گھٹ گھٹ کر کہا "میں آپ سے ایک گزارش کرتی ہوں۔"

"کیا ہے میگی؟"

"پہلے ڈرائنگ روم میں بیٹھیے پھر کہوں گی۔" قدموں کی چاپ سے کہیں ماں کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اس لیے ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

میں نے پیار سے پوچھا۔ "کیا ہے میگی؟"

میگی نے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ میں نے انتظار کیا کہ وہ کچھ کہے۔ کچھ کہنے کے لیے اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں گھبرا گیا۔ اس لڑکی کو کیسے تسلی دوں؟ اس کا بھائی محاذ پر تھا خدا معلوم وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ دنیا میں ماں کے سوا اس کا کوئی سہارا نہ تھا۔ اس کے بعد اس کا کیا بنے گا؟ یہ جوان لڑکی لندن شہر میں اکیلی کیسے رہے گی۔

میں نے اس کے چہرے پر سے اس کا ہاتھ ہٹایا اور کہا "میگی! اگر میرے لیے کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف کہو۔"

"میں آپ سے جو درخواست کروں گی پتہ نہیں آپ اس کا کیا مطلب نکالیں۔ اس لیے کچھ کہنے سے پہلے عرض کر دوں کہ اگر کوئی گستاخی ہو تو معاف فرمائیں۔"

"جو کچھ کہنا چاہتی ہو بے فکر کہو۔"

"کل میری ماں کہہ رہی تھی کہ اگر آپ اس پتھر کی طرف دھیان سے دیکھیں تو میرے بھائی کے متعلق بتا سکتے ہیں۔ اس لیے میں نے آپکو آنے کے لیے لکھا تھا۔"

"تم وہ انگوٹھی لے آؤ۔ میں دوبارہ دیکھنے کی کوشش کروں گا۔"

"لیکن اس کے بعد بھی ناکامی نے منہ چڑایا تو؟"

میں میگی کے دل کی بات سمجھ گیا اس لیے خاموش رہا۔ میں نے سوچا کہ میں کوئی درویش نہیں ہوں۔ اس زندگی میں بہت سے پاپ کیے ہیں۔ آج اگر ایک پاپ اور کرنا پڑا تو میرا یہ گناہ سب سے کم اور چھوٹا ہوگا۔

میں نے میگی سے کہا: "خدا را اب چپ ہو جاؤ۔ اور وہ انگوٹھی لاؤ تاکہ میں بغور دیکھ سکوں۔ میں وہی کروں گا جیسا کہ تم کہہ رہی ہو۔ اس سلسلے میں اگر مجھ سے کوئی خطا ہو جائے تو معاف کر دینا۔"

میگی نے وہ انگوٹھی لا کر دی۔ میں نے وہ انگوٹھی ہاتھ میں لے کر کہا: "ذرا جا کر دیکھو کہ تمھاری ماں سو رہی ہے یا بیدار ہے۔"

تقریباً پندرہ منٹ بعد میگی واپس آئی۔ اور بولی — "ماں جاگ چکی ہے۔ اور میں نے آپ کے آنے کی اطلاع بھی دیدی ہے۔"

"کیا میں انھیں دیکھ سکتا ہوں"

"آیئے"

میں بیمار بڑھیا کے بستر کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میرے ہاتھ میں وہی انگوٹھی تھی — انہیں گڈ مارننگ کہا: "مسز کلیفورڈ آپ کا لڑکا زندہ اور سلامت ہے۔"

یہ سنتے ہی بڑھیا نے اپنا سر تکیے سے ذرا اٹھایا اور بولی: "کیا آپ نے اس انگوٹھی کے پتھر میں دیکھا ہے؟"

"جی ہاں میں نے اسی میں دیکھا ہے۔"

یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے اور وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی! "تم پر خدا کی رحمت ہو۔" مسز کلیفورڈ کچھ ہی دن بعد صحت یاب ہو گئیں!

میرا وطن واپس جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ خواہش ہوئی کہ جا کر میگی اور اس کی ماں سے مل آؤں۔ اب ان دونوں کا کوئی بھی پرسان حال نہ تھا۔ فرینک جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ تقریباً ایک ماہ قبل میگی نے بذریعہ خط یہ افسوسناک خبر مجھ تک پہنچائی تھی۔ میں نے حساب لگا کر دیکھا جس وقت میں نے کلیفورڈ سے کہا تھا کہ آپ کا لڑکا زندہ اور سلامت ہے اس سے پہلے ہی وہ ملک عدم کو جا چکا تھا۔ اس لیے میں مسز کلیفورڈ سے ملنے سے کترا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے بذریعہ خط میگی اور اس کی ماں کو اپنی روانگی کی اطلاع دیدی۔

رفتہ رفتہ لندن کی الوداعی رات بھی گزر گئی۔ میں آج اپنے وطن جا رہا تھا۔ صبح ناشتہ کی میز پر بیٹھا ہی کہ اچانک صدر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ چند منٹ بعد نوکرانی نے آ کر اطلاع دی کہ مس کلیفورڈ آپ سے ملنے آئی ہے۔

اس وقت تک میں نے ناشتہ ختم نہیں کیا تھا۔ سمجھ گیا کہ میگی آخری بار الوداع کہنے آئی ہے۔ اسے ڈیوٹی پہ جانے میں دیر نہ ہو جائے۔ اس لیے میں مادام سے اجازت لے کر ہال میں آ گیا۔ دیکھا کہ میگی کالا کپڑا پہنے کھڑی تھی۔ قریب ہی فیملی لائبریری تھی، میگی کو لے کر وہاں گیا اور بٹھایا۔

"کیا آپ آج چلے جائیں گے؟" میگی نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں آج ہی چلا جاؤں گا۔"

"اپنے وطن پہنچنے میں آپ کو کتنے دن لگیں گے۔ اور آپ کا قیام کہاں رہے گا؟"

"میں پنجاب سول سروس میں ہوں۔ مجھے کہاں تعینات کیا جائے گا ابھی معلوم نہیں۔"

"وہاں سے فرنٹیر کتنی دور ہے؟"

"کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔"

"ڈیرہ غازی خان کے نزدیک فورٹ منرو میں فرینک کی قبر ہے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔

"میرا جانا سب اس طرف ہوا تو آپ کے بھائی کی قبر پر ضرور جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"آپ کو تکلیف تو نہ ہوگی؟"

"تکلیف کیسی؟ وہاں سے ڈیرہ غازی خان تو زیادہ دور نہیں ہے۔ میں وہاں جا کر ایک بار انھیں ضرور خود دیکھوں گا۔"

میگی کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اس کا گلا رندھ سا گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک شلنگ نکال کر میز پر رکھا اور کہا: "براہ مہربانی ایک شلنگ کا پھول خرید کر میرے بھائی کی قبر پر چڑھا دیں۔"

اس رقت آمیز جملے سے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ سوچا کہ محنت و مشقت سے حاصل کیا ہوا ایک شلنگ واپس کر دوں اور کم از کم یہ بتا دوں کہ ہمارے ملک میں پھولوں کی اتنی بہتات ہے کہ بغیر پیسے کے بھی مل جاتے ہیں۔ پھر سوچا کہ اس لڑکی میں قربانی اور محبت کا جو جذبہ ہے اسے اس سے کیوں محروم کر دوں۔ محنت سے کمائے ہوئے اس شلنگ سے جو سکون اور فرحت محسوس کرے گی وہ انمول ہے۔ کم از کم اس سے اس کی روح پرسکون ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر میں نے شلنگ لے لیا۔

"میگی! میں اس شلنگ سے پھول خرید کر (باقی صفحہ ۲۶ پر دیکھیے)

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

نیا سال بھی اردو دنیا کے لیے کچھ زیادہ سازگار ثابت نہیں ہوا اور پچھلے دو تین سال سے موت کی گرم بازاری کا جو سلسلہ جاری ہے اس نے کچھ اور اہم شخصیتیں ہم سے چھین لیں۔ ۱۶ جنوری کو لاہور میں مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی کا انتقال ہوا۔ وہ ہمارے دور میں مغل آرٹ کے سب سے بڑے نمائندے تھے۔ انھوں نے غالب اور اقبال کے کلام کی روح کو اپنی تصویروں میں پیش کرکے اردو ادب کی تاریخ میں بھی ہمیشہ کے لیے اپنی جگہ بنالی ہے۔

جنوری ہی کی ۲۷ تاریخ کو بزرگ صحافی سردار دیوان سنگھ مفتون کا دہلی میں انتقال ہوا۔ جیسا کہ گذشتہ شمارے میں ان کے انتقال پر تعزیتی نوٹ لکھتے ہوئے کہا گیا تھا مفتون نے اردو صحافت کی جو خدمات انجام دیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

۸ فروری کی رات کو الہ آباد میں پروفیسر مسیح الزماں حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے۔ عام اخباری اطلاعات کے مطابق انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۴ سال تھی۔ لیکن ان کے رفیق کار ڈاکٹر سید محمد عقیل نے ان اطلاعات کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی عمر ۵۳ سال تھی۔ بہرکیف ابھی ان کے مرنے کے دن نہ تھے۔ اردو ڈراما اور مرثیے پر انھوں نے بہت اہم کام کیا ہے وہ بزرگ محقق اور ناقد پروفیسر مسعود حسن رضوی کے داماد اور پروفیسر اعجاز حسین کے لائق شاگرد تھے۔ ابھی ان کی ذات سے اردو تحقیق و تنقید کی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔

۱۵ فروری کی شام کو حیدر آباد میں حضرت حیرت بدایونی کی وفات ہوئی۔ وہ بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے اور اپنے خوردوں سے بھی بہت جلد بے تکلف ہو جایا کرتے تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی فکر سخن کرتے تھے۔ اردو کا کچھ کلام "آئینہ" کے نام سے اور فارسی کلام "ابریق" کے نام سے چھپ چکا ہے ان کی عمر چوراسی سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کے پسماندگان میں اردو کی مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو کا نام بھی ہے جو ان کی صاحبزادی ہیں۔

۲۲ فروری کو پروفیسر ڈاکٹر سید اعجاز حسین ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے۔ وہ ایک اچھے استاد اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی مرتب کردہ "مختصر تاریخ ادب اردو" کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ آج بھی اردو کی نصابی کتابوں میں شامل ہے۔

۱۹ مارچ کو صبح ساڑھے سات بجے ارون ہاسپٹل نئی دہلی میں دماغ کی رگ پھٹ جانے سے حضرت شمیم کرہانی کی موت واقع ہو گئی۔ شمیم صاحب ۱۸ مارچ کی شام کو ایک مقامی مشاعرے میں شرکت کے لیے پہنچے تو پوری طرح ہشاش بشاش تھے اور احباب سے خوش گپیاں کر رہے تھے کہ اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی انھیں فوراً ہی ہاسپٹل لے جایا گیا جہاں اگلی صبح وہ وفات پا گئے۔

شمیم صاحب ہردلعزیز شاعروں میں تھے مشاعروں میں ان کا کلام ذوق و شوق سے سنا جاتا تھا اور ناقدین بھی ان کے کلام کو وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہیں غزلوں کا الگ مجموعہ "حرف نیم شب" کے نام سے کچھ عرصہ پہلے ہی شائع ہوا تھا مرحومین کے غم میں پوری اردو دنیا کے ساتھ ہم ان کے ساتھ شریک ہیں۔

Regd. No. D. (D) 118 Phone 271649 APRIL 1975

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 846/57

TAHREEK

[illegible]

مندرجات

سرورق: کمار پاشی

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریر دہلی

جلد ۲۳ شمارہ ۲

مئی ۱۹۷۵ء

ادارۂ تحریر

گوپال متل

مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: دس روپے فی کاپی: ایک روپیہ

غیر ممالک سے

سالانہ: تیس شلنگ فی کاپی: تین شلنگ

پرنٹر، پبلیشر اور پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس دہلی

مقامِ اشاعت:

۹۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی

گوپال متل

کہاں جا رہا ہے تو اے جانے والے ـــــ ؟

گیا ہیں ۶ر مئی سے ۹ر مئی تک ترقی پسندوں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ جس کا مینی فیسٹو ۱۶ر اپریل کے "پیٹریاٹ" میں شائع ہوا ہے۔ حسب دستور اس میں ادبی معاملات کا ذکر برائے نام ہے۔ اس کے برعکس اس میں سامراج، سرمایہ داری اور رجعت پسندی کے خلاف جہاد کا ذکر ہے، سوشلزم کی کامیابیوں کا ذکر ہے، چلی میں سامراج کی سازش کا ذکر ہے اور ایک درجن ملکوں میں سوشلزم کے استحکام کا بھی۔ لیکن اسے پڑھ کر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان تمام معاملات میں ادیب اپنے فریضے کی ادائیگی کس طور پر کریں گے؟

کسی وقت سوویٹ روس کا تابع مہمل بن جانا ترقی پسندی کی علامت تھی۔ یہ کام بڑا آسان تھا۔ سوویٹ حکمرانوں کے بیانات کو سامنے رکھ کر مجرمانہ قسم کا ادب تیار کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب چین بھی روس کا سیاسی مدمقابل ہے اور اس حد تک ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے امریکہ سے زیادہ روس کو تشویش ہے۔ ترقی پسندی کے دعوے دار ادیب اب کس کی اطاعت کریں گے؟ روس کی یا چین کی؟

ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی بنیاد ظن یا قیاس پر نہیں۔ ترقی پسند من حیث مجموعی سی۔ پی۔ آئی۔ کے وفادار تھے۔ لیکن اب ہندوستان کے سیاسی اسٹیج پر سی۔ پی۔ آئی۔ کمیونزم کی اجارہ دار نہیں۔ اس کے مقابلے میں سی۔ پی۔ آئی۔ ایم۔ بھی ہے اور نکسل وادی بھی۔ سی۔ پی۔ آئی کو سی۔ پی۔ آئی۔ ایم اور نکسل وادی دونوں ہی رجعت پسند سمجھتے ہیں۔ اور نکسل وادی باقی دونوں پارٹیوں کو سرمایہ داری کا ایجنٹ۔ اس لیے یہ سوال واقعی اٹھتا ہے کہ اب ترقی پسند اپنی وفاداری کا محور ان میں سے کس پارٹی کو قرار دیں گے؟

پس نوشت: یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ "شاعر" کے تازہ شمارے میں راجندر سنگھ بیدی کا مندرجہ ذیل بیان نظر پڑا جو اس کا بین ثبوت ہے کہ کمیونسٹ پارٹی ادیبوں کو حلیف کی بجائے اپنا تابع مہمل ہی سمجھتی رہی ہے:-

> ... پھر ہم آہستہ آہستہ دیکھنے لگے کہ اس میں کچھ جانب داریاں ہونے لگی ہیں۔ یعنی جانب داری میں جانب داری۔ ہم اپنے آپ کو جانب دار تو سمجھتے تھے۔ لیکن جانب داروں میں جانب دار پیدا ہو گئے۔ ہم نے دیکھا کہ ہم میں سے دو ممتاز ادیب اٹھ کر جاتے ہیں، کانوں میں کھسر پھسر کرتے ہیں اور اگلے دن ایک نیا ریزولیشن ہمارے سامنے آ جاتا ہے اور ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس پر دستخط کیجیے ـــ ہم جس حد تک مانتے تھے اس حد تک دستخط کر دیتے تھے۔ لیکن بیچ میں سوچتے تھے کہ آخر ہم سے کیوں نہیں پوچھا جاتا؟ ہم ان کے ساتھی ہیں، ہم مشرب ہیں اور اسی عقیدے کے حامل ہیں جس کے یہ ہیں۔ پھر ہم سے کیوں نہیں پوچھا جاتا؟ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس تحریک کا تعلق سیاسی جماعت سے ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ہم سے کہا گیا کہ سیل میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ آپ کو پارٹی کا ٹکٹ دیا جائے ــ ●●

ستیہ پرکاش

سوویٹ بلاک میں عورتوں کا درجہ

اقوام متحدہ کی تنظیم نے ۱۹۷۵ء کو عورتوں کا بین الاقوامی سال قرار دیا تھا۔ اور اس سلسلے میں اکتوبر میں مشرقی برلن میں ایک عالمی کانگریس ہوگی۔ ۲۲ جنوری کو مشرقی جرمنی کی وزرا کونسل کے اوّل ڈپٹی چیئرمین مسٹر الفریڈ نیومان نے ایک پریس کانفرنس میں عورتوں کے بین الاقوامی سال کے مقاصد کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ "جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک میں عورتوں کے قدیم مسائل ایک مدت ہوئی حل کیے جاچکے ہیں۔"

اگرچہ کمیونسٹ ملکوں کے ترجمان مجموعی طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عورتوں سے متعلق سماجی مسائل اب بھی موجود ہیں۔ لیکن وہ اس بات پر مصر ہیں کہ جہاں تک عورتوں کے سماجی درجے اور سماجی اور سیاسی حقوق کا تعلق ہے۔ سوشلسٹ نظام کی بدولت یہ حل کیے جاچکے ہیں۔ بالعموم وہ بلغاریا کی کمیونسٹ پارٹی کے پلیٹ بیورو کی مارچ ۱۹۷۳ء کی تقریر کو دہراتے رہتے ہیں:

"عورتوں کی سماجی آزادی اور ایسا ماحول پیدا کرنا جس میں عورتیں انسانی سرگرمی کے ہر شعبے میں ایک نمایاں رکن کی حیثیت شریک ہوسکیں اور ان کی شخصیت کی پوری نشو و نما ہوسکے سوشلسٹ انقلاب کی عظیم ترین کامیابی ہے۔"

اپنے اس دعوے کی حمایت میں وہ یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ صنعت اور دوسرے شعبوں میں جہاں پہلے مردوں کی اجارہ داری ہوا کرتی تھی وہاں اب عورتوں کی بہت بڑی تعداد کام کرتی ہے۔ سوویٹ یونین اور مشرقی جرمنی میں مزدوروں کی مجموعی تعداد میں ۵۰ فیصدی عورتیں ہیں۔ پولینڈ، ہنگری، رومانیہ اور بلغاریہ میں مزدور عورتوں کا تناسب ۴۰ سے ۵۰ فیصدی تک ہے۔ اور چیکوسلواکیہ میں ۴۸ فیصدی۔ رومانیہ میں صنعتی مزدوروں میں ۳۲ فیصدی اور زرعی مزدوروں میں ۵۹ فیصدی اور صحت اور سماجی امور کے شعبوں میں ۶۲ فیصدی عورتیں ہیں۔

بظاہر یہ اعداد و شمار بہت متاثر کن ہیں لیکن ان اعداد و شمار سے اس کی نشاندہی نہیں ہوتی کہ صنعتوں میں عورتوں کا درجہ کیا ہے، وہ کس قسم کے کام کرتی ہیں اور انھیں کتنے گھنٹے کام کرنا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ سے کہ تعلیم اور ایسے دوسرے شعبوں مثلاً طب میں عورتیں بہت بڑی حد تک دخیل ہوگئی ہیں۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مردوں کے رویے میں بنیادی تبدیلی آگئی ہے۔

جیسا کہ وارسا کے ایک اخبار پولیٹیکا نے اپنی ۲۴ مئی ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا، "بعض پیشوں میں عورتوں کا ضرورت سے زیادہ نفوذ خطرناک عامل ہے۔ ہر شعبے میں جن میں وہ شعبے بھی شامل ہیں جہاں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا تناسب زیادہ ہے۔ جتنی اونچی پیشہ ورانہ، بیوروکریٹک یا سیاسی سطح پر آپ نظر ڈالیں گے آپ کو عورتوں کی تعداد بتدریج گھٹتی ہی نظر آئے گی۔"

کمیونسٹ ممالک میں یہ شکایت زیادہ سے زیادہ ہوتی جارہی ہے کہ اپنے اہم اقتصادی رول کے باوجود عورتوں کو ذمہ دارانہ عہدوں تک رسائی سے محروم رکھا جاتا ہے۔ عورتوں کی ملازمت کے اعداد و شمار کے ساتھ اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انتظامیوں اور سیاسی زندگی میں ان کا دخل اب بھی برائے نام ہے۔ جہاں تک سماجی درجے اور سماجی رویوں میں تبدیلی کا تعلق ہے، دوسری بات زیادہ اہم ہے۔ پولش اخبار "ٹرمبونا لوڈو" نے اپنے ۱۵ مارچ ۱۹۷۳ء کے شمارے میں تسلیم کیا ہے کہ "اگر عورتوں کی بڑھتی ہوئی استعداد کو نظر میں رکھا جائے تو کارخانوں میں ذمہ دارانہ عہدوں تک ان کی رسائی کی رفتار کافی سست ہے۔" واقعہ یہ ہے کہ کمیونسٹ دور حکومت میں پولینڈ میں کوئی عورت وزیر نہیں بنی۔ اور نائب وزیروں میں

بھی عورتوں کی تعداد برائے نام ہے۔ بخارسٹ سے شائع ہونے والے جریدے "اقتصادی مسائل" نے اپنی اپریل ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ انتظامی کونسلوں میں عورتوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ڈیڑھ سو درک ٹیموں میں صرف تین ٹیمیں ایسی تھیں جن کی سربراہ عورتیں تھیں۔ فروری ۱۹۷۴ء میں چیک عورتوں کی یونین کی کانگرس میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم کو رنا ک نے کہا کہ چند ہی عورتیں ڈائرکٹر یا ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں اور ایسے کارخانوں میں بھی جہاں کام کرنے والوں میں ۸۰ فیصدی عورتیں ہیں ذمہ دار عہدے بالعموم مردوں کے ہاتھ میں ہیں۔

۱۹۷۴ء میں ہنگری کی نیشنل کانگرس آف ٹریڈ یونینز نے ایک سروے شائع کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ کپڑے کی صنعت میں بھی جہاں کام کرنے والوں میں قریب قریب عورتیں ہی عورتیں ہیں، ۲۴ کارخانوں میں صرف دو کارخانے ایسے تھے جن کی منیجر عورتیں تھیں۔

عورتوں کے عہدے مردوں کے مقابلے میں چوں کہ کم اہم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی اوسط آمدنی بھی مردوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن اس دعوے کے باوجود کہ مساوی کام کے لیے مساوی اجرت ملے گی۔ آمدنیوں کا سارا فرق صرف عہدوں کے فرق کی وجہ سے نہیں۔ ہنگری کے اعداد و شمار کے مرکزی دفتر کے سروے کے مطابق جس کی رپورٹ ۲۷ نومبر ۱۹۷۴ء کو شائع ہوئی۔ خواتین گریجویٹوں کی آمدنی ۱۹۷۱ء میں مساوی استعداد رکھنے والے مردوں کے مقابلے میں ۲۲ فی صدی کم تھی اور انٹرمیڈیٹ تک تعلیم اور تربیت حاصل کرنے والی عورتوں کی آمدنی مردوں کے مقابلے میں ۲۹ فیصدی کم تھی آمدنیوں کے فرق کی ذمہ داری مدت ملازمت، صلاحیت کے فرق اور ذمہ داری کی سطح پر صرف ۵۰ فی صدی تھی۔ باقی فرق کا باعث تعصبات اور صنفی امتیاز تھا۔

عورتوں کو معاشی شعبوں میں جو کمتر درجہ دیا جاتا ہے اس کا باعث یہ ہے کہ سوویٹ بلاک میں قدیم تعصبات بدستور کارفرما ہیں اور خود عورتیں بھی ان کا شکار ہیں۔ نوجوان عورتوں کی بیشتر تعداد جن میں سے اکثر صاحبِ اولاد بھی ہوتی ہیں۔ کمتر آمدنی والے کام کرتی ہے، اور ان کے حصول ملازمت کا باعث کام سے دل چسپی کے مقابلے میں ضرورت سے زیادہ ہے۔

سوویٹ لیبر کوڈ، جو مشرقی یورپ کے ملکوں میں کم و بیش اسی طرح رائج ہے، یہ اصول مقرر کرتی ہے کہ عورتوں سے کتنے گھنٹے کام لیا جانا چاہیے اور یہ کہ ان سے کس قسم کے کام لیے جا سکتے ہیں؟ لیکن یہ ضابطہ بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ایسے شواہد موجود ہیں کہ ایک ہی صنعت میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے سپرد جو کام ہیں وہ دشوار تر ہیں۔ سوویٹ یونین میں تعمیراتی صنعت کے کارکنوں میں عورتوں کی تعداد تقریباً [illegible] فیصدی ہے۔ حادثوں اور بیماری کا شکار وہ نسبتاً زیادہ ہیں کئی صنعتوں میں عورتوں کو رات کے وقت کام کرنا ہوتا ہے اور ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مقررہ اوقات سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ پولینڈ کے ریڈیو ناگو را سٹیشن نے ۲ نومبر ۱۹۷۳ء کو ایک نشریے میں کہا تھا کہ پھلوں اور سبزیوں کے گودام میں عورتوں کو جن کی تعداد کارکنوں میں ۸۰ فی صد ہے، ہر دو گھنٹے میں آلوؤں کی بیس بوریاں اٹھانی پڑتی ہیں جن میں سے ہر بوری کا وزن پچاس کیلو ہوتا ہے۔ ایک عورت کا دعویٰ تھا کہ اس نے گذشتہ مہینے میں کام کے مقررہ اوقات سے دو سو پچاس گھنٹے زیادہ کام کیا۔ اگست ۱۹۷۴ء میں ہنگری کے اخبار "نیپزا بادساگ" میں ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کمتر صلاحیت کی وجہ سے عورتوں کو بھاری صنعتوں میں بالعموم ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جو زیادہ محنت کے طلب گار ہوتے ہیں اور جنھیں بجا طور پر تھکا دینے والے اور اعصاب شکن کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۲ء کے ایک سروے کے مطابق ہنگری کی ۳۸ فیصدی عورتیں ایسے کام کر رہی تھیں جو بے حد مشقت چاہتے تھے اور کام کا ماحول بھی ناخوش گوار تھا نتیجے کے طور پر ان میں سے ایک تہائی کو وقت سے پہلے ہی ملازمت سے الگ ہونا پڑتا تھا۔ اپاہجی کی پنشن پانے والوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد دگنی تھی۔

مشرقی یورپ کے بعض ملکوں میں (باقی ص ۴۰ پر)

کرشن موہن

آنند

حقیقت میں آنند ہی وشو کی کامنا ہے
کہ آنند زمان کی ابتدا ہے
اور آنند ہی انتہا ہے
برہمن کہ ہے روحِ کُل، ایکتا ہے
یہ اشکالِ دنیا ہیں زنجیرِ رنگ و نمائش کے حلقے
(یہ زنجیر تصویرِ نشو و نما ہے)
برہمن ہے آنند، آنند ہی اس کا سانس انا ہے
نمک جیسے پانی میں گھل مل گیا ہے
اسی طرح موجود کی آتما ہے
ابھرتی ہے لے جس طرح بانسری سے
نکلتے ہیں جس طرح مکڑی سے جالے
اگن سے برآمد ہیں جیسے شرارے
مظاہر نکلتے ہیں یوں آتما سے
جو اک رشتۂ استوا پر ٹکا ہے
وجود اک نمود و شہود و خلا ہے
بدلتا ہے یہ روپ آنند اس کا
برہمن کا آنند اس کی رضا ہے

کمار پاشی

دعا دیتے چلو

دعا دیتے چلو ان کو
جنھیں جینا نہیں آتا
جو شب بھر شہر کی سڑکوں پہ آدم خور گھوڑوں کی طرح سے ہنہناتے ہیں

دعا دیتے چلو ان کو
ہمارے شہر میں جو بچے ہیں جن کی بے لباسی کے
جلانے آپ سے مل کر کبھی شاید خوش نہیں ہوتے
وہ جن کے قد بہت چھوٹے نظر آتے ہیں دنیا کو
جو اپنے پیٹ کے بل رینگ کر چلنے میں شاید عافیت اپنی سمجھتے ہیں

دعا دیتے چلو ان کو
کہ جن کے غم بڑے، خوشیاں ہیں چھوٹی سی
کہ جو بکھرے ہوئے ہیں اپنے افسانوں کی صورت جسم کی سنسان بستی میں

دعا دیتے چلو ایسا کبھی دن آئے
ازل سے منتشر بدبخت روحوں کو کوئی آکر سمیٹے اور ان کو شکل دے کوئی
تو شاید آئنہ ہم کو ہمارا گم شدہ چہرہ کبھی لوٹا دے
دعا دیتے چلیں آؤ

احمد وصی

بتائے کوئی

ان ازل اور ابد کے جھمیلوں سے گر
بچ نکلنے کی صورت بتائے کوئی
تو میں مانوں اسے
تو میں جانوں اسے
کیوں کہ لاکھوں ہزاروں یگوں سے یونہی
لوگ اس واہمہ میں گرفتار ہیں
لاکھ بیراگ لو
لاکھ سنیاس لو
زندگی جن اصولوں سے نکھر گئی
ان سے بچ کر نکلنا تماشا نہیں
ہر صنم
ہر خدا کا یہ اصرار ہے
میرے آگے جھکو
مجھ کو سجدہ کرو
کون کس کس کے آگے جھکائے جبیں
کس کو پوجے کوئی کس کو مانے کوئی
کیوں کہ ہر ذہن میں ایک سنسار ہے
اور اس ایک سنسار کے واسطے
کیا فقط ایک بھگوان کافی نہیں ؟

انوار رضوی

تشکیک

اندھیرا اجالا
مقاماتِ امکاں
کوئی ہے ؟
بہت دور تک کچھ نہیں ہے
بڑھو ——
ملاؤ شنی کے حرم کو کھنگالو
کرن ٹوٹ کر کھو گئی ہے
خدا ——
ہے ؟ نہیں ہے ؟؟
اندھیرے میں سیٹی !
اندھیرے میں سیٹی !!

بہار کا گیت

بھنور میں رقصاں گلابی پودے
فلک کو دیکھو
انار دانوں کا ذائقہ لو
بدن کے اندر کئی خدا ہیں
کمالِ شب کی زبان سمجھو
خزاں کی دھرتی میں بیج پھوٹے
ہوا کی سمتوں میں گل کھلاؤ

بھنور میں رقصاں گلابی پودے

عروج زیدی

کیوں مجھے زیست سے ہے پیار ، یہ قصہ کیا ہے
کچھ تو بول اے نگہِ یار ، یہ قصہ کیا ہے
کس کے دامن سے لپٹنے کو سرِ راہ گزر
خاک ہے مائلِ رفتار ، یہ قصہ کیا ہے
دل میں اک درد ہے ، بڑھتا ہوا بے نام سا درد
پھر مجھے عشق سے انکار ، یہ قصہ کیا ہے
رشک تھا میرے مقدر پہ گلوں کو لیکن
اب ہوں کانٹوں کا سزاوار ، یہ قصہ کیا ہے
میں تھا آغازِ غمِ دوست میں تنہا تنہا
اب وہ خود ہے مرا غمخوار ، یہ قصہ کیا ہے
کیا طلب ہے کہیں سب کچھ ہوا ، کہیں کچھ بھی نہیں
میں نہ مجبور نہ مختار ، یہ قصہ کیا ہے
شوخیٔ حسن سے تھی پردۂ در میں جنبش
مجرمِ شوق گنہگار ، یہ قصہ کیا ہے
ساری دنیا ہے مگر اک دلِ مرحوم کے بعد
کوئی مونس ہے نہ غمخوار ، یہ قصہ کیا ہے
کبھی دریا نے کیا ہے کسی قطرہ کا طواف
چڑھتے سورج کے پرستار ، یہ قصہ کیا ہے
موت کے جبڑے سے بچ رہی ہے دنیا
مر کے زندہ ہوا فنکار ، یہ قصہ کیا ہے
ان سے حالِ غمِ دل کہنے کا موقع ہے مگر
بجھ سا ہے لیکن لبِ اظہار ، یہ قصہ کیا ہے

شباب للت

ہمارا ذوقِ نظر بدنام
تمھیں ہم رندوں سے کیا کام
نظر کا جام سنبھل کر تھام
کہیں ہو جائے نہ تو بدنام
کبھی تیرا تو کبھی سقراط
لا کتنوں کو دش کا جام
مسافر تھکا ہوا لاچار
پڑ گئی ہے جنگل میں شام
بہلنے گیا ضبط کا شہر
سمندر کر گیا اپنا کام
جلی میں صحرا کی دوپہر
آتما میں جنگل کی شام
اٹھا کر پھینکا اس نے دور
سمجھ کر مجھے شکستہ جام
بھرت کے نیناں سرخ تو تیر
ابھی لوٹے نہیں بن سے رام
کہے من مرضی وہ منہ زور
لگا دے لیکن میرا نام
صفر کی صورت ہم نادار
مگر اوروں کے بڑھا دیں دام
کوئی کے لب پر کومل گیت
کوئی کے ہردے میں کہرام
تری خاموش نظر کا شور
کر گیا میری نیند حرام
چلی ہے میخانے میں لوٹ
جھپٹ لو تم بھی شباب اک جام

راہی بلند شہری

بھولی بسری ہوئی چند یادیں ہیں اور عہدِ رفتہ کی پرچھائیاں ساتھ ہیں
ورنہ جو تیرے ملنے سے پہلے تھیں بیشتر آج بھی وہ ہی تنہائیاں ساتھ ہیں
ہم نے چاہا تو تھا دل کے زخموں کو ہم مندمل کر سکیں کچھ سکوں پا سکیں
دل کے زخموں کو لے کر جہاں بھی گئے ہم نے دیکھا کہ پروائیاں ساتھ ہیں
محفلِ زندگی کتنی ویران ہے کتنی خاموش ہے کتنی سنسان ہے
نغمہ ہے تیری آواز کانوں میں لے ہے یعنی ہر وقت شہنائیاں ساتھ ہیں
تم ہو اور بختِ رنگیں کی گلکاریاں صبحِ عیش و طرب بزم آرائیاں
ہم ہیں اور بختِ برہم کی ناکامیاں شامِ غم اور تنہائیاں ساتھ ہیں
شاعری اور پھر شیوۂ عاشقی کیسی افتاد راہی یہ ہم پر پڑی
بزم در بزم چرچے ہی چرچے ہیں اور شہر در شہر رسوائیاں ساتھ ہیں

حنیف کیفی بریلوی

ٹمٹماتے ہوئے مجروحِ انا کے یہ چراغ
کاش دیکھے کوئی کیفیؔ دلِ خوددار کے داغ
روشنی بھی کوئی فرمانِ سزا ہے شاید
سائے کی قید سے ملتا نہیں پل بھر کو فراغ
ڈھونڈتے پھرتے ہو کیا دشتِ انا میں یارو
اس خرابے میں کسی کو نہ ملا اپنا سراغ!
اپنی فطرت کے نہاں خانے میں رہتا ہوں اسیر
میری نظروں کے مقدر میں نہ جنگل ہیں نہ باغ
تیز جھونکوں پہ نہ رکھو کوئی الزامِ ستم
میں ہی نادان ہوں آندھی میں جلاتا ہوں چراغ
کھو گئیں جانے کہاں مجھ سے بچھڑ کر کیفیؔ
ایک دل میں نہ ملا میری نواؤں کا سراغ

طلعت عرفانی

فصیلِ شب پہ سناٹا بہت ہے
لرز جائے کوئی سایا بہت ہے
دریچے، کھڑکیاں سب بند کر لو!
بس اک اندر کا دروازہ بہت ہے
کڑکتی دھوپ میں چھت پر نہ جاؤ!
جھلس جانے کا اندیشہ بہت ہے
کھلا بندِ قبا اس کا تو جانا
بدن کچھ بھی نہیں چہرہ بہت ہے
مری تکمیل کو طلعتؔ جہاں میں
وہ اک ٹوٹا ہوا رشتہ بہت ہے

کرشن مراری

ایک گہری سوچ میں ڈھلتی گئی ہے خامشی
زندگی کی اک یہی تصویر اب ہے زندگی
شوخ عارض پر جیسے کھلتے ہوئے رنگیں گلاب
صبح دم جیسے ہو مشرق میں شفق کی تازگی
اک نئی تہذیب کے جنگل میں شاید کھو گیا
آدمی کو ڈھونڈتا ہی رہ گیا ہے آدمی
حسنِ خوابیدہ کو دیکھا تو ہوا محسوس یہ
گود میں اب بادلوں کے چاندنی ہے سو گئی

ہوش نعمانی

سورج کو نیند آ گئی ہر بلب جاگ اٹھا
ذہنوں میں کلبلایا گناہوں کا دیوتا
میرا ضمیر چیخ رہا تھا بری طرح!
میں اس کے جلتے گھر کو مگر دیکھتا رہا
وہ تو بتا رہا تھا کئی روز کا سفر
زنجیر کھینچ کر جو مسافر اتر گیا
اک سمت سنگ باروں کا تھا مشتعل ہجوم
اک سمت ایک شخص تھا اور پر سکون تھا
نظریں جھکا کے ہاتھوں کو اونچا نہ کیجیے
بارود میں نہ ڈالیے سگرٹ جلا ہوا

شوکت حیات

سچویشن نمبر ۲

صدیوں کے مسافر —— تھکے تھکے قدموں کو عمل کی قید سے رہائی دلا کر ساکت ہوا اور اس کا چہرہ دیکھنا چاہا۔ ہتھیلیوں سے ڈھانپے ہوئے سائیکل کے کھڑتل پہیوں کی طرح وہ مسلسل گھومتا چلا جاتا تھا۔ آواز دینے پر بھی نہیں رکا جیسے سنتے، رکنے اور کچھ کہنے کی امید دل سے اب وہ آزاد تھا۔ چلتا جا رہا تھا۔ چہرہ ڈھانپے ہوئے۔

روتے ہوئے!

بہت دنوں سے وہ چہرہ ڈھانپے ہوئے تھا۔ اور اب یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ سچ مچ رو ہی رہا تھا یا ہنس رہا تھا۔ میں اس کے چہرے کو دیکھ کر اس کے ہنسنے یا رونے کی تصدیق چاہتا تھا۔ آوازیں کہاں تک صحیح ہوتی ہیں!؟ روتی ہوئی آواز ہنستی بھی تو ہے۔ لیکن چہرہ بھی کب صحیح ہوتا ہے کہ حالت کی توضیح کرے۔ اور چہرہ ہوتا بھی ہے.....؟

اس نے چہرہ تو نہیں کھو دیا!!!؟؟؟

معاً یہ خیال کوند گیا۔ اور فوراً ہی بہت گہرائی میں ڈوب گیا۔ جہاں سے اس کا لوٹنا مشکل تھا۔

یہ ایک قدم تھا —— ان گنت رواں دواں قدموں میں ایک ساکت قدم۔ اس ایک ساکت قدم پر کئی متحرک قدموں کی ٹکراتی ہوئی شبیہیں ابھریں جو مل جل کر ایک دھندلی تصویر بناتی تھیں —— صرف ایک تصویر،

اور دنیا کے کسی آدمی کو بھی میری باتیں سننے کی فرصت نہیں ہے اور ان کی دقتوں میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی تو یہی سوچا کہ میں نے کتابوں کے اوراق پھاڑ دیئے۔ بڑی محبت سے ان میں آگ لگائی۔ اور ان کے جلے پھٹے ٹکڑے کوڑے کرکٹ کے اس ڈھیر پر رکھ آیا جہاں سے ہوا کے ایک ہلکے جھونکے سے وہ پورے محلے میں پھیل گئے۔

کتابوں کے چند عاشق (حرامزادے) جب میرا چہرہ نوچنے کے لیے آئے تو گھبرائے بغیر میں نے صرف اپنا زاویہ بدل دیا۔ سوچنے والی ہر کھوپڑی کا مقدر مکڑی اور کلہاڑی کے درمیان تو یوں بھی پھنسا ہوتا ہے۔ میں نے اندر ہی اندر مردہ آواز کی بھڑاس نکالی۔

مجھ سے بچو حرامزادو۔ کوئی رنیدہ گولی بن کر سینہ نہ چیر دے!

کئی متحرک قدموں کے بعد پھر اپنے بدنما پیروں سے ایک قدم پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اسے سکوت کے لنگر سے جامد کرتا ہوں —— اس بار بھی ایسا ہی لگا کہ لنگر میرے اپنے اندر گرا دیا گیا ہے۔

وہ اسی طرح جا رہا ہے۔ چہرہ ڈھانپے روتا ہوا۔ بے گھر دیاروں سے نامعلوم منزلوں تک سڑکوں پر لنگتا ہوا زندگی کی غلطیوں اور ہم عصروں کی مزاحمتوں کو لہولہان جھیلتا ہوا۔ اس کے لیے کچھ ٹھوس عمل کرنے کے لیے اس کے رونے کی تصدیق ضروری معلوم ہوتی تھی۔ کئی قدموں تک ٹکراتے ٹکڑے پھیلی ہوئی نامکمل تصویر پھر ابھری اور سورج کے نیچے ہانپتے ہوئے آئینے کی طرح چمک چمک کہنے لگی۔ کچلے ہوئے لوگ میرے بھائی ہیں اس سے مجھے انکار تھا اور نہ ہوگا!

پھٹے حال لوگ ٹھوس عمل کی ناکامی کا ثبوت ہیں جو سوچنے والے کا مذاق اڑاتے ہیں —— اب تو یہ بھی جی چاہتا کہ قلم کے بجائے ہاتھوں میں آتشی ذرات کا گولا لے لوں اور انہیں اچھال اچھال کر اپنے بھائیوں کے گرد روغنی جسموں کے گارے سے تحفظ کا حصار کھڑا کر دوں۔ لیکن بھائیوں اور دشمنوں کے اندر کی ابد سے ازل تک پھیلی ہوئی بے شکل اداسی اور ادھورے خالی پن کو کیسے دور کروں۔ لیکن "یہ" ہو جائے تو "وہ" —— بعد کی بعد میں پہلے۔ "یہ"..

میرے جسم پر گرد کی تہیں جم رہی ہیں تو جمنے دو —— دیکھنا یہ ہے کہ اندر کی کائی کو بلیچنگ پاؤڈر میسر آتا ہے کہ نہیں!

ساری زمین مظر اندر سے ٹہر و آنسلہے۔ ایشیائی کے بھونکتے

ہوئے ایک دوسرے کو نوچنے میں مصروف ہیں اور وہ منھ ڈھانپے روتا چلا جا رہا ہے۔

یہ تصویر کا آخری سرا تھا۔

صدیوں تک ہانپتا کانپتا ٹیڑھے میڑھے قدموں کے ساتھ بے نتیجہ رہتا ہوں تو بھول جاتا ہوں کہ میں چل رہا ہوں یا رک گیا ہوں۔ بے ان گنت قدموں میں مکمل ہوتی ہوئی ٹکڑا ٹکڑا تصویر دھندلی ہوتی جا رہی ہے۔ بالکل گم ہو چکی ہے۔ ایک جھٹکا لگتا ہے جیسے تصویر نے ڈوبنے سے پہلے مجھے پوری قوت سے اپنی طرف کھینچ لینا چاہا ہو۔

میں بزدل ہوں۔ بچپن سے مجھے بزدلی کے سوا اور کچھ نہیں سکھایا گیا۔ جانتا ہوں ٹھوس عمل کی منزل اس وقت آئے گی جب میں اندھیرے اور گھنے سناٹے میں پہنچ کر بے دست و پا ہو جاؤں گا

اب سوائے اس کے اور کیا کام ہے کہ تھکی آنکھوں سے تدمعلوم کے ایک زاویے پر ساکت کھڑے ہوئے اس افسانہ نگار کے روتے ہوئے چہرے سے ہاتھ ہٹانے کا انتظار کروں۔ ●●

بقیہ:- وقت

تماشے کئے ہیں۔ اور زندگی سے بھی آگے نکلنے کے لیے ہم نے ایسے بم بنائے ہیں جن کے پھٹنے سے زندگی کا نام و نشان بھی مٹ جاتا ہے۔ نہ جانے یہ دوڑ کب ختم ہو گی جو کہ ایک ہی محور کے گرد ہے۔ ہم تیز چلیں یا آہستہ لیکن یہ محور اتنا ہی ہے۔ پھر اس دوڑ کا فائدہ کیا ہے۔ یہ اسی دوڑ کا نتیجہ ہے۔ ہم میں سے کئی زخمی ہو گئے ہیں۔ کتنوں کی سانس پھول گئی ہے۔ کچھ گر پڑے ہیں۔ اور کچھ تو اس دوڑ میں اتنے اندھے ہو گئے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کی لاشوں پر دوڑ رہے ہیں۔

یہ گھڑیوں کی دوکان۔ چلو یہیں پر ٹھیک وقت کا پتہ لگے گا۔ اس گھڑی پر کیا وقت ہے۔ آٹھ۔ یہ کیا بجا رہی ہے۔ چار ــــ ارے یہ تو ــــ وہ دیکھو ــــ دس ــــ میرے پاس والی گھڑی گیارہ ــــ ارے یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کہاں ہے وقت ــــ پکڑو پکڑو ــــ وقت کو.... میں پاگل ہو رہا ہوں .... ●●



وزیر آغا

کتابوں کی معیت میں

جہاز کا خطرے کا سائرن چیخ اٹھا ہے۔ اور سائرن کی آواز کے ساتھ پورے جہاز میں افراتفری سی مچ گئی ہے۔ جہاز کے کپتان سے میرے دیرینہ مراسم ہیں اس لیے اس نے مجھے ایک لائف بوٹ مہیا کر دی ہے تاکہ میں کسی قریبی جزیرے میں پناہ لے سکوں۔ مگر اس نے مجھے اپنے ساتھ جہاز کی لائبریری سے صرف تین کتابیں لے جانے کی اجازت دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں کون سی کتابیں اپنے ساتھ لے جاؤں اور پھر بتاؤں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ —— وقت تنگ ہے اور مجھے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا ہے۔ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ میں اپنے بچوں میں سے کسی ایک کو اپنے ساتھ لے جاؤں اور باقی کو جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں غرق ہونے کے لیے چھوڑ دوں۔ ایسی صورت میں میرا ردعمل تو یہ ہوگا کہ اپنے بجائے اپنے بچوں کو لائف بوٹ میں سوار کر دوں اور خود ڈوب جاؤں۔ یہی صورت کتابوں کی ہے اگر یہ کتابیں انتہائی نادر و نایاب صحیفے ہوتے تو میں انھیں لائف بوٹ میں بھر کر جزیرے کی طرف بہا دیتا اور خود جہاز کے ساتھ ہی سمندر کی تہہ میں اتر جاتا مگر چونکہ ان کتابوں کی لاکھوں جلدیں پہلے ہی سے دنیا میں بکھری پڑی ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ سوال کتاب کی بقا کا نہیں، میری اپنی بقا کا ہے۔ نجانے مجھے جزیرے میں کتنا عرصہ گزارنا پڑے۔ سنا ہے بعض مسافروں کو سال ہا سال ایک ہی جزیرے میں یکہ و تنہا زندگی بسر کرنا پڑی ہے۔ وہاں انہیں جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے غذا تو کافی مقدار میں ملی۔ اور دیکھنے کو مناظر بھی بیشتر آئے لیکن تنہائی اور بوریت کے احساس نے انھیں کچل کر رکھ دیا۔ اس بوریت ہی کا مقابلہ کرنے کے لیے جہاز کے جہاندیدہ کپتان نے مجھے اپنے ساتھ تین کتابیں لے جانے کا مشورہ دیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کتاب تو دوست کی طرح ہے۔ اگر دوست کم آمیز اور اس کی شخصیت اکہری ہے تو میں چند ہی دنوں بلکہ چند ہی ساعتوں میں اس سے اکتا سکتا ہوں۔ اسی طرح میں ہر اس کتاب سے اکتا سکتا ہوں جو مجھے سوچ کی غذا مہیا نہ کر سکے۔ اور جس کے مطالعے سے مجھے ہر بار ایک نئے بُعد کا احساس نہ ہو۔ نجانے مجھے اپنے طویل قیام میں ان تینوں کتابوں کو کتنی بار پڑھنا ہوگا۔ اور یہ نہ ہو کہ دوسری ہی بار کے مطالعے میں ان سے اکتا جاؤں اور انھیں پورے زور کے ساتھ سمندر میں پھینک دوں —— کتابیں کئی قسم کی ہیں بعض ایک بار کے مطالعہ کے بعد ہی باسی ہو جاتی ہیں اور بعض سو بار مطالعہ کرنے کے بعد بھی تازہ محسوس ہوتی ہیں۔ سائرن دوسری بار چیخا ہے اور جہاز سربسجود ہونے لگا ہے۔ وقت اور بھی تنگ ہے۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی کتابوں کو اٹھایا ہے اور پھر سر کو انکار میں ہلاتے ہوئے انھیں ایک طرف رکھ دیا ہے۔ معاً میری نظر لورین آئزلے (LOREN EISLEY) کی کتاب "THE IMMENSE JOURNEY" پر پڑی ہے اور میں نے جلدی سے یہ کتاب اٹھا لی ہے۔ میں دوبارہ کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگا ہوں۔ ایک چھوٹی سی کتاب شیلف میں سے پھدک کر زمین پر آ گری ہے۔ میں نے کتاب کو اٹھا کر دیکھا ہے۔ یہ نطشے کی "THUS SPAKE ZARATHUSTRA" ہے۔ میں نے خوش ہو کر یہ کتاب بھی اپنے تھیلے میں ڈال لی ہے۔ اب مجھے ایک، فقط ایک کتاب اور چاہیے۔ شیلف میں سے میر، غالب، میراجی، فیض اور ان کے علاوہ مجھے گھورنے لگے ہیں۔ مگر میں ان سے نظریں ملانا نہیں چاہتا۔ ییٹس، کیٹس اور ایلیٹ نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی ہے۔ مگر فی الحال مجھے ان کی بھی ضرورت نہیں۔ دانتے، سیفو، ملٹن، میرا بائی اور وارث شاہ —— نہیں مجھے تو ایک ایسی کتاب چاہیے جس میں سمندر کی وسعت، جنگل کی سی بوقلمونی اور شہر کی سی ہماہمی ہو۔ معاً میری نظر وہٹ مین (WHITMAN) کی کتاب "LEAVES OF GRASS" پر پڑتی ہے اور میں اس کتاب کو بھی اپنے تھیلے میں ڈال لیتا ہوں۔ اب جہاز کچھ اور بھی جھک گیا ہے۔ میں اپنی لائف بوٹ میں آ جاتا ہوں اور جہاز سے دور ہٹنے لگتا ہوں پھر میں [illegible] دیکھتا ہوں کہ عرشۂ جہاز

پر جہاز کا کپتان ایک سنگ میل کی طرح ایستادہ ہے۔ اور لمحہ بہ لمحہ جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں اترتا جا رہا ہے۔ مگر میں اپنے جسم کی لائف بوٹ میں محفوظ، تینوں کتابوں کو سینے سے لگائے ایک بالکل نئی DIMENSION میں آ گیا ہوں اور اب اس قابل ہوں کہ جزیرے میں رہوں اور اس بوریت کو اپنے قریب بھی نہ آنے دوں جو جزیرے کے ہر مسافر کا نوشتۂ تقدیر ہے۔

اور اب کہ میں جزیرے میں پہنچ گیا ہوں تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ میں نے سینکڑوں کتابوں میں سے ان تین کتابوں کا انتخاب کیوں کیا۔ ان میں سے دو کتابیں تو بالکل مختصر سی ہیں۔ مگر تیسری کتاب قدرے بڑی ہے۔ تاہم اس اعتبار سے یہ تینوں کتابیں بڑی ہیں کہ انہیں صفحوں کے حساب سے نہیں بلکہ فقروں، مصرعوں یا لفظوں کے حساب سے پڑھنا چاہیے۔ میں ان کتابوں کے لیے انگریزی کا محاورہ PACKED WITH WISDOM استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ جزیرے میں رہتے ہوئے آپ WISDOM سے بھی اکتا سکتے۔ ان کتابوں کی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر قدم پر آپ کو ٹھہرا لیتی ہیں اور پھر سوچ کو مہمیز لگا کر آپ کو کسی اور ہی دنیا میں لے جاتی ہیں۔

میں نے سب سے پہلے لورین آئیزلے کی کتاب THE IMMENSE JOURNEY کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور فوراً میں جزیرے کی فضا کو عبور کر کے ماضی اور مستقبل میں دُور دُور تک گھومنے لگا۔ کئی منٹ تو میں اس کتاب کے عنوان ہی کو بار بار پڑھتا چلا گیا ہوں۔ عظیم سفر THE IMMENSE JOURNEY لیکن کیسا سفر؟ —— یہ کوئی مہماتی کہانی نہیں جو خزانے کی تلاش سے متعلق ہو۔ یہ تو کہانی ہے زندگی کے سفر کی۔ جو قرنوں پہلے شروع ہوا۔ اور قرنوں بعد ختم ہوگا۔ لورین آئیزلے ایک سائنس دان بننے سے پہلے ایک شاعر تھا۔ سائنس دان عملی آدمی ہوتا ہے وہ حقائق کی روشنی میں ہر شے کا تجزیہ کرتا ہے اور پھر کسی اور مسئلہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن جب شاعر پر کوئی بات منکشف ہوتی ہے تو اس کا تخیل برانگیخت ہو جاتا ہے۔ یہی اس کتاب کا امتیازی وصف ہے کہ اس میں ایک شاعر نے سائنس داں کا روپ دھار کر رقص دیا ہے۔ یا شاید اصل بات یہ ہے کہ ایک سائنس دان نے شاعر کے تخیل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی بیوی کی موت پر کچھ اس طرح کے تاثر کا اظہار کیا تھا کہ میں نجانے کب سے شاہراہ پر اکیلا چلا جا رہا تھا کہ وہ ایک پگڈنڈی سے کود کر شاہراہ پر آ گئی اور میرا ہاتھ تھام کر میرے ساتھ چلنے لگی۔ وہ چلتی گئی، چلتی گئی اور پھر ایک جگہ اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور شاہراہ سے پھوٹنے والی ایک اور گرد آلود پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ مگر میں آگے ہی آگے چلتا رہا۔"

لورین آئیزلے نے زندگی کے سفر کو بھی کچھ ایسے ہی دیکھا ہے۔ زندگی سمندر سے برآمد ہوئی اور پھر نباتات، حیوانات اور پرندوں کی صورت میں مصروفِ سفر ہوئی اور لاکھوں کروڑوں برس تک کروٹ پہ کروٹ لیتی چلی گئی۔ مگر پھر آج سے محض چند لاکھ سال پہلے انسان بھی اس کارواں میں شامل ہو گیا۔ زندگی کا سفر جاری ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ انسان کب اس کارواں سے کٹ کر دوبارہ اس تاریکی میں چلا جائے جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا اور زندگی شادیانے بجاتی ہوئی آگے ہی آگے کو بڑھتی چلی جائے۔ لورین آئیزلے لکھتا ہے کہ جب میں صبح کے جھٹپٹے میں بیدار ہوتا ہوں اور نیویارک کی کسی بلند بالا عمارت کی چھت پہ سے پرندوں کی چہکار کو سنتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے پرندے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں —— "کیا وہ (انسان) ابھی گیا نہیں؟؟" —— میں لورین آئیزلے کے اس ایک فقرے پہ گھنٹوں سر دھن سکتا ہوں۔ انسان کو اس دنیا میں وارد ہوئے ابھی عرصہ ہی کتنا گزرا ہے۔ لہٰذا وہ یہاں کے چرند پرند کے لیے قطعاً اجنبی اور غیر ارضی ہے۔ تاہم اس نے زندگی کے قافلہ اور دوسرے نمایندوں کو اپنا مطیع کر لیا ہے اور اب یہ نمایندے اس اجنبی تسلط سے اکتا کر سوچتے ہیں کہ نجانے وہ کب دفع ہوگا؟ —— میں سوچنے لگا ہوں کہ یہ کرۂ ارض کروڑوں برس تک زندگی کے بغیر ہی خلا میں گھومتا رہا۔ پھر کروڑوں برس ہوئے اس پر زندگی نے اپنا گھونسلہ بنایا (سائنس دان اس واقعہ کو اپنی بے رحم حقیقت نگاری کے تحت یوں بیان کرتے ہیں کہ لامحدود کائنات میں آوارہ پھرتے ہوئے اس کنکر پر جسے ہم زمین کہتے ہیں زندگی کا FUNGUS لگا ہوا ہے) ابھی صرف چند لاکھ سال ہوئے کہ انسان پیدا ہوا۔ آنے والے زمانے میں یہ اجنبی شاید سب سے پہلے رخصت ہوگا، پھر چرند پرند جائیں گے، پھر حشرات الارض، پھر نباتات اور زمین خود دوبارہ کسی اندھی، گونگی اور ٹھنڈی شے کی طرح خلا میں کروڑوں اربوں برس تک گھومتی چلی جائے گی۔ لورین آئیزلے پوچھتا ہے: "یہ زندگی کیا

ے آئی؟ کیوں کہ جب اس کے عناصر ترکیبی کو الگ الگ کر کے دیکھیں بظاہر ان میں کوئی راز نظر نہیں آتا مگر محض ان عناصر کو ایک جگہ جمع کر دینے سے زندگی پیدا بھی تو نہیں ہوتی۔ مختصر ترین سیل CELL میں بھی کم و بیش تین لاکھ PROTEIN MOLECULES ہیں جو ایک خاص ترتیب سے منسلک اور مربوط ہوں تو زندگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ ترتیب کیا ہے؟ — اس ترتیب کا محرکِ اعظم کون ہے؟ کیا وہ اور اس کا سارا پراسرار نظام اور اس کے جملہ حیرت انگیز مظاہر — جھینگر اور چڑیاں اور آوارہ پھرتے ہوئے انسان بجائے خود کسی انوکھی قوت کے چہرے کے مختلف نقاب نہیں ہیں؟ — میں نے آئزلے کی کتاب لمحہ بھر کے لیے بند کر دی ہے اور سوچنے لگا ہوں کہ کیا زندگی محض اس کرۂ ارض تک محدود ہے؟ — ہرگز نہیں! کائنات میں لاکھوں کروڑوں کہکشائیں موجود ہیں۔ ہر ہر کہکشاں میں لاکھوں ستارے موجود ہیں اور ہر ستارے کے گرد ایک خاص تعداد میں سیارے ہیں۔ ان سیاروں میں سے کسی بھی سیارے پر زندگی کی نمود ممکن ہے۔ مگر چوں کہ زندگی کا امتیازی وصف تنوع اور بوقلمونی ہے اس لیے کہیں یہ تو نہیں کہ کائنات میں زندگی کے لاکھوں کروڑوں روپ تو ہوں لیکن انسانی روپ کہیں اور موجود نہ ہو؟ تو پھر کیا ہم اس بھری کائنات میں اکیلے ہیں؟ — معاً مجھے جزیرے میں اپنی تنہائی بے معنی نظر آنے لگی ہے۔ کیوں کہ اب مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ انسان تو بھری کائنات میں تنہا ہے۔

میں نے کتاب دوبارہ کھول لی ہے اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا ہوں۔ معاً میری نظریں لورین آئزلے کے اس فقرے پر رک جاتی ہیں:

THE CLOCK IN THE BODY, IN OTHER WORDS HAS PLACED A LIMIT UPON THE PACE AT WHICH THE APE BRAIN GROWS — A LIMIT WHICH THE HUMAN ANCESTORS IN SOME MANNER ESCAPED.

اور یہ فقرہ میرے ذہن میں ایک ہیجان سا برپا کر دیتا ہے زندگی کے ہر مظہر کے اندر اس کی اپنی ایک گھڑی (کلاک) موجود ہے جو ایک مقررہ رفتار سے ٹک ٹک کرتی چلی جاتی ہے۔ ہر مظہر اپنی کلاک کی ٹک ٹک کا اسیر ہے۔ انسان صرف اس لیے انسان ہے کہ ارتقا کے کسی موڑ پر اس نے APE کی کلاک کے زندان سے جست بھری اور ایک نئی کلاک کے زندان میں آ گیا۔ اس لیے MISSING LINK کی تلاش بے سود ہے۔ انسانی دماغ کی نمو دراصل بتدریج نہیں بلکہ ایک جست کے ذریعہ ہوئی — کئی برس ہوئے میں نے ایک کتاب لکھی تھی — "تخلیقی عمل" اس میں ایک بنیادی نکتہ یہ تھا کہ تخلیق کا عمل ایک پراسرار سی جست کے تابع ہے۔ اور یہ جست جسم، معاشرہ، تاریخ، اسطورہ، فن، بلکہ ساری کائنات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ آج جب میں نے آئزلے کی کتاب کو دوبارہ ہاتھ میں لیا تو اس جست کا ایک سائنسی ثبوت بھی مل گیا۔ مگر اس کتاب سے مجھے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ملا ہے۔ مثلاً یہ خیال کہ حیوان کے اندر کی گھڑی، انسان کی گھڑی سے مختلف ہے۔ اور انسان اور حیوان کی گھڑیاں نباتات کی گھڑیوں سے مختلف ہیں۔ جو گھڑی آہستہ چلتی ہے وہ زیادہ دیر چلتی ہے۔ اور جو زیادہ تیز چلتی ہے وہ جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اب کھلا کہ پرانے زمانے میں عمریں کیوں لمبی ہوتی تھیں کہ ان دنوں انسانی معاشرے کے کلاک کی رفتار وہ نہیں تھی جو بیسویں صدی میں ہو گئی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میری زمین کی گھڑی بھی تو دوسرے سیاروں کی گھڑیوں سے مختلف ہے اور اسی لیے میری زمین کے وقت کا پیمانہ بھی دوسرے سیاروں کے وقت کے پیمانوں سے مختلف ہے۔ پھر میری کہکشاں کی گھڑی ہے جس کی رفتار دوسری کہکشاؤں کی رفتار سے مختلف ہے۔ میں کس قسم کی کائنات کا باسی ہوں۔ اوپر دیکھوں تو وقت کی پرتیں تا حدِ خیال پھیلی ہیں اور یہ وقت سست سے سست تر ہوتا چلا گیا ہے (جیسے مثلاً ایک ستارے کا عرصۂ حیات جو کروڑوں روشنی کے سالوں پر محیط ہے) نیچے دیکھوں تو بھی وقت کی پرتیں تا حدِ خیال ہیں مگر یہ وقت تیز سے تیز تر ہو رہا ہے (جیسے مثلاً وائرس VIRUS کی عمرِ طبعی جو پلک جھپکنے میں ختم ہو جاتی ہے)۔ میں خود وقت کی لاتعداد پرتوں میں سے صرف ایک پرت کا باسی ہوں۔ یہ کیسا زندان ہے، وقت کی لاکھوں منزلہ عمارت کی صرف ایک منزل میں رہنا، وہیں پیدا ہونا اور وہیں عمرِ عزیز ایک خاص رفتار کی گھڑی کے تحت گزار کر چپکے سے رخصت ہو جانا! لورین آئزلے کی کتاب کا

یہ کرشمہ ہے کہ اس کے ایک ہی فقرے نے میرے ذہن میں اتنا بڑا ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ میں نے اسی لیے یہ کتاب چنی تھی کہ میں اس کی معیت میں ساری عمر گزار سکتا ہوں۔

جزیرے میں یکہ و تنہا زندگی بسر کرنا صدیوں پرانے بن باس کی ایک صورت ہے۔ جب میں نے جہاز کو چھوڑا تو گو تم سدھیارتھ کی طرح گویا کپل وستو کو الوداع کہی اور بن باس اختیار کیا۔ میں اپنے اس گھر میں بہت محفوظ تھا۔ اس لیے کہ میری ذات معاشرے سے پوری طرح جڑی ہوئی تھی اور میرے لیے سخت سے سخت سمندری ہچکولوں میں بھی جہاز سے نیچے گرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن جب میں نے جہاز کو چھوڑا تو گویا اپنے معاشرے اور اس کے پیچ در پیچ دھاگوں سے کٹ کر یکایک بالکل اکیلا ہو گیا۔ پہلے تو مجھے بڑا خوف محسوس ہوا کیونکہ میں اب بھری کائنات میں تنہا تھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ میرے اندر یہ احساس جاگا کہ میں نے اپنے شانوں پر معاشرے کا کتنا بڑا بوجھ اٹھا رکھا تھا اور میری شخصیت کس طرح اس بوجھ تلے پس کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی لیے حساس اذہان خود کو پہچاننے کے لیے ہمیشہ شہر کو چھوڑ کر غاروں صحراؤں اور پہاڑوں کی طرف بھاگتے رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ شہر اور اس کی مخلوق فرد کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ معاشرہ نہیں چاہتا کہ کوئی بھیڑ اس کے گلے سے الگ ہو کر بھٹک جائے۔ اسی لیے وہ اخلاقی ضوابط، سماجی قوانین، روایت اور اصول اور قاعدہ اور ڈسپلن کی گرفت سے اسے اس طور جکڑ لیتا ہے کہ وہ پھر کبھی اس جال سے باہر نہیں جا سکتا مگر اس سارے حزم و احتیاط کے باوجود وہ ان لوگوں کو نہیں روک سکا جو اسے خیر باد کہہ کر بار بار جزیروں اور پہاڑوں اور صحراؤں کی طرف جاتے رہے ہیں۔ نطشے، انہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ اس کا جزیرہ "سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا جہاں اس نے اہرام مصر ایسی ایک بلند و بالا چٹان کے پاس بیٹھ کر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا —— "انسان اور وقت سے چھ ہزار فٹ دور ——" اور پھر تنہائی اور آزادی کے اس مقدس لمحے میں اپنی ذات سے پہلی بار متعارف ہوا۔ اس نے ذات کے اس نئے روپ کو زرتشت کا نام دیا۔ اور اس کے ہونٹوں سے ٹپکتے ہوئے ہر لفظ کو اپنی کتاب THUS SPAKE ZARATHUSTRA میں محفوظ کرتا چلا گیا۔ آج یہ کتاب میرے ہاتھ میں ہے اور میں انبوہ کی کلبلاہٹ سے دور اپنی ہی ذات کی معیت میں بیٹھا، اس کا دل جمعی سے مطالعہ کر سکتا ہوں۔

نطشے نے جب یہ کتاب لکھی تو وہ جانتا تھا کہ یہ ایک شاہکار ہے۔ مگر زمانے نے اسے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ وجہ یہ کہ اس وقت تک زمانہ "گلے کا فلسفہ" (PHILASOPHY OF THE HERD) کے تابع ہو چکا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی مشین اور مشینی نظریات اور انسانی ہمہ اوست کے فلسفے کے رواج نے اس کی پذیرائی کو تا دیر ملتوی رکھا۔ پھر پہلی جنگ عظیم لڑی گئی۔ جس کے بعد سب سے پہلے یورپی ممالک اور ان کے بعد انگریزی دان طبقات آہستہ آہستہ اس کی اہمیت کے معترف ہونے لگے حتیٰ کہ عیسائی پادری اور انگریز مجسٹریٹ بھی دبی زبان میں اس کی تعریف کرنے لگے۔ بدقسمتی اس کتاب کی یہ تھی کہ بعض حلقوں نے اسے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا واحد محرک قرار دے ڈالا۔ حالانکہ بقول آسکر لیوی یہ جنگیں نسلی تفاخر کے جذبے کے تابع اور KINGDOM OF HEAVEN کے حصول کی اس کوشش کا المیہ تھیں جو یہودی ذہن کی عطا تھی —— وہ یہودی ذہن جس کی تفسیر کانٹ اور ہیگل اور فشٹے کے نظریات میں ملتی ہے نہ کہ نطشے کے افکار میں۔ یہودی ذہن بھیڑ چال کے فلسفے کا قائل ہے اور خودی کے اس جوہر سے صرف نظر کرتا ہے جو فرد کو انبوہ سے اوپر اٹھا کر ایک اعلیٰ و ارفع منصب پر فائز کر دیتا ہے۔ کانٹ نے اس "خودی" کا گلا گھونٹنے کی ترغیب دی۔ اس نے جرمن ذہن کو شخصی مسرت کے تصور سے الگ کر کے بادشاہ اور "ملک" معاشرے اور ہمسایے کی خاطر متحرک ہونے کی ترغیب دی —— فشٹے نے جرمن قوم کا یہ مقدس فریضہ قرار دیا کہ وہ انسانیت کو لازمی طور پر "روح" کی ایک بنیاد مہیا کرے۔ اس طرح ہیگل نے MORAL IDEA پر زور دیا اور DIVINE STATE کا وہ تصور پیش کیا جسے بسمارک نے حقیقت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے KINGDOM OF HEAVEN کو زمین پر لانے کی دھن میں فرد کی انفرادیت کو اداروں کی اجتماعیت کے تابع کر دیا۔ جب کہ نطشے نے اس استحصال کے خلاف علم بلند کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اجتماعی زنگ آلودگی کا نہیں، انفرادی تازگی کا داعی

ہے۔

نطشے اکثریت کا نہیں اقلیت کا قائل ہے۔ گلّے کا نہیں گلّہ بان کا والہ و شیدا ہے اور وہ بنی نوع انسان کو نہیں بلکہ مردِ مومن کو اپنی منزل قرار دیتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا یہ نظریہ آمریت کی طرف ایک قدم تھا بلکہ اس نے تو فرد کو اجتماع کی اس آمریت سے بچانے کی کوشش کی جس نے یورپ کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا تھا۔ ارتقا غزال کی طرح چوکڑیاں بھرنے کا نام ہے نہ کہ بھیڑ کی طرح نپے تلے قدم اٹھانے کا۔ اور یہ چوکڑی ہمیشہ کوئی ایسا مردِ قلندر بھرتا ہے جو بہر اعتبار اپنی نوع سے افضل ہوتا ہے۔ یوں دیکھیے تو نطشے نہ محض BRUTE FORCE کا علم بردار ہے اور نہ وہ مردم بیزاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ تو پرانے زنگ آلود جہان کو ایک دھماکے کے ساتھ اڑانے اور اس کے بعد TRANSVALUATION OF VALUES کی مدد سے ایک ایسے جہانِ نو کو وجود میں لانے کا داعی ہے جس میں خیر و شر کی جملہ سابقہ توضیحات ختم ہو جائیں گی اور ایک نئی اخلاقیات کا سورج طلوع ہوگا۔

نطشے کی یہ کتاب ایک نئی بائیبل ہے جو دنیا کو عطا ہوئی۔ نہ صرف اس کا اسٹائل قدیم عہد نامہ کی یاد دلاتا ہے بلکہ اس کا مشن بھی ایک پیغمبر کے سے فرمودات کا اظہار ہے —— مگر ایک ایسا پیغمبر جو پیغمبروں کی صف سے بالکل الگ تھلگ کھڑا ہے۔ اخناتن تاریخ کا پہلا "فرد" تھا۔ نطشے دوسرا "فرد" ہے اور جس طرح اخناتن نے اپنے زمانے سے انحراف کیا، بالکل اسی طرح نطشے نے بھی کیا ہے عجب بات یہ ہے کہ اس کام کے لیے دونوں نے ایک شعری پیرایۂ بیان کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔

جزیرے میں رہتے ہوئے مجھے یہ احساس بار بار کچوکے لگاتا ہے کہ میں ساری دنیا سے کٹ گیا ہوں۔ ایسے میں یہ کتاب مجھے اتنا اونچا اٹھا لیتی ہے کہ سمندر کے اس پار کی زمینیں تک میری نگاہ کی دسترس میں آجاتی ہیں۔ اور مجھے سارا معاشرہ اپنے قدموں میں کلبلاتا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے۔ تنہائی کا مقابلہ کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے اور یہ طریق مجھے نطشے کی اس کتاب ہی سے ملا ہے۔ تجدیدِ ملاقات کے لیے میں کتاب کی ورق گردانی کرتا ہوں، اور میری نظریں ان الفاظ پر آکر رک جاتی ہیں:

"اور وہ بھی ہیں
جو بھاری قدموں کے ساتھ چلتے ہیں۔
اُن چھکڑوں کی طرح
جو پتھروں سے لدے ہوئے نشیب کی طرف لڑھک رہے ہوں
یہ لوگ زور شور سے عزّت اور تمکنت اور اچھائی کی باتیں
کرتے ہیں
اور اپنے (پتھریلے) بوجھ کو خیر کا نام دیتے ہیں

اور وہ بھی ہیں
جو چاہتے ہیں کہ انھیں آسمان پر چڑھا دیا جائے۔
اور وہ اسے خیر کا نام دیں
اور وہ بھی ہیں
جو چاہتے ہیں کہ انھیں پاتال میں گرا دیا جائے
اور وہ اس بات کو بھی خیر ہی کہہ کر پکاریں!

نطشے کے سامنے سارا انسانی معاشرہ اور اس کی اخلاقیات پیاز کی طرح ہے جس کی پرتوں کو وہ ایک ایک کرکے اتارتا چلا جاتا ہے اس لیے نہیں کہ آخر میں صدف کے اندر کا "موتی" ملے گا۔ بلکہ شاید یہ بتانے کے لیے کہ پیاز پرتوں اور لفافیوں کے سوا اور کچھ نہیں جزیرے میں رہتے ہوئے پرتوں کے اترنے کا منظر مجھے ایک عجیب سی روحانی بالیدگی عطا کرتا ہے جیسے گویا میں زندگی کو پہلی بار اس کی اصل صورت میں دیکھ رہا ہوں۔

میں نے کتاب کی مزید ورق گردانی کی ہے اور کہیں کہیں سے کوئی حصہ پڑھتا ہوں:

جب سے انسانیت وجود میں آئی ہے
انسان نے بہت کم مسرت کو چکھا ہے
بھائیو! یہی تو ہمارا "پہلا گناہ" ہے

لوگوں کے درمیان رہنا مشکل ہے
اس لیے کہ چپ رہنا مشکل ہے

ہم دونوں ایک بڑے دروازے میں رک گئے

میں نے کہا — "بونے! اس دروازے کو دیکھ کہ اس کے دو چہرے ہیں

یہاں دو سڑکیں آکر ملتی ہیں
یہ پیچھے کی طرف جاتی ہوئی سڑک جو ازل تک چلی گئی ہے
اور وہ آگے کو بڑھتی ہوئی سڑک جو ابد تک جاتی ہے
یہ سڑکیں ایک دوسری کی "نفی" ہیں
مگر وہ اس دروازے پر یکجا ہو گئی ہیں
اور دروازے کی پیشانی پر لکھا ہے — "لمحۂ حال"
بونے! کیا ہم ان سڑکوں پر آگے ہی آگے بڑھتے جائیں
کیا یہ سڑکیں اسی طرح ازلی و ابدی طور پر رواں ہیں؟"
اور بونے نے تحقیر کے ساتھ کہا:
"ہر سیدھی شے جھوٹ ہے
ہر سچائی مڑی ہوئی ہے
وقت بجائے خود ایک دائرہ ہے۔"

میرے لیے اس کتاب کا ہر فقرہ ایک جہانِ معنی کا صدر دروازہ ہے۔ میں اس صدر دروازے میں سے اندر کی کائنات کی ایک جھلک پاتا ہوں اور پھر اس تجلی کی تاب نہ لا کر گھنٹوں ایک دائرۂ نور میں گرفتار رہتا ہوں — یوں وقت گزرتا چلا جاتا ہے۔

ابتداءً یہ زمین بالکل بنجر تھی۔ ایک طرف پانی کا بیابان تھا، دوسری طرف خشکی کا بیابان! پھر پانی کے بیابان میں زندگی کی کلبلاہٹ سی ہوئی اور وہ کروڑوں برس تک اپنے اس INCUBATOR میں پھلتی پھولتی چلی گئی۔ تب ایک اور "زندگی" نے پانی کے شفاف گھونگھٹ کو اپنے چہرہ پر سے ہٹایا تو اسے خشکی کا بیابان دکھائی دیا۔ اور وہ ایک چور کی طرح اس پر دبے پاؤں رینگنے لگی۔ یہ سلسلہ بھی لاکھوں برس جاری رہا۔ پھر یکایک نجانے کیا ہوا کہ کسی نے صورِ اسرافیل پھونکا اور بنجر زمین پر گھاس کی سبز چادر بچھ گئی۔ اور ان گنت رنگوں کے پھول ساری زمین کو ڈھانپنے لگے۔ پھر گھاس کی اس چادر پر انسان کے جدِ امجد نے ڈرتے ڈرتے اپنا پہلا قدم رکھا اور اس گھاس ہی کے خوشے سے کچھ بیج نکال کر کھائے۔ یوں اس نے بصارت بھی حاصل کی اور بصیرت بھی۔ وہ دن اور آج کا دن گھاس اور انسان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسانی معاشرہ بھی گھاس ہی کی طرح ہے دائم ہو تو یہ پھول اور پتیاں اسی فراوانی سے نکالتا ہے کہ مالتھس کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ پھر گھاس کا ایک اور وصف یہ ہے کہ اگر آپ اس پر درانتی چلائیں یا ویسے ہی اپنے ڈھور ڈنگروں کی خدمات سے فائدہ اٹھا کر اسے صاف کر دیں تو ایک معین عرصہ کے بعد یہ دوبارہ زمین کے اندر سے برآمد ہو جاتی ہے۔ یہی حال انسانی معاشرے کا ہے۔ موت کی درانتی ایک پوری نسل پر چل جاتی ہے تو ایک نئی نسل کی سبز پتیاں باہر نکل کر ساری زمین کو دوبارہ ڈھانپ لیتی ہیں اور معاشرے کو ایک بار پھر سبز کر دیتی ہیں۔ والٹ وھٹ مین انہی سبز پتیوں کا شاعر تھا۔ اس نے نسلوں اور موسموں کی آمد و رفت کو دیکھا، حدِ نظر تک پھیلی ہوئی زمین اور حدِ خیال تک پھیلی ہوئی ستاروں کی گزرگاہ کو دیکھا اور اس کے احساس کے افق پر خدا، انسان اور فطرت کی تثلیث ابھر آئی۔ مگر اس نے ان تینوں کو اس طور مربوط کر دیا کہ ساری کائنات اکائی میں ڈھل گئی۔ یہ کام ایک ایسا حساس شخص ہی کر سکتا تھا جس نے ایک وسیع اور کشادہ فضا اور ایک مخلوط معاشرے میں جنم لیا ہو۔ مثل مشہور ہے کہ سرِ انگریز ایک جزیرہ ہے اور ہر امریکی ایک برّاعظم! بات کچھ ایسی غلط نہیں۔ انگریز اس لیے ایک جزیرہ ہے کہ وہ کٹا ہوا الگ تھلگ اور کم آمیز ہے۔ اس قدر کہ ٹرین میں سفر کرتے ہوئے بھی وہ اپنے اور دوسرے مسافروں کے درمیان اخبار کی ایک کھڑکھڑ کرتی ہوئی دیوار کھڑی کر لیتا ہے۔ اور بڑی مشکل سے گفتگو پر آمادہ ہوتا ہے۔ اس نے اپنی سماجی زندگی میں بھی قانون اور قاعدہ، روایت اور رسم و رواج کے متعدد حصار قائم کر رکھے ہیں جو اسے بیرونی اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ جب کہ امریکی مزاجاً ایک برّاعظم کی طرح انجمن آرا اور گپ شپ کا رسیا ہے اپنی اس عادت کے تحت وہ اکثر ہدفِ طنز بھی بنا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کم گوئی یا کم آمیزی کا مرتکب نہیں ہوا۔ اس اعتبار سے وہ برصغیر ہند و پاک کے باسیوں سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ دونوں زمین کی وسعت اور نسلوں کے اختلاط کی پیداوار ہیں اور اسی لیے اپنے معاشرے ہی سے نہیں، سرحد پار کے معاشروں سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ والٹ وھٹ مین اسی امریکی مزاج کا نمائندہ ہے۔

گروہ امریکہ کا کبیتہ سمجھا ہے کہ محبت کا قائل، سرزمین وطن کا عاشق اور روح کی لطافت کا اعلامیہ ہے۔

اگر نطشے کی کتاب آسمان سے نازل ہوئی ہے تو پھر والٹ وھٹ مین کی کتاب گھاس کی پتیاں (LEAVES OF GRASS) کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زمین سے پھوٹی ہے جب ۱۸۵۵ء میں یہ پہلی بار شائع ہوئی تو اس کی ضخامت پچانوے صفحات سے زیادہ نہیں تھی لیکن جب یہ متعدد ایڈیشنوں کے بعد ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی تو اس کی ضخامت خاصی ہو گئی تھی۔ یہ کتاب بڑ کے اس درخت کی طرح تھی جس کی جڑیں شاخوں سے اتر کر زمین میں دھنستی رہتی ہیں۔ اور درخت کے حجم میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یا پھر یوں کہہ لیجیے کہ یہ مجموعہ چھوٹی بڑی لاتعداد نظموں کی آمیزش سے ایک ہی بڑی نظم بن کر نمودار ہوا ہے۔ بعینہ جیسے لاتعداد افراد کے ملنے سے معاشرہ اور انگنت معاشروں کے امتزاج سے نسل انسانی کے خد و خال نمایاں ہوتے ہیں۔

جزیرے میں رہتے ہوئے جہاں مجھے نطشے کی ضرورت ہے کہ وہ مجھے خود آگہی کی ترغیب دے اور بلندی پر سے اشیا کو دیکھنے پر مائل کرے وہاں مجھے وھٹ مین کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ مجھے اپنی ہی ذات کی چکا چوند سے باہر لا کر اور زمین کی سطح پر اتار کر، انسانوں کے جم غفیر کے احساسات سے روشناس کرائے۔ جب تک بدھ بُت کا چھپتا رہے اپنی ہی ذات کی تجلی میں گرفتار رہا، اس کی حیثیت آلپس کی بلندی پر براجمان فریڈرک نطشے سے مختلف نہیں تھی۔ لیکن جب وہ وہاں سے اٹھ کر انسانوں کے درمیان آ گیا اور اس نے محبت، مفاہمت، یکتائی اور ہم آہنگی کا درس دیا تو وہ گویا کبیر یا وھٹ مین کے روپ میں نمودار ہوا ــــ سوچتا ہوں کہ نطشے اور وھٹ مین شگفتگیِ ذات ہی کے دو مرحلے ہیں ایک لمحہ کی تابندگی سے اکتساب نور کرتا ہے، دوسرا اسی روشنی کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ ایک اظہار ہے، دوسرا ترسیل! جزیرے میں رہتے ہوئے محض اظہار کی سطح پر زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اس لیے مجھے ترسیل کی سطح پر بھی اترنا چاہیے تاکہ میں اپنی مسرت اور دکھ میں دوسروں کو بھی شریک کر سکوں یا دوسروں کی مسرت اور دکھ میں خود بھی شریک ہو سکوں۔ مگر والٹ وھٹ مین عظیم امریکی براعظم کی مسرت یا دکھ تک خود کو محدود نہیں رکھتا ــــ بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نسل، رنگ اور قوم کی حدود کو پار کرکے ساری نسل انسانی کے دکھوں اور خوشیوں میں شریک ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے وہ ساری کائنات میں پھیل گیا ہے "گھاس کی پتیاں" میں محبت بیک وقت قانون فطرت بھی ہے۔ اور قانون خداوندی بھی اور اس لیے یہ کرۂ ارض ہی پر نہیں، تاروں سے آگے کے جہانوں پر بھی کمند پھینکنے کی خو دیں سکت اور ہمت رکھتی ہے۔

اے روح!
یہ وہ ساعتِ نایاب ہے جب تو
کتاب، آرٹ، دن اور اسکے اسباق سے اوپر اٹھ کر
ایک بے نطق کائنات میں پرواز کر سکتی ہے۔
اور (اس پرواز کے دوران) تو
ایک خاموش، نووارد تماشائی کی طرح
اُن تمام باتوں پر غور کر سکتی ہے جو تجھے عزیز ہیں
یعنی ــــ رات، نیند، موت اور ستاروں (کی آبجو)

اے جوانی!
بڑی ہی مہربان، ہمت، توانائی اور کشش سے لبریز جوانی!
کیا تو جانتی ہے
کہ تیرے بعد بڑھاپا بھی اسی کر و فر، توانائی اور کشش کے
ساتھ نمودار ہو گا؟

(جیسے)
دن، بھرپور، شاندار ــــ آفتاب، حرکت، آرزو اور
قہقہے سے سرشار دن!

(اور اس کے بعد)
رات، لاکھوں ستاروں کی معیت میں
نیند اور تھکاوٹ کو دور کرنے والی تاریکی کو اپنے (اپنے
کے) ساتھ لگائے ہوئے!

سفر ــــ فوری سفر!
لہو میری شریانوں میں کھولنے لگا ہے

اے روح! لنگر کھول دے
رسیوں کو توڑ
بادبان کو کھول
کیا ہم یہاں درختوں کی طرح زمین میں گڑے نہیں ہیں؟
کیا ہم یہاں حیوانوں کی طرح محض کھاتے اور اونگھتے نہیں رہے ہیں؟
کیا ہم نے یہاں کتابوں سے خود کو تاریک اور بے حس نہیں کر دیا؟

چنانچہ والٹ وھٹ مین کی یہ کتاب مجھے اس لیے بھی پسند ہے کہ یہ مجھے جزیرے سے باہر نکلنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ٹینی سن کے لوٹس ایٹرز نے اپنی تقدیر سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اور جزیرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اونگھنے لگے تھے۔ مگر وھٹ مین کے اندر جذبۂ سیاحت سدا بیدار رہتا ہے۔ ہر امریکی کی طرح اس کے پرے میں بھی کولمبس چھپا ہوا ہے جو اسے نئی نئی سرزمینوں کی تلاش پر اکساتا رہتا ہے۔ میرے لیے جزیرے کے قیام کے دوران وھٹ مین کی معیت میں نئی نئی سرزمینوں کو دریافت کرنے کی مہم ایک ایسا خوشگوار تجربہ ہے۔ جس سے میں کبھی اکتا نہیں سکتا۔ اس کی ہمراہی مجھے اس لیے بھی عزیز ہے کہ وہ زندگی کی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے گھاس کی ہر پتی، درخت کی ہر شاخ، پہاڑ کے ہر ٹکڑے، اور سمندر کی ہر موج میں دل چسپی لے سکتا ہے اور پھر مجھے زمین سے اوپر اٹھا کر ایک ایسا منظر بھی دکھا سکتا ہے جس میں شاخیں، پتیاں، موجیں اور خم زندگی کے ایک ہی وسیع و بے کنار جزرومد میں پوری طرح ضم ہو چکے ہیں۔ آگے بڑھ کر جزو کو مرکز نگاہ بنانا اور پھر پیچھے ہٹ کر اس سارے پس منظر کو دائرۂ نگاہ میں سمیٹ لینا جس میں جزو محض ایک موہوم سا نقطہ ہے —— بس یہی والٹ وھٹ مین کے مووی کیمرے کا کمال ہے اور یہی اس کا کمال فن بھی ہے!

اور اب کہ جزیرے میں رہتے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ جزیرے کا یہ "باغ بہشت" ایک زنداں سے مختلف نہیں —— زنداں کیوں کہ انسان دکھ کی قید ہی سے نہیں مسرت کی قید سے بھی اکتا سکتا ہے (انسان کے جد امجد کا باغ بہشت سے باہر آنا اب سمجھ میں آیا ہے) میں بھی اس جزیرے سے نجات کے اس بندی خانے سے باہر نکلنے کا آرزو مند ہوں۔ اس کے لیے میں تمام عمر پیچھے نوح کی طرح ایک کشتی تیار کرتا رہا ہوں جسے چلانے کے لیے میں نے تین ملاحوں کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں۔ اگر یہ ملاح آپس میں دست و گریباں نہ ہوئے یا میں ان سے لڑ نہ پایا تو آپ دیکھیں گے کہ میں آئندہ برس تک اس سرزمین کو ضرور تلاش کر لوں گا جہاں سے میں نے اپنے سمندری سفر کا آغاز کیا تھا اور جہاں میرے عزیز و اقارب اور دوست احباب ایک زمانے سے میری واپسی کے منتظر ہیں!! ●●

عبدالرحیم نشتر

اپنی کہانی

اگر سن سکو میرے غم کی کہانی تو
پردیس سے آنیوالی ہواؤں سے پوچھو وہ
تخ بستہ کیوں ہیں ——— ؟ انھیں
کیوں حرارت سے محروم رکھا سیہ سرد
راتوں کا مقسوم رکھا۔ وہ کیوں سر بریدہ'
پریشان، بھٹکتی ہیں بے چین روحوں
کی کالی زمیں پر جہاں چلتی پھرتی ہوئی
زندہ لاشیں، عداوت، رقابت، تعصب
کے گہرے اندھیرے میں دل کا سکون ڈھونڈتی
ہیں مگر نارسیدہ ہواؤں سی حیراں پریشاں
زمیں آسماں ایک کرتی ہوئی زندہ گھومتی
ہیں۔
اگر اس ٹھٹھرتی ہوئی شب کی بھیگی
رگوں میں ذرا دیر ٹھہرو۔ ——— ہواؤں
کے نیزوں کو اپنا بدن سونپ دو تو میں
کیوں تر بتر ہوں اپنے لہو میں مرا درد کیا
ہے۔ مرا درد کیوں ہے یہ سب جان لوگے
یہ میرے سراپا میں ڈوبا ہوا کس کا پیکر
ہے۔ پہچان لوگے۔

شاہین بدر

پت جھڑ

ہم پت جھڑ ہیں
کیاری کیاری خون جگر سے سینچتے ہیں
آشاؤں کے دیپ جلا کر
جلادوں کے خنجر جیسی کالی رات کی چھاؤں میں
نگہبانی کرتے رہتے ہیں
اور ہمارے خون کی رنگت جب پودوں کی رگ میں آجاتی ہے
غنچہ غنچہ کھل اٹھتا ہے
قبل اس کے کہ ہم مسکائیں
فصل بہاراں
اپنا دست ہوس پھیلا کر لوٹتی ہے گلشن کی نکہت
قہقہہ غنچہ غنچہ اٹھتا ہے ———
برگ و شجر کانپ اٹھتے ہیں
اور ہماری قسمت سے وابستہ
سوکھے پتے رہ جاتے ہیں!

عبداللہ کمال

جہنم پنپتا ہے

پسلیوں کی ٹٹیس
مادر زاد ننگی
میرے اندر اک جہنم پنپتا ہے
پسلیوں کی ٹٹیس ہٹا کر
اختلاط آسودہ عورت
دھند میں لپٹی کرن ہے
پسلیوں کی ٹٹیس مادر زاد ننگی
میں جہنم کو جنم دوں
اختلاط آسودہ عورت کو نکالوں
یا ابھی ان پسلیوں کی ٹٹیں کو ڈھک دوں؟

اختر بستوی

مار آستیں

بلاؤں کی فراوانی ہے اور آفات کی کثرت
مصیبت ہی مصیبت ہے جدھر نظریں اٹھاتا ہوں
ہمیشہ اک تڑپ سی جاگزیں رہتی ہے سینے میں
نہ دن کو چین آتا ہے نہ راحت شب کو پاتا ہوں
مصائب لاکھ ہوتے ہیں نہ بیتابی مجھے ملتی
حقیقت یہ ہے محسوسات نے میرا سکوں کھویا
خلش قلب و جگر کی فطرتِ حساس نے دی ہے
زرا احساس میری آستیں کا سانپ ہے گویا

شاہد عزیز

زیست کے مکانوں میں

جانے کتنی صدیوں سے
اک طویل تنہائی
ایک گہرا سناٹا

رات ہے نہ دن کوئی
وقت ہے نہ سایہ ہے
کھڑکیاں نہ دروازہ

زیست کے مکانوں میں
پھر بھی لوگ رہتے ہیں

سلیم شیرازی

آکاش رچنا

اور پھر یہ ہوا
سارے موتی اور امرت
جو
ساگر کو متھ کر نکالے گئے تھے
اٹھا کر
سبھی چل دیے

اور پھر
کسمپرسی کی حالت میں
روتا ہوا
اپنی آنکھوں میں
اپنائے جانے کی اک کامنا سی لیے
زہر فریاد کرتا رہا
اور میں
بڑھ کے وہ سارا زہر
ایک ہی سانس میں پی گیا
اور
وہ زہر پیتے ہی میں
آسماں بن گیا —

عقیل شاداب

مجھے یہ ادنیٰ کرشمہ کبھی دکھا تو سہی
تو اپنے خول سے باہر نکل کے آ تو سہی

میرے گمان پہ چھا جا کبھی خدا بن کر
مرے یقین کے قدموں کو ڈگمگا تو سہی

مرے خلوص محبت کا کچھ پتہ تو چلے
جو ہو سکے کبھی تجھ سے مجھے بھلا تو سہی

گھٹن سے گھر کی کبھی تو فرار حاصل کر
ندی کی دھار میں کھل کر کبھی نہا تو سہی

ابھی تو دید کی لذت سے روشناس نہیں
کسی کو دیکھ کے کھڑکی میں کھلکھلا تو سہی

یہ تیرے جسم کا پودا نہ سوکھ جائے کہیں
زمیں سے جو نکلا ہے تو لہلہا تو سہی

میں اور چھور ترے ناپ ہی سکوں شاید
مجھے ہواؤں میں اپنی کبھی اڑا تو سہی

سلگ اٹھوں گا میں سگریٹ کی طرح شاداب
مجھے بھی بھول کے اک روز منہ لگا تو سہی

منظور ہاشمی

خواب کے جسم میں سورج کے جو نشتر اترے
خون میں ڈوبے ہوئے صبح کے منظر اترے

دل میں بیتاب تمناؤں کے چشمے پھوٹے
آنکھ میں ہاری ہوئی فوج کے لشکر اترے

پار جانے کا کوئی اور طریقہ ہی نہ تھا
چڑھتے دریا میں بہت سوچ سمجھ کر اترے

ہم سے قائم ہے ابھی سنت ابراہیمی
ہم ہی ہر جلتی ہوئی آگ کے اندر اترے

تیز پانی کے مسافر ہیں ہمیں کیا معلوم
کس کی منزل ہے کہاں کون کہاں پر اترے

انیس اشفاق

میرے اندر کی گھٹن مانگ رہی ہے پھیلاؤ
اس قدر ٹوٹ کے چاہو کہ بکھر جاؤں میں

تیشے چمکاؤ تراشو یہ صداؤں کے پہاڑ
اپنی آواز کے اندر ہی سنور جاؤں میں

یوں نہ پگھلاؤ یہ آہن، کہ بدن کھلتے ہی
آگ کے شعلوں کی دیوار پہ مر جاؤں میں

زہر ہی زہر ہیں سورج کی یہ ساری لہریں
تیرگی کے ہی سمندر میں اتر جاؤں میں

اک صدی ہو گئی بے چہرگی کا زخم لیے
شیشے چمکیں تو کہیں خود سے نہ ڈر جاؤں میں

ونود اشک

زندگی؟ نہیں نہیں بزم میں، اجاڑ میں
واہمے تراشیے واہموں کی آڑ میں

بے شمار زلزلوں کے بعد بھی حیات ہے
کہاں کی خاک جذب ہے سانولے پہاڑ میں

کہیں نہیں وہ سرکشیں کہیں نہیں کہیں نہیں
آ کے جان ڈال دیں جو سو گئے کواڑ میں

کتنا بدنما ہے تاڑ چھاؤں ہے نہ حسن ہے
خود سے تو دیکھیے کیا نہیں ہے تاڑ میں

منجمد ہے رات اک، عذاب ہے نہ ڈھل سکی
نہ پوہ میں نہ ماہ میں نہ جیٹھ میں اساڑ میں

ہو سکے تو روک لو جتنا جلد ہو سکے
لوگ بہہ رہے ہیں اشک آنسوؤں کی باڑ میں

ساجد اثر

تم نے شیرازۂ امید بکھرنے نہ دیا
خود کو احساس کے زینے سے اترنے نہ دیا

بدنصیبی کے دھندلکوں نے، مرے ہونٹوں پر
مسکراہٹ کی لکیروں کو اُبھرنے نہ دیا

پیش قدمی کا سزاوار میں ہوتا کیسے؟
ساجدؔ جب تیری محبت کی نظر نے نہ دیا

میں نے رفتار کی تیزی سے کیا پیار، مگر
میری منزل کا پتہ میرے سفر نے نہ دیا

ایک گونگے نے، چھپانے کے لیے راز اپنا
لب کشائی، سے مجھے مشورہ کہنے نہ دیا

نرمئ وقت نے، کوشش کے دیاروں میں مگر
کامیابی کے سفیروں کو ٹھہرنے نہ دیا

مہدی پرتاپ گڑھی

مشیروں نے مجھے دریائے خوں میں ڈال دیا
مری انا نے مگر سطح پر اُچھال دیا

نہ حل نکال سکے ناقدانِ دردِ حیات
ہمارے عہد کو دنیا نے وہ سوال دیا

نگل لیا تھا اندھیرے نے بے نیازی کے
تری نگاہ نے آخر مجھے سنبھال دیا

کسی کا حسنِ توجہ بہت گراں گزرا
ہر ایک زخمِ جگر نے لہو اچھال دیا

ہماری فکر نے روشن کیے وہ فن کے چراغ
کہ جس نے چہرۂ الفاظ کو اجال دیا

وہ لمحہ موت بھی آساں نہیں تھی جب مہدی
کسی نے جینے کا مجھ کو نیا خیال دیا

ظہیر غازیپوری

بہت قریب سے دیکھا تو آشنا سا لگا
جو غیر لگتا تھا مدت سے آج اپنا لگا

بس ایک بار ہی کھنکا تھا چوڑیوں کی طرح
پھر اس کے بعد نہ سازِ حیات اچھا لگا

مری نگاہ سے اک بار دیکھنے کے بعد
مجھے بتاؤ تمہیں میرا شہر کیسا لگا

مرے وجود کی وابستگی سے پا کے فروغ
وہ پاس آیا تو میرے لہو کا پیاسا لگا

عجیب ہے مرا دل بھی کہ جب پکارا ہے
خود اپنے آپ سے مجھ کو خفا خفا سا لگا

سید حبیب

کسے یاد کر رہا ہے دلِ بےقرار سوچا　　وہ نہیں ہے تیرے بس میں نہ اسے پکار سوچا
یہ جو اشک بہہ رہے ہیں یہی تجھ سے کہہ رہے ہیں　　ترے باغ میں نہ آئے گی کبھی بہار سوچا
گیا بیت وہ زمانہ اُسے اب نہیں ہے آنا　　کسی بے وفا کا کیوں ہے تجھے انتظار سوچا
وہ کسی کے ہو چکے ہیں ترے بھاگ سو چکے ہیں
تجھے اب نہیں ہے اُن پر کوئی اختیار سوچا

کنور سین حسرت

لامتناہی لمحہ

کچھ بھی نہ سوچنے کی لگاتار کوشش کے باوجود کچھ سوچے چلے جانے سے تنگ آ کر وہ صوفے سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ بالکنی میں کھڑے ہوتے ہی ڈھلتے سورج کی اپنے آپ میں سمٹی سکڑتی روشنی نے اسے اور بھی بیزار کر دیا — ابھی دیواریں مٹیالی ہونے لگی ہیں۔ شام کا پھیلتا ہوا آغوش صبح کی گود میں مچلتی سنہری کرنوں کی یاد کو کس قدر شدید کر دیتا ہے۔ لگتا ہے اپنے آپ سے کٹ کر کوئی دور کی اجنبی اور سونی دھرتی — کمرے کے اندر دل و دماغ کو ڈسنے والا بوجھل احساس اسے یہاں بھی جکڑنے لگا تو وہ گھبرا گیا — پتہ نہیں آج کل مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کوئی بھی ایک خیال یادوں کے لمبے سلسلے کی جانب کھینچ لے جاتا ہے۔ ہر ایک لمحہ مجھ سے یوں چپک جاتا ہے جیسے میرے وجود ہی کا — سورج تو باہر بھی اپنا وجود کھو رہا ہے۔ گھر کا اندر باہر بھی — اپنے آپ کو دوبارہ کسی چنگل میں سرکتے دیکھ کر وہ پشیمان ہوا اٹھا اور اس نے چاروں طرف سے گھرتی آ رہی اکتاہٹ کو جھٹک پھینکنے کے لیے جماہی لینی شروع کی تو دیکھا اس کا بیٹا راجو نیچے گلی میں مالک مکان کے لڑکے نیٹو کے ساتھ کنچے کھیل رہا ہے سب کچھ بھول کر وہ ابل پڑا۔ جی میں آئی کہ زناٹے دار گالی دے کر اسے اوپر بلائے اور کراری ڈانٹ پلانے کے بعد دو چار چانٹے بھی رسید کر دے۔ — ابھی نہ روکا تو جواری بن جائے گا۔ بری عادت پڑ جاتی ہے تو چھوٹتی نہیں۔ پڑھائی لکھائی سے جی چرانے لگے گا۔ روٹی کمانے لائق تو ہونا ہی چاہیے۔ اس کی ماں ٹھیک کہتی ہے۔ سختی نہ کرنے سے بچے بگڑ جاتے ہیں کتنی بار سمجھایا ہے مگر — وہ آواز دینے کو ہوا تو راجو اپنی باری کھیلنے کے لیے زمین پر پانو کے بل بیٹھ چکا تھا بیٹے کو کچھ کرتے ہوئے دیکھنے کے خیال نے اس کے منہ پر تالا لگا دیا اور پھر وہ اپنے آپ تک محدود ہو گیا۔ گرد و پیش سے بے خبر۔ جرم و سزا کے احساس سے آزاد بیٹے کو کنچے کھیلنے میں مست دیکھ کر وہ خود کو کوسنے لگا — بچپن کی لاپرواہی کتنا بڑا وردان ہے۔ آزاد لمحوں کی زنجیر — سورج کے اگنے یا ڈھلنے سے لاتعلق۔

دیواروں پر سے غائب ہوئی دھوپ کو کہیں دور کھوجنے کی بے سود جستجو میں کھویا وہ صبح بس سٹینڈ پر راجو کی عمر کے لڑکے کے موت کے منہ سے بال بال بچنے کا سوچنے لگا۔ دفتر میں فائل پر سر جھکائے بھی اس دہشت ناک منظر کا خیال کر کے وہ کئی بار کانپ اٹھا تھا — لڑکا وہاں کھڑی ٹیکسی کے ڈرائیور کو چڑاتا ہوا ہی ہی کرتا پیچھے ہٹتے ہٹتے سڑک کے عین بیچ میں پہنچا کہ دائیں طرف سے بس آ گئی۔ لگتا تھا پوری رفتار سے بھاگتی ہوئی گاڑی اسے کچل گئی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ مسافروں کے منہ ڈر سے کھل گئے تھے۔ لائن میں کھڑی چند عورتوں میں سے ایک کی تو چیخ نکل گئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے لڑکے کو صحیح و سلامت کھڑے دیکھا تو سب کی جان میں جان آئی۔ وہ اور کئی دیگر آدمی اسے ڈانٹنے لگے مگر لڑکا ان کی جانب دھیان دینے کی بجائے پھر سے ڈرائیور سے مذاق کرنے لگا تھا — چھوٹی عمر میں اپنے کو چھو کر گزرتی موت کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ عمر کے ڈھلتے ہی ڈوری ہاتھ سے نکلتی محسوس ہونے لگتی ہے۔ صحن میں پھیلی دھوپ دیواروں پر سے ہوتی ہوئی آدمی کو ان چاہے سایوں کے حوالے کر دیتی ہے۔ سردی بڑھنے لگتی ہے اردگرد یخ بستہ ہونے لگتا ہے۔ عین دل کے بیچ کوئی کیڑا رینگنے لگتا ہے جو اندر ہی اندر سب کچھ کترتا رہتا ہے۔ بے نام سا خوف دامنگیر ہو جاتا ہے۔ منہ کا ذائقہ کسیلا رہنے لگتا ہے۔ جرم و سزا، گناہ و ثواب دل و دماغ پر کنکھجورے کی طرح چپک جاتے ہیں۔ سانس تک لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ بے پروائی اور بے نیازی بے وفا دوست کی مانند ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ وقت کا بے حس ہاتھ گردن کے گرد شکنجہ — وہ لرز اٹھا اور سہم کر نیچے گلی میں کھیل رہے اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے لگا —

راجو نے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا زمین پر ٹیک چکا تھا۔

انگوٹھے کا ضرورت سے زیادہ حصہ زمین کے ساتھ لگا دیکھ کر وہ غصے میں آنے لگا ـــــ انگوٹھے کی پہلی پور کو ناخن کی تیز دھار تک ہی زمین پر لگانے سے بات بنتی ہے۔ بیوقوف کہیں کا۔ کنچے ایسے تھوڑی جیتے جاتے ہیں۔ ہر بات کو کرنے کا ڈھنگ ہوتا ہے۔ اسے نہ اپنایا جائے تو بازی مات ہو جاتی ہے ـــــ وہ ٹھٹھک گیا ـــــ بازی کی تو ساری بات ہے۔ کنچے کھیلنا اچھا ہے نہ برا۔ برا تو بس ہارنا ہے جیت کہیں بھی ہو اپنے آپ میں ایک دھندا ہے۔ پردیپ بھی یہیں مار کھاتا تھا۔ وہ بچپن میں لوٹنے لگا ـــــ ہمیشہ بازی ہار جاتا تھا۔ انتہائی دلکش ناک نقشے والا۔ گانے بجانے کا رسیا۔ خوبصورتی کا دلدادہ۔ بے حد لاپرواہ اور لاابالی طبیعت والا۔ معصوم اور منہ سوڈ۔ مگر بازی کھیلنے کا گُر نہیں آتا تھا۔ جوانی میں قدم رکھتے ہی سب مٹی ہو گیا۔ زندگی کا ہلکا سا تھپیڑ بھی برداشت نہ کر سکا۔ جان۔ بیوی اور دو بچوں کو بلکتے چھوڑ کر پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ یہ اچھا نہیں ہے۔ ایسا کرنا پاپ ہے۔ میں یہ ناانصافی کبھی نہیں کر سکتا۔ کسی کی زندگی سے کھیل کر ـــــ دوسروں کی زندگی کا اتنا خیال کرنے والا اپنا ستیاناس کر بیٹھا ـــــ ارے!

راجو کو بائیں ہاتھ میں کنچا سنبھالتے دیکھ کر وہ چلّانے کو ہوا ـــــ گدھا ہے۔ ابھی تک نہیں جان پایا۔ انگوٹھے کو اس کے ساتھ والی انگلی سے کس طرح متعلق کرتے ہیں۔ کاش روشی یہاں ہوتا وہ اسے سکھاتا۔

روشی! غضب کا نشانے باز۔ زمین پر انگوٹھا ٹیکتا۔ بائیں ہاتھ میں پکڑا کنچا دائیں ہاتھ کی بڑی انگلی پر ٹکاتا اور دور پڑے دشمن کے کنچے کی سیدھ پر رکھنے کے لیے اپنی بائیں آنکھ بند کرتا تو سب سہم جاتے۔ کنچا اس کے ہاتھ سے نکلتے ہی عین نشانے پر جا لگتا۔ پڑھائی لکھائی میں کورا، کنچے کھیلنے میں طاق۔ رات پڑنے سے پہلے ہی سب کی جیبیں خالی کر دیتا۔ جراب کی بنی تھیلی میں مال بھر کر گلی گلی گھومتا ہوا چیلنج کرتا پھرتا۔ ہر کوئی اس کی تھیلی میں پڑے رنگ برنگے بلوروں کو رشک اور حسد کی نظروں سے دیکھتا ہوا اندر ہی اندر جلتا اور بل کھاتا رہتا۔ رات کو بستر میں پڑا ہارے ہوئے کنچوں کو یاد کر کے کروٹیں بدلتا ہوا روشی کے ہاتھ کا جادو حاصل کرنے کی ترکیب سوچتا رہتا۔ ہم سب کہتے ـــــ لے لے ہماری پڑھائی لکھائی۔ بدلے میں ہمیں اپنی مہارت دے دے۔ ہمارے ماں باپ خواہ مخواہ ہمیں اس کے ساتھ کھیلنے سے روکتے رہتے ہیں۔ وہ اتنا برا بھی تو نہیں۔ دوستی کے نام پر ایک دو کنچے واپس بھی کر دیتا ہے۔ جیت کا مال واپس کرنے کی خوشی بھی تو اس کی قسمت ہی میں ہے۔ ہر طرف سے آزاد ہے۔ نہ ڈر نہ شرم، ہرے پیلے نیلے، گلابی، سرخ بلور اکٹھے کرنے میں مست ـــــ بازی جیتنا نہ جانتا ہوتا تو ایک بھی امتحان پاس نہ کر سکتا۔ ہر سوال کا جواب بتلانے کا مول چار کنچے۔ امتحان کے کمرے سے باہر نکلتے ہی واپس جیت لیتا۔ پھر بھی بازی کھیلنے کا موقع تو دیتا ہی تھا۔ ہار میں اپنا مزہ ہوتا ہے۔ کیا ہوا جو بی۔اے۔ ایم۔اے۔

پڑھ لکھ کر ہم نے کون سا تیر مار لیا۔ نوکری میں گذر بھی نہیں ہوتا عیش و عشرت کا ذکر ہی کیا۔ کسی نہ کسی چیز کی کمی بنی رہتی ہے۔ بچے راضی نہ بیوی خوش۔ ماں باپ کے طعنے الگ۔ چھوٹے بہن بھائی امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ روشی راجہ بنا بیٹھا ہے۔ ہم سب کو بمبئی موج منانے کی دعوت دیتا ہے۔ آوارہ گردی کے شوق میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔ چار دن دھکے کھانے کے بعد ہی سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ ساری عمر کتابوں سے ماتھا مارنے پر بھی کچھ نہ سیکھ پاتا۔ ہم میں سے ایک بھی اس کے مقابلے کا نہیں۔ کار میں گھومتا ہے۔ سیٹ کی پشت پر ولایتی شراب کی بوتل رکھی رہتی ہے۔ کہتا تھا پنجاب میں دیسی شراب کے سبھی ٹھیکے لے لوں تو بات بنتی ہے۔

بمبئی پہنچتے ہی اپنے بڑے بھائی کو بلا کر کہا تھا ـــــ یہ جوانی اور توانائی کہاں کام آئے گی رات بھلا اپنے محلے میں پڑ جاؤں گا۔ لوگ مجھے روکنے آئیں گے۔ لوگ کون سے۔ وہی نتھن دادا کے پالتو کتے۔ ان کی نہیں سنوں گا۔ نتھن دادا خود کھولی سے نکل کر گالیاں دینے لگے گا۔ میری جانب جھپٹے گا۔ وہی موقعہ ہے، ننگی تلوار لے کر کود پڑنے کا۔ قد کاٹھ میں دیو جیسا نظر آتا ہے۔ اندر سے کھوکھلا ہے۔ تمہارے ڈھول کی مار نہیں۔ کاٹ دینا کتے کی ٹانگ بازو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ علاقے کی پولیس اسے ختم کرنا چاہتی ہے۔ انہیں حصہ جو نہیں دیتا۔ میں نے دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ نقلی شراب کا دھندا ہاتھ میں آتے ہی لاکھوں میں کھیلنے لگیں گے۔ بھوکوں مر رہے ہیں ـــــ

کیا کام کیا ہے سالے نے۔ اب ہر سالے دھندے میں اس کا حصہ ہے۔ سمگلر کنگ کہلاتا ہے۔ دنیا بھر کی (باقی صـــ پر)

آنند لہر

وقت

وقت چل رہا ہے یا گھڑی چل رہی ہے - یہ ایک سوال ہے۔ سڑک بھی چلتی ہے اور گاڑی بھی چلتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سڑک ایک ہی بار چلتی ہے اور گاڑی اس پر زندگی بھر چلتی رہتی ہے۔ سڑک جتنی چلتی ہے اتنی ہی لمبی ہو جاتی ہے۔ اس کا وجود اتنا ہی بڑا ہو جاتا ہے لیکن گاڑی ہزاروں میل چلنے کے بعد بھی اتنی ہی رہتی ہے گاڑی کا وجود کبھی بڑا نہیں ہوتا لیکن گاڑی کے لمبے وجود کی وجہ سڑک ہے۔ سڑک اپنے وجود کو لمبا کر کے گاڑی کے سفر کو لمبا کر دیتی ہے۔ لیکن گاڑی لمبا سفر کرنے کے باوجود اپنے وجود کو بڑا نہیں کر سکتی۔

وقت جتنا چلتا ہے۔ اتنا ہی بڑا ہو جاتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن گھڑی کا اپنا ایک محور ہے۔ وقت جب چلتا ہے۔ تو تازہ ہو جاتا ہے۔ اس کا ہر لمحہ ایک نیا لمحہ ہے۔ گھڑی جب چلتی ہے تو پرانی ہوتی جاتی ہے۔ لگتا ہے کہ ہم سب گھڑیاں ہیں۔ جو اپنے علم کی سوئیوں میں وقت کی رفتار کو گرفتار کر کے اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں ہماری یہ چاہ ہی ہمارا شعور ہے۔ اور یہی شعور نئی کھوج کا ذمہ دار بھی ہے۔

وقت چلتا ہے تو گھڑی چلتی ہے یا گھڑی چلتی ہے تو وقت چلتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ گھڑی چلے نہ چلے، لیکن وقت چلتا ہے اور وقت کی کوئی بھی رفتار ہو ہم گھڑی کی سوئیوں کو جس طرح چاہیں گھما سکتے ہیں۔ لیکن یہ صرف ذہن ہے جو گھڑی اور وقت کے درمیان ایک باقاعدہ تعلق بنائے رکھتا ہے۔

پھر وقت بھی تو ایک گھڑی ہے۔ جو صبح شام۔ دن۔ رات کے روپ میں چلتا رہتا ہے۔ لگتا ہے یہ بھی کائنات کی عظیم طاقت کی گھڑی ہے۔

محسوس ہوتا ہے دنیا میں گھڑیاں ہی گھڑیاں ہیں وقت نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور وقت کو گھڑیوں نے پیدا کیا ہے ——— دن رات۔ مہینے سال اور گنتی بنائی ہے اور انسانی ذہن اسی گنتی میں الجھ کر رہ گیا ہے۔

خیر مجھے تو تین بجے پہنچنا ہے۔ ممکن ہے آج کام ہو جائے۔ ایک بات یاد آگئی۔ ایک بار ایک آدمی کینسر کا علاج ڈھونڈنے لگا۔ اور تین سال بعد دوسرا آدمی بھی کھوج کرنے لگا۔ لیکن جس نے پہلے کھوج شروع کی اس کا کام مکمل ہونے ہی والا تھا کہ دوسرے نے کینسر کا علاج ڈھونڈ لیا۔ پہلے کوئی نہیں جانتا۔ اس کا نام کسی جگہ لکھا نہیں جائے گا۔ وقت کہاں انصاف کرتا ہے! یا اس سے انصاف ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک آدمی تیس سال کی عمر میں مر گیا جو جینا چاہتا تھا۔ اور اسی گلی میں ایک آدمی کی عمر ایک سو پچیس سال ہے۔ لیکن وقت اسے مارنا نہیں چاہتا۔ وقت کی بے انصافی دیکھو۔ شاید اس کی بے انصافی ہی اس کا انصاف ہو۔

لیکن مجھے تین بجے گیسٹ ہاؤس پہنچنا ہے۔ جہاں میرا انٹرویو ہے۔ تین بجنے میں کتنا وقت باقی ہے؟ میرے پاس گھڑی نہیں ہے کس سے پوچھوں ہر شخص مصروف ہے۔ اور پھر چلتے چلتے پانچ دس منٹ کا فرق تو لوگ بتا ہی دیتے ہیں۔ اور مجھے صحیح وقت چاہیے۔ اگر وقت تھوڑا رہ گیا ہو تو میں ٹیکسی کر لوں۔

مشینی زندگی کی یہ خاصیت ضرور ہے اگر گھڑی کی رفتار آدمی کی رفتار سے آگے نکل جائے تو ٹیکسی اس کو پورا کر سکتی ہے اگر فاصلہ دنوں کا ہو تو ہوائی جہاز۔ مشینی زندگی کشمکش اور مقابلہ کی زندگی ہے۔ یہ ایک عجیب سی دوڑ ہے۔ اور ہم سب اپنی قوت کے مطابق مشینیں لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے اور یہاں تک کہ وقت سے بھی آگے اور اپنے آپ سے بھی آگے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے آواز سے بھی تیز چلنے والے ہوائی جہاز

دلی

ترقی کی شاہراہ پر

گزشتہ تین سالوں کے کارنامے

صنعت

نریلا میں نئی صنعتی بستی قائم کی جا رہی ہے جہاں ایک ہزار بے روزگار انجینئروں کے لیے ۸۶۲ صنعتی شیڈ زیر تعمیر ہیں

پانچ لاکھ افراد کو روزگار فراہم کرنے کا پروگرام

اس پروگرام کے تحت تقریباً ۱۹ ہزار تعلیم یافتہ بیروزگاروں کو روزگار فراہم کرنے والی ۵۶ نئی اسکیموں پر عمل درآمد ہو رہا ہے اور دیہی علاقوں کے بیروزگاروں کے لیے انقلابی پروگراموں پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔ اس سال بیس لاکھ روپے کی لاگت سے خصوصی روزگار اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔

تعلیم

دلی میں تعلیم کو کام، تجربہ اور سائنس کے اعتبار سے مکمل بنانے کے لیے ترجیحی پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔

ہریجنوں کی فلاح بہبود

ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو اضافی اسکیمیں چوتھے پلان میں مخصوص تھیں ان کی تعداد دوگنی کر دی گئی۔ اور ۲۰۰ ہریجن بستیوں کا سدھار کیا گیا۔

طبی سہولیات

۱۹۷۳-۷۴ء میں پسماندہ اور جھگی جھونپڑی علاقوں میں مزید دس نئی ڈسپنسریاں کھولی گئی ہیں اور اس طرح ڈسپنسریوں کی تعداد بڑھکر ۵۰ ہو گئی ہے۔ اور ۵۰۰ — ۵۰۰ بستروں والے دو اسپتال زیر تعمیر ہیں۔

کسانوں کو راحت

کسانوں کو راحت پہنچانے کے لیے ایجنسیاں قائم کی گئی ہیں جو چھوٹے کسانوں کو مالی امداد اور کم سود پر قرضے دیتی ہیں۔

زیادہ دودھ دینے والی اچھی نسل کی گایوں کا فارم اور "مادہ منویہ بنک" قائم کیا گیا ہے۔

دلی کے پانچویں پنجسالہ منصوبے میں سماج کے کمزور طبقوں کی فلاح و بہبود، بیروزگاری کو ختم کرنے، گندے علاقوں کے سدھار، مکانات کی فراہمی اور زیادہ سے زیادہ شہری سہولیات مہیا کرنے کے کام کو ترجیح دی گئی ہے۔

دلی کو مثالی راجدھانی بنانے میں
اپنا بھرپور تعاون دیجیے

جاری کردہ:- محکمۂ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ —— دلی

شمسی طہرانی

ادب کے بنیادی عناصر اور محرکات

ایک تجزیہ

ڈیوڈ ڈیچیز (DAVID DAICHES) کے قول کے مطابق ادب کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جا سکتی ہے۔ اور ادب کے متعلق نظریات عہد بہ عہد بدلتے رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے:-

FOR LITERATURE IS A COMPLEX PHENOMENON DIFFERENT ASPECTS OF WHICH ARE SEEN AND EMPHASIZED BY DIFFERENT AGES (CRITICAL APPROACHES TO LITERATURE)

لوگ عام طور پر فنِ ادب اور ادب کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ دونوں میں بیّن فرق موجود ہے۔ دراصل فن کا لفظ کئی طرح استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم فنونِ لطیفہ کے علاوہ کھانے، پکانے کے فن، فنِ جنگ، فنِ اشتہار اور دوسرے سیکڑوں فنون کا ذکر کیا کرتے ہیں لیکن اس لفظِ فن کا مرکزی مفہوم ہر جگہ ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی اس کا مفہوم مہارت یا ہنرمندی (SKILL) ہے اور اس ہنرمندی کا عمداً اور قطعیت کے ساتھ استعمال خاطر خواہ نتائج بھی برآمد کرتا ہے۔ فنِ ادب سے مراد صرف تخلیقِ ادب کا فن ہی ہو سکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہنرمندی یا مہارت کے مختلف درجے ہوتے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ ادب میں زبان کی ہنرمندی اعلیٰ سطح کی ہوتی ہے۔ جس میں گفتگو کی بہ نسبت زیادہ احتیاط، زیادہ ترتیب و تسلسل اور مقصدیت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ادب میں ہنرمندی کا اظہار صرف الفاظ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جب کہ گفتگو میں الفاظ کے ساتھ شخصیت سے بھی اس ہنرمندی کا اظہار کیا جاتا ہے یہاں تک کہ کبھی کبھی شخصیت کا استعمال الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ادب کو باوازِ بلند پڑھا جائے یا خاموشی سے۔ مگر اس کا فنی تاثر ہر حالت میں یکساں ہی رہتا ہے۔ مثلاً نظموں کو زور سے پڑھا جا سکتا ہے اور گراموں کو کھیلا بھی جا سکتا ہے۔ مگر ان کا تاثر فنی اعتبار سے ایک ہی رہے گا۔ اس لیے ادب سے ہماری مراد صرف لکھے ہوئے یا چھپے ہوئے الفاظ ہی نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ جو لفظ آنکھ کے لیے قابلِ فہم ہے وہ دراصل کان کے لیے ایک علامت ہوتا ہے۔ یعنی جو لفظ درحقیقت سنا جاتا ہے (خواہ ذہنی طور پر) وہ ایک ہی ساتھ آنکھ سے پڑھا بھی جاتا ہے۔ مزید برآں ادب کے فن جیسے شاعری وغیرہ میں بڑی حد تک الفاظ کا واضح طور پر سنا جانا خواہ وہ ذہنی طور سے سنے جائیں اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ان کا سمجھا جانا جب ہم یہ سمجھ لیں کہ فنِ ادب کے معنی اظہار ہیں تو اس سے مراد ایسے اظہار سے ہوتی ہے جو قابلِ ابلاغ ہو۔ یعنی فن کار اپنے اظہار میں کسی چیز کا ابلاغ کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس کا ابلاغ کرتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ یعنی وہ چیز "تجربہ" ہے۔ ایسا تجربہ جو صرف اس لیے مسلم و مقتدر ہے کہ وہ محض تجربہ ہے۔ اور یہ بات تسلیم کر کے ہم اس کو "خالص تجربہ" کا نام دے سکتے ہیں لہٰذا ادب کا معاملہ دراصل خالص تجربہ کا معاملہ ہے۔ مگر یہ خالص تجربہ ادب کے دائرۂ عمل پر کوئی پابندی عاید نہیں کرتا۔ زندگی میں کوئی واقعہ بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو تجربہ نہ کہا جا سکے اور ہر کوئی قدم خود تجربہ کی بنا پر ہو۔ یہ بات ہمیں نظریۂ ادب کی ایک اہم اصولی بحث تک پہنچا دیتی ہے۔ بظاہر اس معمولی سی بات سے کہ ادب خالص تجربہ کے اظہار کا نام ہے۔ دراصل ہمارے سارے ادبی نظریے کے اہم اصولوں کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سب

پہلے اظہار، نمائندگی کے ایک وسیع اور جاندار نظریے کے امتزاج یعنی ابلاغ کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ مصنف اپنی جانب سے زبان کے ذریعہ ایک تجربے کا اظہار کرتا ہے۔ وہی زبان دوسری جانب (قاری کے لیے) تجربے کی نمائندگی یا عکاسی کرتی ہے۔ لیکن ان دونوں اصطلاحوں میں سے کوئی بھی اصطلاح پوری طرح یہ بات واضح نہیں کرتی کہ ادب کیا ہے۔ اس لیے کہ ادب تجربے کا ابلاغ کرتا ہے۔ یعنی جو تجربہ مصنف کے ذہن میں موجود تھا اسے قاری کے ذہن میں پہنچ جانا چاہیے۔ لیکن قاری تک صرف یہی پہنچانا کافی نہیں ہوتا کہ تجربہ کس چیز کا ہوا ہے۔ اور نہ یہ بات کافی ہوتی ہے کہ وہ تجربہ کیسے ہوا ہے۔ بلکہ تجربہ کو بجنسہٖ اس طرح پیش کیا جانا چاہیے کہ وہ ایک ذہن سے نکل کر دوسرے ذہن میں جوں کا توں منتقل ہو جائے۔ ایک قدرتی منظر کو دیکھ کر اگر میرے الفاظ جو کچھ میں نے دیکھا ہے صرف اسی کی تصویر پیش کر دیتے ہیں یا وہ الفاظ صرف میرے احساسات کا اظہار کر دیتے ہیں تو ایسی حالت میں میرا تجربہ دوسرے تک منتقل نہیں ہوگا۔ لیکن اس تجربے کو اگر ادب بننا ہے تب اسے کلی طور پر ایک ایسا تجربہ ہونا چاہیے جس میں میرے مشاہدے اور محسوسات کا امتزاج ہو۔

جمالیاتی نقطۂ نظر سے ادب صرف خوب صورتی کے لیے ہی تخلیق نہیں کیا جاتا۔ ہم اس کی خوبصورتی کا اسی وقت اندازہ کر پاتے ہیں جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے جس طرح ہم کسی قدرتی منظر کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ خوبصورت ہے ٹھیک اسی طرح ہم ادب کے "ابلاغ" سے حاصل ہونے والے "خالص تجربے" کے بارے میں بھی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ خوب صورت ہے یا نہیں۔ کیوں کہ ابلاغ سے حاصل ہونے والے تجربے اور اس تجربے کے درمیان جس کا ابلاغ کیا جائے امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پر ناقدین نے ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) معلوماتی ادب (۲) قوت و حیات پیدا کرنے والا ادب۔ اول الذکر کے ذیل میں صرف وہ کتابیں آتی ہیں جو اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے انسان کی عام دلچسپی سے متعلق ہوتی ہیں اور ثانیاً ہیئت اور مسرت بھی ان کا لازمی جزو ہو۔ یہ ادب اخلاقی اور ناصحانہ قسم کا ہوتا ہے۔ آخر الذکر ادب اپنے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتا ہے گویا وہ خود ایک مقصد ہوتا ہے۔

اب ادب میں ہیئت (FORM) اور عبارت یا انشاء (DICTION) کو سمجھنا ضروری ہے۔ ہم ادب کے اس پہلو کو جو تخلیقی تجربے کے اولین مواد کی علامت بنتا ہے۔ عبارت یا انشاء (DICTION) کہتے ہیں اور وہ پہلو جو توجہ کے منفرد عمل میں مواد کی وحدت کی علامت بنتا ہے اسے کسی ادب پارے کی ہیئت (FORM) کہتے ہیں۔ مگر یہ ہیئت کسی بیرونی عمل یا اثر سے انشاء پر حاوی نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ انشاء کے اندر سے ہی ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یعنی جب انشاء حقیقی معنوں میں تاثر سے مطابقت رکھتی ہے تو ہیئت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

بہر حال ادب میں ہیئت ایک ایسا پہلو ہے جو انشاء سے اتنا ہی ممیز ہے جتنا کہ کسی زبان کے الفاظ کے معنیٰ اس کی آواز سے ممیز ہوتے ہیں۔ لہٰذا نظریۂ ادب اور تنقید ادب دونوں ہی میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ مذکورہ فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔

ادب کے خصوصی عناصر کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے

(۱) ذہنی یا شعوری عنصر ـــ اس عنصر سے مراد وہ (THOUGHT ـــ) ہے جو کسی ادب پارے میں پایا جاتا ہے ـــ CONTENT سے مراد وہ تمام خیالات وہ مضامین ہیں جن پر مواد کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

(۲) جذباتی عنصر ـــ کسی بات یا خیال کے احساس سے نفس انسانی کو جو حرکت ہوتی ہے وہ از قبیل انبساط ہوتی ہے یا از قبیل انقباض۔ اسی کو عواطف و جذبات سے تعبیر کیا جاتا ہے مرآۃ الشعر ص ۲۲۲ از مولوی عبدالرحمن حافظ کے مندرجہ ذیل دو شعر اس کی مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں ؎

چہ قیامت است جاناں کہ بعاشقاں نمودی
رخ ہمچو ماہ تاباں دلے ہمچو سنگ خارا

مرحبا بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

(۳) تخیلی عنصر ـــ ادیب یا شاعر کے دل و دماغ میں

جو خیال آتا ہے وہ عموماً دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک سرسری تحریک سے پیدا ہوتا ہے۔ چوں کہ ادیب یا شاعر ذکی الحس ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گوئی کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ اکثر مغلوب جذبات ہوتے ہی فن پارے کی تخلیق شروع کر دیتا ہے۔ پھر جوں جوں وہ اپنے حسن خیال اور حسن بیان کا شیفتہ ہو کر فکر کر کے دریائے خیال میں غوطے لگاتا ہے تو دور دور کی باتیں لے آتا ہے۔ اور نئی نئی تشبیہات پیدا کرتا ہے۔ اس کو تلاش معانی بھی کہتے ہیں۔ مثلاً میر خسرو کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

می روی وگریہ می آید مرا
ساعتی بنشیں کہ باراں بگذرد

زلف تو سیہ چراست مانا
بسیار در آفتاب گشتہ است

زہے عمر دراز عاشقاں گر
شب ہجراں حساب عمر گیرند

بہ خانۂ تو ہمہ روز با مداد بود
کہ آفتاب نیارد شدن بلند آنجا

(۴) تخلیقی عنصر ——— اس سے مراد وہ صناعی اور ریزہ کاری ہے جو کسی ادب پارے میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً غالب کہتے ہیں ؎

مرا شگفتنِ گُل در گماں فگند امروز
کہ باز بر سرِ گُل شاخ آشیانم سوخت

اب چند وہ باتیں جنہیں ادب کے بنیادی محرکات کہا جا سکتا ہے۔

(۱) پہلے عرض کیا گیا ہے کہ ادب کی تخلیق کی ابتدا تجربے سے ہوتی ہے وہ تجربہ کسی بھی قسم کا ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی فنکار کی زندگی میں کوئی واقعہ پیش آیا ہو یا اس نے کسی چیز کے متعلق کچھ سنا ہو۔ یا اس کے ذہن میں اچانک کوئی غیر حقیقی (FANTASY) واقعہ ابھر آیا ہو۔ لیکن اس تجربہ کو ایک اعتبار سے بہت مخصوص قسم کا تجربہ ہونا چاہیے۔ یعنی ایک ایسا تجربہ جو فن کار پر چھا جائے اور اپنے اظہار کا بار بار مطالبہ کرے۔ چوں کہ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا جذبہ فطرت انسانی میں موجود ہے لہٰذا "خود اظہاری" یا "خود نمائی" کا یہ جذبہ ادب کی تخلیق کا محرک اوّلیں ہے۔

(۲) ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگوں کو اپنے سوا دوسروں کے حالات و معاملات سے بڑی دل چسپی ہوتی ہے۔ اسی لیے لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ یہ دوسروں سے دل چسپی بھی ادب کی تخلیق کا سبب بنتی ہے۔ فرض کرو کہ ایک فنکار نے ایک بیوہ کو دیکھا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ جو کچھ فن پارہ تخلیق کرے گا اس میں یہی جذبہ کار فرما ہوگا۔

(۳) حقیقی دنیا سے دل چسپی جس میں ہم رہتے ہیں اور تخیل کی دنیا میں جس کے وجود کو ہم صرف خیال سے موجود کر لیتے ہیں۔ چوں کہ ہم حقائق کی دنیا میں رہتے ہیں اور اسی سے دل چسپی رکھتے ہیں، اسی دنیا کو دیکھ کر ہم تخیل کی اس دنیا کو بھی ذہن میں پیدا کر لیتے ہیں جو ہمارے سامنے بظاہر نہیں ہے۔ مثلاً ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو مار رہا ہے۔ ہم نے اٹھ کر بیچ بچاؤ کرا دیا اور پھر وہاں سے واپس آ گئے۔ لیکن اب جب کہ ہم فضا سے دور ہو گئے اور وہ لڑائی جھگڑے کی فضا بھی ختم ہو گئی۔ پھر بھی ہمارے دل میں طرح طرح کے خیالات آئیں گے کہ آخر مارنے والا کیوں مار رہا تھا کیا وہ بڑے درجہ کا آدمی ہے اور مغلوب کیا چھوٹے درجہ کا آدمی ہے؟ اور وہ کیوں چھوٹے درجے کا اور پہلا بڑے درجے کا کیوں ہے؟

غرض طرح طرح کے خیالات پیدا ہوں گے اور یہ خیالات بھی تخلیق ادب کا باعث ہوں گے۔

(۴) ہیئت سے بحیثیت ہیئت، ہماری دل چسپی ——— ہیئت سے یہاں مراد ہے فارم (FORM) کسی تجربے کی خصوصیت محض اس کے مواد سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی اس وحدت سے ہوتی ہے جس میں مواد برقرار رہتا ہے۔ اس لیے تجربے کے ابلاغ کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے مواد اور اس کی وحدت دونوں ہی کا ابلاغ ہو۔ ادب کی عبارت یا انشا، تجربے کے اس مواد کو علامتی بناتی ہے جو اس کے لیے ایک تاثیر بنتا ہے اور ادب کی ہیئت اس کی وحدت کی علامت بنتی ہے۔ زبان میں تجربے کے ابلاغ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے مختلف اجزا کو علیحدہ کر لیا جائے۔ لیکن جوں جوں ابلاغ آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے یہ احساس بھی غالب آتا رہے کہ وہ پھر ایک وحدت میں ترتیب پائے گا۔ اس طرح تاثرات کا سلسلہ انشا یا عبارت آرائی (DICTION) کو ایک ہیئت میں ڈھال سکے گا۔ اور جیسے ہی انشا کی تکمیل ہوگی (باقی ص — پر)

رضا نقوی واہی

شعرستان میں کبوتر بازی

بعض جدید شاعروں کو کبوتر بازی کا بھی شوق ہے۔ یہ بڑا قدیم فن ہے۔ جدید شعرا کی کبوتروں سے دلچسپی اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ کبوتر جدید و قدیم شاعری کے سنگم کی علامت بن سکتا ہے۔ درج ذیل نظم میری طویل نظم شعرستان کا تازہ باب ہے ——— واہی

شعر کہتے کہتے تھک جاتے ہیں جب اہلِ سخن
اس ریاضِ مستقل سے جب اکڑ جاتا ہے تن

اپنی اپنی ہابیوں سے شغل فرماتے ہیں سب
اس طرح اعصاب کو آرام پہنچاتے ہیں سب

شاعرانِ کانپور و غازی پور و سہسرام
زیب و فاروقی و سلطان اخترِ عالی مقام

جو کہ ہندستان میں نامی کبوتر باز تھے
رات دن، جن کے گرہ باز و لقہ، دمساز تھے

آرہے تھے جب مہاجر بن کے شعرستان میں
چند کابک بھی چھپا کر لائے تھے سامان میں

تھے کسی کابک میں شیرازی کسی میں کلسرے
کاغذی تھے ایک میں اور ایک میں ریشم پرے

ایک میں سبزے ابرے تھے ایک میں چینی، مختنگ
جو فضا میں چھوٹ جائیں تو اڑیں مثل پتنگ

نوقلی و ہومر بھی تھا گولہ بھی تھا دو باز بھی
نامہ بر، چتّار، چاہے، اور فلک پرواز بھی

الغرض ان شاعرانِ نو کا یہ شوقِ قدیم
بن گیا اوقاتِ فرصت میں یہاں ان کا ندیم

جبکہ گولہ ان کا اڑتا ہے فضا میں بے درنگ
قلبِ فاروقی میں اٹھتی ہے نئی فکری ترنگ

اس کبوتر سے جو فطرت ان کی ہم آہنگ ہے
ہر پلے نے شعر گو سے مستقل اک جنگ ہے

شاعری سے عاجز آئے ہیں بچارے اس قدر
زیب غوری گنتے رہتے ہیں لقہ کی دم کے پر

حضرتِ سلطان اختر دونوں سے ہشیار ہیں
شاعری کی طرح اس فن کے بھی وہ سردار ہیں

زیب و فاروقی کے پٹھے جونہی بھرتے ہیں اڑان
جھٹ سے ان کے بھی فلک پرواز کرتے ہیں اڑان

اپنے شہپر کے شکنجوں میں پھنساتے ہیں انھیں
اور پھر کابک میں اپنی گھیر لاتے ہیں انھیں

اتنی سرعت سے یہ سلطانی مہم ہوتی ہے سر
ٹکٹکی باندھے ہی رہ جاتے ہیں دونوں دیدہ ور

ان کبوتر باز فنکاروں کی شہرت دیکھ کر
شاعری اور اس پہ یہ فنی مہارت دیکھ کر

کچھ نئے شاعر کبوتر باز بننے کے لیے
ارضِ شعرستان میں ہیں اپنے پر تولے ہوئے

وہ سمجھتے ہیں کہ جو شاعر کبوتر باز ہے
شاعرانہ فکر اس کی آسماں پرواز ہے

جیسے ہی کانوں میں آتی ہے غٹرغوں کی صدا
ان کے تخلیقی عمل کی کھڑکیاں ہوتی ہیں وا

ان کے شعروں میں نظر آتا ہے جھلکوں کا جو رنگ
درحقیقت اس میں پوشیدہ ہے لوٹن کی ترنگ

دیکھ کر گولوں کی جنگی مشق، اُن کی شاعری
رفتہ رفتہ بن رہی ہے ترجمانِ برہمی

مختصر یہ ہے کہ نسلِ نو کے اربابِ سخن
سیکھتے ہیں شعر کے بدلے، گرہ بازی کا فن

گلشن بہار

بے پتے کا خط

تمام پیچیدہ خیال
سگریٹ کے دھوئیں میں اپنا وجود کھو رہے ہیں
میرے تخیّل کی وسعتیں
محدود ذہن میں اسیر ہیں شاید
کمرے کی سانسوں میں ایک عجیب گھٹن
اپنے پر پھڑ پھڑا رہی ہے
میں میز پر پڑے خالی گلاس کی طرح
اپنے اندر کے خلا کو محسوس کر رہا ہوں
سب دیواریں ....
بھولی یادوں اور چہروں کا نقش اُبھارے
چپ چاپ سو رہی ہیں
دھندلی شام کھڑکی میں سے جھانک رہی ہے
شہر کی بتیوں کا ہجوم
تاریک طائروں کا معصوم شور نگل چکا ہے
دور فلک پہ تنہا ٹمٹماتا ستارہ

بے شمار لوگوں کو دوڑاتی سڑکیں
کمرے میں خاموش مدھم روشنی کا احساس
بلا وجہ میری نظر کو چوم رہا ہے
ایش ٹرے میں بجھی ٹوٹی سگریٹوں کے ٹکڑے زندہ ہیں
سہمی فضا میں دھوئیں کی آخری لکیر کھنچ گئی ہے
میری بیہودہ اکیلی زندگی کے لبوں پہ سہما خشک تبسم
اپنے اردگرد پھیلے سناٹے کو بھانپ رہا ہے
اپنے ہونے کا احساس ہی اکثر
مجھ میں لغزش و لرزش پیدا کرتا ہے
میں کتنا اداس اور پریشان ہوں آج
میں نے ابھی ابھی سب بے پتے کے خط پھاڑ ڈالے ہیں
جنہیں کچھ اجنبی اپنوں کے نام لکھا تھا
کیوں کہ مجھے لگا کہ زندگی بھی ایک بے پتے کا طویل خط ہے
جسے سب نے مصروفیت کے کورے کاغذوں پر لکھا ہے

●●

قطعات

رومی بہار رواج

دیکھ کر ظلمتوں کے سایوں کو
زندگی تلملا رہی ہے دوست
دُور تک کچھ نظر نہیں آتا
دھند ہی دھند چھا رہی ہے دوست

آدمی کی اگر یہی پرواز
روز بڑھتی گئی ہواؤں میں
دوستو۔ دیکھنا کبھی نہ کبھی
شہر بس جائیں گے خلاؤں میں

یوں نہ توکمیل میری چاہت سے
میرے غم کو نہ یوں سنوار اے دوست
زخم سہ لوں کا پتھروں کے میں
مجھ کو پھولوں سے یوں نہ مار اے دوست

وقار علیم

جنازے

وہ آج تک زم زم کے لیے بھٹک رہا ہے۔ بوسیدہ پلکوں کی چھاؤں کب کی ختم ہوئی ــــ مگر وہ یوں ہی گشت کرتا رہے گا بہت پہلے اس نجومی نے کہا تھا کہ یہاں کا قدرتی شاہکار بلکہ سب کچھ معدوم ہونے والا ہے۔ تب گھنیری پلکوں تلے اس نے جماہیاں لی تھیں اور مسکرایا تھا۔

جلتے والوں نے اعصابی نظام میں کیسی دہشت انگیز گڈمڈ پیدا کر دی تھی ــ تب سے وہ آج تک زم زم کے لیے سرگرداں ہے۔

راستہ میں برگد کے اس پار چیختے رہنے کی آوازوں نے اسے کمزور کرنا چاہا تھا پھر ایسا بھی ہوا کہ کئی ایک ہمراہی ان آوازوں کے ہمراہ اس سے دور ہوتے گئے۔ ان کی آخری بڑبڑاہٹوں میں کوئی پیغام پوشیدہ تھا مگر اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نحیف ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک تیغ زدہ تودہ اس کے حلق میں گھلتا جا رہا تھا اور اس کی اپنی آواز کو زنگ لگ چکا تھا۔

جب پرکھوں کی داستانیں بکھر گئیں اور مزاروں پر مسجدیں تعمیر ہو گئیں تو سجدے ہمارا مقدر بنا دیئے گئے تھے۔ وہ چاہتا تو اپنا دھواں بجھا لیتا مگر پتہ نہیں کہاں سے دھوئیں کے مرغولے ایک ایک کرکے نحیف مانوس چہرے بن گئے۔ وہ ان داستانوں سے گذر کر ایک خنک شام کو قبرستان پہنچا۔ اب تمام گنجائش ختم ہو چکی تھی۔ مختلف فرسودہ اسالیب کو پڑھتے ہوئے وہ ریگستان پہنچا اور کئی دن تک شترمرغ کی طرح محبوس رہا۔ مگر تب تک بوسیدہ پلکیں چاروں طرف اپنا نظارہ دکھانے لگیں۔ سانسوں میں سوزش ہو رہی تھی۔

اس کو اپنی زندگی ایک کہانی محسوس ہو رہی تھی حالاں کہ اس کی بہت پہلے کی اس عادت سے سبھی نالاں تھے کہ کسی کہانی کا اختتام جاننے کی کوشش اس نے نہیں کی تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تاریکی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ وہ وہیں آ پہنچا تھا جہاں سے اس نے عزم رخت سفر باندھا تھا۔ مگر اب فرسودہ اسالیب کی جگہ چند روشن تحریریں اس کی منتظر تھیں۔ ان قبرستانوں میں مسجدیں نہیں تھیں۔ مگر لاکھوں سجدے ہو رہے تھے۔ آوازیں معدوم ہو گئیں تھیں۔ اس کی آنکھوں پر گھنیری پلکیں کسی ثمر آور درخت کی طرح پھڑپھڑانے لگیں۔ وہ لپکتا ہوا زم زم کے پاس پہنچا۔ اور اس کا وجود بھیگ گیا۔ وہ جماہیاں لینے لگا۔ مگر مسکرانے سے پہلے اس نے منبر کے سامنے ایک دہشت سی ابھرتی دیکھی۔ وہ اٹھا اور وہاں کا فرش اکھاڑ کر کھودنے لگا۔ مٹی کے ہمراہ تازہ اور گلے سڑے مُردوں کی ہڈیاں اوپر آنے لگیں۔ وہ پسینہ میں شرابور ہوا۔ یہاں تک کہ وہ بہت دور اندر تک اتر آیا۔ اچانک ہی اسی فرش کو پھاڑتی ہوئی آوازیں اس کے سارے وجود سے لپٹ گئیں وہ خوف سے چیختا رہا اور اس کا حلق خشک ہو گیا۔ اوپر ایک جنازہ نماز پڑھ رہا تھا کسی نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور رفتہ رفتہ منوں مٹی تلے وہ ڈوبتا گیا۔ ●●

بقیہ:- ادب کے بنیادی عناصر اور محرکات

اسی وقت ہیئت بھی حاصل ہو جائے گی جب تاثرات کے پورے سلسلے کو اس طرح سمجھ لیا جائے کہ وہ منفرد اور متشکل ہیئت کی تعمیر کرتا ہے اور اس لیے ایک وحدت پیدا کرتا ہے۔ تو پھر ادبی تخلیق کی ہر چیز میں مکمل باہمی ربط کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی چیز اتفاقی نہیں ہوتی اور کوئی چیز ایسی نہیں ہو سکتی جس کا تعلق اس کے کل سے نہ ہو۔ تجربے کی یہی وہ اہمیت ہے جس کی ہمیں سب سے زیادہ خواہش ہوتی ہے اور اس کی بنیاد ہیئت سے ہماری وہی فطری محبت ہے۔ جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

حسن رہبر

ایک کھوئے ہوئے لمحے کی تلاش

بعض لہریں بھی عجب ہوتی ہیں۔

صحرا میں سراب کا ذکر تو بار بار سنا ہے۔ مگر وہاں تو لہریں گرفت میں نہیں آتیں۔ فریب نظر کا کھیل ہوتا ہے۔ موجوں اور لہروں کا تماشہ ـــ مگر یہ لہریں ـــ ؟ جن لہروں کو دیکھتی بھی ہوں۔ محسوس بھی کرتی ہوں اور ڈوب بھی جاتی ہوں ـــ مگر پیاس نہیں بجھائی جا سکتی ـــ یا نہیں بجھتی ـــ یہ تو پیاس کی آگ کو اور ہوا دیتی ہیں ـــ آخر یہ لہریں کیسی ہیں ـــ یہ پیاس اتنی سخت کیوں ہے کہ سارا وجود کسی انجانی آنچ میں پگھلنے لگتا ہے۔ حبس اور تاریکی بڑھتی جا رہی ہے۔ زندگی غبارے کی مانند کتنی مختصر اور نازک ہوتی ہے۔ بالکل آنکھیں دہانے پر ٹھہری ـــ کب جل کر راکھ ہو جائے ـــ کچھ پتہ نہیں ـــ جھوٹ تو اب بھی جل رہا ہے۔ آنکھیں بجھتی جا رہی ہیں۔ میں ازل کی پیاسی شاید ابد تک پیاسی رہوں گی۔ میرا تو سارا وجود ہی کھویا ہوا ہے۔ پتہ نہیں کب کون سی شئے کھو گئی کہ پھر آج تک اپنا آپ بھی نہ مل سکا۔ اپنے آپ کو کہاں کہاں ڈھونڈوں ـــ ؟ کن لمحوں سے اس کرب کا حساب مانگوں ـــ جس نے مجھے آپ اپنا غیر بنا دیا ہے۔

یہ بات تو نہیں کہ عارف کبھی مجھ سے ناراض رہا۔ وہ تو مجھے بےحد چاہتا ہے۔ اس نے کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں۔ گھریلو زندگی میں بھی کبھی کوئی الجھن پیدا نہیں ہوئی۔ کبھی کوئی شبہ یا بیزاری ہمارے درمیان خلیج بن کر نہیں آئی۔ اللہ کا دیا سب کچھ نصیب ہے۔ چھریرے بدن کا گورا چٹا ـــ خوب صورت عارف ـــ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر روشنی سی پھیل جاتی ہے۔ آنکھوں میں عجب سا رنگ بھر جاتا ہے۔ اس کے ہونٹوں کی چبھن سے پاؤں کی انگلیاں تک سنسنانے لگتی ہیں۔ بازوؤں کی گرفت بدن پر مرنے لگتا ہے۔ پسلیاں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ مگر سمندر میں ڈوب کر بھی زبان کی طلب کو قرار نہیں آتا۔ آخر یہ کس شئے کی کمی ہے ـــ کس شے کی ؟۔

عارف نہایت خوب صورت، سلجھا ہوا ـــ مہذب گھرانے کا اکلوتا لڑکا ہے۔ ہر لحاظ سے اچھا اور مکمل آدمی ـــ بالکل مکمل ـــ پھر بھی سمندر کی پرشور لہریں ساحل پر حاوی نہیں ہو پاتیں ـــ جیسے موجوں کی آواز ساحل تو سن لے ـــ مگر ساحل کی کوئی پکار موجوں تک نہ پہنچ سکے ـــ آخر کیا وجہ ہے کہ جب ساحل شانت ہو جاتا ہے جب بھی لہریں سر پٹکتی رہتی ہیں۔ جیسے یہ ساحل ان کا اصل ساحل نہ ہو ـــ نہ جانے کیوں موج اور ساحل میں کبھی مکمل مفاہمت پیدا نہیں ہو سکی۔

عارف کو اندر سے کسی شئے کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ یہ خلش کیسی ہے۔ پتہ نہیں چلتا ـــ مگر کچھ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس کے اور میرے درمیان کوئی لکیر ہے ـــ یا پھر اس کا واہمہ ہے۔ مگر آخر ایسا محسوس کیوں ہوتا ہے کہ میں اس کے بےحد قریب ہو کر بھی جیسے بےحد قریب نہ ہوں۔ وہ کبھی اس بات کی تہہ کو نہیں پہنچ سکا ـــ آدمی کے لیے سمندر کی گہرائی کو ناپنا کس قدر مشکل ہے۔ اس نے مجھے سمجھنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ دیکھ میری زندگی میں ـــ کوئی بناوٹ ـــ کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ کھلی کتاب کی طرح میری زندگی کا ہر پہلو اس کی نگاہوں میں تھا ـــ پھر بھی دل میں ایک کانٹا سا کیوں کھٹک رہا ہے اس کے ـــ اجنبیت کا احساس کیوں پیدا ہو رہا ہے ـــ یہ صرف اس کے ذہن کی اپج ہے ـــ یا ہر آدمی کو ایسا تجربہ ہوتا ہے۔ جب ایک ساتھی نے عارف سے پوچھا۔

"عارف شادی کے بعد تم کچھ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہو ـــ ؟"

تو اس نے کہا

"مجھے تو عورت کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن شادی کے بعد ایک سوالیہ نشان سا ابھر کر میرے سامنے آگیا ہے۔"

"کیا ــ؟ شاید میں تمہارے کام آسکوں ــ؟"
"عورت کس حد تک اپنے آپ کو سپرد کر سکتی ہے ــ؟"
"کبھی کبھی اپنے وجود کو بھی سپرد کر دیتی ہے ــ مگر ایسے لمحے آتے ہیں ــ!"

اور اس ایک لمحے کی تلاش وہ دو برس سے کر رہا ہے۔
میری الجھن دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر یہ الجھن کیسی۔ میں خود نہیں سمجھ پاتی۔ میں تو عارف کی ہر مسکراہٹ کا جواب ہنس کر دیتی ہوں۔ اس کے انتظار میں مجھے عجب لذت ملتی ہے۔ جب بھی عارف باہر سے آتا ہے میں بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا استقبال کرتی ہوں۔ اس کے ایک ایک اشارے پر بچھ بچھ جاتی ہوں۔ وہ بھی مجھے مکمل طور پر اپنا سمجھتا ہے۔
بظاہر زندگی حسب معمول ہے۔ لیکن اندر سے وہی احساس ــ کبھی کبھی مجھے بے کل بنا دیتا ہے۔ وہی کسی شئے کی کمی کا۔

پھر وہ خاموش ہو گئی جیسے کہیں کھو گئی ہو۔ میں نے اسے اپنے طور پر بہت کچھ تسلیاں دیں۔ وہ میری بڑی عزیز اور پیاری سہیلی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ کئی سال تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کل جب اچانک وہ میرے شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ مہمان بن کر آئی تو ــ میں نے محسوس کیا جیسے اس کے چہرے سے کشمکش کے بادل چھٹ گئے ہوں۔۔ وہ مجھے بے حد نارمل اور زندہ لگی۔ رات کے کھانے کے بعد جب ہم تنہائی میں باتیں کرنے لگے تو میرے پرسش احوال کے جواب میں اس نے کہنا شروع کیا۔

ایک رات عارف بڑی دیر سے گھر لوٹا۔ ہاتھ میں کنٹیلی چمپا کا پھول لیے ــ ایک نیم جانی پہچانی خوشبو جیسے آواز بن کر ابھر گئی ہو۔ لہو کی پکار بن گئی ہو ــ کسی کھوئی ہوئی شئے کے مل جانے کا اچانک ایک پر مسرت احساس روشن دان سے چپ چاپ اندر آ گیا ــ پوری چاندنی جب سمندر کے سینے پر پڑی تو لہریں پرشور اور منہ زور ہو گئیں ــ اور ساحل کی طرف ایسے بڑھیں جیسے یہی ان کا اپنا ساحل ہو ــ پھر ــ پھر وہ لکیر ــ وہ اجنبیت کی ہلکی سی لکیر ــ وہ کسی شئے کی کمی کا احساس ختم ہو گیا۔ عارف کے دو برس کا طول انتظار حبت کی سرخوشی میں بدل گیا ــ جیسے کوئی گرہ تھی جو کھل گئی ــ کوئی معمہ تھا جو حل ہو گیا۔
وہی کنٹیلی چمپا ــ جس کی خوشبو سے مدہوش ہو کر خالد میری روح میں اتر گیا تھا ــ اس دن پھر کنٹیلی چمپا میرے جوڑے کی زینت تھی۔ خالد جیسا لوٹ کر گیا تو گیا پر کنٹیلی چمپا نے مجھے میرا اپنا آپ میرے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے قسمت سے کوئی شکایت نہیں ــ کوئی شکوہ نہیں ــ عارف کو بھی تو اب مجھ سے کوئی گلہ نہیں ــ!
اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے نہیں خود اپنے آپ سے مخاطب تھی ــ ●●

ستیہ پرکاش

سوویٹ یونین میں مزدوروں کی حفاظت کے انتظامات

سوویٹ یونین کا دعویٰ ہے کہ وہاں صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی صحت اور ان کی حفاظت پر باقی دنیا کے مقابلے میں زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن حقیقی تصویر اس کے الٹ ہے۔

سوویٹ یونین میں صنعتی کارخانوں کے حادثات اور مزدوروں کی علالت کے معاملے میں کارآمد اعداد وشمار مشکل ہی سے دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن اس دعوے کے باوجود کہ صنعتی کارخانوں میں حادثوں کی تعداد گذشتہ پانچ برس میں ۵۴ فیصدی کم ہوگئی ہے۔ اور عارضی معذوری کی تعداد ۲۳ فی صدی کم ہوگئی ہے۔ سوویٹ یونین کا اعداد وشمار شائع کرنے سے گریز ظاہر کرتا ہے کہ جمہوری ممالک کے مقابلے میں وہاں صورت حال اب بھی کافی خراب ہے۔ حادثوں کی تعداد میں کمی کے بارے میں سوویٹ یونین کے دعوے یوں بھی قابل اعتبار نہیں کیوں کہ فیکٹریوں کے منیجروں کی یہ عام عادت ہے کہ وہ حادثات کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۷۴ء کے سوویٹیکایا مولڈاویا کے بیان کے مطابق اس پردہ پوشی کا مقصد" ذمہ داری سے پہلو تہی اور سب ٹھیک ٹھاک ہے" کے تصور کو فروغ دینا ہے

ٹریڈ یونین اخبار" ٹروڈ" نے اپنی ۲۲ر نومبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں اعتراف کیا تھا کہ کارخانوں کے ایک جھنڈ کے انتظامیہ نے چھ ماہ کی مدت میں حادثات کی تعداد صرف چودہ بتائی تھی۔ جب کہ حقیقت میں حادثات کی تعداد انتیس تھی۔ اس سلسلے میں ایک راج مزدور کی موت کے حالات بھی توجہ طلب ہیں جو ایک اونچی چمنی سے گر کر ہلاک ہوگیا تھا۔ ۳ر جنوری ۱۹۷۵ء کے "ٹروڈ" کے مطابق اس مزدور کی موت کی حقیقی ذمہ داری اس کمیشن پر عاید ہوتی ہے جو حادثے کی تحقیقات کر رہا تھا کمیشن نے اپنے بیان میں لکھا تھا کہ حادثے کی ذمہ داری انتظامیہ پر جزوًا ہی عاید ہوتی ہے کیوں کہ مزدور خود بھی جزوًا اپنی موت کا ذمہ دار ہے۔ ایک افسر کے بیان کے مطابق اگر انتظامیہ کو سو فیصدی ذمہ دار ٹھہرادیا جاتا تو اس سے ان کے بونس بند ہوجاتے اور سوشلسٹ مسابقت جوئی کے نظام میں کارخانے کا مقام گر جاتا۔

کچھ شہادتیں تو ایسی ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ صنعتی مزدوروں کی بیماریاں اور ان کے زخمی ہونے کے واقعات کم ہونے کی بجائے بڑھ رہے ہیں۔ پروفیسر ڈی کارکوکمن نے "سوشلسٹ ٹیکنی ٹروڈا" کے ۱۹۷۴ء کے دسویں شمارے میں لکھا ہے کہ "گذشتہ برسوں میں مزدوروں کو مختلف قسم کی جو رقوم بطور تلافی دی گئی ہیں ان میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے" یاد رہے کہ یہ جریدہ محنت اور تنخواہوں کی ریاستی کمیٹی کا سرکاری جریدہ ہے۔ پروفیسر کارکوکمن اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

" ناسازگار ماحول میں کام کرنے سے مزدوروں کی صحت کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کی تلافی کے لیے سماج جتنا کچھ خرچ کرتی ہے اتنا کام کے ماحول کو سازگار بنانے کے لیے خرچ نہیں کیا جاتا۔ بہتر یہ ہو کہ کام کے ماحول کو بہتر بنانے پر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس میں اضافہ کردیا جائے۔ اس سے مزدوروں کی صحت کا تحفظ ہوسکے گا اور انھیں ناسازگار ماحول میں کام کرنے کی وجہ سے نقصانِ صحت کے جو معاوضے دیے جاتے ہیں ان میں کمی ہوگی۔ موجودہ حالات میں صرف یہی نہیں کہ بیماریاں اور حادثے بڑھ رہے ہیں۔ بلکہ اوقاتِ کار میں بھی کمی ہوجاتی ہے۔"

ایک روسی تارک الوطن کا بھی یہی کہنا ہے کہ سوردلووسک کے علاقے میں صنعتی حادثوں کی تعداد ہر برس بڑھ رہی ہے اور کوئلے کی کانوں، بھاری صنعتوں اور تعمیرات کے شعبوں میں تو حادثوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ تیس اور چالیس برس کی عمر کے

درمیان جتنے بھی کارکن ہیں ان میں سے تین میں سے ایک اپاہج ہوگیا اور اسے پچاس سے اسی روبل تک ماہانہ کی پنشن دی گئی۔ ٹیلیں بنانے والی ایک فیکٹری میں کام کا اصول اتنا ناساز گار ہے کہ چند ہی برس میں کام کرنے والوں کی قوت سماعت کو نقصان پہنچنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور چار یا پانچ برس کے بعد بعض تو بالکل ہی بہرے ہو جاتے ہیں (عجوبہ یہ ہے کہ سوویٹ یونین دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے صنعتی شور کم کرنے کا قانون پاس کیا) تانبہ پگھلانے والی فیکٹری میں حفاظتی نقاب مہیا نہیں کیے گئے تھے۔ وہ بے چارے صرف اتنا کر سکتے تھے کہ اپنے چہروں کے آگے گتے کی بنی ہوئی پھنکنیاں لگا لیں۔ اسی طرح شیشے کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں میں بیشتر کے چہرے سوجے ہوئے تھے بھٹیوں کے سامنے کام کرتے وقت یہ لوگ اپنے چہروں کی حفاظت کے لیے چیتھڑوں سے باندھ کر پرانے اخبار ہی لگا سکتے تھے۔

کام کے اتنے ناساز گار اور خطرناک ماحول کی ذمہ داری کسی حد تک سوویٹ یونین کی ٹریڈ یونین تنظیم پر بھی عاید ہوتی ہے، جسے اپنی سیاسی سرگرمیوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ اپنے بنیادی کام پر توجہ دے سکے اور اپنے ممبروں کے لیے ساز گار ماحول کا تقاضہ کر سکے۔

۲۹ جنوری ۱۹۷۵ء کے "پراودا" نے کارخانوں میں گرد و غبار کی وجہ ہوا کی آمد و رفت کے ناقص انتظام کو ٹھہرایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بھٹیوں کے سامنے کام کرنے والوں کو پیش آنے والے حادثوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ صرف ۱۹۷۴ء میں بھٹیوں کے سامنے کام کرنے والوں کو چار بڑے حادثے پیش آئے۔ چھوٹے موٹے حادثے تو ہر ماہ ہوتے رہتے ہیں۔ ان حادثوں کے سلسلے میں کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور نہ ایسی کوئی ضمانت ہے کہ اس قسم کے حادثے آئندہ نہیں ہوں گے۔

صنعتی کارخانوں میں کام کے ناساز گار ماحول سے جو صنعتی بیماریاں پھیلتی ہیں اس کا شکار عورتیں خاص طور پر ہوتی ہیں۔ یاد رہے کہ سوویت یونین کے مزدوروں میں عورتوں کی تعداد اکیاون فیصدی ہے۔ ماسکو کی سٹی پارٹی کمیٹی کے سکریٹری آر کے مین یگوا نے ۴ جنوری ۱۹۷۴ء کے "ٹروڈ" میں لکھا تھا کہ کپڑے، خوراک، کیمیکل اور تیل کے کارخانوں میں کام کے ناساز گار ماحول کی وجہ سے بہت سے کارخانوں میں مزدور عورتوں کی علالت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ان مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سوویٹ صنعت میں کام کے ماحول کو ساز گار بنانے کی کافی گنجائش ہے۔ وہاں کے منصوبہ ساز کارخانوں کے منتظم اور وہاں کی ٹریڈ یونینیں مزدوروں کی صحت و سلامتی کی طرف اتنی توجہ نہیں دے رہی ہیں جتنی دینی چاہیے لہٰذا صنعتی بیماریوں اور حادثوں کی تعداد میں کمی کے بارے میں سوویٹ یونین غیر ملکوں کے سامنے جو دعادی پیش کرتا ہے انھیں شک کی نظر سے ہی دیکھنا چاہیے۔ ●●

تبصرے

انتظار کی رات

شاعر: کمار پاشی

سائز ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۸۸، قیمت چھ روپے

ناشر پی۔ کے۔ پبلی کیشنز: دریا گنج، دہلی ۶

کمار پاشی نے اپنے تخلیقی تجربوں کے اظہار کے لیے کہانی، ڈراما اور شاعری کو وسیلہ بنایا ہے۔ مگر شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اولاً متوجہ کیا ہے۔ "انتظار کی رات" سے قبل ان کے دو شعری مجموعے۔ "پرانے موسموں کی آواز" — اور "خواب تماشا" اور ایک طویل نظم "ولاس یاترا" شائع ہو چکی ہے۔ زیر نظر کتاب ان کی چوتھی شعری پیشکش ہے جس میں نظمیں، غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ غزل اور رباعی میں کلاسیکی نظم وضبط اور نظموں میں آزاد نظم کا اسلوب نظر آتا ہے۔

کمار پاشی کی شاعری دورِ جدید میں انسانی وجود کے استحصال کی داستان ہے اس داستان میں وجود کے تجربے کا رنگ کسی قدر گہرا ہے یہی وجہ ہے کہ "انتظار کی رات" کا مطالعہ کرتے وقت خارجیت سے زیادہ اس پراسرار داخلیت سے واسطہ پڑتا ہے جو آج کے حساس نوجوانوں کا مقدر بن چکی ہے۔ ان کی شاعری میں یہ رنگ وجود وعدم کی کشمکش، خواہشوں کے جال سے نکلنے کی آرزو، خواب اور شکستِ خواب زندگی کی بے کیفی و بے ثباتی لمحہ لمحہ گھلنے اور پگھلنے کے احساس، پراگندگی زخم خوردگی، بیزاری، خوف و ہراس اور انسانی مقدر سے مایوسی کی صورت میں نمایاں ہوا ہے۔ ان کی شاعری پر اگرچہ ایک مخصوص کربناک فضا چھائی ہوئی ہے۔ مگر کہیں کہیں اس جال کو توڑ کر رجائیت کی کرنیں بھی جھانکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور ان کی شاعری کو موضوع و اظہار کی یک رنگی اور محدودیت سے بچاتی ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں "اگر پربت پہ کوئی شہر بستا ہو" اور "بستیاں زندہ رہیں گی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک اور رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ جس کو ایک مخصوص قسم کی فضا آفرینی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ "ایک رنگ برنگی نظم" اسی نوع کی نظم ہے — جہاں تک ان کی شاعری کے اسلوب کا تعلق ہے اس پر خوابناک دھندلکے چھائے ہوئے ہیں۔ داستانی انداز، کہانی کی تکنیک اور مذہبی صحیفوں کے اسلوب نے ان کی شاعری بالخصوص نظموں کی پراسرار روحانی فضا کو اور گہرا اور کسی قدر مبہم کر دیا ہے۔ غزلوں کی فضا واضح، شگفتہ اور روشن نظر آتی ہے اور ان میں کلاسیکی نظم وضبط بھی ملتا ہے۔ مثلاً

اپنے سوالقا کون میں دیتا مجھے شراب
اپنے ہی سر پہ ہاتھ رکھا اور مر گیا
جو کھو گیا کسی شب کے سیہ سمندر میں
بندھا ہوا ہیں اسی لمحۂ زوال سے تھا
خواہشوں نے جسے سادہ حال اب کے
بچ نکلنا ہوا محال اب کے
سلگے تمام عمر بدن کے الاؤ میں
سایہ ہمارے سر پہ کسی بد دعا کا تھا

اور نظم کا یہ ٹکڑا بھی پڑھیے جو ان کی نظموں کی تکنیک کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

"کہاں ڈھونڈوں! اسے، اس رات کے سنسان پنجر میں
سروں پر اب مقابر کی طرح چھائی ہے تاریکی
سبھی راہیں ابھی تک جاگتی ہیں تک رہی ہیں راستہ اس کا
اندھیری رات کے خم دار زینے سے اترنے والے لوگوں میں
وہ پہلا شخص ہے جو
گھر نہیں پہنچا۔"

کمار پاشی زندگی اور ذات کے عرفان اور سطحی احساس میں امتیاز کرتے ہیں۔ زبان کی صحت اور عدم صحت کے فرق سے بھی آگاہ

ہیں۔ اور ان کا کلام ان عناصر سے بھی پاک ہے جو بہت سے شعرا کے ہاں فیشن اور فارمولے کے طور پر پائے جاتے ہیں امید ہے کہ ان کے سابقہ مجموعوں کی طرح اس مجموعے کو بھی قبول عام ملے گا۔

——ڈاکٹر عنوان چشتی

راکھ

شاعر: احتشام اختر

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۱۱۲ قیمت چھ روپے

ناشر: پی کے پبلی کیشنز۔ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی۔۶

احتشام اختر نوجوان شاعر ہیں۔ ان کی تخلیقات رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اور اب "راکھ" کی صورت میں یکجا طور پر سامنے آئی ہیں۔ احتشام اختر اس نکتے سے آگاہ ہیں کہ شاعری "بیان واقعہ" نہیں بلکہ "واقعہ کے تاثر کا اظہار" ہے اس لیے ان کی بیشتر مختصر نظمیں اور غزلوں کے بہت سے اشعار مخصوص لمحاتی تاثرات کا فنی اظہار ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری پر غیر ضروری سنجیدگی اور نیم پختہ بلوغیت کا غلاف چڑھانے کی مصنوعی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اپنے جوان جذبات، خون گشتہ آرزوؤں، ناکام خواہشوں، خوابوں اور محبت کی دلدوز کیفیتوں کو ان کی فطری معصومی اور دلکشی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ان کی شاعری کی فضا رومانی عناصر سے مل کر بنی ہے اس لیے اس میں غنائیت اور حسن وعشق کی رمزیت کے عناصر بھی ہیں۔ اور یہ کیفیات انھوں نے کلاسیکی نظم و ضبط نیز نئی امیجری کے ذریعہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے ؎

دل کی دیواروں پہ کیوں نام لکھا ہے اُس کا
لوگ پڑھ لیں گے یہ تحریر مٹانے دو مجھے

آنکھوں کے صحرا میں ہر سو
گیلی گیلی پیاس تھی پہلے

اس کی تصویر ہی آنکھوں میں بسالوں کہ یہ شے
لاکھ ارزاں سہی میرے لیے نایاب بھی ہے

لباس روح سے دھاگا الگ نہ کر پایا
مرا وجود تو پنہاں ہر ایک تار میں تھا

میں بے قصور رہوں یہ فیصلہ ہوا ورنہ
میں اپنے جرم کا اقرار کرنے والا تھا

اپنے ذہن کی تحریروں کو
دیمک بن کر چاٹ رہا ہوں

نظموں میں "خوابوں کا نگر" اور "واپسی کا المیہ" خصوصیت سے داد طلب ہیں۔

"راکھ" کی بعض نظمیں شہریار کی مختصر نظموں کی طرح سپاٹ بھی ہیں۔ اور کہیں کہیں عروض وقوافی کے جھول بھی ہیں۔ چوں کہ احتشام اختر ایک تعلیم یافتہ اور باخبر شاعر ہیں اس لیے امید رکھنی چاہیے کہ مستقبل میں ان کی شاعری میں ایسی کمزوریاں کم ہوں گی۔ اور محاسن میں اضافہ ہوگا۔ مجموعی طور پر ان کی پہلی شعری پیش کش قابل توجہ ہے۔ کتابت وطباعت خاصی اور ٹائیٹل عمدہ ہے۔

——ڈاکٹر عنوان چشتی

دیدار غالب

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۱۶۶ - قیمت پانچ روپے

ہست و بود

سائز ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۲۲۴

قیمت دس روپے

ناشر—مرکز تصنیف وتالیف، نکودر (پنجاب)

یہ دونوں کتابیں جناب عرش ملسیانی کی تصنیف ہیں۔ "دیدار غالب" میں غالب کی شخصیت اور شاعری پر مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔ غالب کا انا۔ غالب خطوں کے آئینے میں۔ غالب بحیثیت غزل گو۔ غالب کو خراج ہائے عقیدت۔ غالب ایک ڈرامائی لیجر۔ غالب کا تصور عشق۔ غالب اور لوہارو۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

مصنف کا خاص زور غالب کی سیرت اور کردار کی مختلف خصوصیات کو ابھار کرنے پر ہے۔ اس کے لیے انھوں نے غالب کی نفسیات، ان کے حالات وواقعات اور خود ان کی تحریروں سے مدد لی ہے اور اس عظیم شاعر کی شخصیت کی کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ مضامین کے اختصار کی وجہ سے کہیں کہیں تشنگی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر "غالب کا انا" میں انانیت کی نفسیاتی بنیادوں کی طرف اشارہ ضرور کیا گیا ہے لیکن تحلیل نفسی کی روشنی میں غالب کی انانیت کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو فاضل مصنف صرف یہ کہنے

پر اکتفا نہ کرتے کہ " انا انسان کی انتہائے خودی سے پرورش پاتا ہے " بلکہ وہ اس پہلو سے بھی اس نفسیاتی حقیقت کا جائزہ لیتے کہ انانیت زیادہ تر احساس کمتری کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ غالب کی انانیت میں ان کے مخصوص قسم کے احساس کمتری کو بہت دخل ہے اگر اس پہلو سے بھی غالب کی انا کا جائزہ لیا جاتا تو مضمون بھرپور ہو جاتا ۔

غالب پر ڈراما ئی فیچر فنی اعتبار سے اچھا اور موثر ہے ۔ اس سے غالب کا کردار بڑی اچھی طرح ابھر کر سامنے آتا ہے ۔ لیکن امراؤ بیگم کا کردار نہ صرف دھیما پڑ جاتا ہے بلکہ ان کے کردار کے جو نقوش واضح ہوتے ہیں وہ اصل نقوش سے مختلف ہیں ۔ اس فیچر سے ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ غالب کی بیوی ایک جھگڑالو عورت تھیں اور انھوں نے عام بیویوں کی طرح مصیبتیں مجبوراً برداشت کیں ۔ ایسا کرنے میں ان کے ایثار اور وفا کو کوئی دخل نہ تھا ۔ یہ بات واقعات کے بھی خلاف ہے اور فنی انصاف کے بھی منافی ہے ۔

" خطوں کے آئینے میں " غالب کی عادات وخصائل کا اچھا تجزیہ کیا گیا ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں جو طریقۂ کار اختیار کیا گیا ہے اس سے نتائج کچھ بکھرے سے گئے ہیں ۔ ایک ایک خط کو لے کر اس سے نتیجہ اخذ کرنے کے بجائے غالب کی سیرت و کردار کے مختلف پہلوؤں کو بنیاد بنا کر مختلف خطوط سے مثالیں دی جاتیں تو یہ مضمون بہتر نتائج کا حامل ہوتا ۔

ان مضامین کے ذریعے غالب کی شخصیت کے تقریباً تمام رخ نظر کے سامنے آ گئے ہیں ۔ مضمون نگار نے تنقید میں توازن کو برقرار رکھا ہے ۔ اور جہاں بحیثیت شاعر غالب کی عظمت کے نقوش واضح کیے ہیں وہیں " کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا " کے تحت بحیثیت بشر ان کی خامیوں کا بھی بیان کر دیا ہے ۔

" ہست و بود " عرش صاحب کے سترہ متفرق مضامین کا مجموعہ ہے اور جیسا کہ مصنف نے خود لکھا ہے " اس کتاب میں شائع شدہ مضامین بیشتر ادبی شخصیتوں سے متعلق ہیں جن میں کم لوگ زندہ ہیں اور اکثر راہی ملک بقا ہو چکے ہیں ۔ ان میں سے اکثر مضامین " آجکل " میں شائع ہوتے رہے ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو دوسرے جرائد میں چھپے ہیں ۔" زیادہ تر مضامین ان شخصیتوں سے متعلق ہیں جن سے مصنف کا خود کوئی تعلق رہا ہے یا انھوں نے قریب سے دیکھا ہے ۔

اس قسم کے مضامین کا انداز تاثراتی ہے اور ان میں وہی واقعات بیان کیے گئے ہیں جن میں یا تو وہ خود شریک رہے ہیں یا جن کا علم انھیں ذاتی طور پر ہے ۔ اس اعتبار سے یہ مضامین ایک طرح کی یادداشتیں ہیں جنھیں دل نشیں انداز میں بیان کر دیا گیا ہے ۔ ان میں تنقید کی گنجایش کم سے کم ہے لیکن جہاں کہیں بھی تنقیدی رائے کے اظہار کا موقع ملا ہے وہاں مصنف نے اعتدال اور توازن کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے ۔ یہاں تک کہ اپنے والد پر بھی خالص عقیدتمندی سے بالا ہو کر مضمون لکھا ہے ۔ کتاب میں ایک بات جو خاص طور پر کھٹکتی ہے وہ " نقلی جگر " والے واقعہ کی تکرار ہے ۔ یہ واقعہ کئی مضامین میں بیان کیا گیا ہے ۔ مختلف اوقات میں مضامین کی اشاعت کے باعث اس واقعہ کے بار بار بیان کرنے کی ضرورت ہو سکتی تھی ۔ لیکن ایک ہی کتاب میں یکجا طور پر ان کے مضامین کے شائع ہونے کی صورت میں یہ واقعہ کسی ایک مضمون میں بیان کر دینا کافی تھا ۔

عام طور پر شعرا میں یہ عیب پایا جاتا ہے کہ وہ نثر میں بھی شاعری کرنے لگتے ہیں ۔ عرش صاحب نے نثر اور شعر کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے ۔ دونوں کتابوں میں ان کی راست زبان اور واضح انداز بیان نثر کی مزاج شناسی کے آئینہ دار ہیں ۔

—— حنیف کیفی

بارہ ماسہ نیہہ

شاعر: مولوی حفظ اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ
مرتبہ: سید ندا الحسن قادری ۔ ناشر: مکتبہ قادری ۔ رامپور
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۴۸ قیمت : تین روپے

صوفیائے کرام نے ہماری زندگی کے ان گوشوں کو روشن کیا ہے جہاں غیر صوفی شعرا کی نگاہیں نہ پہنچ سکیں ۔ زندگی کے یہ پہلو تاریک ہی رہ جاتے ۔ اگر ان بزرگان دین کی دوررس نگاہیں ان پر روشنی نہ ڈالتیں ۔ مولوی حفظ اللہ قادری ان صوفی شعرا میں سے ہیں جن کا عوام سے راست رابطہ رہا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عربی اور فارسی کے متبحر عالم ہونے کے باوجود انھوں نے بارہ ماسہ تصنیف کی ۔ اس میں ایک برہن کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے ۔ ساتھ ساتھ ہندوستان کی آب و ہوا اور دیہاتی ماحول کی منظر کشی بھی کی گئی ہے ۔ برہن کے پیام بر موسمی پرندے ہیں جنکے

ذریعہ اپنے "سجن" کو سندیش بھیجتی ہے اور بدلتے ہوئے موسموں کی تاب نہ لا کر رات دن بے چین نظر آتی ہے۔

بارہ ماسہ خالص ہندوستانی شاعری کا انداز ہے ہندوستان کے دیہاتی ماحول میں ایک برہن کی رو داد غم بارہ مہینوں کے بیان پر تقسیم ہے اور ہر موسم کی خصوصی کیفیات کا رشتہ برہن کی واردات قلبی اور اس کے جذبات سے جوڑا گیا ہے۔

بارہ ماسہ کی زبان اودھی ہے۔ لیکن کہیں کہیں کھڑی بولی بھی شامل ہو گئی ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ رام پور کے علاقے میں جہاں اودھی بھاشا کا نام و نشان نہیں، مولانا نے اودھی بھاشا کو اپنایا ہے اور بڑی خوبصورتی سے اس زبان میں بارہ ماسہ کو نظم کیا ہے۔

ساون کے مہینہ میں ایک برہن کی کیفیات ملاحظہ کیجئے۔

گھٹا کاری کا جب چھایا اندھیرا
برہ کی فوج نے برہن کو گھیرا
پپیہا رات دن کرتا ہے پی پی
پیا کارن تڑپتا ہے مرا جی

کنوار میں . . . . .

میں سندر سیام بن کب تک رہوں ری
دوڑ کر جو رے کا گا سے کہوں ری
مہینہ کنوار کا جاڑے کا ہے دوار
میں کیوں کر گرم سوؤں بن ترے پیار

صالحہ صدیقی ●●

بزمِ احباب

عبدالرؤف ملک (لاہور)

محترم گوپال متل صاحب! آداب۔ دہلی میں میرا ایک دوست سوم آنند ہے، جس سے میرے بہت دیرینہ تعلقات ہیں اور وہ مجھے اپنوں کی طرح عزیز ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اس سے ملاقات اور مسلسل خط و کتابت رہی ہے اور اب بھی ہے۔ پچھلے دنوں جب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ دوبارہ قائم ہوا تو میں نے اس سے فرمائش کی کہ کوئی اچھی سی کتاب پڑھنے کے لیے بھیجے۔ اس نے آپ کی کتاب "لاہور کا جو ذکر کیا" ارسال کی میں نے اسے پڑھ کر بہت حظ اٹھایا اور بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔

میں اپنا تعارف آپ کی کتاب کے توسط سے ہی کراتا ہوں آپ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۴۵ پر نگینہ بیکری میں آنے والوں میں جس "کامریڈ عبداللہ ایک خوش شکل نوجوان" کا ذکر کیا ہے، میں اس کا چھوٹا بھائی ہوں۔ اس زمانہ میں آپ کو نگینہ بیکری اور ادب لطیف کے دفتر میں دیکھا بھی تھا۔ لیکن چوں کہ وہ میرے بالکل لڑکپن بلکہ بچپن کا زمانہ تھا اس لیے آپ کی صورت اور یاد ذہن میں بالکل دھندلی سی ہے۔ آپ اپنی اور میری عمر میں تفاوت کا اندازہ اس سے کرلیں کہ آپ نے ۱۹۳۲ء میں بی۔ اے کیا اور میں اسی سال سکول کی پہلی جماعت میں داخل ہوا عقاید اور نظریات کے اعتبار سے کمیونسٹ ہوں لیکن FANATIK ہرگز نہیں۔ اور سیاسی نظریات سے زیادہ بنیادی انسانی اور اخلاقی اقدار کو اہمیت دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص ان کا پاس کرے اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

آپ کی کتاب نے مجھے خاصا متاثر کیا ہے۔ اس سے جہاں آپ کی اپنی زندگی کے کئی گوشے وا ہوتے ہیں۔ وہاں دیگر بہت سی ادبی، سیاسی اور صحافتی شخصیتوں کے قول و فعل اور کردار و عمل پر سے پردے سرکتے ہیں۔ میرے نزدیک آپ کی یہ کتاب صرف آپ کی ذاتی یادداشتوں کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اس دور کی، ادبی، سیاسی اور صحافتی سرگرمیوں کی ایک روئیداد بھی ہے گو یہ بہت مختصر اور تشنہ ہے۔ لیکن ایک زیادہ جامع تاریخ کی اساس ضرور بن سکتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک تاریخی ماخذ کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

عظیم صدیقی (دہلی)

ڈاکٹر گیان چند جین (جموں) کا مراسلہ (ماہنامہ تحریک ستمبر ۱۹۷۴ء) نظر سے گذرا۔ پڑھ کر کافی حیرت ہوئی۔ کیوں کہ چو کفر از کعبہ برخیزد کے مصداق وہ حضرات جو اردو کے درس و تدریس سے وابستہ ہو کر اس طرح کی ٹھوکریں کھائیں تو طالب علموں کا کیا حشر ہوگا۔

میرا سوال نہایت مختصر تھا جو ابھی تک تشنۂ جواب ہے — بحر متقارب کے علاوہ غزل کس بحر کے کس وزن پر ہے؟

اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے دو وزن پیش کیے۔ ایک وہی بحر متقارب جس کو پہلے ہی اس کے جواب سے نکال لیا گیا تھا اور دوسرا وہ جو رکن ثمانی یعنی مفاعلاتن پر مبنی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں ان دو صورتوں کے علاوہ کوئی اور بحر نہیں تو ان کی ذہنی مجبوری ہے۔ رکن ثمانی کیوں مستحسن نہیں۔ اس کی وجہ اگر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض کی جائے تو شاید وہ کبھی ان کتابوں کو "مستند" نہ فرمائیں جنھوں نے اس کو جائز ٹھہرایا ہے۔

جب قواعد العروض اور تلخیص العروض آپ کے دسترس میں نہیں تو کیوں کر آپ دوسری کتابوں سے ان کا موازنہ کرسکتے

ب اور جہاں تک محقق توسی کی علمی قابلیت کے اعتراف .....
بات ہے تو عرض کروں گا کہ آپ اپنے وہ مکتوب (ہماری زبان
گراچی ۱۵ دسمبر ۱۹۶۸ء و ۲۲ اگست ۱۹۶۵ء) نہ بھولیے جن
جواب میں ڈاکٹر صفدر آہ کو یہ لکھنا پڑا ۔" یہی ڈاکٹر گیان
مد کو کرنا چاہیے تھا۔ محقق طوسی ۔ خاقانی یا حزیں کی پگڑیاں
چھالنا انھیں بالکل زیب نہیں دیتا ۔" (ہماری زبان ۔
ا جنوری ۱۹۶۶ء)

ڈاکٹر صاحب کا یہ تحریر کرنا "محقق نے جامی اور دوسرے
عرا کے اشعار کی اسی وزن میں تقطیع کی ہے"۔ نہایت ہی گمراہ
ن ہے۔ کیا آپ یہ غور فرمائیں گے کہ توسی کب مرے اور جامی
ب جنمے ؟

معیار الاشعار آپ کے پاس ہے کیوں کہ آپ نے اس ہی
ے حوالے سے یہ بات تحریر فرمائی ہے تو محترم اس کتاب کو پھر پڑھیے
خاص طور پر صفحہ ۳ سطر ۳ جس میں اس کتاب کی طرز تحریر کے
بارے میں لکھا ہے ۔ اور اسی کی روشنی میں یہ کتاب پڑھیے ۔
در اسی کتاب کے صفحہ ۲ سطر ۸ ۔ ۹ پر بھی غور فرمائیے —
"مولوی سعد اللہ صاحب (مراد آبادی) نے حاشیہ لکھا
ہے اور انصاف کو بالائے طاق رکھ کر جا بجا اعتراض کیے
ہیں .... "

جس صفحہ اور سطروں کا حوالہ آپ دے رہے ہیں۔ وہ
ساری عبارت ح کے بعد کی ہے ۔ (ح ۔ جنی حاشیہ ۔ یعنی
مولوی سعد اللہ صاحب کا حاشیہ جنھوں نے جامی اور دوسرے
شاعروں کے اشعار اپنی اس بات کے ثبوت میں پیش کیے ہیں
جو محقق پہ اعتراض پر مبنی ہے) جہاں تک محقق کے فرمان کا
تعلق ہے تو وہ بھی اسی کتاب کے صفحہ ۲۱۶ سطر ۸ ۔ ۹ پر مندرجہ
ذیل ہے ۔
۱۔ قدما اثلم در صدر یا در ابتدا بیتا در بکار داشتہ
اند ....

۲۔ استعمال قبض در فارسی روا نیست بہیچ وجہ ....
محقق نے ساری کتاب میں ایک شعر کی بھی تقطیع نہیں
کی ۔ صرف بحر اور وزن کا نام لکھنا ہی تقطیع نہیں ۔
حضرت سعد اللہ نے بھی جامی کے شعر کی تقطیع نہیں
کی —

پھر آپ نے یہ کیوں کر تحریر فرمایا کہ "محقق نے جامی
اور دوسرے شعرا کے اشعار کی اسی وزن سے تقطیع کی ہے"
اگر آپ اس بات کو ثابت کر دیں تو بندہ سو روپے نقد
مع دستار فضیلت نذر کرنے کو تیار ہے ۔

آپ کا یہ فرمانا "بے چارے کرشن موہن کو ماخوذ کرنے
کی کیا ضرورت تھی ۔ یہ وزن تو امیر خسرو سے منسوب ریختے
کی غزل سے لے کر ہر دور کے اردو شعرا نے باندھا ہے"۔ ایک
نہایت ہی عجیب بات ہے ۔ میں اس بات پر مصر ہوں کہ کرشن
موہن نے ایک ایسے وزن میں نظم کہہ کر جس میں مجھ کو کسی بھی اردو
فارسی شاعر کا ایک شعر بھی نظر نہ آیا ایک نہایت قابلِ تعریف
کام کیا ہے اور آپ اس بات کے درپے ہیں کہ کرشن موہن نے
کوئی قابلِ تعریف کام نہیں کیا بلکہ اس وزن میں تو ہر دور کے
شعرا نے شعر کہے ہیں ۔

کیا آپ چند ایسے اشعار مع شعرا کے نام ظاہر کریں گے
جنھوں نے اس بحر کے اس وزن میں شعر کہے ہیں جو کرشن موہن
صاحب نے باندھی ہے تاکہ میں بھی اپنی تحقیق میں اضافہ
کر سکوں ؟

پیرزادہ حامد حسن عاجز (رامپور منہاران)

"تحریک" مارچ ۱۹۷۵ء نظر نواز ہوا ۔ یہ شمارہ اس
اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں اردو کے
چار بڑے مجموعوں کی ابتدائی صفحات میں نقاب کشائی کی
گئی ہے ۔

ظفر غوری کا یہ مطلع

پتھر سے سب لوگ کھڑے تھے منظر لہو لہان پڑے تھے

اس کا وزن فعلن فعلن فعل فعولن —— یا
فعلن فعلن فعلن فعلن
ہے ۔ دوسرا مصرعہ ان دونوں اوزان پر نہیں ۔ ارباب
عروض اس سلسلے میں توجہ فرمائیں ۔ ●●

خبرنامہ

۵ راپریل ۱۹۷۵ء کو شام ساڑھے پانچ بجے غالب اکیڈمی نئی دہلی میں، دہلی رائٹرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام جناب کرشن موہن کے نئے شعری مجموعے "گیان مارگ کی نظمیں" کی رسم اجرا ادا کی گئی۔ جلسے کے داعیان میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، بلراج کومل اور عبداللہ کمال کے نام شامل تھے۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر مسعود حسین خاں وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے فرمائی۔ شرکا میں دہلی کے ممتاز ادیب، شاعر، صحافی اور اہل ذوق حضرات شامل تھے۔

سب سے پہلے سید ذہین حسن نقوی، سیکریٹری غالب اکیڈمی نے، جو اسٹیج سکریٹری کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں مہمان خصوصی جناب کرشن موہن اور دوسرے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور جلسہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے صدر جلسہ سے درخواست کی کہ وہ کتاب کا اجرا فرمائیں اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات و خیالات سے بھی شرکائے جلسہ کو بہرہ اندوز ہونے کا موقع بخشیں۔ انھوں نے اردو کی طرف سے حکومت کی بے اعتنائی کا بھی شکوہ کیا اور اردو والوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی زبان کو زندہ رکھنے اور اپنے شاعروں اور ادیبوں کی قدر افزائی کے لیے اپنے طور پر جو کچھ کر سکتے ہیں اس سے انھیں گریز نہیں کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کرشن موہن صاحب کی شاعری کو روایت کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ شعری موضوعات اور شعری زبان کے معاملے میں ان کا رویہ اپنے پیشرو شاعروں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ ہم ان کی شاعری کو تجرباتی شاعری کا نام دے سکتے ہیں اور میری رائے میں ان تجربات کو فنی اعتبار حاصل کرنے کے لیے ابھی وقت درکار ہے۔ قابل قدر بات یہ ہے کہ کرشن موہن صاحب نئے نئے تجربات کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ جو ان کی خود اعتمادی کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے بعد عبداللہ کمال صاحب اور ضیا فتح آبادی صاحب نے کرشن موہن کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں اپنے منظوم تاثرات پیش کیے۔ ان کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ مائک پر آئے۔ نارنگ صاحب نے کہا کہ جس طرح زندگی کے لیے سانس لینا ضروری ہے اسی طرح شعر کہنا کرشن موہن کی ناگزیر ضرورت ہے۔ انھوں نے کرشن موہن کی نظموں کے حوالے پیش کرتے ہوئے ان کے شعری میلانات کی وضاحت کی اور ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس نئے جمالیاتی نقطۂ نظر پر زور دیا جو بدہیئتی میں خوب صورتی کے پہلو تلاش کر سکتا ہو۔

تیسرے مقرر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب تھے۔ انھوں نے کہا کہ کرشن موہن کی شاعری میں ہندی اور اردو کی آمیزش سے ایک نئے اسلوب کی داغ بیل پڑتی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری تنوع کی بھی حامل ہے۔ ان کی نظموں میں ہر قسم کے موضوعات آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ وسیع اور نظر دور رس ہے اور ان کے کلام میں ایک چونکا دینے والی ندرت اور اپج ملتی ہے۔ تلمیحوں اور استعاروں کی رنگا رنگی بھی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔

آخری تقریر جناب آنند نرائن ملا کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ میری نظر سے کرشن موہن کی سابقہ تصانیف بھی گذری ہیں لیکن "گیان مارگ کی نظمیں" میں انھوں نے جس طرح کی شاعری پیش کی ہے اس سے لطف اٹھانے میں، میں خود کو معذور پاتا ہوں۔ یہ شاعری جس زبان میں کی گئی ہے، اسے میں اردو ماننے سے بھی انکار کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ اردو کی انفرادیت کو ختم کرنے کے

مترادف ہے۔ میں کرشن موہن صاحب سے کہوں گا کہ وہ خود بھی اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں۔

آخر میں کرشن موہن صاحب نے اپنی ایک غزل اور پھر ایک نظم سنائی اور اسٹیج سکریٹری کی طرف سے صدر جلسہ، مقررین، مہمانِ خصوصی اور دوسرے شرکا کے شکریے اور چائے نوشی کی دعوت پر محفل ختم ہوئی۔

پہلی فروری ۷۵ء کو بزمِ سخن کٹک کی جانب سے حضرت امجد نجمی، سابق مدیر "شاخسار" کی پہلی برسی کے موقع پر "یوم نجمی" منایا گیا۔ ظہر سے عصر تک قرآن خوانی تھی۔ عصر کے بعد جناب ممتاز علی چیرمین وقف بورڈ نے حضرت نجمی کے مزار پر لوح نصب کی سنگ مرمر کی اس لوح مزار پر جمیل مظہری اور سید مسیح اللہ مسیح کے قطعات کندہ ہیں۔ اس کے بعد موصوف نے دیوان بازار میں "نجمی لائبریری" کا افتتاح کیا۔ یہ لائبریری مسلم ینگ کلچرل ایسوسی ایشن نے قائم کی ہے۔ شام کے وقت مستان درگاہ میں بزمِ سخن کے مستقل آفس کا قیام عمل میں آیا۔ گاندھی بھون میں رات ساڑھے نو بجے سے جناب ممتاز علی کے زیر صدارت مشاعرہ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک تھے۔ انھوں نے اردو میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک ایسی ہندوستانی زبان ہے جس کی قوتِ اظہار دوسری علاقائی زبانوں مثلاً اڑیا، بنگالی، ہندی وغیرہ میں نہیں پائی جاتی۔ اس کے باوجود اسے ابھی تک کوئی مخصوص علاقہ نہ مل سکا اسے بعض مخصوص علاقوں میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت ملنی چاہیے۔

ڈاکٹر مہتاب نے فرمایا کہ حضرت امجد نجمی اردو کے ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا کلام ہمارے ادب کا ایک قیمتی سرمایہ اور ہماری تہذیب کا ایک قیمتی ورثہ ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کی ذمہ داری وہ خود لیں گے۔ اس کے علاوہ مرحوم کی منتخب شاعری کا اڑیا ترجمہ شائع کرنے کی بھی کوشش کریں گے۔ کرامت علی کرامت نے کہا کہ ہم اہلِ اردو عموماً اپنے بزرگوں کی قدردانی کا حق ادا نہیں کرتے۔ آج میر، مومن اور نظیر اکبرآبادی کے مزارات کس مپرسی کے عالم میں ہیں۔ دہلی میں ذوق کے مزار پر پبلک لٹرین بنا دیا گیا ہے۔ ایسے میں اسے حضرت امجد نجمی کی خوش قسمتی تصور کرنا چاہیے کہ انھیں کم از کم لوحِ مزار تو ملا۔

اس کے بعد حضرت نجمی کی آواز ٹیپ ریکارڈ سے سنانے کے بعد مشاعرے کا آغاز کیا گیا جو صبح کے ساڑھے چار بجے تک چلتا رہا۔ اناؤنسر کا فرض جناب حفیظ اللہ نیولپوری نے انجام دیا۔

حلقۂ اربابِ دانش کی جانب سے نئی دہلی کی غالب اکیڈمی میں ۲ر فروری کی شام کو ایک تنقیدی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جناب عمیق حنفی نے کی۔ اس میں جناب ابوالفیض سحر نے ایک مقالہ بعنوان "تنقید میں تلاش و توازن کا عنصر" سنایا۔ محترمہ ہاجرہ شکور نے اپنی ایک غیر مطبوعہ کہانی بعنوان "نقطہ نظر" پڑھی اور جناب مظفر حنفی نے چند تازہ غزلیں سنائیں۔ یکے بعد دیگرے تمام تخلیقات بحث و تنقید کا موضوع بنیں۔ جس کے ذیل میں ہم عصر ادب کے بعض نئے پہلوؤں پر روشنی پڑی۔ گفتگو کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا۔ اور نشست کامیابی سے اختتام پذیر ہوئی۔

حلقۂ اربابِ دانش پہلے بھی اس طرح کی ادبی نشستوں کا اہتمام کرتا رہا ہے۔ اراکین حلقہ کی خواہش ہے کہ ہر ماہ ایک ایسی ہی تنقیدی نشست کا اہتمام کیا جائے۔ اس کا منشا ادب دوست اور اہلِ قلم حضرات کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے جہاں اردو شعر و ادب سے متعلق ہر مکتبۂ خیال کے لوگ ایک جگہ جمع ہو سکیں اور دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوں اور اس طرح شعر و ادب کی ترویج و ترقی کی سمت میں تخلیقی اور تعمیری اقدامات کیے جا سکیں۔

۵ر فروری کو بمبئی کے خوبصورت ہال "برلا ماتوشری سبھا گھر" میں ممتاز جدید غزل گو ممتاز راشد کے اعزاز میں ایک ثقافتی شو کا اہتمام کیا گیا۔ شو کے آرگنائزرز میں اختر الایمان چاند عثمانی، خلیل فقیہہ، شاکر غوری اور ....

خبرنامہ

۵ اپریل ۱۹۷۵ء کو شام ساڑھے پانچ بجے غالب اکیڈمی نئی دہلی میں، دہلی رائٹرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام جناب کرشن موہن کے نئے شعری مجموعے "گیان مارگ کی نظمیں" کی رسم اجرا ادا کی گئی۔ جلسے کے داعیان میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، بلراج کومل اور عبداللہ کمال کے نام شامل تھے۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر مسعود حسین خاں وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے فرمائی۔ شرکا میں دہلی کے ممتاز ادیب، شاعر، صحافی اور اہل ذوق حضرات شامل تھے۔

سب سے پہلے سید ذہین حسن نقوی، سیکریٹری غالب اکیڈمی نے، جو اسٹیج سکریٹری کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں مہمان خصوصی جناب کرشن موہن اور دوسرے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور جلسہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے صدر جلسہ سے درخواست کی کہ وہ کتاب کا اجرا فرمائیں اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات و خیالات سے بھی شرکائے جلسہ کو بہرہ اندوز ہونے کا موقع بخشیں۔ انھوں نے اردو کی طرف سے حکومت کی بے اعتنائی کا بھی شکوہ کیا اور اردو والوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی زبان کو زندہ رکھنے اور اپنے شاعروں اور ادیبوں کی قدر افزائی کے لیے اپنے طور پر جو کچھ کر سکتے ہیں اس سے انھیں گریز نہیں کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کرشن موہن صاحب کی شاعری کو روایت کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ شعری موضوعات اور شعری زبان کے معاملے میں ان کا رویہ اپنے پیشرو شاعروں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ ہم ان کی شاعری کو تجرباتی شاعری کا نام دے سکتے ہیں اور میری رائے میں ان تجربات کو فنی اعتبار حاصل کرنے کے لیے ابھی وقت درکار ہے۔ قابل قدر بات یہ ہے کہ کرشن موہن صاحب نئے نئے تجربات کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ جو ان کی خود اعتمادی کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے بعد عبداللہ کمال صاحب اور ضیا فتح آبادی صاحب نے کرشن موہن کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں اپنے منظوم تاثرات پیش کیے۔ ان کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ مائک پر آئے۔ نارنگ صاحب نے کہا کہ جس طرح زندگی کے لیے سانس لینا ضروری ہے اسی طرح شعر کہنا کرشن موہن کی ناگزیر ضرورت ہے۔ انھوں نے کرشن موہن کی نظموں کے حوالے پیش کرتے ہوئے ان کے شعری میلانات کی وضاحت کی اور ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس نئے جمالیاتی نقطۂ نظر پر زور دیا جو ہر ہیئتی میں خوب صورتی کے پہلو تلاش کر سکتا ہو۔

تیسرے مقرر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب تھے۔ انھوں نے کہا کہ کرشن موہن کی شاعری میں ہندی اور اردو کی آمیزش سے ایک نئے اسلوب کی داغ بیل پڑتی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری تنوع کی بھی حامل ہے۔ ان کی نظموں میں ہر قسم کے موضوعات آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ وسیع اور نظر دور رس ہے اور ان کے کلام میں ایک چونکا دینے والی ندرت اور اپج ملتی ہے۔ تلمیحوں اور استعاروں کی رنگا رنگی بھی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔

آخری تقریر جناب آنند نرائن ملا کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ میری نظر سے کرشن موہن کی سابقہ تصانیف بھی گذری ہیں لیکن "گیان مارگ کی نظمیں" میں انھوں نے جس طرح کی شاعری پیش کی ہے اس سے لطف اٹھانے میں، میں خود کو معذور پاتا ہوں۔ یہ شاعری جس زبان میں کی گئی ہے اسے میں اردو ماننے سے بھی انکار کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ اردو کی انفرادیت کو ختم کرنے کے

مترادف ہے۔ میں کرشن موہن صاحب سے کہوں گا کہ وہ خود بھی اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں۔

آخر میں کرشن موہن صاحب نے اپنی ایک غزل اور پھر ایک نظم سنائی اور اسٹیج سکریٹری کی طرف سے صدر جلسہ، مقررین، مہمانِ خصوصی اور دوسرے شرکا کے شکریے اور چائے نوشی کی دعوت پر محفل ختم ہوئی۔

پہلی فروری ۷۵ء کو بزم سخن کلکتہ کی جانب سے حضرت امجد نجمی، سابق مدیر "شاخسار" کی پہلی برسی کے موقع پر "یوم نجمی" منایا گیا۔ ظہر سے عصر تک قرآن خوانی تھی۔ عصر کے بعد جناب ممتاز علی چیرمین وقف بورڈ نے حضرت نجمی کے مزار پر لوح نصب کی سنگ مرمر کی اس لوح مزار پر جمیل مظہری اور سید مسیح احمد مسیح کے قطعات کندہ ہیں۔ اس کے بعد موصوف نے دیوان بازار میں "نجمی لائبریری" کا افتتاح کیا۔ یہ لائبریری مسلم ینگ کلچرل ایسوسی ایشن نے قائم کی ہے۔ شام کے وقت مستان درگاہ میں بزم سخن کے مستقل آفس کا قیام عمل میں آیا۔ گاندھی بھون میں رات ساڑھے نو بجے سے جناب ممتاز علی کے زیر صدارت مشاعرہ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک تھے۔ انھوں نے اردو میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک ایسی ہندستانی زبان ہے جس کی قوتِ اظہار دوسری علاقائی زبانوں مثلاً اڑیا، بنگالی، ہندی وغیرہ میں نہیں پائی جاتی۔ اس کے باوجود اسے اب تک کوئی مخصوص علاقہ نہ مل سکا اسے بعض مخصوص علاقوں میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت ملنی چاہیے۔

ڈاکٹر مہتاب نے فرمایا کہ حضرت امجد نجمی اردو کے ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا کلام ہمارے ادب کا ایک قیمتی سرمایہ اور ہماری تہذیب کا ایک قیمتی ورثہ ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کی ذمہداری وہ خود لیں گے۔ اس کے علاوہ مرحوم کی منتخب شاعری کا اڑیا ترجمہ شائع کرنے کی بھی کوشش کریں گے۔ کرامت علی کرامت نے کہا کہ ہم اہل اردو عموماً اپنے بزرگوں کی قدردانی کا حق ادا نہیں کرتے۔ آج میر، مومن اور نظیر اکبرآبادی کے مزارات کس مپرسی کے عالم میں ہیں۔ دلی میں ذوق کے مزار پر پبلک لٹرین بنا دیا گیا ہے۔ ایسے میں اسے حضرت امجد نجمی کی خوش قسمتی تصور کرنا چاہیے کہ انھیں کم ازکم لوح مزار تو ملا۔

اس کے بعد حضرت نجمی کی آواز ٹیپ ریکارڈ سے سنانے کے بعد مشاعرے کا آغاز کیا گیا جو صبح کے ساڑھے چار بجے تک چلتا رہا۔ اناؤنسر کا فرض جناب حفیظ اللہ نیولپوری نے انجام دیا۔

حلقۂ ارباب دانش کی جانب سے نئی دہلی کی غالب اکیڈمی میں ۲ر فروری کی شام کو ایک تنقیدی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جناب عمیق حنفی نے کی۔ اس میں جناب ابوالفیض سحر نے ایک مقالہ بعنوان "تنقید میں تلاش و توازن کا عنصر" سنایا۔ محترمہ ماجدہ تنکوستے اپنی ایک غیر مطبوعہ کہانی بعنوان "نقطہ نظر" پڑھی اور جناب مظفر حنفی نے چھ تازہ غزلیں سنائیں۔ یکے بعد دیگرے تمام تخلیقات بحث و تنقید کا موضوع بنیں۔ جس کے ذیل میں ہم عصر ادب کے بعض نئے پہلوؤں پر روشنی پڑی۔ گفتگو کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا۔ اور نشست کامیابی سے اختتام پذیر ہوئی۔

حلقۂ ارباب دانش پہلے بھی اس طرح کی ادبی نشستوں کا اہتمام کرتا رہا ہے۔ اراکین حلقہ کی خواہش ہے کہ ہر ماہ ایک ایسی ہی تنقیدی نشست کا اہتمام کیا جائے۔ اس کا منشا ادب دوست اور اہل قلم حضرات کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے جہاں اردو شعر و ادب سے متعلق ہر مکتبہ خیال کے لوگ ایک جگہ جمع ہو سکیں اور دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوں اور اس طرح شعر و ادب کی ترویج و ترقی کی سمت میں تخلیقی اور تعمیری اقدامات کیے جا سکیں۔

۵ر فروری کو بمبئی کے خوبصورت ہال "برلا ماتوشری سبھا گھر" میں ممتاز جدید غزل گو ممتاز راشد کے اعزاز میں ایک ثقافتی شو کا اہتمام کیا گیا۔ شو کے آرگنائزر زمیں اخترالایمان چاند عثمانی۔ خلیل فقیہہ۔ شاکر غوری اور ....

دی آر نیوگی کے نام شامل تھے۔ پروگرام کی صدارت جناب پربھاکر گپتے (منسٹر آف اسٹیٹ فار ٹاؤن شپ ہاؤسنگ مہاراشٹرا اسٹیٹ) نے فرمائی۔ پروگرام کو ریڈیو کے مشہور اناؤنسر امین سایانی نے بہت دلچسپ طریقے سے پیش کیا۔

پہلے مرتضیٰ احمد خاں، مسز منیشا گری اور آفتاب احمد خاں نے ساز و آواز کے ذریعے ممتاز راشد کی غزلیں پیش کیں۔ اس کے بعد مشہور رقاصہ ڈانسر حبیبہ رحمان نے ممتاز راشد کی ایک غزل کو رقص کی مدراؤں اور بھاؤوں کے ذریعے پیش کیا۔ درمیانی وقفے میں کیفی اعظمی نے ممتاز راشد کی شخصیت اور فن کا تعارف کروایا اور شو کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ "اس دلکش صحافتی شو کے انعقاد کا مقصد یہ ہے جدید غزل کے ایک اہم فنکار کی زندگی سے متعلق مسائل کا بوجھ کسی حد تک کم کیا جا سکے۔"

درمیانی وقفے کے بعد شاہد بجنوری اور اے۔ آر۔ بنگالی نے اپنے قہقہہ بردوش آئٹمز پیش کیے۔

شو میں شریک ہونے والی فلمی شخصیتوں کو جن میں جانی واکر، جیا بھادری، شبانہ اعظمی اور آشا سچدیو قابلِ ذکر ہیں۔ امین سایانی نے ایک کے بعد ایک کو اسٹیج پر بلایا۔ پھر امین سایانی اور فلمی ستاروں کی دلچسپ نوک جھونک نے فضا کو کشتِ زعفران بنا دیا۔

آخر میں [illegible] نازاں نے ممتاز راشد کی ایک غزل اور اپنے گائے ہوئے چند مشہور نغمے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیے۔

۹ اپریل ۷۵ء کو انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر "اردو گھر" کی زیر تعمیر عمارت میں ڈاکٹر سروپ سنگھ نے انجمن کی گیارہ کتابوں کی رسم اجرا ادا کی۔ ان میں ایک کتاب (انتخاب فانی) نئی تھی اور دس کتابیں وہ تھیں جو دوبارہ شائع کی گئی ہیں۔ جلسہ کی صدارت انجمن کے نائب صدر ڈاکٹر یوسف حسین نے فرمائی۔ اور نظامت کے فرائض عبداللہ کمال نے انجام دیے۔

ابتدا میں انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے شرکائے جلسہ سے جن میں دہلی کے ممتاز شاعر، ادیب، استاد، صحافی اور دوسری نمایاں سماجی شخصیتیں شامل تھیں، ڈاکٹر سروپ سنگھ کا تعارف کرایا اور اردو اور اردو والوں سے انھیں جو محبت ہے اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انجمن کی تاریخ پر مختصراً روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ زیر تعمیر "اردو گھر" جس میں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں، بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے ایک خواب کی تعبیر ہے۔ لیکن یہ تعبیر ابھی ادھوری ہے۔ اور اس کی تکمیل کے لیے آپ سب کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سروپ سنگھ نے خوشنما پیکٹ میں بندھی ہوئی کتابوں کی ایک ایک جلد، پیکٹ کھول کر انجمن کے جنرل سکریٹری کو پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کی طرف دیکھنے کے بجائے اردو والوں کو اپنی زبان کی ترقی کے لیے خود اپنے طور پر زیادہ ..... کوشاں ہونا چاہیے۔ حیدرآباد سے آئے ہوئے مہمان جناب راج بہادر گوڑ نے بڑی مدلل تقریر کی اور کہا کہ جب تک اردو کو بعض علاقوں میں ثانوی سرکاری زبان کی حیثیت نہیں دی جاتی اردو والوں کو اطمینان سے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ انھوں نے آئین کی دفعات ۳۴۵ اور ۳۴۷ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان پر عمل درآمد کے لیے یہ شرط کہ کسی ریاست میں اردو بولنے والوں کا فیصد تناسب کیا ہے، مغالطہ آمیز ہے۔ موجودہ ریاستیں لسانی بنیاد پر قائم ہوئی ہیں اس لیے کسی ریاست میں فیصد تناسب کی یہ شرط کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی۔ ان دفعات کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ فیصد تناسب کے تصور کو بدلا جائے۔ گوڑ صاحب نے اور بھی کئی عملی باتیں کہیں جو گہری توجہ کی مستحق تھیں۔

آخر میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے انجمن کی حالیہ سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور ڈاکٹر خلیق انجم کی کارگزاریوں پر اپنے اطمینان اور خوشنودی کا اظہار کیا۔

علی گڑھ سے دہلی آنے کے بعد انجمن کا یہ پہلا جلسہ تھا جو بہت کامیاب رہا اور اکثر شرکا خدمتِ اردو اور انجمن سے وابستگی کا ایک نیا ولولہ لے کر رخصت ہوئے۔

تحریک کو مراسلہ لکھتے وقت اپنا نام و پتہ یا خریداری نمبر لکھنا ضرور یاد رکھیں

وہ جو ہم میں نہیں رہے

۲۵ مارچ ۷۵ء کو رات کے ایک بجے مولانا عبدالخالق نقوی دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ وہ کچھ برس سے دل کے عارضے میں مبتلا تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۶ برس تھی۔

مولانا عبدالخالق نقوی کا شمار عربی زبان اور ادب کے ممتاز ہندوستانی ماہرین میں ہوتا تھا۔ عربی کے علاوہ وہ اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی انھیں پوری دسترس تھی۔ کئی برس تک انڈین سکول آف فارن لنگویجز میں عربی کے استاد رہے۔ اس اسکول کے لیے انھوں نے دو ڈکشنریاں بھی عربی سے انگریزی میں ترتیب دی تھیں۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ایما پر کالیداس کی مشہور تصنیف "وکرم اوروشی" کا عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ علمی رسائل میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔ تحریک میں بھی ان کے کئی مضامین چھپے ہیں۔

سیاسی عقائد کے اعتبار سے نقوی صاحب راسخ العقیدہ نیشنلسٹ مسلمان تھے اور ملک کی جنگ آزادی میں بھی انھوں نے شرکت کی تھی۔ ان کا وطن بھوپال تھا۔ وہی ان کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بھی رہا۔ دلی آنے کے بعد انھوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور ان کا پورا وقت علمی مشاغل میں صرف ہوتا تھا

کراچی میں ڈاکٹر محمود حسین خاں فالج کے حملے کی تاب نہ لا کر ۶۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انتقال کے وقت وہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز تھے۔ اس سے پہلے وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور کچھ مدت تک پاکستان کے وزیر تعلیم بھی رہے تھے۔ وہ سابق صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پرو وائس چانسلر ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے بھائی تھے۔ اور تعلیم و تدریس کے شعبوں میں اپنے بھائیوں کی طرح ہی، ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں انھیں عزت و شہرت حاصل تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے برعکس انھوں نے سیاست سے کبھی سروکار نہ رکھا اور اپنے دوسرے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی طرح پوری زندگی علمی مشاغل میں صرف کی۔ ذاکر صاحب کی وفات کے بعد، ان کی دائمی رخصت ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ دوسرے بہت سے نیازمندوں کی طرح ہم اس غم میں ان کے شریک ہیں اور دست بہ دعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں یہ غم برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔

پونا میں مولانا عامر عثمانی کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک مشاعرے میں اپنا کلام سنا رہے تھے کہ ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ اس سے جانبر نہ ہو سکے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کچھ عرصہ سے ان کی صحت اچھی نہ تھی اور انتقال سے پندرہ روز پہلے بھی ان پر دل کا سخت دورہ پڑا تھا۔ لیکن دوستوں کے اصرار پر وہ دیوبند سے بمبئی اور پونا تک کا سفر اختیار کرنے اور مشاعرے میں شرکت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے

مولانا عامر عثمانی ایک کہنہ مشق صحافی، صاحب طرز انشا پرداز اور عالم باعمل تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے نومبر ۱۹۴۹ء میں ماہنامہ "تجلی" جاری کیا اور پھر وہ اسی کے ہو کر رہ گئے۔ اس کے سارے مضامین انھی کے قلم کے مرہون منت ہوتے تھے۔ علمی اور دینی مسائل پر اظہار خیال، بدعتوں کے رد، الحاد اور بے دینی کے مختلف مظاہر کے خلاف قلمی جہاد اور کتابوں پر بے باکانہ تبصروں کے علاوہ ملا ابن العرب مکی کے نام اور "مسجد سے میخانے تک" کے عنوان سے وہ "تجلی" میں ایک طنزیہ کالم بھی لکھتے تھے جو

خاص وعام میں یکساں طور پر مقبول تھا۔ وہ ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ مختلف نظموں، غزلوں اور رباعیات وقطعات کے علاوہ انھوں نے حفیظ جالندھری کے "شاہنامہ اسلام" کی طرز پر ایک طویل مثنوی بھی لکھی تھی جو اسی نام سے شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم ان کی دینی بصیرت کا بھی بڑا اچھا اظہار ہے اور ان کے شاعرانہ کمال کا بھی۔

ادارۂ تحریک کے ساتھ مولانا عامر عثمانی کے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ یہ تعلقات کئی برس پرانے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں زیادہ استواری آتی گئی۔ ان سے آخری ملاقات جماعت اسلامی ہند کے اجتماع کے موقعہ پر ہوئی جس میں شرکت کے لیے وہ دیوبند سے تشریف لائے تھے۔ ان کی طبیعت ان دنوں بھی کچھ ناساز تھی اور وہ بہت کمزور نظر آتے تھے لیکن انھیں دیکھ کر یہ گمان ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس قدر جلد ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔ ان کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ پچاس سے کچھ ہی اوپر ہوگی۔ انگریزی اخبارات میں ۶۲ سال چھپی ہے جو درست نہیں ہے۔

مولانا کے پسماندگان میں ان کی غمزدہ بیوہ نسیم فاطمہ صاحبہ، چھ لڑکیاں، ایک لڑکا اور ان کا محبوب رسالہ "تجلی" شامل ہیں۔ ان کے برادر خورد عمر فاروق عثمانی صاحب نے اپنے خط میں "تجلی" کو بدستور جاری رکھنے کے ارادے کا اظہار کیا ہے۔ یہ ارادہ بہت مبارک ہے۔ اور ہم علم وادب کے قدر دانوں سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس ارادے کی تکمیل کے لیے عمر فاروق صاحب کے ساتھ بھرپور تعاون فرمائیں۔ اگر "تجلی" زندہ رہا تو یقین ہے کہ اس سے عامر صاحب کی روح خوش ہوگی۔ ●●

بقیہ: لا متناہی لمحہ

سیر کر آیا ہے۔ یار دوستوں کے نام فارم خرید دیا ہے۔ کہتا ہے دو تین کروڑ کی آسامی ہوں۔ دو ڈھائی لاکھ خرچ کر کے مندر بنوانے کی سوچ رہا ہے۔ پاپ کرنے پاپ دھونے کے لیے پیسہ ہی تو چاہیے۔ امیر وزیر سب تک اس کی رسائی ہے کتنا تو ایسے غیرے نتھو خیرے کو ہوتا ہے کامیاب آدمی کو کہیں پڑ ر نہیں۔ ہماری طرح سسک سسک کر نہیں جی رہا۔ کئی بار تقاضا کر چکا ہے — میرے ساتھ لگ جاؤ — مگر ہمت نہیں پڑتی — کیچڑ پھینکنا آتا نہیں تھا سمگلنگ خاک کروں گا۔ ہر وقت کی پریشانی کا رونا ضرور جاری رہے گا۔ کسی طرح پورا بھی تو نہیں پڑتا۔ کہنے کو سرکاری نوکری ہے۔ بازار میں سر سے نہیں اترتا آگے پیچھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جہاں کھڑے ہیں وہیں جمے رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ لے دے کر بچوں کو ڈانٹنے لگتے ہیں — یہ کام شریفوں کا نہیں، وہ کام اچھے خاندان کے لڑکے نہیں کرتے۔ اس ہر لمحہ بنجر ہوتی ہوئی روح والے سماج میں شرافت کو پوچھتا کون ہے۔ لوگ روشی ہی کو سلام کرتے ہیں۔ ہمیں ہر کوئی قصائی کی نظر سے دیکھتا ہے — ہارے ہوئے، مات کھائے ہوئے —

یکایک اُسے اپنی بیوی کی آواز سنائی دی۔ وہ ترش لہجے میں راجو کو ڈانٹ رہی تھی — تم نے یہ کام کیا ہی کیوں۔ جو کچھ جیتا ہے اُسے ابھی پنٹو کو واپس کر دے۔ ابھی اس کی ماں آ کر گلے پڑ جائے گی۔ بازی جیتنے کا اتنا ہی شوق ہے تو باپ سے کہہ اپنا مکان بنوانے کا انتظام کرے۔ سنتا ہے یا نہیں۔ ●●

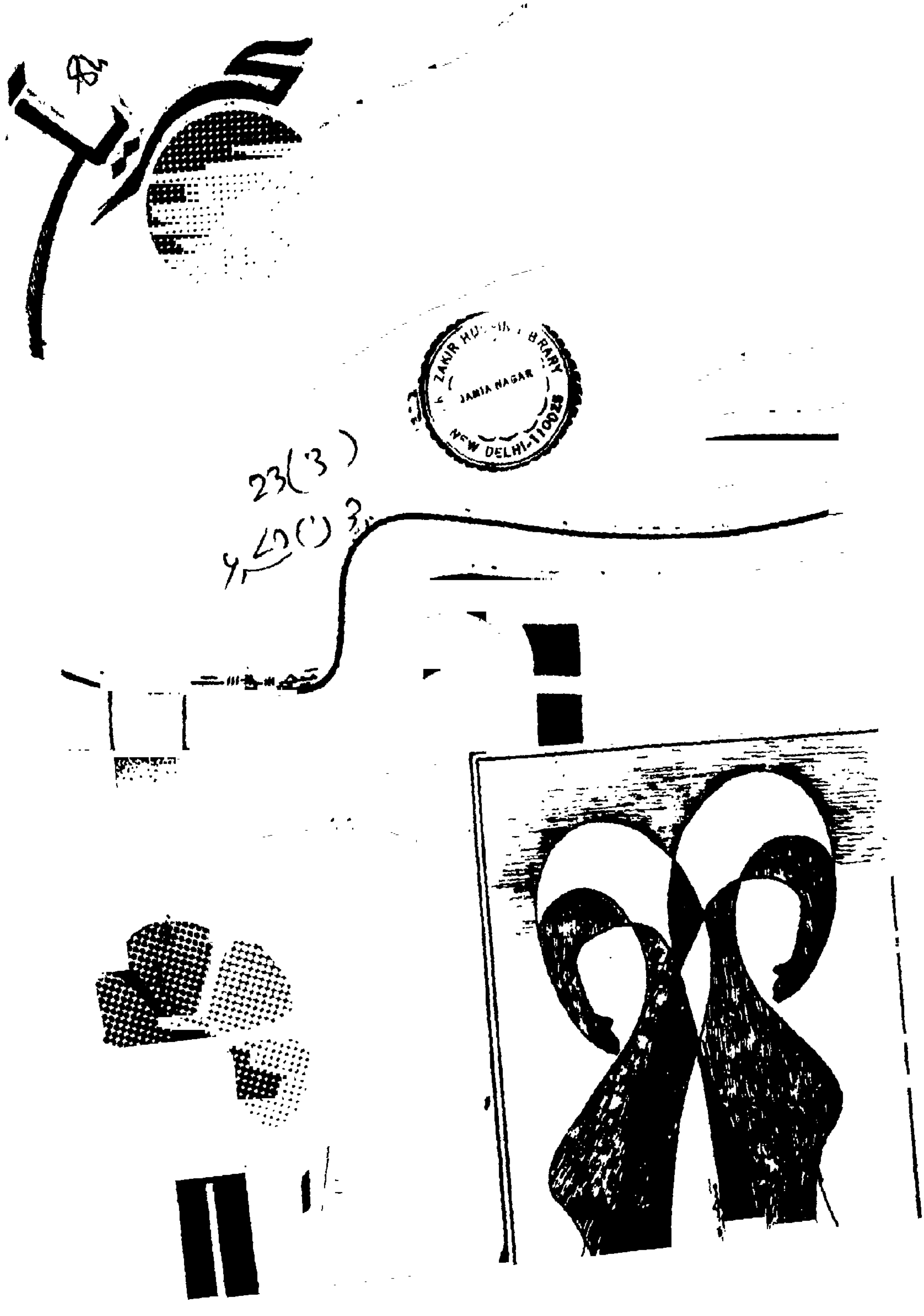
بقیہ: سوویٹ بلاک میں عورتوں کا درجہ

میں کاشتکاری کے شعبے میں کام کا ماحول بہت ہی ناقص ہے۔ یہاں کارکنوں میں عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ رومانیہ کی پارٹی کی سالانہ کانگرس میں جولائی ۱۹۷۳ء میں صدر سیسکو نے اس بات پر کڑی نکتہ چینی کی تھی کہ زراعت میں مرد نسبتاً آسان کام کرتے ہیں۔ پولینڈ کے لیبر منسٹر نے ایک انٹرویو میں جو "گلوس پراسی" میں ۱۰ مارچ ۱۹۷۴ء کو شائع ہوا تھا، یہ انکشاف کیا تھا کہ زراعت میں ۳۰ فیصدی عورتیں ساٹھ سال کی عمر کے بعد بھی کام کرتی رہتی ہیں جب کہ دوسرے شعبوں میں ایسی عورتوں کی تعداد ۳ یا ۴ فیصدی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ●●

Regd. No. D. (E) 116 Phone 271540 MAY 1975

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No [illegible]

TAHREEK



پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کیلیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک دہلی

جلد ۲۳ شمارہ ۳

جون ۱۹۷۵ء

ادارۂ تحریر

گوپال متل

مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت دس روپے — فی کاپی ایک روپیہ

غیر ممالک سے

سالانہ تیس شلنگ — فی کاپی تین شلنگ

پرنٹر پبلیشر اور پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس دہلی

مقام اشاعت

۹۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲

مندرجات

گوپال متل

اصلی نقلی چہرے

اپنے بلند بانگ دعاوی کے باوجود ترقی پسندوں کو اپنی ذات پر بھروسا نہیں۔ نہ وہ اپنے خط و خال کی بے پردہ نمائش کی تاب لا سکتے ہیں اور نہ اپنے عزائم ہی کو کھل کر بیان کر سکتے ہیں۔

یہ بات کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کمیونسٹ پارٹی کا امدادی دستہ ہے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ گذشتہ شمارے میں ہم نے ماہنامہ "شاعر" سے راجندر سنگھ بیدی کا جو بیان نقل کیا تھا اس میں بھی یہ بات موجود ہے۔ لیکن ترقی پسند اس کا اعلان کبھی نہیں کرتے۔ اور اپنی دکان چمکانے کے لیے ایسی شخصیتوں کی بھی آڑ لے لیتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ ان کی ہمنوا نہیں تھیں بلکہ جنھیں ان کے مقاصد سے بنیادی اختلاف تھا۔

۶ مئی سے ۹ مئی تک گیا میں ترقی پسندوں کی جو کانفرنس ہوئی اس میں بھی یہی کچھ ہوا۔ کانفرنس کی اہمیت جتانے کے لیے اس پر بڑا زور دیا گیا کہ یہ کانفرنس رابندر ناتھ ٹیگور کے جشن سالگرہ کے موقع پر منعقد ہو رہی ہے۔ جنھوں نے چالیس برس پہلے ترقی پسندوں کی پہلی کانفرنس کو پیغام تہنیت بھیجا تھا ——

اب یہ صحیح ہے کہ ٹیگور نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کو پیغام تہنیت بھیجا تھا۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ انھیں اس محاذی ادارے کے مقاصد سے کوئی ہمدردی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ کانفرنس کے مینی فیسٹو کے گول مول الفاظ سے وہ دھوکا کھا گئے تھے۔ کمیونزم کے بارے میں ان کی حقیقی رائے اس خط سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے پوتے سندر کو جو ان دنوں جرمنی میں تعلیم پا رہا تھا، لکھا تھا اور جس میں انھوں نے بولشوزم اور فاشیزم دونوں ہی سے اپنی بیزاری کا برملا اظہار کیا تھا۔ وشوبھارتی نے چٹھی پتر کے نام سے ٹیگور کے خطوط کے مجموعے شائع کیے ہیں۔ چوتھے مجموعے میں ٹیگور کا یہ خط موجود ہے۔ خط کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

"جہاں کہیں افلاس انسانوں کو کمزور کر دیتا ہے وہاں وبائیں پھیل جاتی ہیں۔ اسی طرح یورپ میں مصائب کے ساتھ ساتھ فاشیزم اور بولشوزم کی قوت میں اضافہ ہوا ہے ... یہ دونوں گمراہی اور ضلالت کا مظہر ہیں ... جب زندگی کی لہر مدھم ہوتی ہے تو بولشوک موت کے پیالی جن کر آ دھمکتے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر لرز جاتا ہوں کہ آدمی آدمی سے کتنا خوف ناک سلوک کر سکتے ہیں ..... تم خواہ کچھ بھی کرنا لیکن ان آدمخور تنظیموں میں کبھی نہ الجھنا ..."

یہ بھی درست ہے کہ منشی پریم چند نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی افتتاحی کانفرنس کی صدارت کی تھی۔ لیکن اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ "دوسروں پر اپنے خیالات ٹھونسنے والا راسخ العقیدہ شخص ایک آوارہ منش کے مقابلے میں کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ آخر الذکر کی نجات ممکن ہے لیکن ایک رعونت کیش راسخ العقیدہ شخص کی نجات کا کوئی امکان نہیں۔"

منشی پریم چند کے عقاید کے بارے میں یہ الفاظ بھی کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں چھوڑتے۔ لیکن اپنی بات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے انھوں نے اس ادب سے اپنی بیزاری کا اعلان بھی ضروری سمجھا "جو صرف ایک مخصوص طبقے کا حاشیہ بردار ہو۔" منشی پریم چند کے یہ الفاظ ادب کے .... کمیونسٹ نظریے سے کس حد تک متصادم

ہیں اس کا اندازہ کمیونسٹوں کے پیر و مرشد لینن کے مندرجۂ ذیل بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

"ادب کے لیے جانب داری لازمی ہے —
سوشلسٹ پرولتاریہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ
ادب میں جانب داری کے اصول کو انتہائی مربوط
اور مکمل طریقے پر عملی شکل دینے کی کوشش
کرے۔"

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ پرولتاریہ سے لینن کی مراد کمیونسٹ ڈکٹیٹر شپ تھی اور اس ڈکٹیٹر شپ نے روس میں جو گل کھلائے ان سے بھی سبھی واقف ہیں۔ ٹیگور یا پریم چند ایسی باتوں کے ہرگز روادار نہیں ہو سکتے تھے۔

ہندوستان کے کئی ادیب جو شروع میں کمیونسٹوں کے خوش نما لفظوں سے دھوکا کھا کر ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان سے الگ ہو گئے۔ ان میں محمد دین تاثیر بھی تھے جنھوں نے لندن میں سجاد ظہیر کے ساتھ مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی تھی۔ ہندوستان آکر انھوں نے جب اس انجمن کا حقیقی رخ دیکھا تو نہ صرف یہ کہ انجمن سے الگ ہو گئے بلکہ اس کی مخالفت پر بھی کمربستہ ہو گئے۔ یہ شعر انہی کے ہیں:

عجیب بات ہے جنت کو یاد رکھتا ہے
کہ شعر وہ ہے جو فتنوں کو یاد رکھتا ہے
کہیں گے وہ جو نہ کوئی شریف کرتا ہو
کہیں گے وہ جو میاں افتخار کہتا ہے

یہ میاں افتخار وہی ہیں جنھیں چراغ حسن حسرت نے جو خود کبھی کسی زمانے میں ترقی پسند رہ چکے تھے "دولت کا دیوتا" قرار دیا تھا۔ انھوں نے عوام میں سیاسی شعور پھیلانے کے تمام دعاوی کے باوجود ڈسٹرکٹ بورڈ کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا تھا کہ وہ ان کی زمینداری میں پرائمری اسکول قائم کر دے۔ بہرحال کمیونسٹوں نے اس "دولت کے دیوتا" سے خوب فائدہ اٹھایا اور ان کے خوانِ نعمت کی خوب خوب ریزہ چینی کی۔

یہ عجیب بات ہے کہ طبقاتی جنگ کی تمام تر دعویداری کے باوجود کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں کو امرا اور وزرا کی قصیدہ خوانی کا فن بھی خوب آتا ہے اور اس سے ان کے ضمیر میں جو خلش پیدا ہوتی ہے اس کا ازالہ وہ آپس کی صحبتوں میں اس قسم کے فقروں سے کر لیتے ہیں — "کیا ہوا اگر آج اس کی جوتی ہمارے سر پر ہے، کل جب انقلاب آئے گا تو اس کی گردن پر ہماری تلوار ہوگی۔"

بسمل سعیدی

رفتید ولے نہ از دلِ ما

مولانا عبدالخالق نقوی

کیوں کر نہ غمِ مرگ ہو بسمل جاں کاہ
ہے وردِ زباں ہر نفس انا للہ
افسوس جدا ہو گئے ہم سے ناگاہ
مولانا عبدالخالق نقوی آہ
خلقِ حسن و پاک خصائل کتنے
علم و ادب و ذوقِ مسائل کتنے
دیکھا یہ سرِ تربتِ نقوی بسمل
ہیں خاک بسر آج فضائل کتنے

مولانا ماہر عثمانی

اک سانحہ ہے حضرتِ ماہر کی وفات
اک عالم و نقاد کی، شاعر کی وفات
ہر بندہ کے تجزیے پہ قدرت جس کو
اُس رازِ درونِ گل کے ماہر کی وفات
بے لوث نگارش تھی، قلم تھا بے باک
لرزاں تھے تری نقد و نظر سے افلاک
سو بار کیا ہے تبصروں نے تیرے
خورشید کو بے قدر تر از ذرۂ خاک
سمجھا یا نظر نے تری دریا کو سراب
کتنے ہی عمیق قلزموں کو پایاب
الٹی ہے تری جرأتِ حق گوئی نے
چہروں سے معاصی کے، تقدس کی نقاب

گوپال مِتّل

جنوبی ویٹ نام میں کمیونسٹوں کی فتح کا حقیقی مفہوم

ہندوستان میں جو لوگ شمالی ویٹ نام کے لیڈروں کے بیانات سے گمراہ ہو کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جنوبی ویٹ نام میں کمیونسٹوں کی فتح، نوآبادیت پر قوم پرستی کی فتح ہے، یا یہ کہ شمالی ویٹ نام کے فاتحین وہاں "قومی جمہوری انقلاب" جیسی کوئی چیز لانا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ شمالی ویٹ نام کے چند حالیہ واقعات پر سرسری نظر ڈال لیں۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو انھیں محسوس ہو جائے گا کہ شمالی ویٹ نام میں جو چیز آنے والی ہے۔ وہ نہ قوم پرستی ہے اور نہ جمہوریت بلکہ خالصتہً استبدادی قسم کی کمیونسٹ ڈکٹیٹر شپ ہوگی۔ صاف ظاہر ہے کہ جنوبی ویٹ نام میں شمالی ویٹ نام کے کمیونسٹ رہنما وہی کچھ کریں گے جو اب تک انھوں نے ان علاقوں میں کیا ہے جن پر ان کا قبضہ تھا۔

۶ر اپریل ۱۹۷۵ء کو شمالی ویٹ نام میں قومی اسمبلی کے جو انتخابات ہوئے انھوں نے اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ جمہوریت کے بارے میں شمالی ویٹ نامی لیڈروں کا تصور اس تصور سے کافی مختلف ہے جو جمہوری ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ حکمران پارٹی بہرحال برسرِ اقتدار آجائے حکومت نے انضباطِ انتخابات کے لیے انتظامیہ کمیٹیاں قائم کر دیں۔ اور ان لوگوں کو دستور حق رائے دہندگی سے محروم رکھا۔ جن پر حکمران پارٹی کی مخالفت کا شبہہ ہو سکتا تھا۔ اسمبلی کی ۴۲۵ سیٹوں کے لیے امیدواروں کے علاوہ باقی سب امیدوار ویٹ نام فادر لینڈ فرنٹ نے کھڑے کیے تھے۔ یہ وہی ہمہ گیر تنظیم ہے جسے ۱۹۵۵ء میں ہوچی منہہ نے قائم کیا تھا۔ اپنی ساخت کے اعتبار سے یہ تنظیم قومی محاذ برائے آزادیِ جنوبی ویٹ نام کے مشابہہ تھی۔ ایک سرکاری سرکلر میں، جو ۲۳ر جنوری کو ہنوئی ریڈیو سے نشر بھی ہوا، یہ صاف طور پر بتا دیا گیا تھا کہ کون کون لوگ انتخاب میں کھڑا ہونے یا ووٹ کے حق کا استعمال کرنے کے نااہل ہیں۔

ان میں سزا یافتہ انقلاب دشمن بھی تھے، عام قسم کے وہ زمین مالک بھی، جن طبقے کا از سر نو تعین نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ بھی جن کی اصلاح کے لیے انھیں کمیونسٹ تعلیم دی جا رہی تھی، اور وہ لوگ بھی جو کسی نہ کسی وجہ سے زیر نگرانی تھے۔ انتخابات کی تیاریاں بھی زیادہ تر فادر لینڈ فرنٹ نے ہی کی تھیں۔

شمالی ویٹ نامی لیڈر اپنے عزائم کی پردہ پوشی کے قائل نہیں۔ حکمران ویٹ نام ورکرز پارٹی کے اوّل سکریٹری لی ڈوان نے اپنی کتاب "ویٹ نام میں انقلاب" (مطبوعہ ۱۹۷۰ء) میں کہا ہے کہ آزادی، مساوات، بھائی چارہ، انسانی حقوق اور جمہوریت صرف خوش نما تراکیب ہیں۔ جن کا مقصد بورژوا تسلّط کو برقرار رکھنا ہے۔ جمہوریت کی مکمل ترین اور افضل ترین شکل پرولتاری ڈکٹیٹر شپ ہے۔ شمالی ویٹ نامی جریدے "تاپ چی کونگ ڈوئی نہان ڈان" (فروری ۱۹۷۵ء) کے مطابق ویٹ نامی ورکرز پارٹی بجائے خود "ایک کڑے ضابطے والی تنظیم ہے اور جمہوری مرکزیت کے نظام پر یقین رکھتی ہے" پارٹی کی پینتالیسویں سالگرہ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے ٹی ٹروانگ چن نے ایک جلسے میں کہا تھا کہ پارٹی کڑی ڈسپلن کو مانتی ہے۔ یہ بات کہ ۱۹۶۰ء کے بعد ویٹ نام ورکرز پارٹی اپنی کوئی کانگرس منعقد نہیں کر سکی، ظاہر کرتی ہے کہ جمہوریت کے زبانی دعوے بھی چنداں اہم نہیں، اصل چیز ڈسپلن ہی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں پارٹی کے ضابطے میں یہ درج کیا گیا تھا کہ کانگرس بالعموم چار سال کے بعد منعقد ہوا کرے گی اور مئی ۱۹۶۰ء میں ویٹ نام ورکرز پارٹی کے نظریاتی جریدے "ہاک تاپ" نے کانگرس کو "پارٹی کی سرگرمیوں میں اہم ترین سرگرمی" قرار دیا تھا۔

لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پارٹی زیادہ اہمیت اس بات کو دیتی ہے کہ اپنے شکنجے کو مضبوط بنایا جائے۔ کم حوصلگی، نااہلیت

اور پست نظریاتی معیار کے نام پر صفائی کی مہم بھی زیرِ عمل ہے۔ اگست ۱۹۷۴ء میں زراعتی کوآپریٹیو اداروں کی کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے لی ڈوآن نے کچھ ڈیلی گیٹوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ دیہی علاقوں میں پارٹی کے صرف تیس یا چالیس فیصدی ممبر ہی سرگرم ہیں۔ چالیس فیصدی ممبروں کا معاملہ بین بین ہے اور دس سے بیس فیصدی تک ممبر کوئی کام کے نہیں۔ ستمبر ۱۹۷۴ء کے شمارے میں "ہاک ٹاپ" نے پارٹی کے ممبروں پر الزام لگایا تھا کہ وہ غیر پرولتاری اور نیم بورژوائی تصورات، موقع پرستی اور سامراجی تصورات پھیلاتے ہیں۔" لی ڈوآن نے فروری میں سالگرہ کی تقریب کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ پارٹی کو ایسے لوگوں کو اپنی صف میں شامل نہیں کرنا چاہیے جو انقلابی جدوجہد کے بارے میں مجہول رویہ رکھتے ہیں اور سختیوں سے گھبراتے ہیں۔ پارٹی کی صفوں کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان لوگوں کو جو پارٹی کی رکنیت کے اہل نہیں، خارج کر دیا جائے۔ پارٹی ڈسپلن کو توڑنے والوں اور موقع پرستوں کے لیے پارٹی کی صفوں میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ اور لبرل ازم کو کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جانا چاہیے۔

ڈسپلن کے نفاذ کے لیے حکمران صرف نظریاتی تبلیغ پر اکتفا نہیں کرتے۔ گذشتہ چند ماہ میں پبلک کو بار بار یہ بتایا گیا ہے کہ کمیونسٹ نظامِ زندگی کے نفاذ میں سیکورٹی فورسز کا فریضہ بہت اہم ہے۔ گذشتہ ستمبر پیپلز سیکورٹی فورسز میں مسابقت جوئی کی مہم کی ابتدا کرتے وقت پبلک سیکورٹی منسٹری نے ایک ہدایت نامہ جاری کیا تھا۔ جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ فورس کے نوجوانوں کو پرانے سماج کے اثرات اور برائی عادات کی مخالفت کرنی چاہیے اور پرانے لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے کے خلاف بھی جہاد کرنا چاہیے اسی طرح تخریب کاری، جاسوسی اور قانون شکنی کے عام رجحان کے خلاف بھی انہیں سرگرم عمل ہونا چاہیے۔ فوجی اخبار "کوان ڈوئی نہان ڈان" نے اپنی ۲۵ فروری ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ جاسوسوں اور رجعت پسندوں کی سرگرمیوں کے اہم مراکز شہر ہی ہیں۔ یہ جاسوس عوام کے حوصلوں کو پست کرنے اور ہمارے جذبۂ جہاد کو کمزور بنانے کے لیے ہر قسم کے استعمال کرتے ہیں اور پسماندہ اور غیر مطمئن لوگوں کو اس بات کے لیے ابھارتے ہیں کہ وہ حکومت کے لیے مشکلات پیدا کریں۔ اسی پرچے نے اپنی ۲۰ نومبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ دشمن اور برے عناصر فوج کے کمزور حصوں کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز سمجھتے ہیں اور فوج کے حوصلوں کو پست کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اپنی ۲ مارچ ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں "نہان ڈان" نے لکھا کہ عوامی سطح سیکورٹی فورس پرولتاری ڈکٹیٹرشپ اور ریاست کے تحفظ کا موثر ترین وسیلہ ہے۔

ملٹری فورس سیلف ڈیفنس ملیشیا، سول ڈیفنس فورس، ولیج پبلک سیفٹی فورس بھی اسی قسم کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ ادارے مخبر بھرتی کرتے ہیں جن میں پڑوسی بھی شامل ہوتے ہیں اور رشتہ دار بھی۔ "ہنوئی موئی" نے اپنی ۱۴ جنوری ۱۹۷۴ کی اشاعت میں لکھا تھا کہ دان ڈین قصبے میں محلے اور عوام نے ناپسندیدہ عناصر کی گرفتاری میں سرگرم حصہ لیا۔ محلے کے ایک رکن کی اس بنا پر خاص طور پر تعریف کی گئی کہ اس نے اپنے حقیقی بھائی کے خلاف مخبری کی تھی۔

باقی کمیونسٹوں کی طرح شمالی ویٹ نام میں بھی قانونی اداروں کو ریاستی ادارے سمجھا جاتا ہے جن پر حکمران پارٹی کی تابعیت لازمی ہے۔ پیپلز کورٹ کے صدر ڈام وام باچ نے ۲۴ دسمبر ۱۹۷۴ء کو قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ قانونی اداروں کا مقصد ریاستی پالیسیوں کی تکمیل اور انضباط کو برقرار رکھنا ہے۔ انہی صدر صاحب نے ۱۹۷۵ء میں یہ بھی فرمایا کہ "عدالتیں مقدمات کی سماعت کو موثر تر بنائیں گی تاکہ ریاستی انتظام کو تقویت پہنچے۔"

کرشن موہن

تنتر یوگ

لذتِ جسم و ہم آغوشی کو
اپنے کلیان کا درپن سمجھے
چند بھولے ہوئے بھولے راہی
بھوگ کو یوگ کا سادھن سمجھے

فرید بانی

لوگوں کے عیبوں کے لیے اندھا بن جا
بدخوئی جو کوئی کرے، بہرا بن جا
بدگوئی کرنا ہو تو گونگا بن جا
چکلے جانا چاہے تو لنگڑا بن جا

نیچتا کی نیو

کامنا کا کھیل ہے یہ زندگی
کامنا چکر میں ہر اک جیو ہے
کرشن موہن ہے مگر یہ بھی درست
مالِ وافر نیچتا کی نیو ہے

درپن

بھوگ کو روگ من کا بنا کر
ہم نے جیون کیا ہے اجیرن
کامنا ہو اگر اپنے بس میں
من بنے یوگ درشن کا درپن

کائی

سنگیں سناٹا ہے طاری
یاس رواں ہے آس تھمی ہے
گہری جیون جھیل پہ ہر سو
شنکاؤں کی کائی جمی ہے

کامنا

کامنا ہے ہمارا کھلونا
جس طرح چاہیں ہم اس سے کھیلیں
کامنا کے کھلونے بنے جو
ہر سمے کام کا کشٹ جھیلیں

فضا ابن فیضی

کوئی ہجوم میں مجھ کو نہ پا سکا دے گا
سراغ اس کا، ہما راہی نقشِ پا دے گا
خود اپنی خاک سے ابھرا ہوں آفتاب آسا
چراغِ بزم نہیں میں کہ تو بجھا دے گا
کسے یہ فکر بدن کو سنبھال کر رکھے
دکھوں کا سیل تو دیوارِ جاں گرا دے گا
جنوں کے نام پہ سب بے لباس ہیں، پھر کون
بصیرتوں کو مری خلعت و قبا دے گا
ترا وجود ہے ساون کے ابر کا ٹکڑا
یہ میری پیاس کو کچھ دن تو آسرا دے گا
پھر آئیں جاڑے کی راتیں، کہانیاں چھیڑو
کوئی الاؤ بھی چوپال میں جلا دے گا
کسی افق پہ سجلنے کہ دور کی ہوں کرن
نہیں ہوں آگ کا شعلہ کہ تو ہوا دے گا
ستارۂ سحری کو بہت حقیر نہ جان
یہی تجھے ترے خورشید کا پتا دے گا
کھڑا ہوں دیر سے دہلیزِ وقت پر چپ چاپ
کوئی تو مجھ کو کبھی دعوتِ نوا دے گا
یہ میرے دور کے ناقد ہیں، کیا خبر تھی مجھے
زمانہ ہاتھ میں اندھوں کے آئینہ دے گا
ہنر کی دھوپ میں کم بخت ساری عمر جلا
مرے قلم کا شجر مجھ کو چھاؤں کیا دے گا
ذرا بطونِ معانی میں اب اترنا سیکھ
شعورِ لفظ تجھے مر کے خود صدا دے گا
فضاؔ کچھ اور تپا اپنے آپ کو اک روز
یہ سوزِ دل، ترے لہجے کو جگمگا دے گا

عروج زیدی

ذکرِ درماں سے نہ بد ظن غمِ پنہاں ہونا
میرا مشرب نہیں اپنوں سے گریزاں ہونا
گل تو گل، سایۂ دیوارِ چمن بھی ہے حرام
کوئی آسان ہے شرمندۂ احساں ہونا
آسماں! تیرے ستاروں کا بھی کچھ مصرف ہے؟
خاک کے ذرّوں کی معراج ہے انساں ہونا
نیند آنکھوں میں نہیں خوابِ پریشاں کی قسم
تم مرے خواب میں آ کر نہ پریشاں ہونا
یہ بھی منجملۂ آدابِ دعا ہے شاید
میرا نا کردہ خطاؤں پہ پشیماں ہونا
دھوپ نے چھین لیا رنگ، ہوا نے خوشبو
گل نے چاہا تھا حریفِ رخِ جاناں ہونا
منصبِ عشق ملا، درد کا اعزاز ملا
سچ تو یہ ہے کہ بڑی چیز ہے انساں ہونا
بادل آتے ہیں، برستے ہیں، گزر جاتے ہیں
سب کی قسمت میں کہاں خالقِ طوفاں ہونا
یہی فانی کا تخیل یہی احساسِ عروجؔ
عمر بھر عقل سے سیکھا کیے ناداں ہونا

نوبہار صابر

جب سے پکی سڑک بن گئی گاؤں میں
آ بسی شہر کی بھیڑ کر ری، گاؤں میں
الاماں! کس قیامت کا بھونچال تھا
جھونپڑی اک نہ سالم بچی گاؤں میں
دل گزاروں کے تاریک ہوتے گئے
جتنی بڑھتی گئی روشنی گاؤں میں
سنگپاروں کی آنکھوں میں چبھنے لگی
اب تو خیشوں کی ہم سائیگی گاؤں میں
شہر جس کی کدورت سے بدنام تھا
اب وہی خاک اڑنے لگی گاؤں میں
جب الاؤ کے شعلے ضیا پوش تھے
کیا فضا تھی الف لیلوی گاؤں میں
مسترد ہو گیا بانسری کا چلن
نغمہ زن ہے دودھ بھارتی گاؤں میں
رجب سے میلوں تماشوں کا موسم گیا
کھل کے ملتی نہیں زندگی گاؤں میں
صابرؔ اب کے تو جاتے ہی مرجھا گئی
میرے خوابوں کی نازک کلی گاؤں میں

سعادت احمد

انتظار اب بھی ہے!

ملک پور کے دامن میں دریا کے کنارے ایشیا کی سب سے بڑی کھاد کی فیکٹری بن رہی تھی۔ اس فیکٹری کو پانی کے لیے ایک بہت بڑے کنویں کی ضرورت تھی جس کی تیاری کا ٹھیکہ میرے دوست کریم الدین کو ملا تھا۔

اتنے بڑے کام کو وہ تنہا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تو میں فوراً اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ویسے بھی میں شہر کی تھکا دینے والی مصروفیت، شور و غل اور انسانوں کے ہجوم سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا — ایام گذشتہ کا زخمی خواب میری پرسکون زندگی میں تلخیاں گھول چکا تھا — میں سکون کا متلاشی اور تنہائی کا طلب گار تھا — جنگل پہاڑیاں نیلے آکاش پر چاند، ہریالی سے پٹے ہوئے سرسبز میدان میرے فطری میلان کے عین مطابق تھے۔ میں پھر سے ایک بار ان حسین نظاروں میں کھو جانا چاہتا تھا۔

کنویں کی کھدائی کا کام شروع ہو چکا تھا — مردوں کے دوش بدوش بوڑھی عورتیں اور نوجوان لڑکیاں بھی کام کر رہی تھیں۔

میں ان مزدوروں کو کام کرتے دیکھ رہا تھا تو مجھے مصر کے اہرام یاد آئے۔ انسانی محنت کی عظمت کا ایک لافانی نقش جو صفحۂ ہستی پر ثبت ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ محنت کش مزدور نہ ہوتے تو شاید اس دنیا میں تاج محل، ایلورہ، اجنتا جیسی نادر روزگار یادگاریں کبھی نہیں ہوتیں۔ ماضی و حال کے محنت کش انسانوں کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک بھوری بھوری آنکھوں لمبی پلکوں اور کالی کالی زلفوں والی لڑکی پر پڑی — مجھے میرے ماضی کا شکستہ خواب یاد آیا۔ اس لڑکی کا چہرہ شانو سے بہت ملتا جلتا تھا — ہاں شانو، جو اب بھی میری روح کا اجالا تھی۔ میرے احساس کی خوشبو تھی۔ میرے دل کی دھڑکن اور میری زندگی کا حاصل۔!

شادری پربت کی ہری بھری وادی میں واقع حسنہ پور اپنے سادہ دلفریب مناظر اور چھوٹی چھوٹی گھونسلوں جیسی جھونپڑیوں کے ساتھ پل بھر کے لیے میری نگاہوں میں نقشِ مبہم کی طرح ابھر کر خیالوں میں پھیل گیا۔

حسنہ پور کے مشرقی حصہ میں شانو کا باپ اپنے جوار، مکئی اور تور کے کھیتوں کی نگہبانی کرتا تھا۔

شانو شام ہونے سے پہلے اپنے باپ کو کھیت پر کھانا پہنچانے جاتی اور گھر لوٹتے وقت میں اس کو راستے ہی میں پا لیتا تھا — بھیگی ہوئی شام اور خوشبو میں بسی ہوئی ہواؤں میں سجتی ہوئی پورن ماشی کے چاند کی دودھیا چاندنی میں ہم دونوں خوابوں کی پرچھائیوں کی طرح ساتھ ساتھ چلتے۔

راستے کے دونوں جانب شنبالو کی ہری بھری باڑیں تھیں۔ جھینگروں کی سیٹیوں سے جب شانو پر پراسرار سا خوف چھا جاتا تو وہ میرے قریب تر ہو جاتی۔ اور میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا — اس طرح دونوں گاؤں تک پہنچ جاتے تھے۔!

اور پھر نہ جانے کیا بات ہوئی شانو نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا میں ہر شام اُس راستے پر جاتا لیکن وہاں مجھے ویرانی کے کالے سایوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔

کبھی راستے میں شانو کا باپ کھیت سے آتا ہوا اور کبھی گاؤں سے کھیت کی طرف جاتا ہوا مل جاتا تھا۔ ایک دن نہ جانے کیوں میرا دل بہت بے چین ہو گیا — شانو کی دید کے لیے کہ اچانک...... راستے میں گاؤں کے مکھیہ سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ شانو کی شادی گاؤں کے ایک نوجوان مادھو سے ہو رہی ہے۔

"شانو کی شادی ہو رہی ہے" مکھیہ کی بات پر مجھے اعتبار

نہیں آیا اور میں پاگلوں کی سی حالت میں دوڑا دوڑا گاؤں پہنچا شانو کے گھر پر شہنائی بج رہی تھی۔ میرے سامنے سماج کی بنائی ہوئی صدیوں پرانی رسم کسی پنڈت کے ہاتھوں انجام دی جا رہی تھی۔

شانو کی شادی ہو گئی۔ میری امیدوں کے محل ٹوٹ گئے — آرزوؤں کی کلیاں پھول بننے سے پہلے مرجھا گئیں۔ اور زندگی موم کی طرح پگھلتی رہی۔ لمحات کا سفر جاری رہا — اور پھر وہ زمانہ ایک خواب بن گیا — ایک بھولا ہوا، ٹوٹا اور جلا ہوا خواب — اور آج میری صدیوں جاگی ہوئی آنکھوں میں وہ خواب لہرا رہا تھا۔ کسی آنچل کی طرح، کسی پرچم کی مانند — کسی شفاف چشمے میں بل کھاتے ہوئے سنہرے سانپ کی طرح۔

دفعتاً میرا نام لے کر کسی نے مجھے پکارا! — میں چونک پڑا — میرا دوست کریم الدین کنوئیں کی کھدائی کے کام کے بارے میں مجھ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا — شانو مجھے دیکھ رہی تھی — ہاں — میں شانو کو دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکی شانو کے روپ میں میرے آگے کھڑی تھی۔!

وہ کنوئیں سے باہر آئی شاید اس کو پیاس لگی تھی۔ میں نے اسے لوٹے میں پانی ڈالتے ہوئے مدھ بھری آواز میں بے اختیار کہا —

"تم پیاسی ہو نا — ؟"

وہ پلکیں اٹھا کر ایسی شناسا نگاہیں جیسے کہہ اٹھیں۔

"— ہاں — صدیوں سے پیاسی ہوں!"

"شانو تم — —" میرے لبوں کو ایک جنبش ہوئی۔

"نہیں — بابو — میں مالا ہوں —"

"مالا — — تمہارا نام بھی اچھا ہے —" میں نے اس کی بھوری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"... بابو — یہ ملک بہت خراب ہے"

پھر ... فضا میں لہرائی — "ارے مالا — جلدی پانی پی کام رک گیا ہے۔"

پانی پی کر وہ چلی گئی — مگر دل پر ایک نقش سا ابھار گئی — اور جیسے جیسے ... کچے خاکے میں رنگ بھرتے گئے — یہ

سب کچھ اس قدر خاموشی سے ایسے دھیرے دھیرے اس طرح غیر محسوس اور غیر ارادی طور پر ہوا کہ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے خود اپنی حالت پر ہنسی آ گئی اور دل کی قسمت پر رونا آ گیا — غم کی دھوپ میں خوشی کی برسات — چھوڑی ہوئی راہوں کی طرف میرے قدم خود بخود بڑھتے گئے۔

ایک رات صاف بے ابر آسمان پر پورا چاند بڑی آب و تاب کے ساتھ دمک رہا تھا۔ میں مالا کو اپنے ساتھ لیے ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں اس کے اور میرے سوا کوئی اور بھی نہیں تھا جنگل پہاڑیاں چٹیل میدان اور خوابیدہ کھیت — چاروں طرف دھواں دھواں سا پھیلا ہوا تھا — مالا میرے پاس تھی — پیاسے جسم۔ پیاسی روحیں — ————

— ایک آس کی آگ میں ہم پگھل رہے تھے — تحلیل ہو رہے تھے — چاند تاروں کی چمک، خشک عنبر کی مہک، اور — اور بہتی رات کا رومانی سکوت —!

خیالوں کے آسمانوں سے اترتے ہوئے جھنجھناتے سے لہجے میں بات بڑھانے کی خاطر میں نے کہا

"مالا تم دن بھر کام کرتے ہوئے تھک نہیں جاتیں۔؟"

"نہیں بابو ہم غریب دیہاتی بھلا تھکنا کیا جانیں اور پھر یہ ٹھیکیدار بڑا بے رحم آدمی ہے۔"

"نہیں مالا — ایسی بات نہیں ہے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا — "یہ کنواں برسات شروع ہونے سے پہلے تیار ہو جانا چاہیے۔" پھر میں نے اس کی آنکھوں کا خمار اپنی پیاسی آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ "مالا تمہیں اتنی رات گئے ادھر آتے ڈر نہیں لگتا۔!"

"تم جو ہو بابو —" اس نے خوشی سے بھرپور آواز میں اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا

"مالا —!" اچانک اور بے اختیار میں نے پوچھا "تمہاری شادی نہیں ہوئی ابھی تک؟"

وہ یوں تڑپ اٹھی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو — بڑی مظلوم نگاہوں سے میری طرف دیکھا — سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔ جیسے آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کے طوفان کو مجھ سے

چھپانا چاہتی ہو ــــ اس کی خاموش اور نمناک نگاہوں میں صدیوں کا انتظار جیسے منجمد ہو کر رہ گیا ــــ

"شاید مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے چھوڑتے ہوئے کہا۔

وہ خواہ مخواہ مسکرا اٹھی ــ "نہیں بابو ــــ یہ تو تمھاری مہربانی ہے ــــ " وہ کھوکھلی سی، زخمی سی آواز میں بولی ــ "بابو تم مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو ــــ ؟"

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو ــــ ؟" میں نے ایک بار اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ــــ "یہ درد بڑا پرانا ہے مالا ــــ یہ تمہارا درد میرا بھی درد ہے۔ تم شاید ان باتوں کو سمجھ نہیں سکوگی

غمِ گذشتہ کی طرح تم پھر مجھے مل گئی ہو ــــ جسم وہی ہے، روپ وہی ہے نام بدل گیا ہے ــــ اور نام میں کیا رکھا ہے ــــ ؟

ہاں مالا ــــ شانو ــــ تمھارے نام چاہے کچھ بھی ہوں، نہ ہوں، تم میری پاکیزہ محبت ہو، زندگی ہو، آؤ پھر سے ہم دونوں ایک ہو جائیں۔ تلاش اور انتظار کے شعلوں کو بجھا ڈالیں۔ ہم جو ایک منقسم اکائی کی طرح ایک دوسرے سے یوں دُور دُور ہیں پھر سے ایک اکائی بن جائیں ــــ ایک جسم، ایک جان ــــ ایک تمنائے عروجِ انسان۔ ایک تکمیل وجودِ آدم ــ !!

مالا سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کی خاموشی جیسے کہہ رہی تھی ــــ . . . . "بابو تم سے پہلے بھی کسی نے میرا ہاتھ پکڑا تھا ــــ اور نہ جانے کیوں پھر چھوڑ کر چلا گیا ــــ کہاں چلا گیا مجھے نہیں معلوم ــــ مگر وہ آج تک واپس نہیں آیا۔"

میں چونک پڑا۔ چاند کو ایک کالے بادل کے ٹکڑے نے نگل لیا تھا۔ فضا کی رنگت بدل گئی تھی۔ کچھ دیر بعد چاند کالے بادلوں سے نکلا تو اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسوؤں نے مجھے ایک بار اور احساس دلایا کہ انتظار منجمد کیسے ہوتا ہے!

"مالا ــــ" میں نے سرگوشی کی

"ہاں مالا ــــ کام ختم ہو چکا ہے ــــ میں شہر جا رہا ہوں۔"

مالا کی آنکھیں خوف، دہشت اور غم سے پھیل گئیں ــــ وہ منتظر اور مظلوم آنکھیں ــ اور جب میں شہر جا رہا تھا، ایک آواز برابر میرا پیچھا کر رہی تھی۔

"بابو ــــ تم آؤ گے نا ــــ؟ میں گاؤں کی ترقی کے لیے محنت اور لگن سے کام کروں گی ــــ تاکہ جب تم یہاں آؤ تو مجھے اور میرے گاؤں کو ایک نئے روپ میں دیکھ سکو!"

ب سے فیض حاصل کرتا ہے نہیں اٹھایا بلکہ یہ سوال ہمیشہ ان ، نے اٹھایا ہے جن کی ادب کے ساتھ وابستگی ثانوی نوعیت ے۔ میری مراد سیاست دانوں، عقیدہ پسندوں اور فلسفیوں ہے جن کی عکاسی کسی نہ کسی رنگ میں ادب کرتا ہے۔ ہمارے ہاں ری برائے شاعری" یا "ادب برائے ادب" کا نعرہ مغرب آمدشدہ ہے۔ لیکن ۱۹۳۵ء سے پہلے شاید اس کے استعمال ورت کبھی نہیں ہوئی۔ اردو ادب میں یہ نعرہ اس وقت بلند ہوا قی پسند تحریک نے ادب کو سیاسی مقاصد کا تابع فرمان کرنے زہ اٹھایا۔ ادب کے اساسی فرائض یعنی عرفانِ ذات، تکمیلِ ت۔ تہذیبِ نفس اور فروغِ صداقت وغیرہ کو ثانوی حیثیت ر ایک خاص قسم کا ٹکسالی ادب پیدا کیا۔ جو ہمیشہ ایک جیسا تاثر ور ایک ہی نظریے کی فوقیت کو ثابت کرتا تھا۔ در آنحالیکہ ب نہ ڈھنڈورچی ہے اور نہ محض پرچارک۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ـیں چاہـر نے قرار پا لیا ہے۔ ایسا فرد و

ہے۔ ادب کا تعلق چونکہ زندگی سے ہے اور زندگی ہمیشہ بامقصد ہوتی ہے اس لیے ادب بے مقصد کس طرح ہو سکتا ہے؟ تاہم اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ادب کی تخلیق کے ساتھ زندگی کے مادی فوائد وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو شاید ادب کی حیثیت بالکل غیر افادی ہو۔ ادب کا عمل بلاواسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ ہے۔ اور جب کبھی ادب کو مقصد کے لیے بلاواسطہ استعمال کیا جاتا ہے تو یہ سستے پروپیگنڈے کی سطح پر اتر کر اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی اپیل محدود ہو جاتی ہے اور تاثر محض لمحاتی۔ اعلیٰ فنکار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ فن کی ایک خاص معیاری سطح برقرار رکھے اور اپنے تجربے کو تخلیقی کٹھالی سے گزر کر کندن بننے کا موقع مہیا کرے۔ صحافتی رپورٹ اور فن پارے میں فرق یہی ہے کہ صحافی واقع کو من و عن بیان کرنے میں تعجیل سے کام لیتا ہے۔ جب کہ فنکار واقعات کے چناؤ، ترتیب اور اسلوب نگارش سے اس واقع کی نئی معنویت دریافت

اور آج پھر میں ملک پور آیا ہوں - پورے دس سال بعد -
اور حیران رہ گیا ہوں - گھونسلوں جیسی جھونپڑیوں والے ملک پور
کا رنگ روپ بدل گیا ہے - جھونپڑیوں کی جگہ سلیقے سے بنائے پختہ
مکان، تنگ ناہموار گلی کوچوں کے بدلے صاف کشادہ سڑکیں ---
سڑکوں کی دونوں جانب ایستادہ سرخ پھولوں کے درخت ---
اسکول --- دواخانہ --- کمیونٹی ہال اور گرام پنچایت کی خوبصورت
عمارتوں کے اس طرف کھیل کا کھلا میدان جس میں صاف ستھرے
کپڑوں میں ملبوس ننھے منے صحت مند بچے کھیل رہے ہیں
میرے سامنے مالا کھڑی ہوئی ہے - اس کے ہونٹوں پر
[illegible] ... کچھ کچھ

دفعتاً میرا نام لے کر کسی نے مجھے پکارا --- میں چونک پڑا
--- یہ دوست کریم الدین کنویں کی کھدائی کے کام کے بارے
میں مجھ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا --- شانو مجھے دیکھ رہی
تھی --- ہاں --- میں شانو کو دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکی شانو
کے روپ میں میرے آگے کھڑی تھی --- !

وہ کنویں سے باہر آئی شاید اس کو پیاس لگی تھی - میں نے
اسے لوٹے میں پانی ڈالتے ہوئے جذباتی آواز میں بے اختیار
کہا ---

"تم پیاسی ہو ---"

وہ [illegible] سی سنسناہٹ جیسے کہہ اٹھیں -

"--- ہاں --- صدیوں سے پیاسی ہوں !"

شانو تم --- " میرے لبوں کو ایک جنبش
ہوئی

"نہیں --- بابو --- میں مالا ہوں ---"

"مالا --- [illegible] ہے --- " میں نے اس کی
[illegible] ہوئے کہا۔

"[illegible] زندگی [illegible] سراب ہے"

یہ [illegible] --- [illegible] --- جلدی
[illegible] گیا ہے "

پانی لے کر وہ چلی گئی --- [illegible] ایک نقش سا ابھار گئی ---
[illegible] خاکے میں رنگ بھرتے گئے --- یہ

جدلیاتی تنقید میں تاریخی، سماجی عظمت کو فنی عظمت کا ہم پلہ قرار
دیا گیا ہے اور شاید یہی نسبت آج کے ادیب کو زر و دولت کی
لوٹ کھسوٹ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے پر مجبور کر رہی ہے۔ وہ اپنی
فنی حیثیت کو نظر انداز کر کے سماجی برتری حاصل کرنے کی تگ و دو میں ہے
اور اس رویے کی نفی کر رہا ہے جو خالص ادبی اور روحانی ہے۔
نتیجہ یہ ہے کہ ادیب جو عام فرد کو زندگی کی پچھلی سطح سے اوپر اٹھانے
کا دعوے دار ہے خود زندگی کی پست دلدل میں کھو گیا ہے اور شاید
یہی وجہ ہے کہ ادب جو زندگی کا عکس نہیں بلکہ جوہر ہے۔ ہمارے
ہاں موثر عمل ثابت نہیں ہو رہا۔

پیاسی روحیں ---

--- ایک آس کی آگ میں ہم پگھل رہے تھے --- تحلیل ہو رہے تھے
--- چاند تاروں کی چمک، خشک عنبر کی مہک، اور --- اور
بہتی رات کا رومانی سکوت --- !

خیالوں کے آسمانوں سے اترتے ہوئے جھنجھناتے سے لہجے
میں بات بڑھانے کی خاطر میں نے کہا

" مالا تم دن بھر کام کرتے ہوئے تھک نہیں جاتیں --- !"

" نہیں بابو ہم غریب دیہاتی بھلا تھکنا کیا جانیں اور پھر یہ
ٹھیکیدار بڑا بھلے رحم آدمی ہے --- "

" نہیں مالا --- ایسی بات نہیں ہے ۔" میں نے اسے سمجھاتے
ہوئے کہا --- " یہ کنواں برسات شروع ہونے سے پہلے تیار
ہو جانا چاہیے --- " پھر میں نے اس کی آنکھوں کا خمار اپنی پیاسی
آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے کہا --- " مالا تمہیں اتنی رات گئے ادھر آتے
ڈر نہیں لگتا --- ! "

" تم جو ہو بابو --- " اس نے خوشی سے بھرپور آواز میں
اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا

" مالا --- ! " اچانک اور بے اختیار میں نے پوچھا " تمہاری
شادی نہیں ہوئی ابھی تک ؟ "

وہ یوں تڑپ اٹھی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو --- بڑی
مظلوم نگاہوں سے میری طرف دیکھا --- سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔
جیسے آنکھوں میں امڈے ہوئے آنسوؤں کے طوفان کو مجھ سے

انور سدید

ادب اور مقصدیت

بنیادی سوال یہ ہے کہ "اس مادیت پرست اور افادیت پسند عہد میں ادب کا کوئی مقصد ہے بھی یا نہیں؟" یہ سوال نیا نہیں۔ بلکہ عہد افلاطون سے عہد حاضر تک ہر دور میں اٹھایا گیا ہے۔ اور اہل فن نے اس کا معقول جواب مہیا کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی دور میں بھی یہ سوال اس ادیب نے جو ادب تخلیق کرتا ہے یا اس قاری نے جو ادب سے فیض حاصل کرتا ہے نہیں اٹھایا بلکہ یہ سوال ہمیشہ ان لوگوں نے اٹھایا ہے جن کی ادب کے ساتھ وابستگی ثانوی نوعیت کی ہے۔ میری مراد سیاست دانوں، عقیدہ پسندوں اور فلسفیوں سے ہے جن کی عکاسی کسی نہ کسی رنگ میں ادب کرتا ہے۔ ہمارے ہاں "شاعری برائے شاعری" یا "ادب برائے ادب" کا نعرہ مغرب سے درآمد شدہ ہے۔ لیکن ۱۹۳۵ء سے پہلے شاید اس کے استعمال کی ضرورت کبھی نہیں ہوئی۔ اردو ادب میں یہ نعرہ اس وقت بلند ہوا جب ترقی پسند تحریک نے ادب کو سیاسی مقاصد کا تابع فرمان کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ ادب کے اساسی فرائض یعنی عرفانِ ذات۔ تکمیلِ ... نات۔ تہذیب نفس اور فروغ صداقت وغیرہ کو ثانوی حیثیت دی اور ایک خاص قسم کا ٹکسالی ادب پیدا کیا۔ جو ہمیشہ ایک جیسا تاثر دیتا اور ایک ہی نظریے کی فوقیت کو ثابت کرتا تھا۔ درآنحالیکہ ادیب نہ ڈھنڈورچی ہے اور نہ محض پرچارک۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ

ادب کی ایک بیش پا افتادہ تعریف یہ ہے کہ "ادب زندگی کا عکاس ہے"۔ اس تعریف میں زندگی کو فوقانی حیثیت دی گئی ہے۔ اور ادب کو زندگی کے حوالے سے جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قطع نظر اس کے زندگی اپنی حسین ترین نمائندگی کے لیے ادب کی مرہون منت ہے۔ اگر اس مجمل تعریف کو قبول کر لیا جائے تو ادب کی مقصدیت واضح ہو جاتی ہے۔ ادب کا تعلق چونکہ زندگی سے ہے اور زندگی ہمیشہ بامقصد ہوتی ہے اس لیے ادب بے مقصد کس طرح ہو سکتا ہے؟ تاہم اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ادب کی تخلیق کے ساتھ زندگی کے مادی فوائد البتہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو شاید ادب کی حیثیت بالکل غیر افادی ہو۔ ادب کا عمل بلاواسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ ہے۔ اور جب کبھی ادب کو مقصد کے لیے بلاواسطہ استعمال کیا جاتا ہے تو یہ سستے پروپیگنڈے کی سطح پر اتر کر اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی اپیل محدود ہو جاتی ہے اور تاثر محض لمحاتی۔ اعلیٰ فنکار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ فن کی ایک خاص معیاری سطح برقرار رکھے اور اپنے تجربے کو تخلیقی کٹھالی سے گزر کر کندن بننے کا موقع مہیا کرے۔ صحافتی رپورٹ اور فن پارے میں فرق یہی ہے کہ صحافی واقعے کو من و عن بیان کرنے میں تعجیل سے کام لیتا ہے۔ جب کہ فن کار واقعات کے چناؤ، ترتیب اور اسلوب نگارش سے اس واقعے کی نئی معنویت دریافت

... سایہ چا ... نے ... پا لیا ہے۔ ایک فردوس

"ہاں مالا —— کام ختم ہو چکا ہے —— میں شہر جا رہا ہوں۔"

مالا کی آنکھیں خوف، دہشت اور غم سے پھیل گئیں —— وہ متنفر اور مظلوم آنکھیں —— اور جب میں شہر جا رہا تھا، ایک آواز برابر میرا پیچھا کر رہی تھی۔

"بابو —— تم آؤ گے نا ——؟ میں گاؤں کی ترقی کے لیے محنت اور لگن سے کام کروں گی —— تاکہ جب تم یہاں آؤ تو مجھے اور میرے گاؤں کو ایک نئے روپ میں دیکھ سکو!"

گم گشتہ کی طرح تم پھر مجھے مل گئی ہو —— جسم وہی ہے، روپ وہی ہے نام بدل گیا ہے —— اور نام میں کیا رکھا ہے ——؟

ہاں مالا —— شانو —— تمھارے نام چاہے کچھ بھی ہوں، نہ ہوں، تم میری پاکیزہ محبت ہو، زندگی ہو، آؤ پھر سے ہم دونوں ایک ہو جائیں۔ تلاش اور انتظار کے شعلوں کو بجھا ڈالیں۔ ہم جو ایک منقسم اکائی کی طرح ایک دوسرے سے یوں دُور دُور ہیں پھر سے ایک اکائی بن جائیں —— ایک جسم، ایک جان —— ایک تمنا ئے

اپنے آپ کو بلند منصب سے خود ہی گرا لیتا ہے۔

موجودہ بالا گفتگو اس مفروضے پر مبنی ہے کہ "ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے"۔ درحقیقت یہ مفروضہ بے حد گمراہ کن ہے۔ ادب آئینہ نہیں کہ اس پر جن واقعے کی شعاعیں پڑیں وہ اسی زاویے سے منعکس ہو کر قاری کے لیے ہو بہو تصویر مرتب کر دے۔ ادب درحقیقت زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور فن کار اپنا تصوّرِ حیات، ذاتی تجربات کی اساس پر فن کے وسیلے سے بیان کرتا ہے۔ یہاں بھی یہ شرط ضروری ہے کہ تصوّرِ حیات فن پارے کی بُنت سے یوں الگ نہ ہو کہ قاری کا منہ چڑا کر اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کرتا ہوا نظر آئے۔ اس لحاظ سے ادب ایک ایسا عمل ہے جو زبان اور تخلیق کے وسیلے سے زندگی اور معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ چنانچہ ادیب ایک عام شہری کی بہ نسبت دوہری شخصیت رکھتا ہے۔ شعور کی سطح پر وہ ایک عام شہری ہے۔ لیکن تخلیقی سطح پر وہ انسانیت کی دائم اور صادق قدروں کا سراغ لگاتا ہے۔ اور ان کے فروغ میں بالواسطہ حصّہ لیتا ہے۔ موخر الذکر عمل ایک روحانی عمل ہے جو صرف فن کار کے باطن میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور اسے یہ خصوصیت عطا کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی زندگی کا اس زندگی سے رشتہ قائم کرے جو فرد کو مکمل روحانی سکون اور ارتقائے ذات مہیا کرتی ہے۔ یہ زندگی فطرت کی زندگی ہے۔ اور ان لوگوں کو جو باؤ بھر آٹے کے لیے سارا دن مشقت کرتے ہیں اس حیوانی سطح سے جہاں کھانے اور سونے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا بلند ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ زندگی کی یہ سطح فرد کو طلوعِ سحر۔ غروبِ آفتاب۔ تاروں بھری رات۔ پھول کی خوشبو۔ چاند کی چاندنی۔ گیت کی مدھر تان اور چہرے کی دل کشی سے لطف اندوز ہونے اور فطرت کے جمالیاتی سحر میں شریک ہو کر روحانی مدارج طے کرنے کا موقعہ مہیا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے ادب معاشرے کے پابندِ زنجیر انسان کو روحانی رفعت مہیا کرنے کا ضامن ہے۔ ادب اس سے بڑی اور کیا خدمت سرانجام دے سکتا ہے؟

دوسری طرف ادیب جب یہ فریضہ قبول کر لیتا ہے تو وہ کسی سیاسی نعرہ بازی کا شکار نہیں ہوتا بلکہ جغرافیائی حدود سے بلند ہو کر عالمی سطح پر امن۔ آشتی اور حسن کا پیامبر بن جاتا ہے۔ ادب درحقیقت روح اور مادّے کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مادہ روح پر غالب آ جائے تو مقصد کے مسِ خام کو فوقیت حاصل ہو جاتی ہے اور فن پارہ روح کو بالیدگی مہیا کرنے کے بجائے ایک مخصوص ردِعمل پیدا کرتا ہے۔ ہمارے ترقی پسند فن کاروں نے ادب میں یہ فریضہ پوری خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔ انھوں نے زندگی کی مجموعی حقیقت کو پیش کرنے کی بجائے صرف ایک قاش کو زندگی سمجھ لیا اور ان جذباتی مایوسیوں کو ابھارا جو انسان کو مضمحل اور منفعل کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند ادب کی اپیل یک طرفہ، اکہری اور نظریاتی حد بندی کی اسیر ہے۔ چنانچہ آج کیفی اعظمی۔ مخدوم محی الدّین۔ علی سردار جعفری۔ ساحر لدھیانوی۔ وامق جونپوری۔ احمد ندیم قاسمی وغیرہ کی بیشتر پرانی نظمیں اور کرشن چندر۔ ابراہیم جلیس۔ حمید اختر۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی اور احمد ندیم قاسمی نے اکثر ترقی پسند افسانے جن کی اوّلین اشاعت پر لوہاری سے راس کماری تک غلغلہ بپا ہو گیا تھا آج قاری کو متاثر نہیں کرتے۔ اس کے برعکس جب روح مادّے پر غالب آ جاتی ہے تو فن پارہ مقصد کی خام سطح سے بلند ہو کر روحانی مدارج طے کر لیتا ہے۔ ایسے ادب کی اپیل یک طرفہ اور محدود نہیں ہوتی بلکہ ایسا ادب زمان و مکان کی حدود کا اسیر ہی نہیں ہوتا اور ہر نیا زمانہ اس کی ایک نئی تعبیر دریافت کر کے اسکے تخلیقی حسن میں شریک ہو جاتا ہے۔ میر۔ غالب اور اقبال وغیرہ چند ایسے ہی فن کار ہیں جو اپنے زمانے سے زیادہ مستقبل کو متاثر کر رہے ہیں اور جن کی نئی معنویتوں کی دریافت کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ تخلیق کا عمل چوں کہ خارج کی بجائے داخل میں ترتیب پاتا ہے۔ اس لیے ادیب پر تعزیر کی کوئی قدغن اثر انداز نہیں ہوتی۔ انسانیت قاتلوں کے نرغے میں آ جائے تو وہ قاتلوں کی پشت پناہی کرنے کے بجائے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے جس سے انسانیت تباہ ہو رہی ہے۔ اس کی زبان پر پہرہ بٹھا دیا جائے یا اس کی متاعِ لوح و قلم چھین جائے تب بھی اس کا داخل بیدار رہتا ہے اور وہ ظلم کی مخالفت سے گریز نہیں کرتا۔ لیکن اس کے لیے اسے اونچی آواز سے نعرہ لگانے اور علم تھام کر جلوس نکالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کا قلم ہی اس کی تلوار اور ڈھال بن جاتا ہے۔ ویسے ایک عام شہری کی حیثیت میں اس کے اس اقدام (باقی [illegible] پر)

مظفر حنفی

رباعیاں

لفظوں میں نہ وسعت ہے نہ گرمی نہ عمق
ترسیل کو ہر گام پہ سو سو خندق
کہنے کو بہت اور کہا جائے نہ کچھ
جذبہ ہے کہ احساس میں پھولی ہے شفق

ہر چند کہ فن کا رکھا جاتا ہوں
میں وقت کے دریا میں بہا جاتا ہوں
کیا کیا نہ لکھا جائے گا میرے پیچھے
افسوس کہ محروم رہا جاتا ہوں

سمٹے ہوئے کوزے میں سمندر جیسے
اک تار میں گوندھے ہوئے گوہر جیسے
آموختہ پڑھتے ہوئے چنچل بچے
پر جوڑ کے بیٹھے ہوں کبوتر جیسے

یہ موسم گل اور یہ لو کے جھکڑ
پر نور فضاؤں میں یہ کالے اندھڑ
اس چاند کی چودہ کو لگا ہے کرفیو
چلنے لگی بندوق کہیں تڑ، تڑ، تڑ

بھوکا تھا مگر چھوڑ دیا روٹی کو
کس ڈھنگ سے سمجھاؤں میں اپنے جی کو
غلے کے تقاضے پہ الجھ کر آخر
ہمسائے نے پھر پیٹ دیا بیوی کو

چینی کہیں غایب ہے کہیں گھی غایب
غلہ کہیں عنقا کہیں ہلدی غایب
پیسہ ہو اگر پاس تو اک نسخہ ہے
اخبار نہ پڑھئے تو غم و رنج غایب

رحمٰن جامی

ٹریٹ منٹ
(TREATMENT)

دنیا کے لوگوں سے اُلجھ کر
اپنے آپ کو زخمی کر کے
تم یہ توقع کیوں کرتے ہو
کوئی تمھارے زخموں پر پھایا رکھّے گا
دُنیا تو زخموں پہ تمھارے
نمک چھڑک کر خوب ہنسے گی
تم تڑپو گے چلّاؤ گے
اور تماشا بن جاؤ گے

تم میں اگر ہمت ہے ذرا سی
دُنیا کو اک زخم لگاؤ
اس کا فاسد خون بہاؤ
پھر یہ دنیا تم کو خود سمجھے گی مسیحا
پھر تم اس کو جدھر بھی چاہو موڑ سکو گے
جیسا چاہو اس سے رشتہ جوڑ سکو گے

کرشن مراری

یہ بھینی بھینی خوشبو تیرے حسیں بدن کی
ہو چاندنی میں رقصاں جیسے ہوا چمن کی

جادو جگا رہا ہے کیا روپ کا یہ موسم
اک دل نشیں پھبن ہے اُس شوخ سیم تن کی

چنچل بدن کی شوخی جھلکے ہے پیرہن سے
نکھری ہوئی ہے رنگت کیا خوب بانکپن کی

کچھ حادثے مسلسل گذرے ہیں ایسے دل پر
سہمی ہوئی ہوا ہے احساس کے چمن کی

وہ لمحہ آتشیں تھا جس نے جلا کے چھوڑا
سدھ بدھ ہی نہیں رہی اب کوئی بھی تن بدن کی

چنچل سی روشنی کے سائے لرز رہے ہیں
مچلی ہے آرزو اک ان تھک کسی تھکن کی

مندر میں کلپنا کے ہر آن ہر قدم پر
دل کش حسیں نمائش چنچل ترے بدن کی

مظہر ہوشیارپوری

کس چشمِ فسوں ساز کی یہ جادوگری ہے
اک نور کی چادر ہے کہ ہر شے پہ تنی ہے

جو بات تری شوخ نگاہوں نے کہی ہے
وہ بات کمالاتِ سخن سے بھی ماورا ہے

یہ سوچ کے پتھر کے صنم میں نے تراشے
انسان نے انسان کی کب بات سنی ہے

گرداب کو جل دے کے تو بچ آئی تھی کشتی
ساحل کی ہوا کھا کے مگر ڈوب گئی ہے

دنیا میں پکارے تو کوئی کس کو پکارے
اک شورِ مسلسل سے فضا گونج رہی ہے

اپنے ہی خیالات کی رعنائی وہ نکلی
میں جس کو سمجھتا تھا تری جلوہ گری ہے

اے کاش کوئی پرسشِ احوال کو آئے
ہم اُن سے کہیں درد کی شدت میں کمی ہے

ان ہی سے بھی ٹوٹے ہیں کبھی رشتے ازل کے
پلکوں کے جھپکنے سے کبھی صبح بھی ہے

محفل میں بلا شبہ مظہر آئیں بہاریں
قسمت میں مرے دل کی وہی نوحہ گری ہے

برج راج حیرت

واقف نہیں ہے کیا مری خود سرا ناؤں سے
آواز دے رہا ہے مجھے کیوں خلاؤں سے

اک فاختہ یہ پوچھ رہی تھی ہواؤں سے
کب تک چلے گا کام تمہاری دعاؤں سے

دستورِ کائنات بھی کتنا عجیب ہے
پھوٹی ہیں زندگی کی شعاعیں چتاؤں سے

میرا یقیں نہ ہو تو سمندر سے پوچھ لو
کوئی مجھے پکار رہا ہے خلاؤں سے

سایہ بھی ان کا آگ اگلتا ہے رات دن
آقائے شہرِ زیست کے گزرنا گداؤں سے

اے انتہائے شوق ذرا صبر کر ابھی
الجھا ہوا ہے ذہن ابھی ابتداؤں سے

تم قتلِ آفتاب کا منظر نہ دیکھنا
کم سن ہو کھیلتے رہو اپنی اداؤں سے

آ تیرگی کے سانپ مرے دل پہ لوٹ جا
تیرا ہی ذکرِ خیر تھا دھندلی فضاؤں سے

شب بھر بھنبھوڑتا رہا کتّا قیاس کا
ایسی بھی دل لگی نہ کیا کر گداؤں سے

دی ہیں جو آو نیم شبی نے بصیرتیں
کافور ہو نہ جائیں سحر کی دعاؤں سے

حیرتؔ یہ اعتقاد کا اندھا کنواں نہیں
بچ کر گزر شعور کی جلتی چتاؤں سے

ہریانہ ترقی کی شاہراہ پر

ہریانہ ملک کے ایک راجیہ کے طور پر وجود میں آنے کے بعد اب تک ترقی کے مختلف میدانوں میں جو کامرانیاں حاصل کیں مندرجہ ذیل حقائق ان کے آئینہ دار ہیں۔

خوردنی اجناس: خوردنی اجناس کے مقابلہ میں ہریانہ نہ صرف آج اپنی ضروریات میں خودکفیل ہے بلکہ 1966ء کے مقابلہ میں جب کہ یہ کمی والا راجیہ تھا، اب فالتو اناج پیدا کر رہا ہے

آبپاشی: 68-1967ء کے 33.57 لاکھ ایکڑ آبپاش رقبہ جات کے مقابلے 1974ء میں آبپاش رقبہ جات بڑھ کر 40.88 لاکھ ایکڑ ہو گیا ہے۔

مئی 1968ء میں ریاست میں کارگر ٹیوب ویلوں کی تعداد 29000 تھی۔ آج انکی تعداد 1,35,197 تک پہنچ گئی ہے

بجلی: ہریانہ ملک کی واحد ریاست ہے جس نے نومبر 1970ء میں دیہاتوں میں بجلی پہنچانے کے لیے نشانہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ مئی 1968ء میں ہر پانچ دیہات میں سے صرف ایک کو یہ سہولت میسر تھی۔

صنعت: مئی 1968ء میں 4598 رجسٹرڈ چھوٹے کاروباری صنعتی یونٹوں کے مقابلے میں ان کی تعداد 1974ء کے آخر تک 15832 ہو گئی۔

پینے لائق پانی کی بہم رسانی: سات برس پہلے ہریانہ میں صرف 203 دیہاتوں کو صاف پینے لائق پانی کی بہم رسانی کا انتظام تھا۔ جب کہ آج 773 دیہات اس سکیم سے مستفید ہو رہے ہیں۔ پہلے کے مقابلے اس کام میں 280 فیصد اضافہ ہوا ہے۔

ٹرانسپورٹ: نومبر 1972 سے مسافر بسوں کو پورے طور پر قومیایا جا چکا ہے۔ آج ہریانہ روڈ ویز کے پاس 1500 بسیں ہیں جب کہ مئی 1968ء میں صرف 567 بسیں تھیں۔ ہریانہ روڈ ویز کو اپنی کارکردگی کے لیے ملک میں امتیازی مقام حاصل ہے۔

کمزور طبقوں کی بہبود: معمر اور جسمانی طور پر معذور اشخاص کو راحت پہنچانے کے لیے متعدد سکیمیں بنائی گئی ہیں، شیڈولڈ جاتیوں اور پسماندہ طبقہ جات کی حالت کو بہتر بنانے کی جانب خاص توجہ دی جاتی ہے۔

سڑکیں: راجیہ کے 65% فیصد دیہاتوں کو پکی سڑکوں کے ساتھ ملانے کا کام پورا کیا جا چکا ہے۔ جب کہ مئی 1968ء میں صرف 1500 دیہات پکی سڑکوں کے ساتھ جوڑے گئے تھے۔ اب پکی سڑکوں کے ساتھ جوڑے گئے دیہاتوں کی تعداد 4358 تک پہنچ گئی ہے

جاری کردہ

ڈائرکٹر محکمہ تعلقات عامہ

ہریانہ — چنڈی گڑھ

مظہر الزماں خاں

تصویر

وہ صدیوں سے تاریک ڈربوں میں سسکتے ہوئے وجود کی کراہوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اور زخمی سانسوں کا کرب اس کے احساس کی گہرائیوں میں سرایت کرتا جا رہا تھا لیکن وہ خاموش تھا یا اس کی گویائی سلب ہو چکی تھی۔ یا پھر اس نے وجود کے تحفظ کی خاطر چپ سادھ لی تھی۔ کیوں کہ یہاں سچ کی آواز کو صلیب پر چڑھا دیا جاتا تھا اور ہر تازہ آفتاب کے چہرے پر کالک پوت دی جاتی تھی۔ چنانچہ وہ مجبور تھا انھیں کی طرح جو صدیوں سے تاریک ڈربوں میں مقید اپنے اپنے وجود کو روشنی کے لیے سسک رہے تھے۔ اور جب کبھی ان کی آنتوں کی چیخوں سے کرۂ ارض دہل جاتا تو وقت کی کھوپڑی پر مسلط نمرود تالیاں بجا بجا کر قہقہے لگاتے تھے کہ دیکھو! ہم نے چاند کے بدن پر فتح پالی ہے۔ اور اب وہاں بھی ہم یسوع مسیح کو صلیب پر چڑھا کر جشن منائیں گے۔ انکار کے جرم میں ان کے وجود پر آہنی رولر پھیر دیا جائے گا۔ تاکہ زمین کے سینے پر وہ پیوند کی شکل اختیار کریں۔

اچانک وہ اپنے خیالات کو نشیب میں اچھال کے ایک سیاہ پتھر پر ٹک گیا۔ اور جیب سے سگریٹ نکالا اور جلا کر دھوئیں کے مرغولے آسمان کی طرف چھوڑنے لگا۔

آفتاب آسمان کے گھٹنوں پہ چھپا ہوا تھا اور اس کی یرقان زدہ کرنیں بکھرے ہوئے ڈربوں کے سروں پر منڈلا رہی تھیں۔ اور وہ سیاہ پتھر پر بیٹھا ہوا ان کے ٹوٹے ہوئے گرد آلود اجسام کا مشاہدہ کر رہا تھا جو دھرتی پر آبلوں کی شکل میں دکھائی دے رہے تھے حالانکہ بارہا اس نے انھیں اجڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ متعدد بار ان کی کراہیں سنی تھیں اور ہر مرتبہ اسے خیال آیا تھا کہ وہ ان کے وجود کو تصویر کی شکل میں محفوظ کر لے۔ اور اس تصویر کو ملک کے ماتھے پر لگا کر وقت کی کھوپڑی پر مسلط اجسام سے کہ ان کو دیکھو! جن کے جسموں پر صدیوں کی گرد جمی ہوئی ہے۔ جو روشنی کی ایک ہلکی سی کرن کی خاطر اپنے وجود کو رگڑ رگڑ کر مٹی میں تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ان کے شیشم کی طرح مضبوط اجسام سے دودھ کی نہریں نکال سکتے ہو۔ بشرطیکہ ان کے سڑتے ہوئے وجود پر تحفظ کا پھاہا رکھو تاکہ ان کی آنتوں کی چیخیں دب جائیں اور وہ بے لوث ہو کر تمہارے لیے دھرتی کی کوکھ سے سونا اور سمندر کی تہہ سے موتی نکال سکیں۔ لیکن تحفظ کی بجائے تم ان کے بسے بسائے ڈربوں کو بارہا اس لیے اجاڑ دیتے ہو کہ وہ ناجائز ہیں۔ حالانکہ اس دھرتی کے سینے پر سیکڑوں ناجائز وجود مسلط ہیں۔ جو لمحہ لمحہ ان کے جسموں سے لہو نچوڑ نچوڑ کر اپنی پگڑیاں سرخ کرتے ہیں۔ اور ان لہولہان پگڑیوں کے پرچم بنا بنا کر لہراتے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں ان خونی پرچموں تلے گزری ہوئی صدیوں کے کارناموں پر شاندار جشن منائیں اور چیخ چیخ کر وقت کے کالے کوؤں سے کہیں کہ دیکھو! یہ تھے تمہارے آبا و اجداد جو اپنے وقت کے خام اجسام سے خون نچوڑ کر اپنی پگڑیاں رنگا کرتے تھے۔ اور ان کی کھالوں سے جوتیاں بنوا کر ان کی کراہوں پر رقص کیا کرتے تھے ——

تف ہے تم پر —— جو کتوں کو مکھن کھلا رہے ہو

دفعتاً سگریٹ کے جلتے ہوئے سرے سے اس کی انگلیوں کی پوریں جل گئیں۔ تب وہ چونکا —— تمام افکار وقت کی آگ میں جل کر راکھ ہو چکے —— تو اس نے فوراً کینوس سامنے رکھا اور اس پر برش سے رنگ بکھیرنے لگا۔ ایک ایک لکیر کینوس پر سوال کی شکل میں ابھرتی جا رہی تھی۔ اور ہر سوال کی پشت پر ایک وجود مسلط تھا۔ جس کے ایک ہاتھ میں کشکول، دوسرے میں اسی کی آنتیں تھیں۔ اور سر پر سایے کی تلاش —— پیٹ پر صلیب بندھی ہوئی تھی —— اور قریب ہی ایک سیاہ کوا سونے کی کوڑی سے موتی نکال کر کھا رہا تھا۔ اور اوپر بہت اوپر سیکڑوں وجود آفتاب کے چہرے پر کالک پوت رہے تھے —————— وہ بڑی مشاقی و انہماک سے ان ڈربوں میں بسنے والے کمزور اجسام کو تصویر کی شکل دے

(باقی صفحہ ۱۴۲ پر)

شمیم اختر

بے نور آنکھوں کا جنازہ

جب آنکھوں میں تیرتا سناٹا اس کونے سے اس کونے تک پھیلا تو مجھے پہلی بار مفلوج ہوتی ہوئی ٹانگوں کا احساس ہوا کہ اس سے پہلے میں اس دنیا میں محوخواب رہا تھا جہاں رنگ برنگی پریاں لوریاں سنایا کرتی ہیں۔

نحیف جسم پر اپنا بوجھ اٹھائے، گلے میں رشتے کا طوق ڈالے، سوکھی سوکھی ٹانگوں سے دھرتی پر پڑی دراڑ کو پھلانگتا ہوا میں تارکول کی چوڑی چکنی سڑک پر چلا آیا کہ شاید نیلی رگوں میں منجمد ہوتا ہوا خون حرارت کے زیر اثر پھر رواں دواں ہو سکے۔

سیلن اور بدبو سے بھرا کمرہ ہر رات مجھے اپنی آغوش میں لے لیا کرتا — لیکن سورج نکلتے ہی اس کی بانہیں ڈھیلی پڑ جاتیں۔

کاغذی تبادلوں کے بیچ میں لے اکثر سوچا کہ اہم کیا ہے۔ سانسوں کا آنا اور جانا کیوں ضروری ہے۔ کیوں ہم بھاگتے رہتے ہیں، دوڑتے رہتے ہیں۔ جانے انجانے راستوں سے گزرتے رہتے ہیں اور ان لفظوں سے بھرے بیگ کو ڈھوتے رہتے ہیں جو بڑے اہتمام کے ساتھ تالیوں کی گونج میں ہمارے ہاتھ میں تھما دیا جاتا ہے۔ میں نے کئی بار چاہا کہ ان الفاظ کو نکال پھینکوں جو منزل کے سامنے دیوار کھڑی کر دیتے ہیں اور یقین دہانی کراتے ہیں کہ منزل دور ہے۔ اور یہ ہو سکتا ہے صرف سایہ ہے، دھند ہے، فریب نظر ہے، اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ صرف ایک خواب ہے جو ہم دیکھتے آئے ہیں اور دیکھتے رہیں گے۔ بھٹکتے آئے ہیں بھٹکتے رہیں گے۔ نہ ہماری آمد پر خوش آمدید کہا گیا ہے۔ اور نہ جانے پر افسوس کا اظہار ہوگا — پھر یہ آنا اور جانا کیوں ہے۔ بانہیں کیوں وا ہوتی ہیں۔ اور پھر ڈھیلی پڑ جاتی ہیں — میں سوچتا رہا، سوچتا رہا — ایک دو دن اور نہ جانے اس طرح کتنے دن گذر گئے اور میں بھٹکا کیا کہ اچانک ایک دن "وہ" مجھے مل گیا — ابلی ہوئی چائے کے بعد باتوں کا سلسلہ — وہ لمحے جو ہماری پکڑ سے بہت دور نکل گئے تھے آج زد میں تھے — ایک کے بعد ایک۔ ان کی باتیں جو اپنے تھے، وہ جو پرائے تھے — ان کی باتیں جو اپنے ہوتے ہوئے بھی پرائے تھے۔ وہ جو پرائے ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھے — یادوں کی شفاف جھیل میں ہم ڈوبتے رہے ابھرتے رہے — وقت دبے پاؤں نکلتا رہا۔ اور جب گھروں کے دروازے کھلنے لگے تو ہم نے ایک طویل جماہی لی۔ ہم جو دو ہوتے ہوئے بھی ایک تھے کہ ہماری منزل ایک تھی، راستے ایک تھے۔ ایک نئے عزم کے ساتھ سفر کا آغاز کیا۔

موٹروں کی بھاگ دوڑ۔ لوگوں کا ہجوم، گوتم بدھا مارگ، گاندھی میدان سنٹرل بنک، سائنس کالج — ماتھے سے ٹپکتا ہوا پسینہ — ملک منزل انصاری ہوسٹل، پتھر کی مسجد — پتھر کے انسان — کانسے کی مورتی — سونے کا کلس — پگھلتی سڑک — جلتا جسم، ڈھلتا سورج — جگمگاتا شہر — بے نور آنکھیں — صداقت آشرم کے پاس پڑا بوڑھا جذامی فقیر۔

جنم جنم سے تنہا سڑک کا ایک حصہ، — "ایک ہی موسم ایک منظر — بے نور آنکھوں کا جنازہ، قبر میں اترتا گیا اور ہم —

ہم آدھی رات تک ایک چھوٹے سے چائے خانہ میں بیٹھ کر شور وغل مچاتے، منھ سے جھاگ اگلتے کڑوی گولیوں کو حلق سے اتار کر اپنی یاد میں آنسو بہاتے اور پھر تھک ہار کر گوتم کے سمان آنکھیں بند کر کے سب کچھ بھول جاتے۔ جب چائے خانے کا بہرا ہمک بتیاں گل کرنے لگتا تو ہم ڈھیر سے جیبوں کو الٹتے اور پھر واپسی کا سفر اختیار کرتے۔

دو تین میل کا طویل سفر اور ذہن میں پکتا ہوا لاوا — سوالوں کا سلسلہ — ہم بڑھتے رہتے، جذامی فقیر کے نزدیک پہنچ کر چند ساعت کے لیے رکتے اور پھر کمرے میں داخل ہو کر ایک دوسرے سے خاموشی کا سبب دریافت کرتے۔ اور نظریں نیچی کر لیتے کہ جواب سننے کی

ہت ہی کس میں تھی۔ ہم نے بار بار سوچا کہ اس زندگی کا حاصل کیا ہے۔ لیکن گلے میں پڑے طوق سے ہماری گردنیں جھک جاتیں۔

تلاش نقطۂ عروج پر پہنچ کر تھم سی گئی۔ تجسس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ سپنے دھندلا گئے۔ چہرے اپنی شناخت کھو بیٹھے۔ اور ہم ایک دوسرے کے خلاف سازش میں مشغول ہو گئے کہ اب ایک لمحے کی ہلسی بانگ رتی ۔۔ اور اداس چہرہ ذہنی کوفت میں مبتلا کر دیتا۔

حیات کو میں بھول چکا تھا کہ وہ اننت دشاؤں میں بٹ کر مجھے بھول چکی تھی۔ گزرے ہوئے لمحوں کو کون یاد رکھتا ہے۔ پھر یہ جستجو کیوں؟ کس لیے؟ —— کوئی ہے؟

ہم نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ گلے میں پڑے طوق کو اتار پھینکا اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ پہلی مرتبہ یا آخری بار تاریک رات ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے تیار کھڑی تھی —— ہم بڑھتے رہے، بڑھتے رہے —— قدم سے قدم ملاتے ہوئے —— صداقت آشرم کے پاس اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں پڑا بھکاری کراہ رہا تھا۔ سرد ہوا سے بچنے کے لیے اس نے خود کو لپیٹ کر گٹھری بنا لیا تھا، لیکن ہوائیں اپنی انیوں سے گدڑی کو چھیدتے ہوئے اس کے جسم میں چبھ رہی تھیں اور وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ چند لمحوں کے لیے ہی سہی اتھاہ دکھ ساگر میں غوطے لگایا جائے۔

ہم اس کے بالکل قریب چلے آئے۔ ہمارے قدموں کی چاپ نے اُسے گدڑی سے منھ نکالنے پر مجبور کر دیا تھا —— ہمیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت کے آئینے جگہ جگہ سے چٹخ اٹھے۔

کرۂ ہوا کے دائرہ کا نصف قطر خود کو مرکز کے قریب لانے کے لیے ٹوٹ ٹوٹ کر سمٹتا جا رہا تھا۔ گزرتی ہوائیں دیوار سے ٹکرا کر دم توڑ رہی تھیں۔ دائرہ کا نصف قطر نقطہ میں ضم ہوتا جا رہا تھا۔ گنگا کا پانی اُچھل اچھل کر سیڑھیوں پر چڑھنے کی کوشش کرتا اور پھر ہانپتا کانپتا واپس چلا جاتا۔ اس میں روانی تھی کہ وہ ساکت تھا؟ پاس کے شمشان گھاٹ سے شعلے بلند ہوتے جا رہے تھے —— اور چنگاریاں دُور دُور تک پھیل رہی تھیں۔ ان پھیلتی ہوئی چنگاریوں میں اور بلند ہوتے ہوئے شعلوں میں اور ہانپتی کانپتی گنگا کی لہروں میں انتشار کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ نصف قطر اپنا وجود کھونے ہی کو تھا کہ لہروں کا ایک زوردار ریلا آیا۔ سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ شعلے سرد ہوتے گئے۔ اس کی سڑی گلی انگلیاں پیپ اور خون سے لت پت جد و جہد کی آخری منزل کو پار کر گئیں۔

رگڑ سے پیدا شدہ حرارت نے الجھن کی کالی سرنگوں میں بچھے بارود کا بوسہ لیا۔ سرنگیں پھٹنے لگیں۔ روشنی سے راستہ جگمگا اٹھا۔ اور جب میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو وہ غائب تھا۔ اور حیات کھڑی مسکرا رہی تھی۔

عبد الخبیر

تیل کی قیمتوں پر روس اور عراق میں کشمکش

عرب ممالک میں روس کے خلاف اس بنا پر نکتہ چینی پھر زور پکڑ گئی ہے کہ وہ عرب ممالک کے خام مال سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اور یہ نکتہ چینی اس وقت شروع ہوئی ہے جب عرب ممالک اپنے تعمیری منصوبوں کی تکمیل کے لیے اپنے وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے آرزومند ہیں۔ عراق جو سوویٹ روس کو سب سے زیادہ تیل سپلائی کرتا ہے، اسے تو اپنے وسیع تعمیری منصوبوں کے لیے تیل کی برآمدات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ روس کے ساتھ اس نے تیل کے جو معاہدے کر رکھے ہیں وہ اس کے لیے سودمند ہونے کی بجائے ضرر رساں ثابت ہو رہے ہیں۔

کویت کے اخبار "السیاسیہ" کو ۱۲ راپریل ۱۹۷۵ء کو انٹرویو دیتے ہوئے کویت کے وزیر خزانہ عبدالرحمٰن سلیم العتیقی نے اس امر کی شکایت کی کہ "سوویٹ روس عرب ممالک کو اونچے داموں پر ہتھیار فروخت کر کے ناجائز سیاسی اور اقتصادی فائدے اٹھا رہا ہے۔ اس طرح اسے جو بھاری بھرکم منافع حاصل ہوتے ہیں اس کی بنا پر وہ اپنی ہتھیاروں کی فیکٹریاں چلا رہا ہے۔ اور عرب ممالک اپنے ہتھیار آزما کر جن کی وہ قیمت بھی دل کھول کر وصول کرتا ہے وہ اپنی ٹیکنالوجی کو بہتر بنا رہا ہے۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ ماسکو "جن نیچی قیمتوں پر عرب ممالک کی اشیا اور وہاں کا خام مال خرید رہا ہے۔ اسے لوٹ کھسوٹ کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔"

سوویٹ روس سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا ملک ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس کے تیل کے ذخائر امریکہ کے مقابلہ میں دُگنے ہیں۔ لیکن اس نے مشرقی یورپ کے اپنے حلیف ملکوں کو تیل سپلائی کرنے کے وسیع پیمانے کے معاہدے کر رکھے ہیں۔

اس برس وہ مشرقی یورپ کو ۰.۳ ملین تیل سپلائی کرے گا یہ معاہدے بہر طور ضرور ہیں اور سائبیریا کے تیل کے ذخائر کے استعمال میں جن ٹیکنیکی مسائل کا سامنا ہو رہا ہے ان سب نے اسے مجبور کر دیا ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ سے تیل درآمد کرے۔

عراق کے کئی کمیونسٹ ممالک کے ساتھ تیل کی سپلائی کے طویل المدت معاہدے ہیں۔ اگرچہ چیکوسلواکیہ، ہنگری اور پولینڈ نے عراق کو قرضے دے رکھے ہیں جو تیل کی شکل میں واجب الادا ہیں لیکن تبادلۂ اشیا کے اصول کے تحت سب سے زیادہ معاہدے عراق اور سوویٹ روس میں ہیں اور یہ معاہدے سوویٹ روس کے لیے فائدہ مند اور عراق کے لیے ضرر رساں ہیں۔ اس کی بجائے کہ سوویٹ روس تیل کے عوض عراق کو کمیاب کرنسی دے، وہ تیل کے عوض عراق کو من مانی قیمتوں پر فوجی ساز و سامان دے رہا ہے۔ سستے داموں تیل خرید کر روسی صرف یہی نہیں کرتے کہ اسے اپنے مشرقی یورپ کے حلیف ملکوں کو مہیا کر دیں بلکہ وہ یہ تیل کمیاب کرنسی کے عوض مغربی ممالک کو بھی برآمد کر دیتے ہیں اور کئی بار ایسی قیمتوں پر جو ان قیمتوں سے کم ہوتی ہیں جن پر عراق ان ممالک کو تیل سپلائی کرتا ہے۔ مصیبت کی جڑ اگست ۱۹۷۰ء کے معاہدے کی دفعات ہیں جو روس کو یہ اجازت دیتی ہیں کہ وہ عراقی تیل کو مغربی ممالک کو برآمد کر سکتا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں یہ اطلاع شائع ہوئی تھی کہ جب عراق نے روس کو ہتھیاروں کے عوض ۱۴ ملین ڈالر کا تیل دینا منظور کیا تو روسیوں نے یہ تیل جرمنی کے ہاتھوں ۲۴ ملین ڈالر کی قیمت پر فروخت کر دیا۔ جرمنی کو تیل فروخت کرنے کا معاہدہ روسیوں نے اس وقت کیا جب عراق کا تیل ابھی انھیں ملا بھی نہیں تھا۔ کہا گیا تھا کہ عراقی اس سودے کی تنسیخ کے لیے کوشاں ہیں۔

بہرحال روسیوں نے اپنی روش کو خیرباد نہیں کہا۔ ۱۱ راکتوبر ۱۹۷۴ء کو بیروت کے اخبار "عرب ورلڈ" نے بغداد کے حوالے سے یہ خبر شائع کی کہ ماسکو عراق کا خام تیل جو اسے قرضوں کی واپسی کے سلسلے میں وصول ہوا تھا۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں فروخت کر رہا ہے اور اس طرح بڑے بڑے منافع کما رہا ہے۔ عراقیوں کا خیال تھا کہ روسیوں نے عراق کے خام تیل کے ۷۷ ملین بیرل مغربی جرمنی کے ہاتھ آٹھ ڈالر فی بیرل کے حساب سے فروخت کر دیے ہیں جو تیل کی حقیقی قیمت کے مقابلے میں ۶۵ و ۳ ڈالر فی بیرل کم تھی۔ عراق کو خطرہ تھا کہ اس وقت جب تیل پیدا کرنے والے ممالک تیل کی قیمتوں کے بارے میں امریکہ سے جھگڑ رہے تھے سوویٹ روس اپنی کارروائیوں سے ان کے موقف کو ضعف پہنچا رہا تھا روسیوں نے اس معاملے میں عراقیوں کی تشفی کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔

واقعہ یہ ہے کہ روسی تیل کی قیمت صرف تین ڈالر فی بیرل ادا کر رہے تھے۔ اس کی وجہ پانچ سال پرانا معاہدہ تھا۔ جو تیل کی قیمتوں میں اضافے سے پہلے کا تھا۔ اس طرح روسی مغربی جرمنی کو جو تیل فروخت کرتے تھے اس پر انھیں فی بیرل آٹھ ڈالر کا نفع حاصل ہوتا تھا۔ ۱۹ رفروری کو "عرب ورلڈ" نے بیروت کے ہفت روزہ "السید" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ ماسکو نے عراق کے اس مطالبے کو مان لیا ہے کہ وہ اسپین کو عراقی تیل ان قیمتوں کے مقابلے میں جو عراق نے اسپینی حکومت کو براہ راست پیش کی تھیں کم قیمت پر تیل فروخت نہ کرے۔

عراق اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک کا خیال ہے کہ ایسے کئی امور ہیں جن کے پیش نظر ان کے لیے تیل کی مناسب قیمتیں وصول کرنا ضروری ہے۔ اہم ترین بات تو یہ ہے کہ تیل کے ذخائر ہمیشہ برقرار رہنے والی چیز نہیں۔ ۱۹۷۲ء میں تیل کے ایک ممتاز ماہر ڈاکٹر خیرالدین حسیب نے متنبہ کیا تھا کہ اگر سوویٹ یونین کے تیل اور گیس کی قیمتوں اور عرب ممالک کے تیل اور گیس کی قیمتوں میں مقابلہ شروع نہ ہوا تو سوویٹ روس کی برآمدات لازماً بڑھ جائیں گی۔ الجیریا کے اخبار "المجاہد" نے مئی ۱۹۷۳ء میں لکھا تھا کہ سوویٹ یونین خام مال مثلاً تیل، گیس، یورینیم اور تانبے کو مغربی ممالک کے ہاتھ فروخت کرنے کے معاملے میں ترقی پذیر ممالک کے مقابلے پر آ گیا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق عراق کے تیل کے نئے وزیر نے ہفت روزہ "پٹرولیم انٹلی جنس" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ سپلائی کی عالمی حالت، فی بیرل آمدنی میں اضافے اور تیل کے ذخائر کو محفوظ رکھنے کے خیال سے عراق ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۴ ملین بیرل یومیہ سے زیادہ تیل پیدا نہیں کرے گا۔ پہلے اندازوں کے مطابق ۱۹۸۱ء میں ۶-۵ یا چھ ملین بیرل یومیہ تیل پیدا کرنے کا خیال تھا۔

اس قسم کی اطلاعات بھی ملی ہیں کہ عراقی حکمران اب تیل کے معاملے میں آزادانہ پالیسی کے حامی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس پالیسی کا باعث یہ ہے کہ عراق اپنے وسیع ترقیاتی منصوبوں کے لیے مالیات کی فراہمی کے سلسلے میں تیل کو انتہائی اہمیت دیتا ہے۔ یہ ترقیاتی منصوبے ان شمالی خطوں کے لیے بھی ہیں جن پر کچھ دنوں پہلے کرد باغیوں کا تسلط تھا۔

بقیہ : تبصرے

چند شعر دیکھیے :

خزاں رسیدہ نہ مایوس ہوں زمانے میں
بہار وقت پہ اپنے چمن میں آنے کی

روایات جنوں شہروں میں اب ملتی نہیں یارو
چلو اک بار پھر دشت و بیاباں دیکھتے جائیں

نئے زاہد نہ اترائیں ابھی سے اپنی توبہ پر
کہاں کی آزمائش ہو گھٹا کالی اگر برسے

ہمیں تو عشق میں اکثر بلائیں راس آئی ہیں
ہمارے ساتھ ذکر گردش ایام آتا ہے

ڈاکٹر عنوان چشتی

صلاح الدین پرویز

موم بتی

اور جب
اس کے قد پر
اینچی کا سامان رکھا گیا
موم بتی ہنسی
موم بتی کا ہنسنا بجا ہے

مجھے کوستی ہے
مرے گھر میں پچھلے کئی سال سے
ایک آواز
جس کے کئی راستے
دھند کے سرد لہجے میں
الجھے ہوئے ہیں
مرے گھر کو
اک موم بتی کی خواہش
کہیں جنگلوں کا نہ رستہ دکھا دے

سفر،
جب نیا کتھئی سوٹ پہنے
نئی ریل گاڑی میں بیٹھا
تو اس کو مسافر سمجھ کر
کئی لوگ ہنسنے لگے
اور جب
اُن کے پیالوں میں رکھی ہوئی
چائے جینے لگی
تب انھیں یاد آیا
— بزرگوں نے مرتے سمے
اپنی آنکھیں
زباں سے چکھی تھیں مگر
موم بتی کی لمبی زباں
ریل گاڑی میں بیٹھی
سفر کر رہی تھی ......
اور تبھی اک سفر
ان کی آنکھیں چرا کر
کہیں لے گیا تھا

مرے ہاتھ میں اک اٹیچی ہے لیکن
اسے کھولنا میرے بس میں نہیں
اور اب
موم بتی بھی ہنسنے لگی ہے۔

مشتاق علی شاہد

فالس سیلنگ

(FALSE CEILING)

دیوزاد ہارویسٹر کمباین[۱]
جب وشال کھیت کی پھیلی ہوئی
وشال چھاتی پر
گنک کاٹتا ہوا — اچانک
بریک ڈاؤن کا شکار ہو گیا
تو — میں اگر یکلچر انجینئر کی جانب مڑا —
وہ فور مین سے اپنی نئی رہائش گاہ کی
'فالس سیلنگ' کا حسن بیان کر رہا تھا!

سیمنٹ اور کنکریٹ کی پختہ چھتوں کے نیچے
— فالس سیلنگ!
(انٹرنل ڈیکوریشن[۲] کا ایک جدید طریقہ!)
کیا خوب — !!

اور گنک کاٹتا ہوا
بریک ڈاؤن کا شکار
دیوزاد ہارویسٹر کمباین — !

[۱] HARVESTOR COMBINE
[۲] INTERNAL DEOORATION

شاہد کلیم

ایک مہمل آرزو

دیوتا!
اے دیوتا!!
آگ پھر برسا رہا ہے
جسم نازک پر مرے یہ آفتاب
کالی سڑکوں پر پگھل کر
بہہ رہا ہے تارکول
حدّتِ تشنہ لبی کو میں بجھا دیتا تو ہوں
حدّتِ تشنہ لبی ـــــ لیکن
بھڑک اٹھتی ہے پھر
جون کے تپتے مہینے میں سفر کتنا کٹھن
تیرے درشن کے لیے
روزِ ازل سے
کر رہا ہوں میں سفر
کاش! جاں لیوا سفر یہ
تو بھی طے کرتا کبھی
میرے لیے
دیوتا!
اے دیوتا!!

رونق زیدی

انتشار

اکیلا راہ گیر ـــــ
کھویا کھویا سا
منزل کے خیالوں میں
رستوں کے کٹے پھٹے سوالوں میں
سمٹتی ـــــ روشنی
پھیلتا ـــــ اندھیرا
قدموں کی آہٹیں آ رہی ہیں
مگر ـــــ دور ہوتی جا رہی ہیں

زندگی

اپنی خواہش کی تکمیل میں
سخت راہوں پہ چلتی رہی
کاوشیں ـــــ بے دلی
چاہتیں ـــــ نفرتیں
روشنی ـــــ تیرگی
موڑ بن بن کے آتی رہیں
مرحلوں سے
گذرتی گئی ـــــ
ـــــ زندگی

المیہ

یہاں ہر رات اپنی تیرگی سے جگمگاتی ہے
یہاں ہر صبح اپنی روشنی میں ڈوب جاتی ہے
یہاں ہر خواب آئینہ ـــــ
مگر بے عکس و بے چہرہ
یہاں ہر موجِ خواہش ـــــ
سنگ ناکامی سے عاجز ہے
یہاں ہے دست رس ـــــ ہر امنگ ـــــ
ہر سہانی محروم قدم بوسی
یہاں ہر رات ہے تکمیل پر ـــــ
ـــــ بے سمت و بے منزل
کہاں تک سعیِ لا حاصل

نازش انصاری

دیوانے تیرے سرے بیچ کھڑے ہیں
یہ لوگ تو دنیا میں خدا سے بھی بڑے ہیں
نکلے تھے کبھی تجھ ملاقات کی دھن میں
اب گرد نے اپنی ہی آنکھوں میں پڑے ہیں
کب تک تو انھیں اپنے دلاسے پہ رکھے گا
جو تیری ہی ٹوٹی ہوئی دھرتی پہ کھڑے ہیں
بجھ جانے پہ یک گونہ سکوں پائیں گے یہ دل
اک عمر دیا بن کے ہواؤں سے لڑے ہیں

دیس راون کا ہے سینے میں چھپا لو نہ مجھے
میں کوئی رام نہیں گھر سے نکالو نہ مجھے
دربدر کر کے صبا جانے کہاں سے جائے
سونی گلیوں کی وراثت ہوں اچھالو نہ مجھے
اس کے خنجر کی بہک بھی بڑی جاں لیوا ہے
میں کہ کچھ بھی نہ سہی سامنے ڈالو نہ مجھے
خود کو مخصوص کیے جانا عبادت سے سوا
ایک دریا ہوں، سمندر میں تو ڈالو نہ مجھے

امیر قزلباش

کون ہے میرا ہمسفر خیال اب کے
مختصر ہے ملا سوال اب کے
کوئی جادو نہ چل سکا اس کا
تم نے دیکھا مرا کمال اب کے
یہ بھی سچ ہے میں اس کی زد میں تھا
بچ گیا وہ بھی بال بال اب کے
شہر کا شہر بے صدا کیوں ہے
کیوں نہیں ہے کوئی خیال اب کے
وہ بھی حاضر جواب تھا ـــــ لیکن
بن گیا میں بھی اک سوال اب کے

فاروق شفق

نیم کے درختوں سے چاندنی جب آئے گی
ایک گاڑھی سرسراہٹ گھر میں پھیل جائے گی
سرخ تتلیوں کے پر جب بدن کو ڈھک لیں گے
چپکے سے کوئی خواہش دل میں رینگ آئے گی
کھڑکیوں کے پردوں سے سرسراہٹ آنے دو
یہ ہوا تو پاگل ہے یونہی آئے جائے گی
جذب کر لے ہونٹوں میں ورنہ دونوں گھر کے بیچ
بات آج کی تیری سیڑھیاں بنائے گی
آسمان کے نیچے کالی کالی سڑکوں پر
آج میری پرچھائیں میرا خون بہائے گی

سید احمد شمیم

وہ اپنے گھر میں بھی اب اجنبی سا لگتا ہے
کہ ایک چہرہ ہے چہرگی سا لگتا ہے
مجھے تو خوف نہ آیا کبھی سمندر سے
کہ اس کا غیض و غضب زندگی سا لگتا ہے
ملا دیا ہے فسانے کو یوں حقیقت سے
کہ واقعہ ہے مگر شاعری سا لگتا ہے
اداس آنکھیں ہیں، چہرہ ملول، الجھے بال
شمیم جانے کیوں اتنا دکھی سا لگتا ہے

ضیا فتح آبادی

اے بے حسیِ امن کوئی میں کسی ملنگ ہوں
گردِ رہِ حیات ہوں سرگرمِ جنگ ہوں
کٹ جاؤں گا جو ڈھیل نہ دی دستِ شوق نے
زد میں ہوائے تند کی ، اڑتی پتنگ ہوں
فصلِ بہار بھی ہے مجھے موسمِ خزاں
ہوں باغ میں مگر گلِ بے آب و رنگ ہوں
پہنا دو حسرتوں کا کفن مجھ کو دوستو
جو چاٹتا ہے دل کا لہو وہ امنگ ہوں
کچھ بھی تو پانیوں میں نہیں فرق و امتیاز
میں ہی کو رودِ نیل ہوں، دریائے گنگ ہوں
لاؤں کہاں سے دشت نوردی کی لذتیں
مجنوں نہیں کہ وسعتِ صحرا تنگ ہوں

احتشام اختر

زمیں بدلتی رہی آسماں بدلتے رہے
مکیں بدل نہ سکے یہ مکاں بدلتے رہے
ہمارے عشق کا محور وہی رہا لیکن
اسے چھپانے کو ہم داستاں بدلتے رہے
کبھی دھوئیں کی تھی چادر کبھی تھا نیل گگن
مکاں وہی تھا مگر سائباں بدلتے رہے
تمہاری یاد کے جنگل سلگتے بجھتے رہے
عجیب چیز تھے یہ بھی سماں بدلتے رہے
بس ایک بات تھی کہنے کو اور کچھ بھی نہ تھا
ہم اس کے واسطے طرزِ بیاں بدلتے رہے
بچھے تھے پیار کے جنگل میں راستے کی طرح
گزرنے والے ہمارے نشاں بدلتے رہے

راج کھیتی

ہر ایک سانس میں کچھ درد درد لگتا ہے
مرا وجود ہی اب گرد گرد لگتا ہے
تمہارے قرب میں گرمی بہت غضب کی تھی
ہوا کا ہاتھ مگر سرد سرد لگتا ہے
نہ جانے آئی کہاں سے بھکاریوں کی یہ بھیڑ
گداگر آج مجھے فرد فرد لگتا ہے
اسی میں دیکھی تھی تصویرِ کائنات کبھی
وہ آئینہ کہ جو اب گرد گرد لگتا ہے
وہ ایک ہم تھے کہ سمجھا حریف کو بھی حلیف
فریب کار تمہیں فرد فرد لگتا ہے
کسی کے ہونٹوں کی سرخی کو کیا ہوا ہے راج
سحر کا چہرہ بھی کچھ زرد زرد لگتا ہے

مخمور جمالی سنبھلی

آشتی میں یہ کیف شے کا نام بھی — اور محبت وجہِ صد الزام بھی
ہم پریشاں خاطروں کو چھیڑ کر — ہے پریشاں گردشِ ایام بھی
ذہن پر جس دن سے چھایا ہے کوئی — سوچنا پڑتا ہے اپنا نام بھی
دل کے جلنے کی ادا کچھ اور ہے — جل رہا ہے گو چراغِ شام بھی
ہو لیے تھے وحشیوں کے ساتھ ساتھ
چل نہ پائے حادثے دو گام بھی

ںمانہ انحادر رکھنے والے سیاہ فام قیدیوں کو سنبھالنا سفید فام
اڈروں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے گروہ نمبر ا قابو سے باہر ہو چکا
ا۔سارے کیمپ میں وہ بہترین جو مادہ کا ذب سمجھے جاتے تھے۔ دن بھر
نہ کو بھی چبا کر کھاتا اور اسی پر گذارہ کرتا ان کا محبوب مشغلہ تھا
ں کہ وہ سب ایک ہی طرح کی حرکت کرتے، سوچتے اور عمل کرتے
ے۔ اس لیے انھوں نے گروہ کی ہر بات کو صیغۂ راز میں رکھنے کی
ام ترکیبوں کو درجۂ اتم تک پہنچا دیا تھا۔

گروہ نمبر ا اور منتھی کے درمیان کشمکش اسی دن شروع ہو گئی
ں کا سبب بِرل کو تاہ بینی تھی۔ قیدیوں نے اسے اسی لقب سے پکارنا
شروع کر دیا تھا۔ بِرل کا مطلب افریقی زبان میں ایسا شخص ہے جو
شمہ پہنتا ہے۔ بِرل کی بینائی اس قدر کمزور تھی کہ اسے کبھی اس بات
اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ جیل کا پھاٹک کب قریب آتا ہے۔ وہ
نو بھی چباتا ہوا پھاٹک تک پہنچ جاتا اور گھبراہٹ میں گو بھی کے ٹکڑے
زادم لوگوں کے قدموں پر گرا دیتا۔ سبھی وارڈروں نے اس کی اس حرکت
سے اغماض کیا تھا۔ مگر منتھی نے ایسا نہیں کیا۔

"یہ گو بھی کس نے گرائی؟ ـــ اس نے گرجدار آواز میں کہا۔
بِرل قطار سے نکل کر باہر کھڑا ہو گیا۔
"میں نے" اس نے بہت نرمی سے جواب دیا۔
"اچھی بات ہے" منتھی نے حاکمانہ انداز سے کہا۔ "پورے
گروہ کو تین وقت کھانا نہیں ملے گا۔
"مگر میں نے اقبال کر لیا ہے کہ یہ غلطی مجھ سے ہوئی ہے" بِرل
نے احتجاج کیا۔
"کان کھول کر سن لو۔" اس نے کہا۔ "میں کسی کا فر سے
حکم سننے کا عادی نہیں ہوں ـــ پتہ نہیں تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو!
میں تمھارا باس ہوں۔ مجھے باس کہہ کر مخاطب کیوں نہیں کرتے؟"

بِرل نے اپنی آنکھیں جھپکتے ہوئے بڑے ہی نرم اور پرسکون
لہجے میں جواب دیا ـــ "میں تم سے بیس سال بڑا ہوں" اس کے
دماغ میں سب سے پہلے یہی بات آئی تھی۔ مگر اس کے ساتھیوں نے
اسے مذاق سمجھا اور ان کے قہقہے پھوٹ پڑے۔ دوسرے ہی لمحہ منتھی
نے ہنٹر نکال کر تڑاتڑ اس کے سر پر کئی ضربیں لگا دیں۔ بِرل نے جلدی
سے اپنا چشمہ اتار لیا ورنہ وہ نیچے گر کر چکنا چور ہو جاتا۔ اس کی
اس پھرتی پر سبھی ساتھی حیران رہ گئے۔

اس رات جیل کی کوٹھری میں بِرل نے اپنے سبھی ساتھیوں
سے معافی مانگ لی۔
"ساتھیو! مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمھیں تکلیف
اٹھانی پڑ رہی ہے۔"
"کوئی بات نہیں، دوست!" انھوں نے کہا: "جو بھی تکلیف
ہوگی سب مل کر بھگت لیں گے۔"
"ساتھیو میں اس کا معاوضہ چکا دوں گا۔" اس نے کہا۔
"میں تمھارے کھانے کے لیے کوئی چیز چرا لاؤں گا۔"

* * * * * *

ذاتی طور پر سر کے زخموں کے متعلق اس کا نظریہ بے حد
فلسفیانہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس پر کسی نے ہاتھ اٹھایا تھا۔
مگر وہ اس طرح کی ناقابل یقین سہیمانہ حرکتوں کا بار بار مشاہدہ
کر چکا تھا۔ اس کے بارہ بچے تھے۔ اداس شام اس کے خیالات
کی رو اپنے بے انتہا منتشر اور پریشان گزشتہ زندگی کی طرف
منعطف ہو گئی۔ زندگی کا یہ سارا ڈرامہ کیپ ٹاؤن کی ایک بھدی
گلی میں واقع تین کمروں پر مشتمل ایک تنگ و تاریک مکان میں کھیلا
گیا تھا۔ بچوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا گیا تھا کیوں کہ مارتھا
اور اس نے مانع حمل ادویات کا استعمال کبھی ٹھیک طور سے کیا ہی
نہیں۔ ایک استاد کو ملنے والی مختصر تنخواہ دوسرا مکان کرایہ پر لینے
کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اگرچہ اس نے تنخواہ میں اضافہ کے لئے
کئی امتحانات میں کامیابی حاصل کی تھی مگر جوں ہی تنخواہ میں اضافہ
ہوتا ایک اور منہ کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ اور ساری تنخواہ ان
بچوں کی اگنی کونڈ بھرنے ہی میں صرف ہو جاتی۔ گھر کی ہر بات
خوفناک تھی۔ خصوصاً بچوں کی لڑائی اور جھگڑا۔ وہ ایک دوسرے
سے گتھم گتھا ہو جاتے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر دیواروں سے
ٹکرا دیتے۔ مارتھا نے بچوں کی اس جوتم پیزار کو روکنا اور جھگڑا نپٹانے
کا کام کہیں درمیان ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ جب تک وہ گھر نہیں پہنچ
جاتا یہ جھگڑا، مار پیٹ، گالی گلوج اور جوتم پیزار جاری رہتی۔
اسے دیکھتے ہی یہ جھگڑے رک جاتے۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ
بچے اسے دیکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور ان میں قدرے انسانیت کی

جھلک آجاتی ہے۔

گھر کی یہی بدنظمی اور گڑبڑ اسے سیاست میں کھینچ لائی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اور کاموں کی بہ نسبت سیاست سہل ہے۔ یہ ایک بیحد منظم اور خوبصورت دنیا تھی جہاں پر کامیابی کے لیے صرف چند نعرے یاد کرنے تھے اور انسانی حقوق کے متعلق کچھ ابتدائی معلومات حاصل کرنی تھیں۔ سیاسی حالات بد سے بدتر ہونے لگے تھے۔ مگر اس سے قبل اس نے کئی کانفرنسوں میں شرکت کی جو اس کے گھر سے بہت دور منعقد ہوتی تھیں۔

"اس وارڈن کا سامنا کرلیں گے۔" اس نے سوچا۔ "مجھے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ سیاست دان بننے کے کیا معنی ہیں۔ اور یہ تمام باتیں اس وقت پیش آ رہی ہیں جب کہ میں مار تھا اور بچوں سے دور بھاگتا پھر رہا تھا۔"

سر کے زخموں سے وہ کراہ اٹھا۔ اس کے بچے ہر روز ایک دوسرے کے ساتھ یہی برتاؤ کرتے تھے اور مارتھا انھیں قابو میں رکھنے سے قاصر تھی۔ اگر وارڈن ہنٹجی نے صبح اسے ٹوکا نہ ہوتا تو وہ مارتھا کو اس طرح کا پیغام بھیجنا چاہتا تھا

"میرے بچو! اچھے ساتھی بن جاؤ۔ ایک دوسرے کی امداد کرو۔ زندگی پرسکون گزرے گی۔"

دوسرے دن وارڈن ہنٹجی نے اس بارہ بچوں والے بوڑھے کو انگور چراتے ہوئے پکڑ لیا۔ دس گیلن کے ایک بڑے ڈرم میں انگور چرا کر اکٹھے کیے گئے تھے۔ اس چوری کی پاداش میں اسے ایک ہفتہ کی قید تنہائی کی سزا ملی۔ دراصل پورا گروہ مشکل میں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وارڈن ہنٹجی کے سر کے پیچھے بھی آنکھیں موجود ہیں۔ اس نے اس بات کا پتہ لگا لیا تھا کہ کس طرح قیدی پھاوڑے سے گوبھیوں کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہیں اور کس طرح پلک جھپکتے میں گوبھی کا ایک ٹکڑا ان کے منہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ کس طرح سگریٹ پی کر دھواں زمین پر چھوڑ دیتے ہیں اور کس طرح کانا پھوسی کرتے ہیں۔

دو ہفتوں تک گروہ نمبر ا بڑی ہی مصیبت میں پھنسا رہا۔ گوبھیاں، تمباکو اور کانا پھوسی ان کے لیے قید خانہ کی زندگی کے مرکزی ستون تھے۔ جن پر ان کی زندگی کی عمارت کھڑی تھی۔ ایک دن شام کو انھوں نے دیکھا کہ ان کا ایک بازساتھی اپنے آپ پر مگن مسکرا رہا ہے۔ اس نے اپنی جیب سے چار اونس تمباکو کا ایک پیکٹ نکال کر ان کے سامنے رکھا اور وہ بھوکے گدھوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ برل مسکراتا رہا۔ آخر وہ درجن بھر بچوں کا باپ جو تھا۔ تمباکو ختم ہونے پر انھیں ...... اس بات پر تعجب ہوا کہ آخر تمباکو ملا کہاں سے۔ اس لیے ایک نے پوچھا۔

"ساتھی! آج کل ہماری نگرانی تو چیلوں کی طرح کی جا رہی ہے۔ آخر یہ تمباکو ملا کہاں سے؟"

"مجھے ہنٹجی نے دیا ہے،" برل نے جواب دیا۔

ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ اس سکون کو توڑتے ہوئے برل نے کہا۔

"میں نے ہنٹجی کو ایک شیڈ میں دیکھا تھا۔" اس کی نیم اندھی آنکھیں شوخی سے چمکنے لگیں۔ "میں نے اسے پانچ تھیلے کھاد چراتے ہوئے، اور اس نے مجھے منہ بند رکھنے کے لیے تمباکو کی رشوت دی۔"

خاموشی اور کچھ اور طویل ہو گئی۔

"قید کی زندگی بہت بُری زندگی ہے" برل نے کہا، جیسے غیر ضروری بحث کر رہا ہو۔ "یہاں آدمی بہت سی بری باتوں کے ارتکاب کے متعلق سوچتا ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر مٹھی بند کر لی۔ اور کہا "دوستو، تم جانتے ہو میں نے ہنٹجی کو پھانس لیا ہے کل میں اس کی قلعی کھول دوں گا۔"

سب ساتھیوں نے یکلخت کہا۔

"یہ بات بھول جاؤ ــــ تمھیں گولی سے اڑا دیا جائے گا۔"

برل ہنسنے لگا۔

"میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تو صرف مثال دے رہا تھا۔ بچوں کا باپ ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ ہنٹجی بھی ایک بچہ ہے۔ بے وقوفی کی حد تک سچا ــــ میں اسے سخت سزا دوں گا کیوں کہ ایک اچھے وارڈن کی ضرورت ہے۔"

دوسرے دن ہنٹجی نے برل کو گواہ مان کر کھاد کی چوری کا اقرار کر لیا۔ اس پر بھاری جرمانہ عاید کیا گیا۔ اس کے بعد سے گروہ اپنی من مانی کرنے لگا۔ ہنٹجی ان کی حرکتیں ایک تماشائی کی طرح

دیکھتا رہتا۔ مگر برل ہر بات انتہا کو پہنچانے کا عادی تھا۔ ایک دن کام ختم ہونے پر ہنچی نے کہا

"برل، میرا جیکٹ اٹھا کر میرے کمرہ میں رکھ دو۔"

"قیدخانہ کے قوانین میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ میں تمہارا نوکر ہوں، ہنچی" برل نے جواب دیا۔

"مجھے ہنچی نہ کہو، میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ میں تمہارا باس ہوں۔" ہنچی نے روکھے پن سے کہا

برل نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔ "میں اس بارے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ایک نہ ایک دن ہمارا ملک آزاد ہوگا اور اس پر ہماری حکمرانی ہوگی اور تمہیں میری کار کی صفائی کرنی پڑے گی اب میرے لڑکے کی عمر پندرہ سال ہے، خدانخواستہ اگر تم کبھی اسے یہ بتا دو کہ میں نے تمہیں کبھی باس کہہ کر پکارا تھا تو میں شرم سے ڈوب مروں گا۔"

وارڈر کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اور اس نے اپنا کوٹ خود اٹھا لیا۔

ایک اور موقع پر برل کھلے میدان میں تمباکو پیتے ہوئے پکڑا گیا۔ اور جب جیل کے کمانڈر کے آگے اسے لے جایا گیا تو اس نے اس بات کا انکشاف کر دیا کہ اسے تمباکو دینے والا کوئی اور نہیں وارڈر ہنچی ہے۔ جیل کمانڈر نے ہنچی کو کھول کر گالیاں دیں اور بے چارہ وارڈر اپنی مدافعت بھی نہ کر سکا۔ وہ رونے لگا۔ اور برل کو ایک طرف لے جا کر کہنے لگا۔

"برل، تمہارے اور میرے درمیان یہ کشمکش اور جھگڑا ختم ہونا چاہیے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ میرے بھی بیوی بچے ہیں اور تمہاری حرکتیں مجھے خودکشی کے راستہ پر لے جا رہی ہیں۔"

"تم اپنا علاج خود کیوں نہیں کرتے؟" برل نے سادگی سے کہا۔

"تم جو بھی کہو گے، جو بھی پوچھو گے میں سننے اور بتانے کے لیے تیار ہوں۔" ہنچی نے مجبور ہو کر کہا۔

"صرف میں ہی نہیں بلکہ پورا گروہ نمبر ۱" برل نے بڑی چالاکی سے کہا۔ "تم سے کچھ چاہتا ہے۔"

ہنچی خوش ہوگیا۔

"میں تمہیں تمباکو کی ضرورت ہے۔ میں اس کا انتظام کر دوں گا" اس نے کہا۔

برل نے اس کی طرف دیکھا۔ پہلی مرتبہ اس کے دل میں رحم اور گناہ کے ملے جلے جذبات پیدا ہوئے۔ وہ سوچنے لگا کہیں میں نے معاملہ کو بہت دور تو نہیں پہنچا دیا۔ یہ شخص تو ابھی بالکل بچہ ہے۔

"ہم تمباکو نہیں تمہیں چاہتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ہو جاؤ۔ ہمیں ایک اچھے، اور ہمدرد وارڈر کی ضرورت ہے کیوں کہ ایک اچھے وارڈر کے بغیر قید کی طول طویل زندگی کاٹنا مشکل ہے۔"

وارڈر ہنچی نے برل کی اس درخواست کو اپنے مخصوص انداز میں عملی جامہ پہنایا۔ اس کے طریقے گروہ نمبر ۱ کے لیے باعث حیرت تھے۔ اکثر وہ اپنی پستول پھینک کر پھاوڑا اٹھا لیتا اور قیدیوں کے ساتھ زمین کھودنے میں مشغول ہو جاتا۔ اور قریب کے اپنے فارم سے چوری چھپے ابلے ہوئے انڈے اور سگریٹ منگوا کر قیدیوں میں بانٹ دیتا۔ گروہ نمبر ۱ نے بھی اس کی اس ہمدردی کا جواب ہمدردی سے اور کام میں مستعدی دکھا کر دیا ان کا فارم بہترین فارم قرار دیا گیا۔ ہنچی کی ہمدردی یک طرفہ نہیں تھی کیوں کہ سیاسی قیدی کھاد وغیرہ چرانے میں ماہر تھے جس کی ہنچی کے کھیتوں کو اشد ضرورت تھی۔

اعجاز اعظمی

نروان!

بیٹھا ہوں کئی سال سے اس پیڑ کے نیچے
آسن کو جمائے
اک آس لگائے
کرتا ہوں تپسیا کہ مجھے گیان ملے گا
نروان ملے گا
مایا کے اندھیرے میں ابھی گم ہیں دشائیں
آتی ہیں کپل وستو سے رہ رہ کے صدائیں
آلوٹ بھی آ !!
رات سنگھاسن کے دلارے
اک پھول نہ سہہ پائے گا سورج کی تمازت
بادل کو نہ راس آئے گی صحرا کی زیارت
گرتے ہوئے پتوں کا کبھی سوگ منایا
طوفانی ہواؤں سے کبھی دھیان لگایا
ہر لمحہ بدلتے ہوئے موسم سے لڑا ہوں
دشوار نپٹنا ہے جہاں آکے کھڑا ہوں
سہمے ہوئے سایوں میں کرن جاگ رہی ہے
سوکھے ہوئے پتوں میں چبھن جاگ رہی ہے
پھیلے ہوئے ماتھے کی شکن جاگ رہی ہے
بیٹھا ہوں کئی سال سے اس پیڑ کے نیچے
اس پیڑ کے نیچے مجھے یہ گیان ملا ہے
روتا ہوا ہر روپ میں بھگوان ملا ہے
نروان نراشا ہے تو نروان ملا ہے

فرحت قیصر

سکونِ پُر آشوب

زندگی کے روز و شب
جھیل کی مانند ہیں !

کوئی ہنگامہ ،
کسی کی یاد ،
کوئی حادثہ ،
ایک پتھر کی طرح گر رہا ہے ٹھہری جھیل میں !
دائرے ، ہلچل ، ذرا سا شور ، امواج رواں ،
وقت کے ہاتھوں ذرا سی دیر میں دب جائیں ہیں!
پھر وہی ٹھہرا ہوا پانی ــــــ
وہی معمول کی سی خاموشی ــــــ
روز مرّہ کی وہی مانوس ٹھہری زندگی !

ہاں ــــ مگر ــــ
ایک پتھر جھیل کی تہ میں کہیں موجود ہے !

شاہد میر

پیڑ کی سوکھی ڈالی پر جو اک پتہ پیلا سا ہے
شاید اس کا میرے سونے جیون سے کچھ رشتہ ہے
کوئی مسافر جس پہ نہ اترا صدیاں گذریں تنہا ہے
سُرخ سمندر کے پانی میں اک سنسان جزیرہ ہے
کبھی کبھی قطرے قطرے کو ترسے ہیں پینے والے
کبھی کبھی پینے والوں کو دریا دریا ترسا ہے
بیچ گھنی پلکوں میں اس کی ہیرے جیسی آنکھیں ہیں
یعنی دو انمول خزانوں پر فوجوں کا پہرا ہے
انسانوں کی بھیڑ میں شاہد کل جو بھول اکیلا تھا
سنتے ہیں اب کوٹھے کوٹھے ذکر اس کی خوشبو کا ہے

زبیدہ بیگم شمع

رہے زندہ دل کی عبادت سلامت
محبت کی انمول امانت سلامت
جبیں حُسن کی ہے تجھی سے درخشاں
محبت کی تجھ سے عبارت سلامت
کبھی قہرمانی کبھی دوست داری
بہر طور تیری عنایت سلامت
جبیں ریز راہوں میں ہے کہکشاں بھی
نفاست، نزاکت، لطافت سلامت
شمیمِ نفس سے تری تازگی ہے
تجھی سے ہے روحِ لطافت سلامت
ترے بحرِ رحمت میں آیا تلاطم
مرا جوشِ اشکِ ندامت سلامت
مبارک تجھے عشرتِ شامِ گلشن
تری شمع کا سوزِ فرقت سلامت

حسنیٰ سرور

اے دل تری وفاؤں کا انعام ہے جفا
دامن لہو لہو تری امید کا ہوا
چارہ گروں نے اور بھی نشتر چبھو دیے
نکلے تھے گھر سے ڈھونڈنے زخموں کی ہم دوا
یادوں کی رہگذر پہ کوئی شمع جل اٹھی
جب بھی کسی نے نام تمہارا کہیں لیا
افسانۂ حیات کہیں بھی تو کیا کہیں
آغاز کا پتہ ہے نہ معلوم انتہا
تیری نگاہ نے مجھے بخشا شعورِ فن
تیرے خلوص نے مجھے جینا سکھا دیا
حسنیٰ امید و بیم کے عالم میں دل جلے
جیسے اندھیری رات میں روشن کوئی دیا

سید حبیب

اے دلِ بیتاب اُن کو یاد کرنا چھوڑ دے
بے وفا ہیں وہ وفا سے واسطہ اُن کو نہیں
عشق میں غم کے سوا کچھ بھی نہیں او بے خبر
ساتھ چھوٹا اُن کا جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا

یوں تڑپنا زندگی برباد کرنا چھوڑ دے
اپنی دنیا درد سے آباد کرنا چھوڑ دے
بھول اُن کو۔ زندگی برباد کرنا چھوڑ دے
اب نہیں آئیں گے وہ فریاد کرنا چھوڑ دے

تبصرے

صفر

ناشر:۔ کلچرل اکاڈمی گیا
قیمت:۔ دس روپے (فی جلد)

"صفر" کلام حیدری کے سولہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کلام حیدری کم و بیش ستائیس اٹھائیس برس سے لکھ رہے ہیں۔ یہ ان کا دوسرا مجموعہ ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ اب سے بہت پہلے "بے نام گلیاں" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

"صفر" کے افسانوں کے مطالعہ سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ کلام حیدری افسانہ نگاری میں کیا بہ اعتبار موضوع اور کیا بہ اعتبار ہئیت SPECIALIZATION کے قائل نہیں ہیں۔ انھوں نے اگر ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں خیر و شر کی کشمکش، انسانی سماج کی اونچ نیچ، آدمی کا آدمی کے ہاتھوں استحصال، اتفاقات محض اور IRONY OF FATE کی باتیں کی گئی ہیں، اس طرح جیسے ان کے پیشروؤں نے کی تھیں ('بھنی' 'واپسی' 'ادھار' 'بابو' اور 'تلاش') تو ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کے ارض و سما مصنف کے اپنے ارض و سما ہیں۔ ان میں روایت سے گریز بھی ملتا ہے اور ایک نئی روایت کا سنگ بنیاد ڈالنے کا عمل بھی۔ ('عنابی کانچ کا ٹکڑا'، 'زندانی'، 'حادثہ'، 'کس کی کہانی'، اور 'صفر')

مثلاً 'کس کی کہانی' کو لیجئے جو صاف صاف دو زندگی کہانی ہے۔ ایک رو وہ ہے جو سطح پر چلتی ہے۔ اور دوسری وہ ہے جو سطح کے نیچے نیچے چلتی ہے۔ اور جس سے 'نوجوان' قطعی ناواقف ہے لیکن جو 'میں' کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ 'میں' بیس سال پہلے کے شب و روز میں بستا ہے (اور نوجوان کی تو عمر ہی بیس سال کی ہے) گویا یہ دونوں ایک دوسرے کے عہد سے قطعی ناواقف ہیں۔

اور اب نوجوان نے مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی قیامت خیزیوں سے اپنی جان بچا کر ہندوستان میں اپنے ماموں (میں) کے گھر پناہ لی ہے۔ بھانجے نے اس سے پہلے کبھی ماموں کو نہیں دیکھا ہے اور نہ ماموں نے بھانجے کو دیکھا ہے۔ لیکن 'میں'، اس میں ان کی جھلک دیکھتا ہے جو اس کے قلب و جگر تھے۔ اس کی باجی، اس کے بہنوئی جو فٹ بال کے ملنے ہوئے کھلاڑی تھے۔ گویا اس کا سارا ماضی اس کی بیش بہا یادیں، اس نوجوان میں سمٹ آئی ہیں جس سے وہ ہمایوں کے سالنامے کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں (کہ اس سے بات کرنے کو اور ہے ہی کیا)

اس افسانے میں دو متوازی لہریں خوب صورتی سے چلتی ہوئی، برّ اعظم کی تاریخ کے مدھم مدھم سے نقوش مرتب کر جاتی ہیں۔

اسی طرح 'زندانی' میں بھی وہ جو آپس میں ایک دوسرے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کے آگے ایک عالم تو عقل و ہوش کا ہے اور دوسرا عالم وہ ہے جو اسے حوا کی بیٹی ہے ماضی کے نہاں خانوں میں پہنچا دیتا ہے، اور اسے جو آدم کا وارث ہے پچھلی رات کی وادیوں میں گم کر دیتا ہے اور اب کیفیت یہ ہے کہ وہ ہیں مگر وہ نہیں ہیں۔ تب اچانک وہ اپنی ذات کی کھلی فضاؤں سے نکل کر پھر ان زندانوں میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں اس کے لیے وہ تھی، اور اس کے لیے وہ تھا کہ دراصل زنداں ہی ان کا اپنا جہاں ہے۔ یہی حال 'حادثہ' کا ہے۔ یہاں بس ایک 'کاش' میں سارا جہاں آ کر اٹک گیا ہے۔ کاش وہ کہہ دیتے کہ یہ محض حادثہ تھا۔ وہ کہہ دے (کاش) کہ اس کا خیال غلط ہے۔ وہ کہہ دے (کاش) کہ وہ اس سے پیار کرتی ہے۔

ان کہانیوں میں خوبصورت NOSTALGIC کیفیتیں ملتی ہیں۔ اور کہانیوں میں جو دو لہریں ایک ساتھ چلتی ہیں ان سے کلام حیدری نے برابر کا انصاف کیا ہے۔

یہ تو رہے شہروں کے قصے، اب ایسے افسانوں کو لیجئے۔ جو ان سے مختلف ہیں اور جانے پہچانے سماجی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔

'سخی' میں معاشی مجبوریاں ایک کڑوی کسیلی حقیقت بن کر سامنے آتی ہیں۔ اس افسانے کے آخری سرے پر ہم ایک عجیب دردناک سچویشن سے دوچار ہوتے ہیں۔ جب 'میں' مولا بخش ہی کی رقم کا ایک بڑا حصہ اس کی میت کی نذر کرتا ہے۔ مولا بخش ایک حادثہ کا شکار ہو گیا ہے اور اس کی دی ہوئی رقم سے 'میں' 'سخی' کہلانے کا مستحق ہو گیا ہے۔

'بابو' ایک بڑے انوکھے سوال پر ختم ہوتی ہے کہ اگر وہ نوٹوں بھری اٹیچی 'یسین' ہی کے پاس رہ جاتی تو آج بابو کون ہوتا۔

'واپسی' ایک ایسے جوڑے کی کہانی ہے جس نے محض ایک آبگینے کی شکست پر زندگی کے تیس سال علیحدگی اور تنہائی کے دشت میں گذار دیئے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ —— ہم نے محض ایک آبگینے کی شکست پر زندگی کو مسلسل ایک شکست بنا دیا اور اب فتح نام کی شے کبھی بھی ہمارا مقدر نہیں بن سکتی۔

یہ وہ افسانے ہیں جن میں سماجی حقائق پر IRONY OF FATE کا عنصر غالب ہے۔

لیکن اکثر مقامات پر ایک چبھن کا احساس ہوتا ہے

"جب نوجوان آدمی سے ملاقات ہوئی" (کس کی کہانی)

"بے تحاشہ جوان عورت نظر آتی ہے۔" (درد)

نثری حشو کا یہ عیب جابجا دکھائی دیتا ہے

کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے۔ لیکن سرورق کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ امنڈتے ہوئے سرخ اور سیاہ رنگوں نے قیامت بپا کر دی ہے۔

—— احمد یوسف

تنقید سے تحقیق تک

مصنف: ڈاکٹر عنوان چشتی

ناشر: پی کے پبلی کیشنز ۲۰۷۲، پرتاپ اسٹریٹ۔ دریا گنج۔ دہلی۔ قیمت: ۱۵ روپے

ڈاکٹر عنوان چشتی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تنقید سے تحقیق تک" اچھے ادبی و تنقیدی مضامین کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک با اضافات کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر عنوان چشتی نے "عکس و شخص" اور "تنقیدی پیرائے" میں اپنی ناقدانہ بصیرت کا ثبوت پیش کیا تھا۔ زیر نظر مجموعہ اس قسم کی ان کی تیسری کاوش ہے۔

دیباچہ، کتابیات اور اشاریہ کے علاوہ اس میں بارہ مضامین ہیں۔ یہ مضامین بالترتیب 'اسلوب کے نظریے'، 'شاعری کی زبان'، 'شعری تکنیک کا مفہوم'، 'اسلوب اور اسلوبیات'، 'شعری آہنگ کا تجزیہ'، 'ادبی روایت'، 'انفرادیت، جدت اور بغاوت'، 'منظوم ترجمے کا عمل'، 'ادب اور اخلاق'، 'عظمت اللہ خاں کا نظریہ فن'، 'غالب اور چند فنی مسائل'، 'منظوم ترجمے کی روایت'، اور 'نئی شاعری میں استعارے کا عمل' کے عنوانات سے شامل ہیں۔ ان مضامین کا غالب رجحان تنقیدی امکانات اور تحقیقی مسائل کی تفتیش و وضاحت کا ہے۔ جس کی طرف ڈاکٹر عنوان چشتی نے دیباچے میں اشارہ کر دیا ہے۔

'شاعری کی زبان'، 'شعری آہنگ کا تجزیہ'، اور 'شعری تکنیک کا مفہوم'، اگرچہ براہِ راست شاعری کی ہیئت سے متعلق ہیں۔ مگر ان میں ان محرکات کا ذکر بھی آیا ہے جو بدلتے ہوئے حالات و عوامل کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں۔ ان میں شاعری کے فن اور معیار سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ضیافتِ طبع کا کافی سامان موجود ہے۔ 'ادبی روایت'، 'انفرادیت، جدت اور بغاوت'، 'ادب اور اخلاق'، اور 'غالب اور چند فنی مسائل'، گویا تلخیِ کام و دہن کی آزمائش کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ خصوصاً روایت سے بغاوت تک کے درمیان جو منزلیں ادب میں آتی ہیں ان کا تجزیہ بڑے دلنشیں انداز میں کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے روایت اور بغاوت سے متعلق کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ مگر ڈاکٹر عنوان چشتی کا یہ مضمون اچھوتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

"روایت سے بغاوت تک کا سفر ایک طویل اور مسلسل سفر ہے۔ اس میں درمیانی سنگ میل بھی آتے ہیں۔ روایت فن اور تجربہ کا نقطۂ آغاز ہے۔ روایت کے بعد انفرادیت کی منزل آتی ہے۔ انفرادیت کے بعد جدت، اور جدت کے بعد بغاوت کا دائرۂ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح اگرچہ شعری تجربہ کی اساس روایت پر ہے، مگر اس کو بغاوت اور اس کے بعد نئی ہیئت

کی تعمیر تک کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

"ادب اور اخلاق" کے موضوع پر نہ صرف اردو میں بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی بحثیں ہو چکی ہیں۔ یہاں تک کہ یہ موضوع اب پامال سمجھا جانے لگا ہے۔ لیکن اس پامال موضوع کو جس طرح ڈاکٹر عنوان چشتی نے تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور 'اخلاق' کے تصور کو مختلف زبانوں اور علم و ادب کے ماہروں کے اقوال کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی جگہ کارنامہ ہے۔ اس سے قبل ادب اور اخلاق کے موضوع پر اردو میں اتنی گہری نظر سے کوئی مضمون نہیں لکھا گیا ہے۔ اسے تاثراتی بیان نہ سمجھا جائے بلکہ یہ میرے تقابلی مطالعے کا فیصلہ ہے۔

بقیہ مضامین بھی معیاری اور معتبر ہیں۔ کتابت و طباعت بہت اچھی ہے۔ —— ڈاکٹر فضل امام

مثنوی مولانا روم (دفتر اول)

مولانا محمد جلال الدین رومی کی مثنوی ایک درسی کتاب کے طور پر سالہا سال تک ہندوستان میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ لیکن اب چوں کہ فارسی تعلیم کا رواج باقی نہیں رہا اس لیے اس کتاب سے استفادہ کرنے والے بھی کم سے کم رہ گئے ہیں۔ ہمیں قاضی سجاد حسین صاحب کا شکر گزار رہنا چاہیے کہ انھوں نے اس مثنوی کو جسے شیخ سعدی نے "قرآں در زبانِ پہلوی" کا درجہ دیا ہے۔ اردو ترجمے اور حواشی کے ساتھ شائع کرنے کا تہیہ کیا۔ مثنوی سات دفتروں پر مشتمل ہے اور ۲۶۶۶ اشعار پر پھیلی ہوئی ہے۔ دفتر اول سجاد حسین صاحب نے شائع کر دیا ہے۔ امید ہے کہ باقی حصے بھی جلد ہی اہل ذوق کے ہاتھوں تک پہنچیں گے۔

قاضی سجاد حسین صاحب نے ایسی اور بھی کئی فارسی کتابیں جو ہندوستان میں مقبول رہی ہیں، اپنے تراجم کے ساتھ شائع کی ہیں ان میں گلستان، بوستان، مالا بدمنہ، اخلاقِ محسنی، پند نامہ عطار اور دیوانِ حافظ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ قاضی صاحب مذہبی آدمی ہیں لیکن عربی اور فارسی ادبیات پر بھی ان کی نظر ہے اور یہ تراجم ان کے ادبی شغف کی واضح مثال ہیں۔ اخلاق و تصوف کے جن رموز و نکات کی یہ کتابیں حامل ہیں ان پر بھی موصوف کو عبور ہے اور ترجمہ کرتے ہوئے انھوں نے انھیں عام فہم بنا کر پیش کیا ہے اس لیے طلبا کے لیے ان کے تراجم بہت مفید ثابت ہوئے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے دیوانِ حافظ کے ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا قاضی صاحب لفظی ترجمے پر زور دیتے ہیں اور شاعری، خاص طور پر اعلیٰ شاعری کے ترجمے کے لیے یہ طریقِ کار زیادہ کارآمد نہیں۔ مثنوی میں اعلیٰ شاعری کے نمونے قدم قدم پر سامنے آتے ہیں اور ان کے لفظی ترجمے سے وہ حظ نہیں اٹھایا جا سکتا جو اصل اشعار کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے۔ اصل اشعار میں ایک جہانِ معنی آباد ہے۔ لیکن ترجمہ اس گہری معنویت سے خالی خالی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے۔ ان کا ترجمہ بھی ساتھ دیا جا رہا ہے۔

جبر خفتن درمیانِ رہزناں | مرغ بے ہنگام کے یابد اماں
(جبر، ڈاکوؤں میں سو جانا ہے | بے وقت کا مرغ کب بچا ہے)
ہر نفس نو می شود دنیا و ما | بے خبر از نو شدن اندر بقا
(ہر سانس میں دنیا نئی بن رہی ہے | ہم اس کے نئے بننے سے بے خبر ہیں)
شاخ آتش را بہ جنبانی بساز | در نظر آتش نماید بس دراز
(جلتی لکڑی کو تیزی سے گھماؤ | تو دیکھنے میں ایک لمبی آگ نظر آئے)

کہیں کہیں اس کے برعکس مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً یہ شعر اور اس کا ترجمہ:

پنبۂ وسواس بیروں کن ز گوش
تا بگوش آید ز گردوں خروش

(وسوسوں کی روئی کان سے نکال
تاکہ تیرے کان میں آسمانی آواز آئے)

"خروش" کا ترجمہ قاضی صاحب نے "آواز" کیا ہے موقع و محل کے لحاظ سے بہت مناسب ہے۔ اسی طرح کی تھوڑی آزادی اگر اور مقامات پر بھی حاصل کر لی جاتی تو ترجمے کا اپن دور ہو سکتا تھا۔ بعض جگہ ایک اور صورت پیش آئی ہے جس کی وضاحت درج ذیل شعر سے ہوگی:

اتصالے بے تکیف، بے قیاس | ہست رب الناس را باجانِ ناس
(اللہ تعالیٰ کا انسانوں سے اتصال ہے | جو قیاس اور بیان سے باہر ہے)

چونکہ پوری کتاب میں لفظی ترجمے کا اہتمام ہے۔ اس لیے ہر جگہ

کا ترجمہ اس کے نیچے درج ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں ترتیب الٹ گئی ہے اس سے بچا جا سکتا تھا اگر ترجمہ اس طرح کیا جاتا: ایک ترجمہ ملاحظہ اور قیاس سے با۔ خدا کو انسانوں کے ساتھ ہے۔

کہیں کہیں غلط ترجمے کی مثالیں بھی ملتی ہیں:

آئینۂ دل چوں شود صافی و پاک نقشہا بینی بروں از آب و خاک

(دل کا آئینہ جب پاک و صاف ہو جاتا ہے

آب و خاک کے علاوہ اور نقش دکھتا ہے)

شعر میں روئے سخن قاری یا سامع کی طرف ہے اور "بینی" جو صیغۂ واحد حاضر ہے اسی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ترجمہ اسے صیغۂ واحد غائب سمجھ کر کیا گیا ہے۔

فکر کن در راہ نیکو خدمتے تا نبوت یابی تو اندر امتے

(بھلائی کے راستے میں خدمت کی فکر کر

تاکہ امت میں رہتے ہوئے نبوت پالے)

دوسرے مصرعے کا ترجمہ محل نظر ہے

شروع میں قاضی صاحب نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں جلال الدین رومی کے سوانحی حالات، ان کے علم و فضل اور ان کے متصوفانہ خیالات کا تفصیلی تعارف درج ہے مثنوی کی اہمیت اور اس کی ادبی قدر و قیمت سے بھی قاضی صاحب نے فاضلانہ بحث کی ہے اور ان تلمیحات اور اصطلاحات کی وضاحت بھی کر دی ہے جنھیں سمجھنے میں عام قاری کو مشکل پیش آ سکتی تھی۔ ہر صفحے پر حواشی بھی درج ہیں جو بیش قیمت معلومات کے حامل ہیں۔

کتاب اہتمام سے شائع کی گئی ہے، قیمت بیس روپے ہے۔ اور ملنے کا پتہ ہے: سب رنگ کتاب گھر، دہلی ۶

—— محمود سعیدی

حیدر علی

تالیف: نریندر کرشن سنہا
ترجمہ: اقتدار حسین صدیقی

ناشر: ترقی اردو بورڈ، مرکزی وزارت تعلیم و سماجی بہبود، حکومت ہند، نئی دہلی۔ قیمت: سترہ روپے

ترقی اردو بورڈ، دوسری زبانوں کی مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھنے والی مستند کتابوں کے اردو تراجم کی اشاعت کی ایک بڑی سکیم پر عمل پیرا ہے۔ اس کے زیر اہتمام کئی اہم کتابوں کے تراجم شائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ "حیدر علی" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ اٹھارویں صدی کے مشہور مہم جو اور سیاسی مدبر حیدر علی کی ابتدائی زندگی سے لے کر اس کے دور حکمرانی تک کی پوری کہانی بیان کرتی ہے۔ مولف نے حیدر علی کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۷۴۹ء سے ۱۷۶۱ء تک کا دور جب وہ گمنامی اور پریشاں حالی کی زندگی سے نکل کر اقتدار کی منزل تک پہنچا، ۱۷۶۱ء سے ۱۷۷۸ء تک کا دور جب اس جنگی سورما اور سیاسی مدبر کو بہ طور حکمراں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو آزمانے کے مواقع ملے اور پھر ۱۷۷۹ء سے ۱۷۸۲ء تک کا دور جس میں انگریز مخالف جذبہ اس پر حاوی رہا۔ اس کی وفات (۱۷۸۲ء) کے بعد یہ جذبہ اس کے جانشینوں میں بھی زندہ رہا اور آخر سلطان ٹیپو کی شہادت پر اس کا خاتمہ ہوا۔

کتاب کی فہرست ابواب پر نظر ڈالتے ہی سے اس کی جامعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ صرف حیدر علی کے خاندانی اور نجی حالات کا ذکر ہے بلکہ اس کی جنگی مہمات، سیاسی حکمت عملی، مرہٹوں سے اس کے تعلقات، انگریزوں سے اس کے روابط، فرانسیسیوں کے ساتھ اس کا رویہ، اس کا قائم کردہ فوجی نظام اور شہری نظم و نسق، جنگی قیدیوں کے ساتھ اس کا سلوک اور اپنے عہد میں اس کے عروج کی سیاسی اہمیت، ان تمام امور پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے اور کئی زبانوں میں دستیاب مستند ماخذ کو سامنے رکھ کر نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ۱۷۴۹ء سے ۱۷۸۲ء تک کے جنوبی ہندوستان اور وہاں ہونے والی سیاسی اقتدار کی جنگ کا پورا نقشہ [illegible] ہے اور اس عہد کی بہت سی تاریخی گتھیوں کو جو اسکاٹ، حیدر آباد اور میسور کے علاقوں سے تعلق رکھتی ہیں کامیابی کے ساتھ سلجھاتی ہے جو امور اس کتاب میں زیر بحث آئے ہیں، ان کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات شاید ہی کسی اور جگہ مل سکیں۔

ترجمے کی زبان سلیس ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس میں ژولیدگی بھی راہ پا گئی ہے۔ تھوڑی سی محنت سے اسے دور کیا جا سکتا ہے۔ اصل کتاب کے اب تک چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ امید

ہے اردو میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہو گی۔

—— ارشد علی خاں

نئے چراغ نئے گلے

مصنف: نثار عزیز بٹ
ناشر: اہرا شعر پبلیشرز اسلام آباد

قیمت ۱۲ روپے۔ درج ذیل تین پتوں پر دستیاب ہے: (۱) مکتبۂ فنون ۴۷، انارکلی، لاہور (۲) مکتبۂ کارواں، کچہری روڈ لاہور (۳) نوائے وقت، لاہور، راولپنڈی، کراچی

بحیثیت ناول نگار نثار عزیز بٹ کا نام بہت سے لوگوں کے لیے نیا ہوگا لیکن ان کے زیر نظر ناول "نئے چراغ نئے گلے" کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ وہ ناول نگاری کے فن سے کما حقہ واقف ہیں اور اس کے تقاضوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتی ہیں۔

ناول کا آغاز ایک روایتی گاؤں کی فضا سے ہوتا ہے اور پھر یہ قصہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا ہوا دنیا کے بڑے شہروں لاہور، دہلی، کراچی، لندن اور پیرس تک جا پہنچتا ہے۔ قصے کا یہ پھیلاؤ اوپری واقعات تک محدود نہیں ہے بلکہ اپنے اندر تہ در تہ معنویت لیے ہوئے ہے جو قاری کو ناول کے متعدد کرداروں اور ان کی ایک دوسرے سے مختلف اور متنوع زندگیوں کے دکھ سکھ اور رنج و مسرت سے آشنا کرتی ہوئی اسے اس کائنات کا ایک مخصوص عرفان بخشتی نظر آتی ہے۔ جس میں وہ بھی رہا ہے ناول کے سبھی کردار حقیقی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں خدا کے سادہ دل بندے بھی ہیں اور وہ ہوشیار لوگ بھی جو دونوں جہان میں اپنے مفادات خصوصی تک رسائی کی راہ آسانی سے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ جذبات و احساسات کی رنگا رنگ کیفیتیں ہیں جو ان زندہ کرداروں کا خاصہ ہیں اور ان کے گوشت پوست کے وجود کو ایک خاص ڈھنگ روپ عطا کرتی ہیں۔

ناول کا کینوس بہت وسیع ہے کیوں کہ یہ ایک سے زاید معاشروں اور ان معاشروں کے پروردہ افراد کی خصوصیات اور ان کے تضادات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مصنفہ نے تقسیم ہند سے پہلے کی اس صورت حال کو بہ طور خاص پیش نظر رکھا ہے جب تین مختلف تہذیبی دھارے جو مسلم، ہندو اور عیسائی تمدن کے پروردہ تھے۔ ایک خاص نقطے پر ایک دوسرے سے ملتے تھے، اسی تمدنی تال میل کے ماحول میں ایک گھریلو رومان جنم لیتا ہے اور پھر بات قوموں کے تاریخی اور تہذیبی شعور تک جا پہنچتی ہے اور ناول کو عام رومانی ناولوں سے بہت دور لے جاتی ہے۔ 'خدا کی بستی' اور 'اداس نسلیں' کے بعد یہ ایک اور ناول ہے جو اس ذہنی کرب اور روحانی صدمے کی غمازی کرتا ہے جس سے وہ ذہین افراد دوچار ہوئے جنھوں نے تقسیم ملک کے قیامت آثار حادثے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کسی نہ کسی سطح پر اس کے عواقب کی زد میں بھی آئے۔

کتاب کا گیٹ اپ خوش نما ہے اور قیمت واجبی

—— ارشد علی خاں

احساسات (شعری مجموعہ)

شاعر: ادم پرکاش لاغر
ناشر: پی کے پبلیکیشنز ۲۰۷۲، پرتاپ اسٹریٹ۔ دریا گنج، دہلی۔ قیمت: پانچ روپے۔

اردو شاعری کی تاریخ روایت اور تجربے کی کشمکش کی داستان ہے۔ روایت کے خارجی پہلو کی پیروی روایت پرستی ہے۔ البتہ روایت کے داخلی پہلو یعنی اس کی روح اور بنیادی لہر کو اپنانے سے فن میں تسلسل اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ جو فن کار اس نکتے سے آگاہ ہیں ایک طرف انھوں نے اپنا رشتہ ماضی سے استوار رکھتا ہے اور دوسری طرف فن کے بنیادی تقاضوں کا حق بھی ادا کیا ہے۔ ادم پرکاش لاغر کے "احساسات" کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں روایت پرستی نہیں ہے بلکہ روایت کا احترام ہے۔ احترام روایت نے ان کی غزلوں کو سریع الفہم اور مانوس بنا دیا ہے۔

ادم پرکاش لاغر نے اپنی شاعری کو فکر و فلسفہ سے بلیغ اور گمبھیر بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے احساسات و خیالات کو فطری سادگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی غزلوں کی یہ ادا زبان اور طرز بیان کی سطح پر بھی باقی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اس زبان کو برتا ہے جو ایک صدی سے غزل کی مستند زبان سمجھی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کی مانوس اخلاقی فضا بھی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ لاغر صاحب کو بڑے مزے سے کہنا آتا ہے (باقی صفحہ ۱۲۲ پر)

بزم احباب

پرکاش فکری (رانچی)

مئی کے تحریک کے اداریے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے سلسلے میں جو وزن دار اور منطقی سوالات اٹھائے گئے ہیں ان کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کانفرنس سے تازہ تازہ آئے ہوئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی گفتگو سننے کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔

ابھی انجمن کا نیا منشور سامنے نہیں آیا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کے متعلق یہ فرمایا کہ بھیمڑی کانفرنس کے فیصلوں نے انجمن کو بہت غیر لچکدار بنا دیا تھا۔ مگر اب ہم نے اس میں کافی لچک پیدا کر دی ہے۔ اب ہم فارم اور طریقۂ اظہار پر کوئی پابندی عاید نہیں کریں گے۔ مگر ادب، کو بہرحال، کسی صحت مند سیاسی پارٹی کا تابع فرمان ہونا ہی چاہیے۔ اور ان کے خیال میں کمیونسٹ پارٹی کے سوا کوئی سیاسی پارٹی صحت مند نہیں ہے۔

انھوں نے مزید فرمایا کہ اب ہم MOOD اور ATTITUDE میں فرق برتیں گے یعنی یہ کہ حد درجے کا رجائی ادیب بھی کبھی کبھی یاس کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر یہ اس کا موڈ ہوا۔ ATTITUDE نہیں۔ مگر ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے کہ کوئی ادیب یاسیت ہی کا اسیر ہو کر رہ جائے۔ ان کے مطابق فانی کی یاسیت اس کا ATTITUDE تھی۔ مگر میر کی یاسیت ایک موڈ تھی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ادب کو بہرحال رجائی ہونا چاہیے۔

یہ باتیں انھوں نے کچھ اس ڈھنگ اور ان تیوروں میں ہیں مانو کوئی مطلق العنان بادشاہ بڑھاپے میں بیٹے کی پیدائش پر خوشی سے بد حواس ہو کر بھوکی ننگی اور کچلی ہوئی جنتا کو ٹیکسوں کی معافی دے رہا ہو۔

تمام بات چیت کے دوران ان کا رویہ نہایت آمرانہ رہا۔ انھوں نے "تحریک" اور شمس الرحمٰن فاروقی کو ادب میں مایوسی پھیلانے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ نئے ادیبوں پر یہ الزام رکھا کہ وہ کلاسیکی ادب سے نابلد ہیں اور اپنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ مگر خود انھوں نے غیر ارادی طور پر نئے ادب سے اپنے کو نابلد ثابت کیا۔ نئے ادب اور ترقی پسند مصنفین کے سلسلے میں پوچھے گئے کسی بھی اختلافی سوال کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اور ان کی ساری گفتگو کے درمیان یہی محسوس ہوتا رہا کہ وہ بالغوں کو حروف تہجی پڑھا رہے ہیں۔ یہ تو حال ہے ایک بہت بڑی مشین کے نہایت چھوٹے سے پرزے کا۔ جانے بڑے پرزوں کا کیا حال ہوگا اور پوری مشینری! تو اس کی داستان تو مایاکافسکی اور فدائف کی خودکشی سے لے کر پولسٹنسین کے دیش نکالا تک پھیلی ہوئی ہے

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں پاسترناک نہایت گھٹیا ادیب ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں ادیب کہیں بھی قلم کی کمائی پر زندہ نہیں رہتا۔ کسی کے یہ کہنے پر کہ مغرب میں ادیب تو قلم کی کمائی پر بڑے مزے سے زندہ رہتا ہے۔ انھوں نے یہ جواب دیا کہ ہمارے یہاں بھی تو گلشن نندہ بہت پیسے کماتا ہے اور تیرتھ رام فیروز پوری نے تو ناول لکھنے کا کارخانہ ہی کھول رکھا تھا۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ادیب اگر کہیں قلم کی کمائی پر جیتا ہے تو صرف سوویٹ روس میں۔ مگر پتہ نہیں کیوں وہ سوویٹ روس کا نام لینے سے برابر کتراتے رہے۔ شاید سچے عاشق کی یہی پہچان ہے کہ وہ اپنے عشق کو اور محبوبہ کے نام کو عام نہیں کرتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ نئے منشور کے تحت کیسا ادب پیدا ہوتا ہے اور ترقی پسندی کی کسوٹی پر انھیں کی صفوں میں

ن کونٹ پورا اترتا ہے ۔

بم شیرازی (نئی دلی)

اردو سروس آل انڈیا ریڈیو نئی دلی کے زیر اہتمام ایوانِ
ب میں جدید شاعروں کا ایک کل ہند مشاعرہ ہوا جس کی صدارت
امت کے فرائض ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری صاحب نے
م دیے ۔ شاعروں کے نام یوں تھے۔
قیصر شمیم، مظفر حنفی، شہریار، فضیل جعفری، ندا فاضلی،
پاشی، زاہدہ زیدی، عتیق اللہ، حسن کمال، آزاد گلاٹی۔
ور گھ پوری، ممتاز راشد، خلیل تنویر، رحمت الاختر، رئیس
، عبدالرحیم نشتر اور دیا رتن آسی ——
آل انڈیا ریڈیو کے منتظمین کے مطابق یہ تمام شعرا
۱۹ء کے بعد ابھرنے والے (جدید شاعری کے) نمائندہ شعرا
۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فہرست کے کئی شعرا ۱۹۶۰ء سے قبل
نے آچکے تھے ۔ دوسری طرف بیشتر ایسے شعرا تھے جو ۱۹۶۰ء
ی بعد یعنی ۷۰ء کے آس پاس سامنے آئے ۔
آل انڈیا ریڈیو کے اس جرأت مندانہ اقدام کو یقیناً سراہا
ے گا کہ اس کے زیر اہتمام اتنے بڑے پیمانے پر جدید شاعروں کا
مشاعرہ ہوا اور جدید شعرا کو مشاعرے کے سامعین سے
ب آنے کا موقع ملا ۔

لیکن مشاعرہ بری طرح ناکام رہا ۔ جس کے کئی اسباب
۔ جدید شاعروں کے مشاعرے کی صدارت ایک ترقی پسند شاعر
ی جس کی کوئی تُک نہیں تھی ۔ واضح ہو کہ جدید شاعروں نے
پسند شاعروں کو ایک عرصہ ہوا REJECT کر دیا ہے ۔ اور
پسند شاعروں نے جدید شاعری کو ملعون و مطعون کرنا
وطیرہ بنا لیا ہے ۔ چنانچہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ترقی پسند شاعر
ید شاعری کے بارے میں کچھ کلمات خیر بھی ادا کرسے ؟ یہی
جعفری صاحب کا رویہ ابتدا ہی سے مخاصمانہ رہا ۔ ان کی
تامی تقریر ہی اتنی زہریلی اور یک رخی تھی کہ جس نے مشاعرے
فضا کو مشاعرہ شروع ہونے سے قبل ہی مسموم کر دیا مشاعرے
روائی بے ترتیب انداز میں چلائی گئی اور جعفری صاحب شاعروں،

طرح طرح کے COMMENTS دینے میں سامعین کے ہم آواز ہو گئے
نتیجہ یہ ہوا کہ آخری شاعر کے طور پر جب رحمت الاختر کا نام پکارا
گیا تو وہ بڑی مشکل سے دو تین شعر پڑھ پائے ۔ سامعین نے کہ
جو سردار جعفری کی پیدا کردہ فضا کے TRANS میں پوری طرح
آچکے تھے، کسی شاعر کو (سوائے چند کے) مائک پر ٹکنے نہ دیا۔
چند ایسے شاعر جو ترقی پسند تھے، جدید نہیں (مثلاً حسن کمال اور
ظفر گورکھ پوری) جعفری صاحب کی پوری ہمدردیاں اور SUPPORT
لے کر مائک پر آئے یہ اور بات ہے کہ انھیں جعفری صاحب کی
خواہش کے مطابق داد نہیں ملی۔

جعفری صاحب نے مشاعرے سے قبل جو تقریر کی تھی اس
میں جدیدیت کی الٹی سیدھی تعریف کے علاوہ جدید شاعری سے
متعلق کئی فتوے بھی صادر کیے تھے : مثلاً "جدید شاعری ترقی پسندی
کی توسیع ہے" (؟) اور "جدید شاعری بیگانگی کی شاعری ہے
اس کا سماج سے کوئی رشتہ نہیں" (؟) اور یہ کہ "جدید شاعری
سرمایہ داروں کا آلۂ کار ہے" (؟) (یہاں ان سے چوک
ہو گئی —— غالباً وہ جدید شاعروں کو سرمایہ داروں کا آلۂ کار
کہنا چاہتے تھے[1] —— سخت تعجب ہے کہ ترقی پسند تحریک
کی وفات حسرت آیات کے اتنے عرصے بعد بھی جعفری صاحب
کے ذہن میں یہ بات واضح نہ ہو سکی کہ جدید شاعری اور ترقی
پسند شاعری میں فرق کیا ہے ؟ یا شاعری اور نعرے بازی
کے درمیان ایک حدِ فاصل بھی ہے ؟ وہ گزشتہ چند ماہ سے
کچھ اس قسم کی تقریریں کرنے لگے ہیں ۔ جن پر مناظرے کا گمان
ہوتا ہے ، ہر چند کہ اس کی حیثیت "باسی کڑھی کے ابال" سے
زیادہ نہیں ۔ انھوں نے انگریزی کا ایک لفظ ALIENATION
کہیں سے سن لیا ہے ۔ جس کے لغوی معنی ہیں "بیگانگی" اور
اس کا اطلاق جدید شاعری کے اس مخصوص رویے پر کرتے
ہیں، جسے "شناخت کی مشکل" کہا جا سکتا ہے اور جو اس عہد کا
مقدر ہے ۔ یہاں یہ بات خاص طور سے ذہن میں رکھنے کی ہے ۔
کہ "ALIENATION" خود بخود پیدا نہیں ہوتا ۔ اس کے لیے

---

[1] جدید شاعری بیک وقت ترقی پسندی کی توسیع بھی ہے
اور سرمایہ داری کا آلۂ کا[illegible] بالعجب !!

وجود غیر انا کے شدید تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس کا مفہوم "یکجائی" ہرگز نہیں، بلکہ وہ کیفیت ہے جب جانی پہچانی صورتیں، اشیاء اور صورت حالات نامانوس اور اجنبی معلوم ہوتی ہیں۔ یا پھر نئے محسوسات انسان پر اس طرح طاری ہوتے ہیں، گویا یہ کیفیات پہلے بھی گذر چکی ہیں " اگر جعفری صاحب ذاتی تجربات اور تخلیقی عمل کے "ڈائمنشن" سماجی مسائل سے ملا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، اس کے بعد شاعری کیا بچے گی؟ کچھ تجربات کا شدید اظہار PRIGMETIC تو ہو سکتا ہے (وہ بھی اس صورت میں کہ جب اس میں تخلیقی عمل کا پورا کرب اور دیانتدارہ شامل ہو) جس کی چھوٹ آس پاس کی چیزوں پر یقیناً پڑے گی۔ لیکن لادے ہوئے افکار و مسائل پر لیڈروں تو بسائی جا سکتی ہے شاعری نہیں ہو سکتی!

للہٰذا آل انڈیا ریڈیو کا یہ "آل انڈیا مشاعرہ" اگر ناکام رہا تو اس پر زیادہ افسوس نہیں کرنا چاہیے کہ اسے ایک متعصب ذہن کے ترقی پسند شاعر نے کنڈکٹ کیا تھا اور اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے تھے ـــــ لیکن آل انڈیا ریڈیو کے اعلیٰ حکام سے یہ شکایت ضرور ہے کہ جدید شاعروں کا مشاعرہ کرنے سے قبل کچھ جدید شاعروں سے مشاعرہ کیوں نہیں کیا گیا۔؟ آل انڈیا ریڈیو بہرحال حکومت کا ایک عوامی ادارہ ہے اور اس کے ذمہ دار عوام کے آگے جوابدہ ہیں۔!

جعفر حسین (لکھنؤ)

مئی کے شمارے میں آپ کا اداریہ "کہاں جا رہا ہے تو اے جانے والے" پڑھا۔ ترقی پسندوں کی کانفرنس کو آپ نے بلاوجہ اہمیت دے دی۔ بھئی مرے ہوؤں کو ستایا نہیں کرتے۔ پرانے ترقی پسند یا تو تحریک سے کٹ گئے ہیں یا انھوں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے اور نئے ادیب اور شاعر ترقی پسندی کے جال میں پھنسنے سے رہے۔ اس صورت میں کیا یہ بہتر نہیں کہ مرنے والوں کو سکون سے مرنے دیا جائے۔

خبر نامہ

"بزمِ احباب" شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی جانب سے فیاض رفعت کے اعزاز میں ڈاکٹر صلاح الدین کے مکان پر ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ منتظمین میں ڈاکٹر صلاح الدین بھی تھے ...... تقریب ان کے افسانوں کا مجموعہ "نئے عہد نامہ کی سوغات" کی اشاعت قرار پائی تھی۔ حاضرین تعداد میں کم تھے مگر انتخابی تھے۔

سب سے پہلے خواجہ احمد فاروقی صاحب نے تمہیدی جملے جلسہ کی غرض و غایت کے ذیل میں کہے اور مقررین سے درخواست کی کہ وہ فیاض رفعت اور ان کی کہانیوں کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ قمر رئیس نے کہا کہ فیاض رفعت بیک وقت ان کے دوست اور شاگرد ہیں۔ وہ اول سے ہی ان کی کہانیاں پڑھتے رہے ہیں۔ انھوں نے ان کی کہانی "بیگم رضیہ" کا بطور خاص ذکر کیا اور کہا کہ یہ ممتاز مفتی کی "بڑی آپا" سے بہتر کہانی ہے۔ ایک دوسری کہانی "سنگ و دشنام" کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اگر اس کا ترجمہ یورپ کی کسی زبان میں کر دیا جائے تو یہ دوسرے ممالک سے بھی کافی تحسین و پذیرائی حاصل کر سکتی ہے۔ فیاض رفعت کی جدید کہانیوں کی بھی انھوں نے کافی تعریف کی۔ وہ کم و بیش پندرہ منٹ تک فیاض رفعت اور ان کی کہانیوں کے بارے میں تقریر کرتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہ صرف انھوں نے فیاض رفعت کی شخصیت کو اچھی طرح سمجھا ہے بلکہ ان کی کہانیوں کا بھی بغور تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔

قمر رئیس کے بعد بلراج کومل بولے۔ ان کا کہنا تھا فیاض رفعت کہانیوں میں علامت نگاری سے کام لیتے ہیں مگر دوسرے علامت نگاروں سے مختلف ہیں۔ ان کے یہاں ابہام نہیں ہے وہ محسوسات کے ادیب ہیں۔ مگر ایک اور بات جو ان کی کہانیوں سے مترشح ہوتی ہے وہ ہے زندگی کا خوف۔ وہ زندگی سے خوفزدہ ہیں جو عموماً تنہائی کے احساس کا محرک ہوتا ہے ان کی کہانیوں میں احساس تنہائی شدت سے نمودار ہوتا ہے۔

شمیم نکہت نے کہا فیاض بے باک ادیب ہیں۔ ان کے مشاہدے میں زندگی جس روپ میں آتی ہے وہ اس کو جوں کا توں پیش کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور افسانوں کی خاص خصوصیت بے باکی ہے۔

شمیم نکہت نے کہا۔ میں نے ان کے علامتی افسانے بھی پڑھے ہیں ان میں ابہام نہیں ہے۔ سمجھ میں آتے ہیں یا ان میں ترسیل کا مسئلہ نہیں بنتی۔

انوار رضوی نے کہا کہ جدید افسانے نے جو شکل اختیار کی ہے وہ غیر ترسیلی انداز کی ہے۔ اس سے نقصان یہ ہوا ہے کہ ادب کا قاری .... ہو گیا۔ فیاض رفعت نے بھی جدید فارم کے افسانے لکھے ہیں۔ مگر علامت و تجریدیت کے باوجود تھوڑی توجہ دینے کے بعد ان کے افسانوں کی تہیں کھل جاتی ہیں۔ اور ان کے اندر کا تسلسل اور معنویت آئینہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے قاری کو REINSTAT کرتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ علامتی و تجریدی انداز کی کہانی میں ربط اور معنویت کی ترسیل کہانی نگار کی کامیابی کا ضامن ہے اور یہی کہانی کی بھی کامیابی ہے۔

ظہیر احمد صدیقی نے اپنی بات معذرت کے ساتھ شروع کی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ابھی تمام افسانوں کا بغور مطالعہ نہیں کر پائے ہیں۔ مگر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان افسانوں میں نکیلا پن ہے ان کی شخصیت اور ان کے ادب میں ایک دو چیزیں نمایاں ہیں اور وہ ہیں جھنجھلاہٹ اور فرسٹیشن۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر فیاض رفعت نے ان عناصر پر قابو پا کر اپنے یہاں اعتدال و توازن پیدا کر لیا تو بہت آگے بڑھیں گے (ورنہ ......) مجموعہ کی اشاعت پر ہدیۂ تبریک بھی پیش کیا۔

صدرِ جلسہ خواجہ احمد فاروقی نے اب ڈاکٹر محمد حسن کو

اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ ڈاکٹر محمد حسن ترقی پسند تنقید کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ تجسس تھا کہ یہ علامتی و تجریدی افسانوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ محمد حسن نے کہا کہ افسانہ نگاری کے میدان میں فیاض رفعت سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ انھوں نے فیاض رفعت کی نثر کو سراہا اور نثر کی اس خوبی پر توجہ دلائی کہ اس پر غزل کی مہر نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ افسانہ نگاری کے فن میں منٹو اسکول سے تعلق رکھتے ہیں اور کرشن چندر اسکول سے مختلف ہیں۔

ان کا کہنا تھا کہ ان کے افسانے آج کے نوجوانوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی تحریر سے مترشح جھلاہٹ شخصی نہیں بلکہ پوری نسل کی نمائندہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے افسانوں کی فضا میں فیاض رفعت ہیں۔ ان کے افسانے محسوسات سے آگے بڑھ کر فکر کی حد میں جانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اس جملہ پر اپنی بات ختم کی کہ فیاض رفعت اب صاحب کتاب ہو گئے ہیں (یعنی ایک ذمہ دار فرد ہو گئے ہیں)۔ امید ہے کہ وہ نئی ذمہ داری کا احساس کریں گے اور اس کو ادا کریں گے۔

حاضرین کی نگاہیں خواجہ صاحب فاروقی پر مرکوز تھیں۔ خواجہ صاحب نے حاضرین پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور گویا ہوئے۔

—— میں فیاض رفعت کو کافی دنوں سے جانتا ہوں۔ ان کے دو نام ہیں۔ یعنی فیاض محمد خاں، اور فیاض رفعت۔ پہلا ان کا پرانا نام ہے اور دوسرا نیا اختیار کردہ ہے۔ میرے ذہن میں جو ان کی تصویر بنتی ہے وہ ہمیشہ فیاض محمد خاں کی ہے۔ ان کی کہانیوں کی فضا ایک نیا برّاعظم ہے، ایک نیا ملک ہے۔ ان کی تحریروں میں پراسرار سائے سرسراتے ہیں۔ انھوں نے ان کی نثر کو بھی سراہا اور کہا کہ ان کے افسانے نثر میں بھی ایک نیا تجربہ ہیں۔ حسیات کو قلم کی گرفت میں لانا ممکن ہی نہیں، تاوقتیکہ لکھنے والا تجربہ سے نہ گزرے۔ ان کا مستقبل حال سے زیادہ روشن ہے۔ انھوں نے کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دی اور ان کے مستقبل میں اپنے یقین کا اعادہ کیا۔

خواجہ صاحب نے یہ بھی کہا کہ میری تمنا رہی ہے کہ شعبہ سے اچھے فن کار، اچھے براڈکاسٹر اور اچھے ادیب نکلیں۔ اور فیاض رفعت ایسے ہیں۔

تقریروں کا سلسلہ ختم ہوا چاہتا تھا مگر ادیب جس کی پذیرائی کے لیے تمام لوگ جمع ہوئے تھے اس کو بھی بولنا تھا۔ خواجہ احمد فاروقی نے فیاض رفعت سے کہا کہ آپ بھی اپنے بارے میں کچھ کہیے۔

فیاض رفعت نے کہا —— میں آپ حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ سب نے میری انتہائی پذیرائی اور ہمت افزائی کی۔ اپنے بارے میں میں اتنا کہتا ہوں کہ فزکس سے بچ کر میں نے افسانے پڑھنا اور بعد میں لکھنا شروع کیے۔ اوّل کے افسانوں میں آس پاس کی زندگی کا عکس کھینچنے کی کوشش کی اور سیدھے سادے افسانے لکھے۔ شوق بڑھنے کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی آئی۔ اور پھر بڑے ادیبوں کو پڑھا۔ اس زمانے میں اتنا پڑھا کہ اب خود کو اتنے مطالعہ کی ہمت نہیں ہوتی۔ میں نے مشکل زندگی گزاری ہے مگر جھلاہٹ اور فرسٹریشن کا شکار کبھی نہیں ہوا (روئے سخن شاید ظہیر احمد صدیقی کی طرف تھا) میں نے بڑے فن کاروں کو پڑھا مگر تقلید کی کوشش نہیں کی۔ ویسے بھی مثالاً پریم چند کی زندگی کے مسائل اور تھے اور اب اور ہیں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے افسانے ایمانداری سے لکھے ہیں۔ شہرت کی طلب میں نہیں لکھے ہیں۔ مجھ کو سماج سے انفرادی شکایتیں نہیں ہیں۔ چوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ میری پذیرائی بھی خوب ہوئی ہے۔ میری شکایتیں اجتماعی نوعیت کی ہیں۔

میری ضروریات ہمیشہ پوری ہوتی رہی ہیں۔ میں زندگی میں بہت آسائش کا متلاشی نہیں ہوں البتہ افسانہ نگاری میں خوب سے خوب تر کی تلاش کرتا ہوں۔

پوری تقریر کے دوران فیاض رفعت کا لہجہ بڑا ٹھہرا ہوا تھا اور تمام باتیں آسانی اور بے ساختگی سے کہی گئی تھیں۔

اب بطور میزبان عبدالحق نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ دوستوں اور بزرگوں کی ایسی بھرپور محفل دہلی میں نایاب ہے اس کا لطف مدتوں یاد رہے گا۔

خواجہ احمد فاروقی نے جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔

(انوار رضوی)

---

۶ مئی کی شام کو ایوانِ غالب کے خوش نما آڈیٹوریم میں فائن

آرٹس کلچرل سوسائٹی (جنرل سکریٹری ساحرہ بیگم) کی جانب سے جو شعری محفل منعقد ہوئی وہ اپنی نوعیت کی پہلی محفل تھی۔ اس محفل کی سب سے بڑی دلکشی تھی، نئی اور کلاسیکل شاعری کی ڈرامائی پیشکش جس کے لیے روشنی اور تاریکی، ساز اور آواز کے ایک مخصوص امتزاج کا سہارا لیا گیا۔

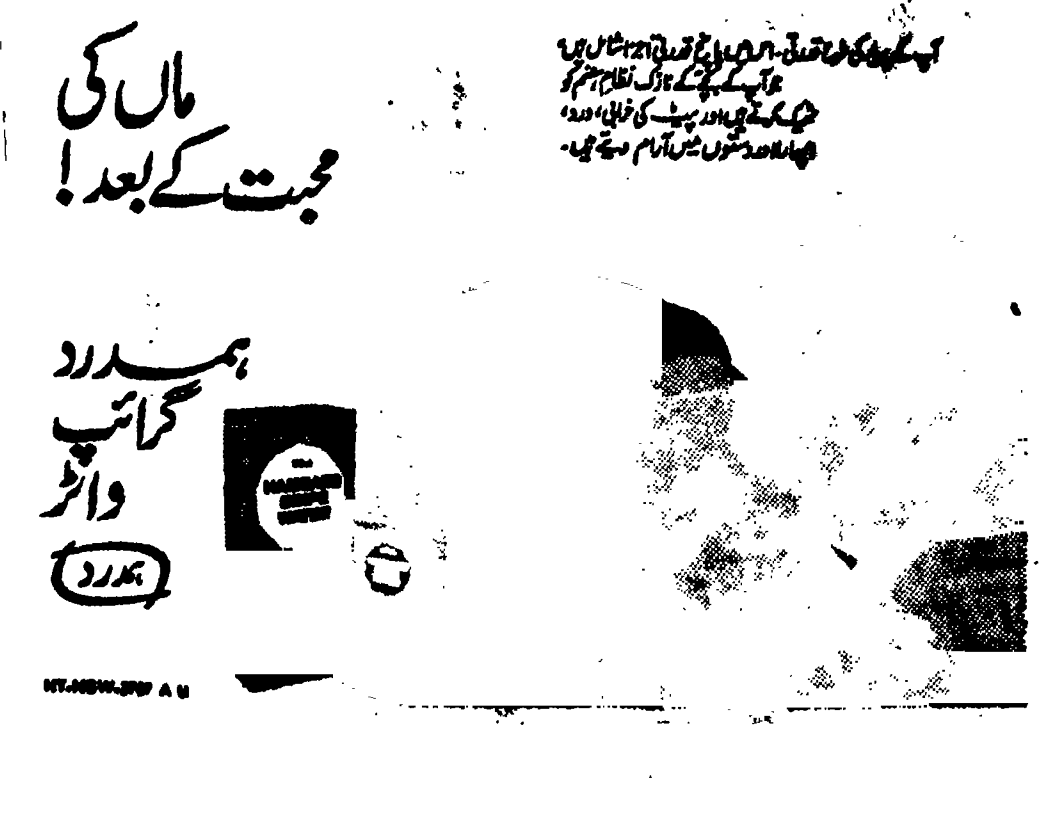
مشاعرے میں شریک شعراء کا رسمی تعارف کرانے کے لیے اسٹیج پر کوئی موجود نہیں تھا۔ اس کی بجائے پس منظر سے مجیب صدیقی کی گمبھیر اور متاثر کن آواز نے شعرا کو باری باری کچھ اس انداز سے متعارف کرایا کہ نیم روشن ہال میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر دی۔

شریک شعرا میں جہاں بالترتیب امیر قزلباش، کمار پاشی اور مخمور سعیدی جیسے نئی شاعری کے علمبردار شاعروں کے نام تھے وہاں کلاسیکل شاعری کی نمائندگی حیات لکھنوی، رفعت سروش اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے کی

ہر شاعر جب مائک پر آیا، اسٹیج مکمل تاریکی میں تھا، سامنے روشنی کے ایک مجموعے سے ہالے میں کلام پڑھتے ہوئے شاعر کا صرف چہرہ ہی دیکھ سکتے تھے، عجیب منظر تھا، دلکش اور خوابناک۔

اس غیر معمولی محفل کی دوسری بڑی کشش تھی ابھرتے ہوئے موسیقار جمیل احمد کی سحر آگیں آواز۔ جیسے ہی شاعر مائک سے ہٹتا تھا اچانک رونما ہو جانے والے نور [illegible] وں میں جمیل احمد اسی شاعر کی غزل چھیڑ دیتے تھے اور سماں سا بندھ جاتا تھا۔

امید کی جانی چاہیے کہ فائن آرٹس کلچرل سوسائٹی جس نے یہ پرکشش بزم شعر و موسیقی منعقد کی وہ اس طرح کی محفلیں دوسرے بڑے شہروں میں بھی آراستہ کرے گی۔ اور اردو شاعری کے ان بہت [illegible] کی دلچسپی کا سامان بہم پہنچائے گی۔ جو مشاعروں کی روایتی فضا سے اکتا چکے ہیں۔ ([illegible])



Regd. No: D (D) 118 Phone 271649 JUN 1975

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 640/57

TAHREEK

سیہ بر سفید

مخمور سعیدی کے دوسرے

مجموعۂ کلام

کا

نیا ایڈیشن

ترمیم و اضافے کے ساتھ

قیمت : چھ روپے

آواز کا جسم

مخمور سعیدی کا تیسرا مجموعۂ کلام

جس سے جدید شاعری

کے وزن و وقار میں اضافہ ہوا ہے۔

خوب صورت گرد پوش

قیمت : دس روپے

انتظار کی رات

کمار پاشی کی چوتھی شعری پیشکش

جو

اردو شاعری کی نئی جہتوں کی نشان دہی

کرتی ہے۔

قیمت : چھ روپے

ولاس یاترا

کمار پاشی کی طویل نظم

جو

ایک منفرد انداز و آہنگ

کی حامل ہے۔

قیمت : دس روپے

نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

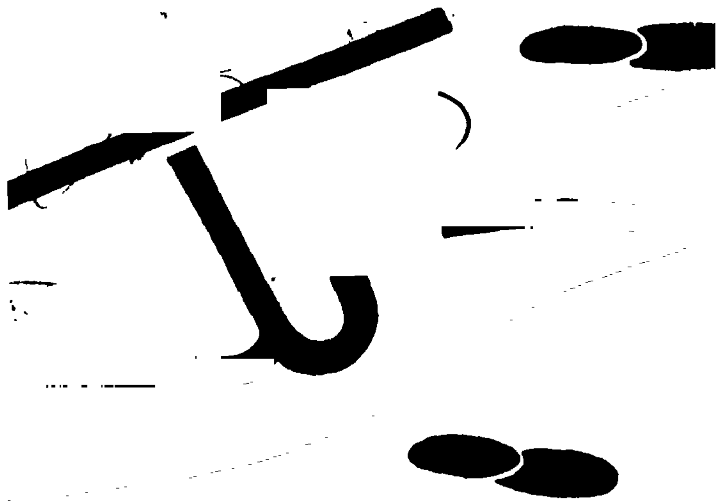
تم نے دیکھا تھا اس کے چہرے کو
تھے کہیں کرب کے کوئی آثار
تم اسے موت کہہ رہے تھے مگر
خوابِ راحت میں وہ تو سوتا تھا

اور پسماندگاں کے سینے میں
جس جہنم کی آگ جلتی تھی
جز خدا کون جان سکتا ہے

سخت حیرت ہے لوگ اس پر بھی
ماتمِ مرگ کر رہے ہیں مگر
ماتمِ زندگی نہیں کرتے



رام سنگھ



پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ
ماہنامہ
تحریک دہلی

شمارہ : ۴   جلد : ۲۳

جولائی ۱۹۷۵ء

ادارۂ تحریر :

گوپال مِتّل
مخمور سعیدی
پریم گوپال مِتّل

سالانہ قیمت : دس روپے فی کاپی : ایک روپیہ
غیر ممالک سے
سالانہ : تیس شلنگ ، فی کاپی : تین شلنگ
خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ
۹ - انصاری مارکیٹ ، دریا گنج ، دہلی ۶

قیمت : ۱/- روپیہ

پرنٹر ، پبلشر اور پروپرائٹر ... ... گوپال مِتّل
مطبع :- ... سود یتیو پریس ، دہلی
مقام اشاعت :- ۹ - انصاری مارکیٹ ،
دریا گنج ، دہلی ۶

شذرات و مضامین :

افسانے :

منظومات :

رام سنگھ

۵ جون کو میرے عزیز ترین دوست اور کرم فرما جناب رام سنگھ ایڈیٹر "نشاط" وفات پا گئے۔ اس روز وہ صبح ۵ بجے جاگے اور حوائج ضروری سے فارغ ہونے کے بعد اپنی اہلیہ ساوتری دیوی سے کہا کہ وہ کمرے کا کولر بند کر دیں۔ اس کے دو گھنٹے کے بعد جب ساوتری دیوی انھیں صبح کی چائے دینے گئیں تو وہ اس دنیا میں نہیں تھے۔

دلی کے صحافیوں میں وہ مقبول ترین شخصیت تھے اپنے اور بیگانے دونوں میں ہر دل عزیز۔ ان کے بارے میں میرے جملہ تاثرات کا اظہار صرف اس ایک مصرعہ میں ہو سکتا ہے:

گئے تم ایک مگر یوں کہ کر گئے تنہا

گوپال متل

مختصر نظمیں

کرشن موہن

امورت کلا

اظہار اتنا بے باک ہوا
اور اک اذیت ناک ہوا
ترسیل اک سپنا چھل بنی
ابلاغ کا دامن چاک ہوا
آہنگِ حسن بلا بن کر
اک نامحسوس خلا بن کر
اب ذہن و دل پر چھایا ہے
رنگ ایک امورت کلا بن کر
دھندلاہٹ میں لہرایا ہے

خلا

جیسے ہے موت امورت کلا
جیون بھی یونہی بن جائے خلا
[illegible] بنے گی یہ دھرتی
اور ویرانی آشاؤں کو ڈس جائے گی
ہر سو وحشت بس جائے گی

ساگر کے نیچے

سیدھی سادی سوچ کے اندر کتنے تیور پنہاں ہیں
ساگر کے نیچے ہیں جنگل اور پہاڑ
بھرے پُرے بھی اور اجاڑ
سلسلہ وار
اور کتنا اوبڑ کھابڑ باہر ہے کتنا ہموار

اکیلا پن

... کہ تنہائی جغرافیائی نہیں ہے
اکیلا نہ تھا دشت و صحرا میں بھی میں
مگر انجمن میں
حسین پیرہن عورتوں اور مردوں کے مابین
اکیلا رہا ہوں

باقی

خاک وخوں کی وسعتوں سے باخبر کرتی ہوئی
اک نظر امکاں ہزار امکاں سفر کرتی ہوئی
اک عجب بے چین منظر آنکھ میں ڈھلتا ہوا
اک خلش سفاک سی، سینے میں گھر کرتی ہوئی
اک کتابِ صد ہنر تشریحِ نمائل کا شکار
اک ذرا سی بات جادو کا اثر کرتی ہوئی
جسم اور اک نیم پوشیدہ مجسم آمادگی
آنکھ اور سیرِ لباسِ مختصر کرتی ہوئی
تشنگی کا زہر سینے کو سپر کرتا ہوا
اک طلب اپنے نشے کو تیز تر کرتی ہوئی
وہ نگاہ اپنے لیے بے صد حسابِ آرزو
اور مجھے بیگانۂ نفع و ضرر کرتی ہوئی

ناصر زیدی

مثالِ خواب حریمِ دل و نظر سے گیا
یہ کون تھا جو خیالوں کی رہگزر سے گیا
مرے لبوں پہ مری تشنگی صدا نہ بنی
وہ موجِ آب کی مانند لب ادھر سے گیا
جنونِ شوق کا عالم تھا، ایک ساعتِ وصل
چڑھا ہوا تھا جو نشہ وہ میرے سر سے گیا
وہ دن بھی تھے وہ مرے ساتھ ساتھ رہتا تھا
کہاں یہ دن ہیں کہ اب وہ مری خبر سے گیا
بسے ہوئے کبھی خوشبو میں نامے آتے تھے
یہ کیا کہ آج میں اک حرفِ مختصر سے گیا
نہ ہم سخن، نہ شناسا کوئی ملا ناصر
سفر کا شوق لیے خواہشِ سفر سے گیا

ممتاز راشد

ہے روشنی نہ اندھیرا عجب حصار میں ہوں
میں آئینہ ہوں مگر وقت کے غبار میں ہوں
مری حدود میں ہے میرے درد کا زہراب
میں جل رہا ہوں مگر اپنے رہگزار میں ہوں
بدلتا رہتا ہوں سمتیں ہواؤں کے رخ پر
میں برگِ سبز سہی پھر بھی کس شمار میں ہوں
جو چاہتا تو کہیں خاک وخوں میں کھو جاتا
یہ حوصلہ ہے کہ ٹوٹی ہوئی قطار میں ہوں
مجھے بھی دیکھ کبھی اے ہوائے آوارہ
بکھر چکا ہوں مگر تیرے انتظار میں ہوں
یہ زندگی ہے کہ زخموں کا سلسلہ راشد
مجھے یہ لگتا ہے میدانِ کارزار میں ہوں

ہم سب کی یاد میں[1]

کمار پاشی

سب کچھ ویسے کا ویسا ہے
ویسی ہی ٹھنڈی، میٹھی، گہری شامیں ہیں
ویسی ہی لمبی جگمگ کرتی سڑکیں ہیں
ویسا ہی اجلے اجلے ہالے ہیں، اک گھر ہے، جس میں
ہم تم بیٹھے بالکل سایوں سے لگتے ہیں
ویسی ہی بوتل ہے، ویسے جام ہیں، ویسا ہی نشہ
ویسا ہی جانا پہچانا اور گہرا ہے
ویسے ہی دھندلے دھندلے سارے منظر
ویسے ہی آباد سے، ویسے ہی بنجر ہیں

ویسے ہی قصے ہیں، جو ہم
اکثر سنتے اور کہتے ہیں
ویسے ہی دکھ سکھ ہیں اپنے
جو گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں
ویسی ہی باتیں ہیں، جن سے
عورتوں کے کھلے جسموں کی بو آتی ہے
ویسی ہی ہے گھر گھر بکھری ہوئی خوشی
ہم تک کبھو کبھو آتی ہے
ویسے کا ویسا ہے سب کچھ
سب کچھ ویسے کا ویسا ہے
نہیں ہے کچھ تو
وہ اک بدقسمت سایہ ہے
جو اس ہجلے جلے سے ہنسنے سے نکل
تاریکی کی گھور گپھا میں ڈوب گیا ہے

مخمور سعیدی

جسے دیکھا گیا: پھرتے ہوئے سڑکوں پہ آوارہ
جسے پایا گیا: بدنام گلیوں کے تجسس میں
فلک رنگین شاموں کی جسے بے چین رکھتی تھی
اٹھاتا تھا جو ان راتوں سے جو لطفِ ہم آغوشی
شرابی نام جس کا پڑ گیا تھا شب کے آدوں پر
جو دیوانہ میانِ کوچہ و بازار رسوا تھا
مہذب لوگ گھبرانے لگے تھے جس کی صورت سے
جسے، اس کے کفن لی تھا اپنے احباب بھی آخر
غلاظت منہ پہ ملنے کو اکیلا چھوڑ جاتے تھے
وہ بزدل جس نے اپنے آخری انجام سے ڈر کر
خود اپنی ذات کی اندھی گپھا میں خودکشی کر لی

تم اتنی دور سے چل کر اسے دفنانے آئے ہو
وہ مجھ سے ملتا جلتا شخص یارو دوسرا ہوگا
کوئی مکار تھا، نظروں کو دھوکا دے گیا ہوگا
کہ میں تو اپنے گھر آنگن میں خوش بیٹھا ہوں زندہ ہوں

گوپال متل

وہ شخص کوئے ملامت میں دھوم تھی جس کی
وہ جس کے دم سے تھی رونق شراب خانے کی
جو زہر عشرت و نیشِ الم سے واقف تھا
جسے غرور تھا خود اپنی سخت جانی پر
وہ شخص آج یکایک ہی مر گیا یارو
سنا ہے زہر شرافت کا پی لیا اس نے

[1] خود اڑا اپنی موت کی خبریں
اور پھر شہر میں تماشا دیکھ
—— امیر قزلباش

خلا

کشور سینہ

آسمان کی بیکراں نیلاہٹوں میں پھیلی شہری چاندنی کو اپنے اوپر سرکتا ہوتے
وہ ٹھٹکا ——— ایک لمحہ تیس سال لمبا بھی ہو سکتا ہے ——— وہ ماضی
پر بچھے اپنے قدموں کے نقوش کا مطالعہ کرنے لگا ——— سب ایک ہی
شکل کے ہیں ——— وقت نے ان کی ساخت اور لمبائی چوڑائی میں
فرق پیدا نہیں کیا۔ کہیں دل و دماغ کا بھی یہی حال تو نہیں ——— وہ
کا جائزہ لیتے ہوئے دادی ماں کی گود میں جا بیٹھا۔
ہوش سنبھالتے ہی وہ دادی ماں سے چرخہ کاتتی بڑھیا کی کہانی
کے لیے ضد کرنے لگا تھا۔ کہانی کی دلچسپی کے انتہا کو پہنچنے سے عین
ہڑبڑا کر اُس کے ہونٹوں پہ اپنا ننھا سا ہاتھ رکھ دیتا ——— بوڑھے
پھیلا جھریوں کا جال اور بھی گھنا ہو جاتا اور بجھی ہوئی آنکھوں میں
بیلنے لگتی ——— مجھے روکتا کیوں ہے ———
بڑا ہوا تو دوستوں کو چاندنی رات میں قصبے سے باہر کھلے میدان میں
لمبی لمبی کتھائیں سنانے لگا۔ سب لڑکے کتھاؤں کے خواب آلود حل
ہونے کو ہوتے کہ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ——— بس آگے نہیں۔
انسانے پر وہ انہیں کچھ ہی دیر بعد وہاں آ کر ماگ رنگ کی محفل جانے
بت پریتوں کا ذکر کر کے ڈرا دیتا۔
ایک بار اُس کے جی میں آئی وہ پہلی کرنوں کو ندی کی لہروں پر مچلتے
دیکھے۔ قصبے کے نزدیک کوئی ندی نہیں بہتی تھی۔ اُسے مندر والے
تالاب کا خیال آیا۔ اُسی رات اُس نے اپنے جگری دوست روشنی کو ساتھ
چلنے کو کہا۔ وہ سہم گیا ——— پاگل تو نہیں ہو گئے۔ مندر کے راستے
میں آموں کے باغ کا بھی سوچا ہے۔ اُس میں رہنے والی ڈائن
رات کو گزرنے والوں کا خون پی جاتی ہے۔ مندر کے پجاری کی انگارہ
آنکھیں دیکھی ہیں۔ کہتا ہے ابھی دھونی میں جھونک کر کھا جائے گا۔
میں وہاں نہیں جاؤں گا ——— روشنی کے چہرے پر حقارت
طنزیہ مسکراتا ہوا وہ اکیلا ہی تالاب کی جانب چل دیا۔ اس بچارے

نے رکنے کے لیے کہا تو وہ بھاگنے لگا۔ روشنی کے ساتھ اس کے باپ نے
تالاب پر پہنچ کر دیکھا بیٹا کنارے پر بیٹھا پانی کی سطح پر چاندنی کے رقص کے
حسین منظر سے محظوظ ہو رہا ہے۔ اُس نے اسے کالر سے پکڑ کر اٹھایا تو اُس
کی جان میں جان آگئی۔ باپ کو اس کو اس طرح مطمئن ہوتے دیکھ کر حیران
رہ گیا۔ دوسرے دن اُس نے اس کے استادوں سے اس کی شکایت کی۔ وہ
بتلانے لگے ——— ہمیں خود پتہ نہیں چلتا اس قدر ذہین طالب علم کو
اپنا سبق پوری طرح یاد نہ کر کے سزا بھگتنے میں کیا لطف آتا ہے۔

کالج میں داخل ہونے کے کچھ عرصہ بعد اُسے پہلی بار قدرت کے حسن
میں ایک کمی کھٹکنے لگی وہ مسکرایا ——— یہی میرے بالغ ہونے کی نشانی
ہے۔ اُس دن سے وہ اپنے وجود سے اُٹھتی انوکھی خوشبو سے مست
رہنے لگا۔ نیشا کے عارضوں پر کھلے گلاب، اُس کے سینے میں مچلتے جذبات
کی آنچ اُس کی سیاہ آنکھوں میں ٹمٹماتے جگنو اسے بدن کی نئی چاہ سے
واقف کرانے لگے۔ وہ محبت کی مہکتی راہ پر بہکتے ہوئے کیف آگیں گیت
گنگنانے لگا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں پہلگام میں دریا کی تیز گام لہروں کو دیکھتے
ہوئے اُس نے نیشا کے بے خود ہوتے وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔
دوسرے دن دونوں اپنے ساتھ آئے ہوئے دوسرے طالب علموں کو
بتائے بغیر شیش ناگ جھیل پر جا پہنچے۔ برف سے ڈھکی پہاڑیوں سے
گھری گہری نیلی جھیل سے بوس و کنار کرتے چاند کو دیکھ کر وہ ایک دوسرے
میں سما جانے کے لیے بے قرار ہو اُٹھے۔ ان کی بہکی بہکی تمنائیں بندشوں
کو توڑنے لگیں مگر آخری قدم اٹھانے سے پہلے وہ ٹھٹکا۔ اور ایک ہی
جھٹکے میں خود کو نیشا سے الگ کر کے اُٹھ کھڑا ہو گیا۔ بیچاری لڑکی اوورکوٹ
پر لپٹی ندامت کے سمندر میں غرق ہو گئی۔
کالج میں واپس آ کر نیشا اُس سے کٹی کٹی رہنے لگی۔ اُسے کوئی ملال نہ
ہوا۔ بلکہ اُس نے سوچا ——— بلا ٹل گئی ہے ——— اس نے یہی محسوس

کیا کہ قدرت اور نسوانی حسن میں اُس کی دلچسپی بڑی تیزی سے کم ہونے لگی ہے اس کے دل و دماغ میں ایک سناٹا گونجنے لگا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کھوکھلا پن آبسا ہے۔ وہ چھت پر سونے کی بجائے کمرے میں لیٹا رہنے لگا مگر ایک رات محرومیت کے طلسم کو اپنے اوپر چھاتے دیکھ کر وہ سہم گیا۔

اس کا ڈر اس وقت دُور ہوا جب اس نے دیکھا وہ کالج میں آتے ہوئے نئے پروفیسر کی جانب کھینچ رہا ہے۔ اُس ادھیڑ عمر آدمی کا ڈھیلا ڈھالا لباس اور اُس کی لڑکھڑاتی چال اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے لگی۔ اس کی ہلکی داڑھی میں بسی سنجیدگی اور اُس کی زرد آنکھوں میں جھلکتی سچائی اُسے نئے احساس سے روشناس کرانے لگی۔ تبھی اس نے دیکھا پروفیسر بھی پڑھاتے وقت اس میں دلچسپی کا اظہار کرنے لگا ہے۔ ایک دن پیریڈ ختم ہونے کے بعد اُس نے بازو سے پکڑ کر اُسے اپنی جانب کھینچا تو وہ دم بخود رہ گیا۔ پروفیسر اُسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہاں سگار سلگا کر اُسے جانچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا ——— تمھاری اور نشا کی کہانی سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ تم نے اچھا کیا جو آکاش میں تیرتے اور انسانی جسم میں سرسراتے زہریلے رومانس سے چھٹکارا پالیا ہے۔ زمین پر بستے ہوئے اس پر زندگی کرنے والوں پر جو بیت رہی ہے اس پر توجہ کرنا ہی ہمارا فرض ہے۔ سماج تبدیلی چاہتا ہے۔ ایک نیا راستہ مانگتا ہے ——— پروفیسر خاموش ہو کر لمبے لمبے کش کھینچنے لگا اور وہ سر جھکائے بیٹھا اس کے فقروں میں چھپے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

کئی مہینوں تک پروفیسر کی باتیں سننے اور اس کی دی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ساتھ ساتھ وہ جگہ جگہ پھیلے دکھ درد، ہمدردی بے بسی کے روح فرسا مناظر دیکھتا رہا۔ اُس نے دیکھا کروڑوں انسان نما جانوروں کو دن کا اجالا نصیب ہے نہ رات کا اندھیرا راس آتا ہے۔ انھیں جہالت کے گڑھے میں پڑے زندگی کے دن پورے کرتے دیکھ کر اُس کا دماغ اُبلنے لگا۔ تب ایک دن پروفیسر کے سامنے جا کر وہ چیخ اٹھا۔ ——— مجھے کیا کرنا ہوگا ——— پروفیسر سنجیدہ ہنسی ہنستے ہوئے اٹھا اور الماری میں سے پستول اور گولیوں سے بھری چمڑے کی پیٹی اٹھا لایا۔ اسے چھونے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جان لینے کا حق اسی کو ہے جو جان دینا جانتا ہو۔ قربانی ہی مکتی کا واحد ذریعہ ہے ——— پروفیسر کی بات سن کر وہ لپکا اور اس کے ہاتھ سے پستول چھین کر اس کی جانب خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا۔

برسوں تک انڈر گراؤنڈ رہ کر اپنی لڑائی جاری رکھ کر ایک دن اسے محسوس ہوا اُس کی دہشت شہادت کے رومانس سے بغلگیر ہو رہی ہے۔ ابھی دم اُسے ایک جانی پہچانی بے بسی جکڑنے لگی۔ پستول پر ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ سب کچھ کھوکھلا دکھائی دینے لگا۔ پتہ نہیں کیوں اُسے اپنے ساتھیوں میں ایمانداری کی کمی کھٹکنے لگی۔ وقت پڑنے پر ہر کوئی اپنی چمڑی بچاتا نظر آنے لگا۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر انصاف پر مبنی سماج کی بنیاد رکھنے کا حلف لینے والے اسے مخبری کرتے دکھائی دینے لگے۔ غداروں کا ساتھی ہونے کی ندامت اسے توڑنے لگی۔ جگہ جگہ بھاگتے ہوئے جان بچانے کی کوشش اسے کچوکنے لگی۔ وہ اپنا ذہنی توازن کھونے لگا۔ خود کو بیک وقت غلط اور درست ثابت کرنے لگا۔ اُس کا اپنا آپ اُسے لہولہان کرنے لگا۔ زندگی کے دھندلائے افق پر ماضی کو ابھرتا مٹتا دیکھ کر وہ بدحواس ہونے لگا۔ کبھی چاند، کبھی محبت، کبھی جذبۂ شہادت اُسے دیوانگی کے عالم میں دھکیلنے لگے۔ اپنے آپ کو انگاروں پر لوٹتا پا کر وہ آخری فیصلہ کرنے کی ہمت بٹورنے لگا۔

آج سرد پورنیما کی رات کو قصبے میں آکر وہ چوروں کی طرح اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ ادھر اُدھر دیکھتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر وہ سب سے اوپر کی منزل کی چھت پر جا پہنچا۔ وہاں پھیلی چاندنی کو گرد و پیش پر مسلط ہوتے دیکھ کر وہ اپنی عمر کا حساب لگانے لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے دیگر باتوں کے ساتھ سیڑھیوں میں سے تھوڑی دیر ابھرنے والی بھاری بوٹوں کی آواز کو یکسر بھول کر وہ لطافتوں کی دنیا میں کھونے لگا تو محدود نیلاہٹوں میں سے جھانکتی ایک بے وجود تصویر کو اپنی جانب آنکھ جھپکائے بغیر دیکھتا پا کر اس کی روح میں بسا کرب اس کی آنکھوں کو گیلا کرنے لگا۔

جلتے جسموں کی کہانی

شفق

بیمار بوڑھا پیاس سے دم توڑ رہا تھا۔

اور راجستھان کے صحرائی گاؤں کی ایک لڑکی سوزنی جب بارہ کوس چل کر ایک کنویں پر پہنچی تو دور اندھیرے سے ایک اونٹنی سوار نمودار ہوا، اُس نے پانی بھرتے ہوئے پوچھا۔ دور سے آرہے ہو؟ پانی پیو گے؟ تو اونٹنی سوار مسکرایا۔ اونٹنی سے اُترا پھر صدیوں سے تپتا ریگستان ازل سے پیاسا وہ اور ٹھنڈے پانی کا آبشار سوزنی، وہ زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ پھر سائرن بجی، پھر گولی چلی، پھر ہال میں روشنی ہوگئی۔

مگر جب اونٹنی سوار ٹھنڈے پانی کے آبشار میں زبردستی بھیگ رہا تھا اُسی وقت مجھے اپنے داہنے پیر کے انگوٹھے میں تیز نشتر کا احساس ہوا۔ ایک ناگ میرے انگوٹھے کو ڈس گیا تھا۔

مجھے اپنی رگوں میں سیکڑوں ہزاروں چھوٹے چھوٹے ناگ دوڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ شاید زہر چڑھ رہا تھا۔

میرے سامنے کی سیٹ پر وہ عورت، جب وہ ہال سے باہر جارہی تھی تو کرب کے عالم میں میری نظریں ناف سے نیچے بندھی ساڑی سے اوپر اور کبوتروں سے نیچے کی گھاٹی میں ناگ کی منزل ڈھونڈ رہی تھی۔

جب رگوں میں ناگ اوپر کی طرف بھاگ رہے تھے میرا کانپتا ہوا ہاتھ اوپر اور نیچے کے درمیان، اس کی سیٹ کی طرف۔

وہ چونکی تھی، پلٹ کر میری طرف دیکھا تھا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ میں دار بچانے کی پوزیشن لے رہا تھا تبھی اندھیرا ہوگیا۔

اور پھر وہی ریگستان، دو بوند پانی کی پیاس، لمحے لمحے ٹوٹتی وہ۔ اور جلتی ہوئی چتا۔

اور میرے اندر جلتی ہوئی آگ، چڑھتا ہوا زہر، بڑھتا ہوا ہاتھ۔ چیخ پڑی وہ، اور ہم دونوں کے درمیان ایک خاموش اور انجان زبان میں تبادلہ، دھندلے میں جو اُبھا، وہ جلتے تپتے ریگزار کی کہانی،

دوڑتے بھاگتے کردار، مشینوں کا شور، کرین کی گھڑگھڑاہٹ، چیختا ہوا سنسناتا ہارن، اُڑتی ہوئی چٹانیں، تڑپتا ہوا کردار زندہ ہوتے ہوئے ہزاروں لاکھوں برس کے مُردہ لوگ، بہتا ہوا پانی، میرا بڑھتا ہوا ہاتھ، اُس کی کمر کا لمس، پلٹتی ہوئی وہ، پھر تالیوں کا شور... اور پھر روشنی...

میں نے اُسے۔ اُس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ میرا ہاتھ اپنی کمر سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زہر میری نس نس میں گھل رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں مجھے گالیاں دے رہی تھیں۔ مگر لب پیاسے تھے۔

وہ میرے آگے چلتی ہوئی ہال سے باہر نکلی اور جب میرے دائیں بائیں کی ہدایت پر عمل کرنے لگی تو میری ہمت بڑھی ہم دونوں سڑک پر پہنچ کر رُک گئے۔ میں نے ٹیکسی رکوائی، وہ اجنبی سی دوسری طرف دیکھتی رہی۔

چلو بیٹھیں، میں نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔

کیوں؟ وہ بگڑ گئی، اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ میں نے ہمت نہ ہاری، تم وہ دن بھول گئیں جب...

جھوٹ ہے، میں تمھیں نہیں جانتی۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے یہاں بہت سے انجانے بھی ہم سفر بنتے ہیں، ہماری پہچان تو صرف یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔

ضرورت ——— اُس کی آنکھیں عجیب سی ہوگئیں، مگر میں تمھارے ساتھ کیوں چلوں۔؟

اس لیے کہ میں تمھارے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔

ٹیکسی جا چکی تھی۔ میں اُس سے کہتا رہا۔ وہ انکار کرتی رہی۔ ٹیکسیاں آتی رہیں ٹیکسیاں رُک رُک کر جاتی رہیں۔

آؤ بیٹھو بھی، میں نے گھسیٹ کر اندر بٹھالیا۔

بوڑ ستنا سرواہ ڈرائیور نے مونچھوں کو اینٹھتے ہوئے مسکرا کر

[illegible] دیا۔

ایڈن گارڈن۔

اس نے احتجاج کرنا چاہا۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

[illegible] ...

اس کی آنکھیں پھر گڑیاں دینے لگیں۔ اتنی دیر میں ایک بار بھی میں نے اسے کھل [illegible] نہیں دیکھا تھا۔ ہونٹ مسکراتے تو آنکھیں گالیاں [illegible] نرم قینچیاں [illegible] کسب کرتیں تو ہونٹ سے زہر بہتا۔

ایڈن گارڈن [illegible] ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی۔

[illegible] نرم [illegible] اس کے گداز بدن کا لمس، درختوں کے [illegible] شام [illegible] دھیرے دھیرے بہتی ہوا [illegible] میں چڑھتا ہوا زہر، میرا ہاتھ اس کی کمر کے گرد، اس کا سر میرے شانے پر، دعوت دیتی ہوئی اس کی آنکھیں اور ہونٹ، تو پھر میں نے [illegible] شرارت کر دی تھی۔

وہ [illegible] جیسے جاگی ہو، پھر وہی کڑوی کسیلی باتیں، پھر وہی کھلتے بند ہوتے [illegible]۔

فلم کیسی تھی؟

فلم... وہ کچھ دیر سوچتی رہی، ٹھیک ہی تھی۔

پھر ہم فلم کی باتیں کرنے لگے، وہ جیسے میری بالکل اپنی تھی۔ میں تو یہی چاہتا تھا کہ وہ بکس ہو جائے تو پھر...

ناگ نے تمہیں بھی ڈسا تھا۔

نہ جانے کیسے میں یہ سوال کر بیٹھا تھا، ساتھ ہی ڈر بھی ہوا کہ یہ پل پل بدلتی ہوئی کہیں چٹانوں سے نہ ٹکرا جائیں۔

نا... گ... وہ کھو سی گئی، [illegible] طور پر اس کے پاؤں [illegible] پاس پڑے ہوئے پتھر پر ٹھوکر لگا دی وہ لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔

[illegible] قطروں سے دیکھتے ہوئے [illegible] گیا۔

[illegible] کام کرو۔ میں نے جھلا کر کہا۔ اس نے [illegible] کو [illegible] تو وہ کچھ بھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے چلا [illegible]۔

میں نے [illegible] کرنے کو دبا ہو [illegible] کیا، اپنے سینے

سے اس کی چھاتی پر دباؤ ڈالا اور اس کے ہونٹ پر ہونٹ رکھ دیئے وہ گم سم سی میری مرضی پر بہتی رہی۔

تمہارے گھر کون کون ہے؟

کوئی نہیں، کیوں؟ وہ جاگ پڑی، اپنے کو الگ کر لیا۔

یونہی ——— میں نے بات اڑا دی۔

رات نے آنچل پھیلایا، روشنی اور اندھیرے کی کشمکش میں بہتے ہوئے وہ لوگ جو آ رہے تھے وہ لوگ جو لوٹ رہے تھے، ہم لوگ جو باتیں کر رہے تھے، مگر خاموش تھے، کیونکہ میں صرف باتوں کے لیے باتیں کر رہا تھا وہ صرف جواب کے لیے باتیں کر رہی تھی میں جب بھی اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا۔ اسے کرنٹ محسوس ہوتا جھٹکا مجھے بھی لگتا۔

ہمارے اندر بھی باتیں تھیں اور باہر بھی، مگر اندر باہر دونوں باتیں بیکار تھیں، میرا بدن چڑھتے زہر سے پھنک رہا تھا اور وہ ناگ کی باتوں کو ہمیشہ ٹال جاتی تھی۔

میں نے اس سے ملنے [illegible] ہم دونوں باہر نکل کر ٹیکسی کا انتظار کرنے لگے۔ وہ کچھ الجھی الجھی سی تھی اور میں حتی الامکان اس کوشش میں تھا کہ لہریں چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائیں۔

وہ ٹیکسی میں میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔

کالی گھاٹ۔ اس نے میری الجھن دور کر دی، مگر [illegible]...

تمہیں کہاں جانا ہے؟

اگر تم جلتے تپتے ہونٹوں کو ایک گلاس پانی بھی نہ پلا سکوں گی تو میں وہاں سے لوٹ آؤں گا جہاں سے تم آگے بڑھو گی۔

تم نے مجھے کوئی آبشار سمجھا ہے؟ کتنا سادا سوال مگر کتنا گہرا۔

آبشار! ہاں سوزنکی بھی آبشار تھی تم بھی آبشار ہو، وہ بھی پیاسا تھا میں بھی پیاسا ہوں، وہاں باہر ریگزار تھا یہاں اندر ریگزار ہے اور آبشار اگر کسی پیاسے کو سیراب نہ کر سکا تو...

تم شاعر ہو؟

نہیں۔

میں نے محسوس کیا، کبوتر پھڑپھڑا کر آزاد فضا میں [illegible] کو بے چین ہیں۔ بندریاں اور پسنیاں دھوپ چاہتی ہیں۔ سانس

گر ہماری چاہت ہے، وہ مانوس و مدرکتا ہوا جو اکھی پھٹ پڑنے کو تیار، پھر میں نے محسوس کیا، شیشے کی دیوار کے پیچھے دُھند تک دیواروں کا سلسلہ ہے دھند، کہر۔ تو اکو سر سیکاب نے کتنی دیواریں توڑیں جب کہ شیشے نے شیشے کی لاج بچانے کا عہد کیا ہو۔

میری ہمت کو اور بچا تی۔ دھیرے دھیرے سمٹنے لگا تھا، میرے دوستوں کی کہانیاں، اُن کے تجربے، پردے کی طرح وائڈ اسکرین کے اس پار گزر رہے تھے۔ مجھے اس پر بھی یقین نہیں تھا کہ اس نے بے خیالی میں جو کچھ کہا وہ کہاں تک درست ہے۔

میں نے اس کی آنکھیں پڑھنا چاہیں، مگر پڑھ نہ سکا کہ اُس کی آنکھیں لمحہ لمحہ گزرنے والے الیکٹرک پول کے بلب کی چمک پھر اندھیرے کا پرتو بنی ہوئی تھیں۔ وہ اس طرح بے تعلق تھی جیسے ہم دو الگ راستوں کے مسافر ہوں۔

ٹیکسی رُکی تو میں بھی اُتر گیا۔ کرایہ ادا کرنا چاہا تو اُس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

پھر وہ بغیر کچھ کہے زینے طے کرنے لگی۔ میں بھی بونے قدم کے ساتھ اس کا ساتھ دیتا رہا۔ پھر اس نے پرس سے کنجی نکال کر تالا کھولا تو میرا ہاتھ پھر پہلے کی طرح بلند ہو گیا۔ میرے ہسبنڈ دورے پر ہیں کل آئیں گے۔

اس نے پھر دروازہ بند کیا اور میں نے کمرہ، کچن، باتھ روم سب پر غور کیا تھا تب ہی گھنٹی بجی۔ وہ دروازے پر گئی تو میں اب اُس سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ وہ کسی کو کچھ نے کی ہدایت دے کر لوٹی تو میں نے اُسے باہوں میں بھرنا چاہا، وہ کترا کر نکل گئی، بے تعلق سی۔

وہ کچھ دیر بعد لوٹی، اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا، بال کھلے ہوئے تھے۔ چہرہ بھی دُھلا ہوا تھا۔ میں نے اسے پھر فلم کی یاد دلائی۔

تم وہ سین بتاؤ جس سے میں تمہارا مفہوم سمجھ سکوں۔ وار گہرا تھا میں تلملا گیا۔

میں نے جب زینے طے کرنے شروع کیے تھے تا تب پندرہویں زینے پر ایک ناگ نے داہنے پیر کے انگوٹھے میں ڈس لیا تھا۔ اُس دن کے بعد اکثر وہ ڈس لیتا ہے اور آج بھی جب اونٹنی سوار سوڑنگی کو سیر ہے کہہ رہا تھا اُس نے ڈس لیا ہے، زہر چڑھ رہا ہے، دیکھو میں بند ہوا جا رہا ہوں، میں بولتا رہا۔ میرے ہاتھ پھیلتے سمٹتے رہے۔ وہ پھیلتی سمٹتی رہی۔

پھر پسپتوں اور بلندیوں نے دھوپ کی حدت محسوس کی، سہن گرما گئی، جو السکھن کے اندر ڈائنا مائٹ کا دل ہلکی سی جنبش پر دھڑک اٹھنے کو تیار اور پھر پھڑپھڑاتے کبوتر...

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ DON'T SPOIL IT

اس نے آخری چھلکا تب ہی الگ کیا جب بلب نے آنکھیں بند لیں، پھر میں خموش ہو گیا۔

اور وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے تمام راستوں پر اپنے شوہر کی باتیں کرتی رہی، یہاں تک کہ ڈائنا مائٹ پھٹ ہی گیا۔ دھواں، آگ، دھند اور طوفان...

گرد صاف ہوئی تو ہمارے اردگرد لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ بہتے لمحوں کی لاشیں۔ آگ اور زہر کی دین۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میرے ہسبنڈ کل ہی آجائیں گے مگر تم... تم نے مجھے... اُف میرے خدا...

بہت دیر بعد چپ ہوئی تو باتھ روم میں چلی گئی اور میں پانی گرنے کی آواز سنتا رہا۔ جب وہ لوٹی تو میں کپڑے تبدیل کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ بڑا گمبھیر تھا، آنکھیں جیسے دو جلتے چراغ، میری ہمت اُس کی طرف دیکھنے کی نہیں ہو رہی تھی۔ جب میں کپڑے تبدیل کر کے دروازے کی طرف بڑھا تب بھی وہ جیوں کی تیوں بیٹھی رہی اور میں نے بھی اُسے نہ چھیڑا کہ ناگن زخمی ہو گئی تھی۔

جب میں دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا، وہ میرے پاس آئی۔ میرا شانہ پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ کچھ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے بولی۔ میرے ہسبنڈ تو کل آئیں گے۔ تمہیں بہت جلدی ہے؟؟

عروج حسن زیدی

بند ہیں دل نہ دریچے روشنی معدوم ہے
ابھی جو اپنا حشر ہونا ہے ہمیں معلوم ہے
حسبِ منشا ہے یہاں دل شاد یا مغموم ہے
اُس بیاباں کا حاکم نہیں محکوم ہے
اب تکلف برطرف، یہ آپ کو معلوم ہے
یوں مرا خوابِ وفا تعبیر سے محروم ہے
دیکھنے کی چیز ہے یہ سحرِ اندازِ نظر
اُن کا ہر مبہم اشارہ حاملِ مفہوم ہے
بوئے گل کس شان سے پھرتی ہے اس دل کے
شہرِ خوشبو کا صبا سے رشتۂ معصوم ہے
اے ... زادۂ آلِ آرزوئے انقلاب
جس طرف نظریں اٹھاتا ہوں فضا مسموم ہے
خواب آخر خواب ہے اس خواب کا کیا اعتبار
جنتِ اندازہ گویا جنتِ موہوم ہے
عشق نے دو ٹوک کیا ہے مجھ کو تڑپانے کے بعد
سوچنا پڑتا ہے وہ ظالم ہے یا مظلوم ہے
اب لبِ احوال بس قالب میں بیچارہ دعا لی دے
فطرتاً تو آدمی اک پیکرِ معصوم ہے
جو بھری محفل میں نظروں کی ہوئی ہے گفتگو
حسن کو معلوم ہے یا عشق کو معلوم ہے
کتنی کیف آور ہے اُن کی شرکتِ غم بھی عروج
ماتمِ دل کی جگہ، جشنِ دلِ مرحوم ہے

محسن زیدی

جاکے ہم اس کو پکار آئے ہیں وہ گھر میں نہیں
اب یہاں اس سے ملاقات مقدر میں نہیں
اب یہاں سے کسی صحرا کی طرف بھاگ چلو
اب کہیں جائے اماں شہرِ ستمگر میں نہیں
کوئی ٹکرائے گا پربت سے تو شیشہ میرا
حوصلہ اتنا کسی وقت کے پتھر میں نہیں
ڈوب کر تیرتے رہنے میں عجب لطف تھا کچھ
اب کوئی موج تہِ موج سمندر میں نہیں
کسی گوشے میں کہیں ہو تو ہو تصویر مری
میں سرِ عام یہاں ہر کسی منظر میں نہیں
لوگ بیٹھے ہیں لہو گھول کے پیمانوں میں
مئے گل رنگ کسی شیشہ و ساغر میں نہیں
دیکھنا ہے تو تصوّر ہی میں دیکھو اس کو
وہ ابھی خواب کی صورت کسی پیکر میں نہیں
اپنے ذرّات جواہر سے ہیں بڑھ کر محسن
آب و تاب ان میں جو ہے وہ کسی گوہر میں نہیں

قیصر قلندر

اُجاڑ رات کے رستے میں دن کا صحرا تھا
وفا کی آنکھوں میں یادوں کا عکس گہرا تھا
بڑے دنوں سے دمکتا ہے عارضِ دل پر
وہ اشک دھیان کی پلکوں پہ آکے ٹھہرا تھا
کھلا تھا پھول کی صورت، زمانہ بیت گیا
اُداس کر گیا معصوم سادہ چہرا تھا
غموں کے شہر سے نکلا نہ قافلہ دل کا
قدم قدم پہ وہاں خواہشوں کا پہرا تھا
وہ دستِ دید میں کشکولِ آرزو لے کر
وفا کے موڑ پہ اُمّید وار ٹھہرا تھا
بساطِ درد پہ یادوں کا کھیل جاری ہے
گلاب رنگ بہاراں یہ دل کا پہرا تھا
وہ زخمی سوچ کی لے کر برات آیا ہے
سنا ہے درد کا قیصر کے سر پہ سہرا تھا

میں امریکن ہوں ——— صلاح الدین پرویز

منہ میں کیا کیا بھرا ہوا ہے
اُردو اپنی پیاری بولی
تھوکو
ورنہ مر جاؤ گے
پیدائش
معلوم نہیں
موت کہاں پر واقع ہوگی

امریکا میں شاید
صبح سویرے کیا کھاتے ہو
بندرابن۔ ناپاک بتاشے۔ تھرمامیٹر
کالا غنچہ۔ باؤلا کتا۔ انڈے مکھن
چائے کے اوپر ہنستا گاتا تیرتا پھرتا
اک پیارا سا امریکا

سب کا پارہ ہے
ایک صفر کے مجس کی ٹوپی
خوبا، پانی، سونا، چاندی، اور گیدڑ کی کھال ملا کر
بُنی گئی ہے
دو بوندیں
دو بوندیں نیچے
دو بوندیں
دو بوندیں اوپر
دو بوندیں
دو بوندیں دائیں
دو بوندیں
دو بوندیں بائیں
دائیں بائیں کے نیچے اوپر تالی
تالی پیپر ویٹ کی بچی
تم تو کالے ہو کر بھی کیوں اتنے اچھے لگتے ہو

اپنے بنگلہ دیش کی جے ہو
جے ہو جے ہو
ماتا پتا بیاری سے بہرے تو نہیں ہیں
چورا ہے سب دیکھ گئے ہیں
ہاسپٹل میں پڑے ہوئے ہیں
بھائی، آنکھیں سولہ سترہ سال پرانی
باپ، جدائی: کائی کلر بلائنڈ ہوتی
امی، لال چنبیلی اپنے باغ میں کھلتی کیسے
بیوی، پانی بھاشا کے کر بالکل مچھر دانی لگتی
اک دو تین
ذرا سی طاقت
اک دو تین
بہت سی طاقت
اک دو تین

ذرا یہ سوچو
بھارت لڑکی ہے یا لڑکا
اور میں کب سے امریکا میں رہتا ہوں
رنگ محل میں کیسے آئے
دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے
ٹانگوں کی طاقت سے اپنی آنکھیں کھینچو
آنکھیں دائیں نہ بائیں گھومیں
سیدھی سیدھی لمبی لمبی نیچے تک آ جائیں
نیچے سے پھر اوپر جائیں
دونوں ہاتھوں پر جم جائیں
کھیل کھیل میں ہاتھ تمہارے بہتی پر گر جائیں
کھیل کھیل میں ...

سلسلہ: شعوری کوشش

مولانا عرشی کا منتخب کلام

نجم الدین نقوی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی ایک محقق کی حیثیت سے ملک اور بیرونِ ملک کے علمی ادبی حلقوں میں عزّت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں لیکن یہ بات شاید کم لوگ جانتے ہوں گے کہ موصوف ایک خوشگو شاعر بھی ہیں اور اوقاتِ فرصت میں اکثر فکرِ سخن کرتے رہے ہیں۔ ذیل میں اہلِ ذوق حضرات کی ضیافتِ طبع کے لیے کسی تبصرے کے بغیر ان کے کلام کا ایک مختصر سا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے :

قیس کے قصے میں کیا رکھا ہے، بس　　دشت ہے کانٹے ہیں اور محمل ہے میاں
دین و دل جو ہار بیٹھا عشق میں　　سچ اگر پوچھو تو اہلِ دل ہے میاں
کوہ کن کو بھی کہا کرتے ہیں لوگ　　زمرۂ عشاق میں شامل ہے میاں
ہم سے بھی عرشی نہ بچنا چاہیے　　سب سے جو ملتا ہے وہ کامل ہے میاں

محبت کے آگے خطر کچھ نہیں　　ہمالہ کو طوفاں کا ڈر کچھ نہیں
نہیں ہے اگر اکسیر زہر اب دے　　میسر تجھے چارہ گر کچھ نہیں
بنا ہے سعادت کوئی اور ہے　　ہما کے فقط بال و پر کچھ نہیں

حکایتِ ستم دوستاں ہے کیا کہیے　　بڑی ہی تلخ مری داستاں ہے کیا کہیے
یہ طے کیا تھا سنائیں گے حالِ دل اس کو　　مگر وہ آج بہت مہرباں ہے کیا کہیے
اگر جلن ہو کسی ایک جا تو سہ لیجے　　رگوں میں آگ کا دریا رواں ہے کیا کہیے
کچھ انحصار نہیں دیر پر حرم میں بھی　　وہی کشاکشِ سود و زیاں ہے کیا کہیے
چبھی ہے کانٹوں کی پہلو میں گر تو چبھنے دو　　یہ خار زار مرا آشیاں ہے کیا کہیے
کشاکشِ غمِ ہستی سے چھوٹنا معلوم　　انھیں پسند مرا امتحاں ہے کیا کہیے
نئی نظر میں نیا اک سماں ہے کیا کیجے　　نفس نفس میں نئی داستاں ہے کیا کہیے

ہم نشیں چھوڑ کہ کرنا ہے بہت کام ابھی　　نا موافق تو ہے مرے گردشِ ایام ابھی

آ ہم مل کے دلِ خستہ کی ڈھارس باندھیں
کچھ دنوں اور تڑپنا ہے تہہِ دام ابھی

دل میں رہنے دے کچھ نازِ محبت کی سماں
ہم کو بے کیف نہ کر تلخیِ انجام ابھی

ہم نہیں شدتِ آلام سے ڈرنے والے
مل رہی ہے مئے دوشینہ ہمیں وام ابھی

ہم سفر تجھ کو ضرورت ہے تو کر لے آرام
ہے مری منزلِ مقصود کئی گام ابھی

پتہ پتہ ہے حقیقت کا سمٹ دی لیکن
حیف اے عقل تری قیدیِ اوہام ابھی

خود شناسی کو پسِ پشت جو ڈالا عرشی
تو اٹھائے گا ستم ہائے دو و دام ابھی

ادا کا نام حسن ہے خود آگہی شباب ہے
حجاب اور کچھ نہیں، حیا فقط حجاب ہے

تری جبیں آنکھ میں بھرا ہے یک جہاں جمال
تمام بحرِ حسن کو محیط اک حباب ہے

نظر کے ساتھ ساتھ ہے تمام نظمِ کائنات
تری نگاہِ ناز میں یہ جذب ہے یہ تاب ہے

یہ خواب ہے کہ صبح دین و دل خراب کر دیے
غضب ہوائیں کا جاگنا جس آنکھ کا یہ خواب ہے

فسانہ ہائے قیس تو وہی ہے سب سے پیش پیش
مری کتاب عشق کا جو مختصر سا باب ہے

خزاں میں بھی لطفِ بہاراں ہے یارو
گلستاں پھر آخر گلستاں ہے یارو

یہ دس پانچ تنکے جو تم دیکھتے ہو
ہمارا یہی عشرتستاں ہے یارو

نہیں بانسری کے سیتے دور جانا
وہ حدِ نظر تک نیستاں ہے یارو

یہ سنسان جنگل یہ پرشور دریا
مسافر کے قدموں کو آساں ہے یارو

چمن میں کھلیں گے بہت لالہ و گل
اگر آمدِ باد و باراں ہے یارو

کبھی وہ کہتے بھی ہیں ہم سے مدعا کہیے
تو پہروں سوچتے ہیں ہم کہ ان سے کیا کہیے

نسیمِ صبح کی سرمستیاں بجا، لیکن
جو ساری رات نہ سوتا ہو اس سے کیا کہیے

تمھیں تلافیِ مافات گر نہیں منظور
تو کس امید پہ پھر اپنا ماجرا کہیے

سفینہ غرقۂ سیلاب کر چکے ہیں ہم
اب آپ قصۂ الطافِ ناخدا کہیے

حجاب اور نہیں کچھ بجز حیا عرشی
حکایتِ ستم انگیزیِ حیا کہیے

یہ ہم جو شوق سے ہر بیش و کم کو دیکھتے ہیں
ستم نمائیِ چشمِ کرم کو دیکھتے ہیں

ہمیں جتا تو دیا ہستی کا شعور تمام
کبھی تو ایک سا ہر بیش و کم کو دیکھتے ہیں

یہ دیکھتے ہیں کہ خونِ جگر تو کم نہ ہوا
یہ بار بار جو ہم چشمِ نم کو دیکھتے ہیں

نہیں ہے جامِ سفالیں کم از پیالۂ زر
ہم اس لیے شوکتِ فغفور و جم کو دیکھتے ہیں

زمانہ لطفِ بہاراں میں محو ہے عرشی
یہاں خزاں کے شکوہ و ستم کو دیکھتے ہیں

فسانۂ رسن و دار کی بلندی نہ اڑا ۔۔۔ کبھی جو چن لیا خود تجھ کو امتحاں کے لیے
یہ بجلیاں، یہ ہوائیں یہ بارشیں پیہم ۔۔۔ فقط ہمارے اک اجڑے سے آشیاں کے لیے
جلو میں انجم و مہتاب و مہر ہیں عرشیؔ ۔۔۔ یہ ساز و برگ و نوا مجھ سے ناتواں کے لیے

گئی یہ بات کہ ہو جلوہ گر تو کیونکر ہو ۔۔۔ بتاؤ آئے وہ گر راہ پر تو کیونکر ہو
مرے چمن کے حسیں پھول لٹ گئے کیسے ۔۔۔ اگر نہ روؤں انھیں عمر بھر تو کیونکر ہو
مری امیدوں کے دریا اتر گئے کتنے ۔۔۔ بہائے آنکھ نہ خونِ جگر تو کیونکر ہو
بہارِ گلشن و ساقی و ساغر و صہبا ۔۔۔ نہ توڑوں شیشۂ تقویٰ اگر تو کیونکر ہو
ادھر تغافلِ بیجا یہاں تکلف محض ۔۔۔ ہو میرے حال کی ان کو خبر تو کیونکر ہو
ابھی تلک جگرِ طور میں بھری ہے آگ ۔۔۔ دکھائے جلوہ جو بارِ دگر تو کیونکر ہو
فریب خوردۂ اسباب ہم نہیں عرشیؔ ۔۔۔ ہو اس جہاں میں ہماری گزر تو کیونکر ہو

اٹھو پھر اناالحق کا نعرہ لگائیں ۔۔۔ ہے مدت سے سونی پڑی دار یارو

چوٹ کھائی تھی کبھی دل پہ جو ابھری ہے اب ۔۔۔ درد جائے گا مگر ایسے نہیں جائے گا

حرم، صومعہ، دیر، مندر، کلیسا ۔۔۔ بہت کم ہمیں یہ فضا راس آئی

فضا میں گونجی ہے کچھ ایسی ہائے و ہوئے بہار ۔۔۔ کہ خشک و تر کی زباں پہ ہے جستجوئے بہار
خرد فریب ہے اس درجہ رنگ و بو کا ملاپ ۔۔۔ کہ جس کو دیکھو کھنچا جا رہا ہے سوئے بہار
یہ کون جھانک رہا ہے گلوں کے پردے سے ۔۔۔ چل اے ندیم اٹھائیں نقابِ روئے بہار
جمالِ گل کے تلاشی جلالِ خار تو دیکھ ۔۔۔ کہ اس کی نوک سے ہے حفظِ آبروئے بہار
خزاں سہی پہ مجھے باغ ہی میں رہنے دو ۔۔۔ مرا دماغ ہے اب تک خراب بوئے بہار
خزاں نے لوٹ لیا گر چمن تو غم کیا ہے ۔۔۔ بہار ہم کو عطا کر گئی ہے خوئے بہار

سفینۂ ہوش کا پھر ڈوبنے کو ہے عرشیؔ
کہ ان دنوں ہے تلاطم پہ آبِ جوئے بہار

اور آخر میں یہ شعر پڑھیے جو مولانا کے مزاج کا سچا آئینہ ہے:

تلاشِ آہوئے رم خوردہ اے خوشا لذت
جو آپ دام میں آ جائے وہ شکار ہی کیا

گوپال متل

روسی سامراجی عزائم سے چین کو تشویش

ہندوستان میں جو ترقی پسند سامراج دشمنی کے نام پر روس کی حمایت کر رہے ہیں انہیں غالباً اس بات کا علم نہیں کہ چین جو روس کے بعد اہم ترین کمیونسٹ ملک ہے ، سب سے زیادہ خطرہ روس کے سامراجی عزائم ہی سے محسوس کر رہا ہے۔ چین اس خطرے کو اس حد تک محسوس کرتا ہے کہ وہ متحدہ یورپ اور یورپ کو اقتصادی طور پر ایک اکائی بنانے کی کوششوں کی حمایت کرنے لگا ہے۔ اس کا تازہ ثبوت یورپی اقتصادی کمیونٹی کے کمشنر برائے اقتصادی امور سر کرسٹوفر سومز کا دورۂ پیکنگ اور چین کے نائب وزیر اعظم ٹینگ سیاؤ پنگ کا دورۂ پیرس ہے۔ ان دونوں دوروں کی اہمیت اس بات سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ چار برس پہلے ہی پیکنگ نے یورپی اقتصادی کمیونٹی کو سامراجی تضادات کا مرکز اور ایک امریکی مشن قرار دیا تھا۔ اب چین یوگوسلاویہ کے بعد دوسرا کمیونسٹ ملک ہے جس نے کمیونٹی کے ساتھ سرکاری سطح پر مراسم قائم کئے ہیں۔ اپنے قیام پیرس کے دوران ٹینگ نے مغربی یورپ کی وحدت کی تحریک کی تعریف ان لفظوں میں کی کہ "یہ کمیٹی کے ممبر ملکوں کی وحدت اور ان کے تحفظ کی ضمانت کا وسیلہ ہے"۔ شاید ہی کوئی ایسا مہینہ جاتا ہو گا جب مغربی یورپ کا کوئی اہم سیاستدان پیکنگ نہ جائے۔ اس سال جو سیاستدان پیکنگ گئے ان میں مغربی جرمنی کی کرسچین سوشل یونین کے چیئرمین فرانس جوزف سٹراؤس، ہالینڈ کے وزیر خارجہ میکس وانڈر اسٹول اور بلجیم کے وزیر اعظم لیو ٹنڈیمانس شامل ہیں۔ اس وقت آئرلینڈ اور پرتگال کو چھوڑ کر سبھی یورپی ریاستوں کے ساتھ چین کے ڈپلومیٹک تعلقات ہیں۔ اور خیال ہے کہ پرتگیزی علاقے میکاؤ کا مسئلہ حل ہو گیا تو پرتگال کے ساتھ بھی چین کے ڈپلومیٹک تعلقات قائم ہو جائیں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چینیوں کو یقین ہو گیا ہے کہ دو برتر طاقتوں یعنی روس اور امریکہ سے بچنے کے لیے تمام ریاستوں کا متحدہ محاذ بننا چاہیے۔ خواہ ان کے سیاسی عقائد کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ اپریل ۷۴ء میں ٹینگ سیاؤ پنگ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ترقی یافتہ دوسری دنیا جس میں مغربی یورپ بھی شامل ہے برتر طاقتوں کے مقابلے میں، ترقی پذیر تیسری دنیا کی حلیف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ برتر طاقتوں میں بھی چین کو زیادہ تشویش سوویٹ روس کے عزائم ہی سے ہے۔ مختلف یورپی طاقتوں کے ساتھ چین کے رابطے میں اہم ترین مقام چین کی اسی تشویش کو حاصل ہے اگرچہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چین ان ملکوں سے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی اور سرمایہ کی فراہمی میں بھی مدد حاصل کرنا چاہتا ہے جس کا اپنے طور پر وہ کفیل نہیں ہو سکتا۔

چینی صرف یورپی اقتصادی کمیونٹی ہی کی حمایت نہیں کر رہے بلکہ ناٹو اور مغربی اتحاد کی بھی، اگر مستقل عام تر نہیں تو عہد بعہد وہ حمایت ضرور کر رہے ہیں۔ یہ بات بھی کم اہم نہیں کہ چینی زیادہ گرمجوشی مغربی یورپ کے ان سیاسیوں کے تئیں دکھاتے ہیں جو سوویٹ روس سے زیادہ بدظن ہیں۔ اور سوشلسٹ ڈیموکریٹک لیڈروں مثلاً ہر برانڈٹ کے تئیں ان کا رویہ نسبتہً بے توجہی کا ہے۔ چینی پروہ روس کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے کا الزام لگاتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں جب فرانس نے پیکنگ کی حکومت کو تسلیم کیا تو چینیوں کا رویہ فرانس کی طرف بڑی گرمجوشی کا تھا۔ لیکن اس کے بعد جب فرانس اور سوویٹ روس میں دوستی بڑھنے لگی تو پیکنگ کا رویہ سرد پڑ گیا۔ اب پھر چین فرانس کے تئیں گرمجوشی دکھانے لگا ہے۔ جن دنوں فرانس اور روس، جسے چین اپنا بدترین دشمن سمجھتا ہے، دوستی کی زیادہ پینگیں بڑھا رہے تھے، فرانس کے

ساتھ چین کی برہمی کا یہ عالم تھا کہ اس نے صدر نکسن کو ایک معزز مہمان کی حیثیت سے مدعو کر لیا۔ لیکن ستمبر ۱۹۷۳ء میں جب فرانس کے صدر پومپیدو پیکنگ گئے تو معاملات سدھر گئے۔ اور اس کے بعد ٹینگ ہسیاؤ پینگ بھی فرانس گیا اور اس کے قیام کے دوران یہ طے ہوا کہ فرانس اور چین کے درمیان اب وزرائے خارجہ کی سطح پر باقاعدہ گفت و شنید ہوتی رہے گی۔ اور اقتصادی لین دین کو فروغ دینے کے لئے ایک مشترک کمیشن قائم کیا جائے گا۔

مغربی جرمنی اور برطانیہ کے ساتھ چین کے مراسم ماضیہ برسوں میں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھے ہیں۔ لیکن اس وقت تک برطانیہ اور مغربی جرمنی کی وجہ سے بہم کشمکش پیدا ہو گئی ہیں جن کا تعلق اپوزیشن سے تھا۔ جب ۱۹۷۲ء میں مسٹر ہیتھ کو پیکنگ جانے کی دعوت ملی تو وہ برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ لیکن جب وہ ۱۹۷۴ء میں وہاں پہنچے تو وہ وزیر اعظم نہیں اپوزیشن کنزرویٹیو پارٹی کے لیڈر تھے۔ پھر بھی ان کا استقبال اتنا ہی شاندار کیا گیا جتنا کسی ریاست کے حکمران کا کیا جاتا ہے۔ ماؤزے تنگ تک سے ان کی ملاقات کرائی گئی۔ مسٹر ہیتھ کا سواگت کرتے ہوئے ٹینگ ہسیاؤ پینگ نے ان کی اس بنا پر تعریف کی کہ وہ "مغربی یورپ کے ملکوں کی وحدت اور ان کی آزادی اور خود مختاری کو مضبوط تر بنانے کی ثابت قدمی سے حمایت کرتے رہے ہیں" اور برطانیہ کو یورپ میں شریک کرکے انھوں نے برتر طاقتوں کی بالادستی کے خلاف عوامی جدوجہد میں سرگرم حصہ لیا ہے۔ نیو چائنا نیوز ایجنسی نے اپریل ۱۹۷۴ء کو لندن میں حالات حاضرہ پر جو اپنا تبصرہ تقسیم کیا اس میں برطانیہ کو خبردار کیا کہ وہ "سوویت جاسوسی کا خاص ہدف ہے"۔ حتیٰ کہ جب مسٹر ولسن ماسکو گئے تو ایک سوویت ایجنٹ ڈپلومیٹ کا لبادہ اوڑھ کر ایسی سرگرمیوں میں مصروف رہا جو دوستانہ مراسم کے منافی تھیں۔

جرمنی کے اپوزیشن لیڈر ہیلموٹ کوہل جو کرسچین ڈیموکریٹک یونین کے صدر ہیں پیکنگ گئے۔ انھوں نے واپسی کے بعد اس بات پر حیرت ظاہر کی کہ پیکنگ مشرقی جرمنی کے اس تصور کو مکمل طور پر مسترد کرتا ہے کہ جرمنی کی دونوں ریاستیں مکمل طور پر الگ ہیں۔ اور یہ کہ پیکنگ جرمنی کی وحدت اور ایک واحد جرمن قوم کے تصور کا حامی ہے۔ پھر مسٹر اسٹراؤس نے جنھوں نے ماؤزے تنگ سے بھی ملاقات کی تھی، واپسی کے بعد کہا کہ چین کے وزیر خارجہ چیاؤ کوان ہوا یورپ کے ان سیاستدانوں کے معاملے میں انتہا کی طرح تشویش میں ہیں جو ان ملکوں پر بھروسہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ جو جنگ کی تیاریاں بھی کرتے رہتے ہیں اور امن کی باتیں بھی۔

ترقی اردو بورڈ کی تین اہم کتابیں

مجموعۂ نغز

حکیم میر قدرت اللہ قاسم کے قلم سے مشہور اور ممتاز اردو شعراء کا ایک قدیم تذکرہ

جو دستاویزی اہمیت کا حامل ہے

مرتبہ: حافظ محمود خاں شیرانی (مرحوم)

سائز ۲۰×۳۰/۸ — ضخامت ۹۰۸ صفحات — دبیز کاغذ — آفسٹ کی چھپائی — قیمت پچاس روپے

****

املا اور اس کے متعلقہ مسائل پر

ایک جامع کتاب

اردو املا

از: رشید حسن خاں

● اس کتاب میں اردو املا کے قواعد و ضوابط سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور علمی دلائل کی روشنی میں ان کا تعین کیا گیا ہے۔

● آفسٹ کی چھپائی ● مضبوط جلد

● سائز ۲۲×۱۸/۸ ● صفحات ۶۰۰

● قیمت ستائیس روپے

****

شہیدانِ آزادی

تحریک آزادی کے ان جانباز سپاہیوں کے مستند سوانحی حالات اور ان کی مصدقہ تصاویر جنھوں نے وطن عزیز پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔

کتاب اعلیٰ کاغذ پر آفسٹ سے چھپائی گئی ہے

جمع و ترتیب:

ڈاکٹر پی۔ این چوپڑہ

سائز ۲۲×۱۸/۸ — صفحات ۵۸۶ — قیمت: چوبیس روپے

نیشنل اکادمی ۲/۴۲۳ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

پورٹ

علی امام

تقریباً ۴۵ کیلوگرام، ۱۲ یا ۱۴ سال اور پانچ فٹ چھ انچ کو اپنے آپ سے لپٹائے ہوئے۔ تیز رفتار گاڑیوں سے بے نیاز سڑک کراس کر رہی ہے۔

تار تار ہوتے میلے چکٹ کپڑے اور اس سے دکھائی دیتے ہوئے خزاں آلود مرجھائی شدہ سے لت پت ٹیلے اور ٹیلے پر لت پت مکھیاں، آنکھوں میں کیچ، بالوں میں گوبر جیسی غلاظت، الجھا ہوا کیچڑ سے نکالی ہوئی کنگھیاں۔ چہرے پر پیدائش کے وقت کی سلسلاہٹ اور جمی ہوئی گندگی۔

ہاتھ میں کھچڑی اور باسی پھپھوندی لگی روٹیاں۔ کہیں لٹکتی ہوئی مچھلیاں —— چنچناتی بھنبھناتی ہوئی اور بہت کچھ ——

چلچلاتی دھوپ اور بھرتی ہواؤں کے ڈر سے بھاگتے ہوئے لوگ اُسے دیکھنا اور سونگھنا تو پسند نہیں کرتے لیکن پیو بیک نہرے جھانکتا ہوا سورج کچھ لمحے کے لیے انھیں روک ہی لیتا ہے۔ وہ آنکھوں کو میچتی ہوئی، بہت کوشش کرتی کہ اس کے تار تار ہوتے ہوئے کپڑے جسم کو ڈھک لیں۔ مگر بار بار کے جھٹکے اور چھپانے سے زخم اور بھی واضح ہوتا معلوم پڑتا۔ تب وہ جھلا کر اسے جوں کا توں چھوڑ دیتی کہ بندے محرومیوں کی قبر گاہ سے خوشیاں نوچ سکیں۔

اوپر دھواں، بادل اور خلاء سے بلا جھجک گزرتا ہوا ساتویں آسمان پر پھیل کر ایک کوانت بنا رہا ہے۔ اور نیچے غلاظتوں کو اٹھائے ہوئے چھوٹی چھوٹی نالیاں سڑک کے کنارے بہتی ہوئی بڑی بڑی نالیوں میں آ کر گرتے ہیں۔ یہ بڑی بڑی نالیاں شہر سے دور ایک [illegible] کی گود میں آ ٹھہرتی ہیں۔

غلاظتوں کی مخالف سمت پر پیچھے جاتے ہوئے لوگ لذت ہوتی ہوئی شراب کا سمندر اور مردہ جانوروں کے گوشت کا مزہ [illegible] ہے۔

مخالف سمت پر کباب، ٹی، گیرج، الیکٹرو پلیٹنگ، اور آٹو موبائلز وغیرہ ہیں۔ میرے گھر کا راستہ دونوں سمتوں کے بیچ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلتا ہے۔ سوچوں کے شغل سے چور ہوتے ہوئے جسم کو گھر واپس لوٹا رہا تھا۔ وہ مکروہات کے بندرگاہ پر دریا بہاتی ہوئی مل گئی۔ چند گز کے فاصلے پر دو آدمی کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے اور سلامی ٹھونکی۔ میں وہیں کھڑا ہو گیا کہ چانس ملنے پر تو [illegible] کر ٹیلے [illegible] کا [illegible] ہوا تھا۔

"بابا چھوکری کو [illegible] کارخانے کے پیچھے دبا ہے۔ استاد [illegible] تو جا، چھیپا کو چھپا اور دلوا کھول کر چکوا ہٹا ہے۔ جب تک ہم آتے ہیں تب تو آنا"

وہ چلا گیا اور میں رہ گیا۔ چپٹا، چوڑا اور ناٹا۔ جسم پر پسینے، ڈیزل اور گریز کی پینٹنگ، قمیص کی جیب سرک کر لٹکتی ہوئی پینٹ، جیب اور ٹخنے پر گھس کر چیدی چیدی۔ قریب پہنچ کر وہ اس کے گال پر اپنی پٹرول سے لت پت انگلیوں سے چٹکیاں لیتا ہے۔ پھر انگلیوں اور ہتھیلی کو خوب رگڑ کر اپنی جھولتی ہوئی قمیص میں پونچھتا ہے۔ منہ سے تھوک نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھتا ہے۔ اس کے گال پر اپنی تھوک آلود ہتھیلی کو رگڑتا ہے۔ چند لمحے بعد دانتوں سے اس جگہ کو چباتے ہوئے اس کے پیر میں اپنا پیر پھنسا دیتا ہے۔ وہ اکھڑتے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے زمین پر آن پڑتی ہے۔ کھیتی دور بہت دور چلا جاتا ہے۔ آنکھیں موندے نالوں کے بہتے دھاروں پر سر جائے اپنی لوٹتی بلتی سانسوں کے درمیان وہ کسی سفر کے اہتمام سے بیس کر دی گئی ہے۔ بیچ بیچ کدورت یا احتجاج کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں ہے۔

ملے پر اس کے ہاتھ پاؤں [illegible] تو کا گریز چھاتا جا رہا ہے۔ مینڈک مردہ [illegible]

کے گندے پہاڑ میں چھپاک چھپاک کودتا ہے۔
میں خود کو ہوا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ گری ہوئی کتابیں کو وہیں چھوڑ
کر انجانے گیپ کی طرف بڑھ جاتا ہوں۔

وہ گندے ڈھیر سے پر بیٹھی چیونٹیوں کی ٹکڑی اور مکھیوں کی دھتکاری
ہوئی اشیا کو چن رہی ہے۔ اس کے پیچھے ایک ٹوکری ہے جو اس کے ساتھ
ہی ساتھ کھسکتی چلی جاتی ہے۔ وہ جلے ہوئے کوئلے کو اٹھا کر اپنی ہتھیلیوں
پر رگڑتی ہے اور اس کی راکھ کو پھانک جاتی ہے۔ اور سیاہ ڈھیلے کو
ٹوکری میں جمع کر لیتی ہے۔
اب کھسک کر کاغذ کے ڈھیر پر پہنچ چکی ہے۔ اسے لکڑی سے کرید
کرید رہی ہے۔ تہہ در تہہ جمے ہوئے نادرات میں منہمک ہے۔ جب
اس کا انہماک ٹوٹتا ہے تو وہ کاغذ کے پلندے کو اپنی ٹوکری میں جمع
کرنے لگتی ہے۔ ایک دیمک لگے ورق کو اٹھا کر چومتی ہے اور دانت میں
دبا کر گھونٹ جاتی ہے۔ پھر وہی الٹ پلٹ۔ ایک کاغذ کو لپیٹ کر ادھر
ادھر دیکھے بغیر اپنے بلاؤز میں ڈھونس لیتی ہے۔ ایک گڑیا کا چین مل جاتا
ہے۔ ایک تہہ شدہ کلنڈر جس پر بڑی بڑی تصویریں بوڑھے بزرگوں کی
دکھائی پڑتی ہیں۔ اسے اٹھا کر ڈیٹ کو غور سے دیکھتی ہے۔ پھر
سے مروڑ کر ایک کنارے اپنی غلاظتوں کا اخراج کرتی ہے اور مڑے
ہوئے کاغذ سے خود کو صاف کر لیتی ہے۔ تب ٹوکری اٹھا کر سڑک پر
آتی ہے، لکڑی بے رخی ہواؤں کے پیچھے چل پڑتی ہے۔ اس کا پھیلا ہوا
پیٹ دیکھ کر میں چونک پڑا۔ آخر زہر نے زہر اگل ہی دیا۔ اب میں
شدت احساس میں میڈیکل کی طرف بھاگا۔ کوئی استعمالی بلیڈ لینے
لگا۔ جب تک وہ غائب ہو چکی تھی میں بے تحاشہ سڑک پر بھاگنے
لگا۔ مگر مخالف سمت سے آتے ہوئے اکھل بھارتیہ جلوس کے چکر میں
پھنس جاتا ہوں۔ کار بس، ٹرک، ٹمٹم، رکشا اور بیل گاڑی سے بچتے
بچاتے ہوئے نکلا تو اونٹ، ہاتھی، گھوڑے اور گدھوں کے ریلے میں
پھنس گیا۔ دیواروں سے چپکا چپکا، گھروں کی سیڑھیوں، دالانوں
سے ہوتا ہوا آگے بھاگ کر آدمیوں کے ہجوم میں گھس جاتا ہوں۔ تو مجھے آگے
بڑھنے سے روکتا ہے۔ بار بار دیوار سے دیوار آتا ہے اور [illegible]
مار کر گم کر دیتا ہے۔ (مخالف سمت سے آیا) بچنے کا حشر یہی ہوتا ہے
پھر تھوڑی میں کھسکتا، گھسٹتا آگے کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہوں۔

چوٹ کھا کھا کر جب بری طرح زخمی ہو گیا تو چیخ پڑا!
تم لینے والے ہو، میں دینے والا ہوں مجھے راستہ دو
تم لوگ لینے والے ہو میں دینے والا ہوں مجھے راستہ
مگر جلوس کے نعروں سے ٹکرا کر میری آواز شکستہ پا لوٹ
میرے ہی اندر چلی آتی مگر میں راستہ کاٹ کر جلوس سے آگے
بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔
گلیوں گلیوں —— سڑکوں سڑکوں بھاگا۔ ہر کسبا،
گرجا، ندی اور نالے کو پھاندا مگر وہ نہ ملی۔
ایک دن مجھے خبر ملی کہ میرے بھائی نے جو بھنگ اور چرس کا
عادی ہو گیا تھا نوکری یا ڈگری یا چھوکری کے چکر میں خودکشی کر لی ہے۔
قانون کے شیطانی ہاتھوں نے میرے باپ کو حراست میں لے لیا
میں گھر تعزیت کرنے جا رہا تھا کہ اچانک وہ ایک گلی سے معمولی
شکل و شباہت میں نمودار ہوئی۔ میں نے جیب ٹٹولی۔ بلیڈ
خریدی اور اسے اشارہ کیا۔ قریب آئی تو بلیڈ اور برفی اس
کی مٹھی میں ڈال دی۔ اب میں نے اطمینان کی سانس لی اور گھر
سوگ میں منہ لٹکائے شامل ہوا۔
آج جب چنگی چوراہے پر پہنچا تو پیپ اور ہاتھ کے بل کھسکتی
وہ دکھائی پڑی۔ جا بجا سے دبائے ہوئے کاغذ اور اس پر سے بہتے
ہوئے سڑے گلے چیتھڑوں سے بھی خالی [illegible]۔ پیلے بے نام موسموں کی
کی زد میں آ کر بہتے ہیں۔ آنکھیں کیچ کے اندر گم۔ ہونٹ [illegible]
رطوبت سے نم۔ کپڑے لچر ہوتے جسم سے فرار اختیار کر چکے ہیں۔
سے بہتی ہوئی پیپ، جگہ جگہ سے رستا ہوا خون اور بدن کو نوچتی
مکھیاں۔
اس کی پشت پر سنبھلا ہوا ایک وجود جس کو استقاط [illegible]
چوستے پر آسمان سے باتیں کرتی ہوئی زمین پتے کی طرف دیکھنا بھی گوارا
نہیں کر رہی ہے۔ کل یہی زمین اچاٹ، اچاٹ اور بے ہنگم رہا کر
مگر خود کو کسی نہ کسی طرح پیکر ڈھال لیتی تھی۔
بچہ ایک ہاتھ سے ماں کے کاندھے کو تھامے دوسرے ہاتھ سے
زمین پر بکھری ہوئی چیزوں کو چنتا جا رہا ہے۔ وہ کھسکتی چلی جا رہی ہے پیچھے
بلا ارادہ کچھ شدت سے اگی ہوئی انگلیاں اس کی طرف پھینکتی ہیں۔
بے نام کیفیتوں کی بے نام ادائیں پہنے ہم جولیوں کی ٹکڑیاں جو [illegible]

دبی ہوئی راکھ

گوربچن سنگھ بھلّہ
سُرجیت

اپنے گزشتہ کئی برس کے معمول کے مطابق وہ آج بھی تڑکے چار بجے اٹھا تھا اور منہ میں داتن ڈال کر گھومنے کے لیے کھیتوں کی جانب نکل گیا تھا۔ لوٹ کر "جپ جی صاحب" کا پاٹھ کرتے ہوئے اس نے غسل کیا تھا مگر آج وہ گوردوارہ جانے کے بجائے صحن میں بچھی چارپائی پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں چھت کی کڑیوں پر یوں ٹکی تھیں جیسے چھت چیر کے آسمان کی وسعت دیکھ رہا ہو۔

بیوی کا انتقال ہوئے آج تیسرا روز تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ پوجا پاٹھ اسے سکون نہیں دے سک رہے تھے۔ جب سے رام سنگھ نے "امرت" چکھا تھا۔ وہ موت کو مکتی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھنے لگا تھا۔ آڑوس پڑوس میں اگر کبھی موت ہو جاتی تو لوگ اسے "کیرتن سوہلے" کا پاٹھ کرنے کے لیے بلوا لے جاتے۔ چتا کو آگ لگائی جاتی تو وہ مرنے والوں کو مذہبی کتابوں کے حوالے دے کر صبر کی تلقین کرتا۔ موت کے نام سے وہ کبھی خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی نظر میں موت انسان کو ملانے والی ایک "آرام گاہ" تھی۔

مرنے کے دس بارہ دن قبل جب پریتم کور کی حالت بگڑنے لگی، تب بھی وہ موت کو یونہی سمجھتا تھا۔ لاکھ دوائیں کرنے کے باوجود جب اس کا آخری وقت قریب آ گیا تب بھی وہ مضطرب نہیں ہوا تھا۔ آخرکار پریتم کور کے اعصاب نے جواب دینا شروع کر دیا۔ رام سنگھ اس کے سرہانے بیٹھا پاٹھ کرتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں پانی نہیں آیا تھا۔ پھر تیزی سے پریتم کور نے ایک طویل سانس لی۔ اس کے بعد اس کے چہرہ کے آثار بگڑنے لگے۔ رام سنگھ نے سرہانے سے اٹھ کر گوردوارہ سے لائے پانی کا ایک چمچ اس کے منہ میں ڈالا تھا۔ لیکن پریتم کور اسے نگل نہ پائی تھی۔

رام سنگھ نے بڑے پُرسکون لہجہ میں اپنے قریب بیٹھے بھتیجوں سے کہا تھا "لو بھئی! تمھاری چچی جا رہی ہے۔"

خاندان کے تمام افراد رونے چلّانے لگے تھے۔ پُرسان جمع ہو گئے تھے۔ رام سنگھ مُردہ جسم کے پاس بیٹھا بڑے معمول بنو سے کہہ رہا تھا۔ "جو آیا ہے ایک دن اُسے جانا ہی پڑے گا۔"

رام سنگھ نے پریتم کور کی چتا پھنکنے کے بعد خود کیرتن سوہلے کا پاٹھ کیا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اس نے آگ دی تھی اور گھر لوٹ کر خود "پرساد" تیار کر کے شمشان سے لوٹے لوگوں میں تقسیم کیا تھا۔ پھر باہر چبوترے پر جا بیٹھا تھا اور "گوربانی" کا پاٹھ کرنے لگا تھا۔

لیکن اب وہ خالی نگاہوں سے ادھر ادھر تاکتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ دراصل بات ویسی نہیں جیسی وہ سمجھتا آ رہا ہے۔ پرسوں کی شام کو ماتم پرسی کے لیے آئے لوگوں کے درمیان گزری تھی۔ کل رات وہ بڑے مزے سے سویا تھا لیکن آج صبح سے بڑا مضطرب ہو گیا تھا۔ اسے معلوم ہو رہا تھا جیسے پریتم کور اس کے سامنے کھڑی ہے۔

اس نے "واہے گورو واہے گورو" کر کے پُرسکون ہونے کی کوشش کی تھی۔ مگر بے چینی برابر بڑھتی چلی گئی تھی۔ اسے نظر آ رہا تھا۔ پریتم کور اس کے سامنے کھڑی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی ہے اور ہوا کے جھونکوں سے راکھ ادھر اُدھر اُڑ رہی ہے۔ کبھی لگتا وہ اُڑتی جا رہی ہے۔ بلند بہت بلند۔

اس کا ذہن بھٹکا جا رہا تھا۔ چاہتا تھا ماضی کا کوئی بھی واقعہ اسے یاد نہ آئے۔ بس وہ بے جان پتھر کی طرح جا رہا تھا پرچھایا

ہے۔ لیکن گزرے دنوں کی کتاب بار بار اُس کی آنکھوں کے سامنے پھڑپھڑا رہی تھی۔

اُس نے اپنے ایامِ شباب میں ہی کھیتی باڑی کا کام کیا تھا۔ شادی کے کچھ برس قبل اور کچھ برس بعد۔ پھر اسے معاشرے سے اکتاہٹ سی ہونے لگی تھی اور وہ اپنا وقت گوردوارہ میں گزارنے لگا تھا۔ اولاد تو تھی نہیں۔ پھر کاٹھ کے بیل کی طرح کماتا کس لیے؟

وہ اور پریتم کور —— دو ہی تو افراد تھے، اپنی زمین ٹھیکہ پر دے کر پیٹ بھرنے کے لیے اناج تو انھیں مل ہی سکتا تھا۔ اپنے بھائی بھتیجوں سے وہ الگ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک ان کے تعلقات بڑے خوشگوار رہے۔ اُس کے بھتیجوں کو ابھی زمانے کی ہوا نہیں لگی تھی۔ اُن کی آنکھ نہ کبھی باپ کے سامنے اونچی ہوئی تھی اور نہ تایا کے سامنے ہی کبھی منہ کھلا تھا۔

وہ صبح اُٹھتا، غسل کرتا اور پاٹھ کرتا۔ اتنے میں پریتم کور چائے تیار کر لیتی۔ جب وہ گوردوارہ سے واپس لوٹتا۔ تو کھانے کا وقت ہو چکا ہوتا۔ دوپہر کے وقت وہ کوئی مذہبی کتاب یا مہاپُرشوں کے حالاتِ زندگی لے کر بیٹھ جاتا۔ پریتم کور شردھا کے جذبہ سے سنتی رہتی۔ دن ڈھلتے ہی وہ کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ سیر کی سیر ہو جاتی اور کھیتوں کی بھی دیکھ بھال۔ شام کو لوٹ کر وہ ہاتھ پاؤں دھو کے "رہراس صاحب" کا پاٹھ کرنے بیٹھ جاتا۔ پھر کھانا کھا کر پریتم کور سے چھوٹی موٹی باتیں کرتا اور سو جاتا۔

یہی تھی اس کی روزمرہ زندگی۔ اُس کی زندگی میں نہ کوئی بڑا غم تھا اور نہ کسی بڑے سکھ کی ہی تمنا۔ دن ہفتوں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے رہے تھے ان کی زندگی نہر کے پانی کی طرح آہستہ آہستہ سست رفتار سے بہہ رہی تھی۔

مذہبی کتابوں کے اثر کی وجہ سے وہ سوچتا کہ انسان پیدائش اور موت کے چکر میں مبتلا ہے۔ اس دنیا سے۔ اس دنیا کی چیزوں سے۔ اس دنیا کی باتوں سے اسے ایک دوری سی ہو گئی تھی۔ اُسے کسی چیز کے ساتھ ضرورت سے زیادہ محبت نہیں تھی۔ کسی کے ساتھ اس نے کبھی دشمنی محسوس نہیں کی تھی۔

گزشتہ دنوں سے اُس نے رشتہ داروں عزیزوں سے ملنا جلنا بہت کم کر دیا تھا۔ پریتم کور اور وہ —— یہی تھی اس کی دنیا۔ کبھی کسی طرح کی ضرورت ہوئی تو اس کے بھائی کے خاندان نے اسے کبھی مایوس نہیں کیا۔

پریتم کور کو اُس کی ہر عادت کا، ہر کام کے وقت کا، موقع کی ضرورت کا پورا علم تھا۔ اُسے کبھی کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے دھندسی چھا گئی۔ چھت کی کڑیاں دھندلی دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس نے انگوٹھے اور درمیانی انگلی سے دونوں آنکھیں ملیں۔ انگوٹھا اور انگلی گیلی ہو گئی۔ پلکیں جھپکاتا ہوا وہ اٹھا اور ہاتھ پیر پر پانی کے چھینٹے مار کے "گوروگرنتھ صاحب" کا پاٹھ کرنے لگا۔ دو چار صفحے پڑھ کر اس نے "گوروگرنتھ صاحب" کو رومال سے ڈھانپ دیا۔

اُس نے الماری کھولی۔ اُسے پریتم کور کی عینک نظر آئی اس نے عینک اٹھا کر اپنی قمیص سے اس کے شیشے صاف کیے اور اسی جگہ رکھ دی۔ قریب ہی تپائی پر پسی ہوئی کالی مرچوں اور دیسی کھانڈ کے چورن کی شیشی پڑی تھی۔ کھانسی اٹھنے پر پریتم کور شیشی کھول کر چورن زبان پر رکھ لیتی تھی۔ کھڑکی پر دوائیوں کی شیشیاں پڑی تھیں۔ پریتم کور ان کے ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر ہی چلی گئی تھی۔

سامنے دیوار پر پریتم کور کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ دو تین ماہ قبل دیواروں پر سفیدی کرکے پریتم کور نے ٹوٹے پھوٹے گورمکھی الفاظ میں "واہے گورو جی مہاراج" لکھا تھا۔ اس کا دل بیٹھ سا گیا۔ وہ پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دل کا بوجھ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کا ایک گوشہ تر ہو گیا۔ پھر وہ زار و قطار رونے لگا۔

کتنی ہی دیر وہ ویسا ہی بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر اس نے ہاتھ منہ دھویا اور جوتیاں پہن کر باہر نکل گیا۔ وہ پھر تیز ہوائی تھی وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ گوردوارہ میں اپنا وقت اس

(بقیہ صفحہ ۱۴۳ پر)

باشندگانِ دلّی!

دلّی میں روزگار کے مواقع بڑھ رہے ہیں

ہم نے یہ روزگار پیدا کئے ہیں۔ جی ہاں! مگر روزگار بھی کہیں پیدا ہوتے ہیں۔ جی! روزگار بھی پیدا ہوتے ہیں۔
یقیناً آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ ہم نے یہ سب کچھ کیسے کیا:

ہم نے یہ روزگار چھوٹے چھوٹے صنعتی یونٹ وکارخانے لگاکر پیدا کئے۔ لیکن یہ اعلیٰ کارکردگی اور آئندہ کی ترقی کے نشاندہی ہیں۔ یہ سب کچھ ۱۹۷۵ء یعنی تین سالوں کی مسلسل کدوکاوش کا نتیجہ ہیں۔ ذرا حساب لگائیں تو اس [illegible] روزانہ تقریباً ۲ یونٹ لگانے کا اوسط بیٹھتا ہے۔ اور اب ہمارے پاس ۱۸ ہزار ترقی یافتہ کارخانے موجود ہیں۔

پچاس ہزار روزگار

ہم نے صنعتوں کی ترقی و توسیع کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس کے بھاری مقاصد میں پانچویں پنجسالہ منصوبے میں پورے پچاس ہزار افراد کو روزگار فراہم ہوگا۔ جی ہاں! ہم نے گذشتہ [illegible] سوں میں بے روزگار انجینئروں اور تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو ۸۶۲ تیار فیکٹریاں فراہم کی ہیں جن سے ۱۵ ہزار افراد کو روزگار حاصل ہوا ہے۔

صنعتی ترقی کے نقشے میں دلّی کا ممتاز مقام

اوکھلا، جھلمل، قاسم پور، وزیرپور، لارنس روڈ اور دلّی کے دوسرے مقامات پر نئی صنعتی بستیاں قائم ہوگئی ہیں۔ بھارت میں چرمی سامان بنانے کی اپنی قسم کی پہلی کمپیوٹر [illegible] فیکٹری وزیرپور میں قائم ہورہی ہے جہاں پر چھوٹے چھوٹے کاریگروں کے لئے چرمی سامان کی سہولیات مہیا کی جائیں گی اب ہمارا دوسرا [illegible] بھارت نگر میں بانی [illegible] دلی کا [illegible] بھی منفرد نوعیت کی ہے۔ نریلا اب ایک بڑا صنعتی قصبہ بننے جارہا ہے۔ جہاں [illegible] چھوٹے صنعتی یونٹ کام کررہے ہیں۔ اب ہم یہاں اسی سال صنعتی اوزار و آلات تیار کرنے کے لئے ایک ٹول روم۔ کم۔ پروڈکشن سینٹر تعمیر کررہے ہیں جس میں ہر سال ایک کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کے اوزار و آلات تیار کرنے کی صلاحیت ہوگی۔

[illegible] ہیں؟ ہم کون ہیں؟؟ ہم ہیں آپ کا اپنا ہی انتظامیہ۔ دلّی انتظامیہ۔ اگر آپ تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ اگر ٹیکنیکل تعلیم و تربیت رکھتے ہیں اور اپنا کاروبار شروع کرنے کے خواہاں ہیں تو آئیے۔ ڈائرکٹر محکمہ صنعت اور دلّی اسمال انڈسٹریز ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے توسط سے [illegible] اسٹنس پروگرام کے تحت ہم اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ اور ہر ممکن تعاون کے لئے حاضر ہیں۔

جاری کردہ

محکمۂ اطلاعات واشاعت، دلّی انتظامیہ دہلی

ماسٹر

شاکر کھام گانوی

ہندوستان میں بچوں کی پیدائش اتنی نہیں جتنی ماسٹروں کی ہے۔ آپ جائزہ لیں تو ہر چار پانچ افراد میں تین افراد ضرور ماسٹر ہوں گے۔ گو کہ چند افراد نے ماسٹری کو خیرباد کہہ کر لیڈری، منسٹری، تجارت اور دوسرے پیشے اپنا کر دور اندیشی کا ثبوت دیا اور نئی پود کے لیے جگہ خالی کی۔ لیکن یہ وہ زرخیز زمین ہے جو بغیر کھاد کے پھل دیتی ہے پھر کس طرح اور کیونکر نئی پیداوار کو روکا جاسکتا ہے۔

مگر آپ دیکھیں تو ہر طرف ماسٹروں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آئے گا۔ دھوبی ماسٹر، ٹیلر ماسٹر، بینڈ ماسٹر، طبلہ ماسٹر، شہنائی ماسٹر، اسٹیشن ماسٹر، پوسٹ ماسٹر غرض ماسٹر ہی ماسٹر۔

تاریخ جدید میں ہندوستان کا نام سونے کی چڑیا کے بجائے ماسٹروں کا گھر ہوگا اور مورخ لکھیں گے کہ ہندوستان [illegible] ایشیا کے جنوب مشرق میں بڑا طویل و عریض ملک تھا۔ اس ملک کی خوشحالی، فارغ البالی اور دولت مندی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صدیوں تک اس ملک کو سونے کی چڑیا کے نام سے پکارا گیا اور اس سونے کی چڑیا کے لالچ میں ہزاروں چڑیمار اس ملک پر حملہ آور ہوتے رہے لیکن بدقسمتی سے بیسویں صدی میں اس ملک میں اس کثرت سے ماسٹروں کی افزائش نسل ہوئی کہ تاحد نظر ماسٹر ہی ماسٹر لہلہاتے دکھائی دیتے تھے اور آخر کار انھیں ماسٹروں نے آپسی کشمکش سے ہندوستان کو ڈبو دیا۔

ان ماسٹروں میں ایک قوم اور جنس ماسٹروں کی بھی ہے جسے اسکول ماسٹر کہتے ہیں۔ جو مدرسہ کی چار دیواری میں کرسی پر کچھ بیٹھا رہتا یا کبھی ٹیبل پر پیر پھیلائے یا ہاتھ میں چھڑی، کھریا اور ٹوٹی بک لیے ایک گروہ درس و تدریس میں مبتلا ہوتا ہے۔ مگر اس غریب کا جائزہ لیں تو وہ انسان تو خیر کیا البتہ چپٹا پھرتا ریڈیو ضرور ہوتا ہے جو پان بھی کھاتا ہے اور سر کے جھٹکے سے سلام کا جواب بھی دیتا ہے۔

ماسٹر ہی وہ ہستی ہے جس کا تعلق سماج کے ہر فرد سے ہے۔ اور سماج کے ہر فرد کا نظریہ ماسٹر کے متعلق مختلف ہے۔ اگر ماسٹر ان تمام نظریات پر مستعدی سے عمل پیرا ہو تو وہ ماسٹر سے کٹھ پتلی بن جائے۔ لیجیے ہاتھوں ہاتھ سماج کے مختلف نظریات کے مطابق اس کی ذمہ داریاں بھی دیکھ لیں۔

ماسٹر محکمے کی نظر میں: ماسٹر مختلف پربھات پھیریوں کا اہتمام کرے۔ بچوں کو زیادہ سے زیادہ ان تقریبات میں شریک کرے جو ملکی یا قومی کہلاتی ہوں۔ بالغوں کو پڑھانے کے بہانے انھیں لیڈروں اور وزیروں کے حالات سے متعارف کرائے۔ عوام سے حتی الامکان چندہ جمع کرے۔ ڈاکٹروں، پٹواریوں، پوسٹ ماسٹروں، پولیس مینوں اور پٹیلوں کے کاموں میں مدد کرتا رہے ایسا ہی ماسٹر قابل ستائش ہے۔ جو نسبندی کروانے کی تاکید کرے۔ خاندانی منصوبہ بندی میں سرگرمی دکھائے۔ کھاد کے گڑھے تیار کرے اور تیار کروائے، کھیتوں کا لگان وصول کرنے میں مدد کرے۔ بچت کھاتے کھلوائے، مردم شماری میں مدد کرے، موت و حیات نیز آمدنی اور خرچ کے تختے تیار کرے، شرمدان کے ذریعہ راستے بنوائے اس کے باوجود تنخواہ میں اضافہ نہ چاہے۔ چھ ماہ تک اگر سال بھر تک بھی تنخواہ نہ ملے تو پریشان نہ ہو اور بدمزگی ظاہر نہ کرے۔ پوری تنخواہ پر دستخط کرے اور کم تنخواہ وصول کرے۔ نوکری کے سوا وہ سلام ہرگز نہ کرے۔ رہا درس و تدریس کا معاملہ تو نہ تو اس بابت کچھ پوچھا جاتا ہے اور نہ ہی اس کا حکم دیا جاتا ہے۔

ماسٹر، افسران کی نظر میں: ماسٹر کی پوشاک سادہ اور صاف و

شفقت ہو لیکن اپنے افسروں سے اونچے درجہ کی نہ ہو۔ چہرہ سے انکساری، خوشامد اور فرماں برداری ٹپکے۔ ماسٹر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے افسروں کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر دے، ان کی ہر بات سراپا گوش ہو کر سنے اور ہاں جی ہاں جی کرے۔ افسروں کے بچوں کو پیار کرے، مٹھائیاں دے۔ ان کی دعوتوں میں بے دریغ خرچ کرے۔ جماعت میں اعلیٰ درجہ کا ڈیکوریشن کرے۔ طلباء کو ملکی اور قومی لیڈروں کے حالات، موجودہ حکمرانوں اور وزیروں کے نام عہدے کے ساتھ زبانی رٹا سکے اور خود بھی رٹتا رہے۔ نقل کرانے اور پرچہ آؤٹ کرانے میں ماہر ہو لیکن اس بات کا بھی خیال رکھے کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ فیشن کے طور پر ہر گناہ دلیری سے کرے لیکن ثبوت باقی نہ رکھے۔

ماسٹر، عوام کی نظر میں: پہلی ہی جماعت میں بچوں کو خط لکھنا پڑھنا سکھا سکے۔ چہارم کے بچوں کو مادری زبان کے علاوہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی ماہر بنا دے۔ غریب طلباء کو فیس، کتابیں، کاپیاں وغیرہ اپنی جیب سے دے۔ بچوں کے سرپرستوں کو چائے اور کھانے کی دعوتوں پر مدعو کرتا رہے۔ بغیر سزا دیے بچوں کو پڑھائے۔ بچوں سے اپنے گھر کا کوئی کام نہ لے بلکہ بچوں اور سرپرستوں کا کام خود ہی کر دے۔ بچوں کو زیادہ سے زیادہ چھٹیاں دے بلکہ بغیر مدرسہ بلائے ہی پڑھائے۔ ہر شخص کی دلچسپی کی خاطر اس کے مذاق کے مطابق بات کرے، ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملے۔ ہر شخص کا ادب کرے خواہ وہ ماسٹر کو مارنے کے لیے ہی کیوں نہ آیا ہو۔ لوگوں کی گالیاں ہنسی خوشی سن کر انھیں دعائیں دے۔ پان اور سگریٹ استعمال نہ کرے، ٹوپی پہنتا رہے، پنجگانہ ادا کرے۔ انگریزی سوٹ سے پرہیز کرے، مذہبی باتوں کی پابندی کرتا رہے۔

ماسٹر، خواص کی نظر میں: کم سے کم چھٹیاں حاصل کرے۔ طلباء کو کسی قسم کی چھٹی نہ دے۔ زیادہ سے زیادہ تعلیمی سرگرمی دکھائے۔ طلبہ کو بڑوں کا ادب و احترام اور وطن پرستی کی تعلیم دے۔ نظم و ضبط قائم رکھے لیکن [illegible] رہے۔ [illegible] روزانہ [illegible]

ایسی کوشش کرے کہ ہر تقریب میں انھیں کو صدر بننے کا چانس ملے۔ الیکشن میں زیادہ سے زیادہ سرگرمی دکھائے۔ ووٹ زیادہ حاصل کروائے۔

ماسٹر، بچوں کی نظر میں: ہفتہ میں صرف ایک بار مدرسہ لے باقی ہفتہ بھر چھٹی دے دیا کرے۔ لکھنے پڑھنے کا ہرگز نہ کہے کھیل تماشوں ہی میں دن گنوائے۔ روزانہ مٹھائی تقسیم کرے یا کم از کم میٹھی میٹھی کہانیاں ہی سنائے۔ کسی جواب کو غلط قرار نہ دے۔ سرپرستوں سے ان کی شکایت نہ کرے۔ ہوم ورک HOME WORK نہ دے، نہ تو مرغا بنائے اور نہ ہی کسی قسم کی سزا دے۔ زیادہ سے زیادہ نقل کروائے بلکہ پرچہ خود ہی حل کر دے یا پھر بغیر امتحان لیے ہی کامیاب کر دے۔

ماسٹر، بیگم کی نظر میں: ہر کام مفت کرا سکے۔ ہر چیز سستی لا سکے۔ چھٹی زیادہ لے لیکن تنخواہ زیادہ پائے۔ دنیا کا [illegible] عالم لیکن بیگم کے سامنے جاہل مطلق بنا رہے۔ بیگم کے ہر حکم کو خدا کا حکم اور ہر گفتہ کو لاجواب تسلیم کرے۔ جاہلوں کو پڑھائے لیکن بیگم سے خود پڑھے۔ کسی سے ہنس کر بات نہ کرے۔ بچوں کو پڑھاتے وقت بیگم اور بیگم کے میکے والوں کی تعریف ضرور کرے ہر مہینے ایک زیور یا [illegible] ضرور بنوا دے۔ سینما خود نہ دیکھے لیکن ہر فلم کا ٹکٹ بیگم کے لیے ضرور لائے۔ بیگم کے میکے والوں پر بے دریغ خرچ کرے۔ ساری تنخواہ لا کر بیگم کے ہاتھ میں دیدے اور اپنی ضرورت کے لیے پیسے حاصل کرتے وقت [illegible] کی باتیں کرے۔

ماسٹر، خود اپنی نظر میں: لوگ اسے عالم کہیں، عالم سمجھیں۔ کوئی شخص اس سے زیادہ عقلمند بننے کی جرأت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہر شخص اس کی عزت و تعظیم کرے۔ ہر بچہ [illegible] اس کے ہر حکم [illegible] تسلیم کرے اسے کام کم کرنا پڑے لیکن تنخواہ زیادہ ملے یعنی مہینہ بھر کی تنخواہ ہفتہ بھر میں ملے اور بچوں کے سرپرست بچوں کو گھر ہی سے سبق یاد کرا کے مدرسہ میں بھیجا کریں۔ [illegible] اور دیگر حضرات اس سے اپنے پیسوں کا تقاضہ نہ کریں بلکہ ہر چیز [illegible] مفت دے [illegible] افسران اسے اپنے ساتھ بٹھانے میں اپنی خوش نصیبی سمجھیں [illegible] سے جواب نہ مانگا جائے [illegible] کی طرف سے [illegible]

عمدہ مکان رہنے کے لیے دیا جائے، آنے جانے کے لیے موٹر اور ریل کا فرسٹ کلاس کا پاس بھی ملے۔ علاج کا خرچ محکمہ برداشت کرے۔ محکمے کی طرف سے ایک ٹرانسسٹر، ایک اسکوٹر اور کچھ ایکڑ زمین یا کم از کم ایک بھینس ہی عنایت ہو۔ ہر فلم کا ٹکٹ بھی محکمہ پیش کرتا رہے۔ وقتاً فوقتاً ضروری رعایت بھی ملتی رہے۔ ہر سال محکمے کی طرف سے اعلیٰ قسم کا سوٹ بطور یونیفارم ملتا رہے۔ ہر پانچ سال کے بعد اسے آئیڈیل ٹیچر کا خطاب ملتا رہے۔ تعلیم و تدریس کے علاوہ اس سے کوئی دوسرا کام نہ لیا جائے لیکن نوکری کے ساتھ ساتھ اسے کاشتکاری اور بیوپار کرنے کی اجازت دی جائے۔ امتحان کے نتیجے خراب ہونے پر بھی اس سے باز پرس نہ ہو۔

ماسٹر کی ذمہ داریاں آپ نے دیکھ لیں اب آپ ہی بتائیے کہ وہ بیچارہ کس کس کی خدمت کرے اور نہ تھکے تو بیچارہ کب ہی بغل جھانکے۔ حیرت ہے اس فرد پر جو ماسٹر بننے میں فخر محسوس کرے بلکہ اگر وہ ماسٹر نہیں بھی ہو تو اپنی دُم میں ماسٹر کا تخلص لگا کر ماسٹروں کے زمرے میں شریک ہونے میں اپنی خوش قسمتی سمجھے۔

بقیہ افسانہ۔ دبی ہوئی راکھ

نے کبھی نہیں گزارا تھا۔ اڑوس پڑوس کے لوگ پریشان ہونے لگے۔ بڑا بھتیجا معلوم کرنے گیا تو وہ گوردوارہ میں نہیں تھا۔ یونہی بھتیجے کے دل میں آیا کہ کہیں تا شمشان نہ چلے گئے ہوں گوردوارہ سے نکل کر پیپل والے چبوترے کو پار کر کے جب وہ شمشان بھومی پہنچا تو رام سنگھ الٹے منہ چتا پر پڑا تھا۔ اس کی دونوں مٹھیوں میں راکھ دبی ہوئی تھی۔

(پنجابی افسانہ)



مٹی

شمس فریدی (عمان)

مٹی میری دور ہے مجھ سے
اس مٹی کا دل میں میرے درد چھپا ہے
اسی مٹی کی خوشبو، آکر
اس مٹی میں ڈھونڈ رہا ہوں
مٹی ہے یہ، لیکن اس میں
باس کہاں ہے اس مٹی کی
مٹی مٹی سب مٹی ہے
فرق ہے لیکن مٹی میں بھی
مٹی ماں ہے،
مٹی میں ہے ماں کے دودھ کی میٹھی خوشبو
روپ ہے مٹی، رنگ ہے مٹی
مٹی کا احساس عجب ہے
لیکن کس کو کون بتائے
مٹی مٹی سب مٹی ہے
مٹی کو تو مٹی ہی میں مل جانا ہے

اندیشہ

ماہر منصور

یہ غم جو میری ہستی پر
کئی برسوں سے چھایا ہے
کبھی زہر ہلاہل تو کبھی تریاق بنتا ہے
کبھی راتوں کو سورج کی طرح تاریکیوں کا قتل کرتا ہے
کبھی دن میں اندھیرا بن کے چھاتا ہے
کبھی یہ چلچلاتی دھوپ میں ابر رواں
باد صبا بن کر گزرتا ہے
کبھی صحرا کی لو بن کر بہاروں کو جلاتا ہے
بہر صورت
اک ایسا باب ہے میری کتاب زیست کا
جس کو
ہزاروں بار سوچا ہے
کہ اس کو زندگی سے کاٹ کر پھینکوں
میں ایسا کر بھی سکتا ہوں
مگر ڈر ہے
[illegible] کا نسخہ ہی پھٹ جائے گی!!

منہدم ہونے سے پہلے

سلطان ساجد

پرانی حویلی سے اب بھی نکل کر
صدا جو بھٹکتی ہے جنگل میں شہروں میں اکثر
ہزاروں فسانے ہیں منسوب اس سے
مگر ایک پاگل کی باتیں ہوں جیسے
صدا ڈھونڈتی ہے حویلی سے باہر نکل کر
مکینوں کو اپنے،
یہ پیغام دینے کی خاطر
عمارت کی دیواریں جن کھنڈروں میں
گر کے زمیں بوس ہونے کو ہے اب

جناب پرشاد آلہ

کشتیاں ڈوب رہی ہیں کوئی ساحل لاؤ
اپنی آنکھیں مری آنکھوں کے مقابل لاؤ
پھول کاغذ کے ہیں اب کانچ کے گلدانوں میں
تم بھی بازار سے پتھر کے عنادل لاؤ
بار احساس ہے منزل کی تہی دامانی
کوئی سایہ کوئی پیکر سر منزل لاؤ
روشنی ہے مری ویران نگاہی کا سبب
اب کوئی چہرہ مہ و سورج کے مماثل لاؤ
تیرگی میں سلگتی ہوئی روحوں کے لیے
آندھیوں کے مکانوں سے بوئے گل لاؤ
ایک آواز ابھرتی ہے پس منظر خوں
اے اجالو مری تصویر کا قاتل لاؤ
مڑ کے دیکھو گے تو پتھر سے بدل جاؤ گے
اب تصور میں نہ بھولی ہوئی محفل لاؤ

کرشن مراری

جلتے ہم اپنے آپ سے جو اپنے گھر گئے
خود سے ملے نہیں تھے کہ پہلے ہی ڈر گئے
یہ سلسلے حیات کے بکھرے کچھ اس طرح
ہم آئے باخبر تھے مگر بے خبر گئے
دیکھا تھا زندگی میں ہر اک لمحے کا حساب
یہ لمحے تیری راہ میں خود ہی بکھر گئے
اب تک ہے مجھ کو یاد وہ چنچل ملن ترا
جب چلتے چلتے سوچ کے دریا ٹھہر گئے
انداز و حجاب کے پہلے ملن کے وقت
نظروں میں یوں سمائے کہ دل میں اتر گئے
آکر جنوں نے ایسا تسلط جما لیا
سب تار و پود ہوش و خرد کے بکھر گئے

حامدی کاشمیری

کالی آندھی کی رو میں جنگل ہے
آنکھ میں کپکپاتی مشعل ہے
کہہ گئے تھے وہ شہسواروں سے
سبز ٹیلوں کے نیچے دلدل ہے
تک رہے ہیں سب آسمانوں کو
گرد کے پار کوئی بادل ہے
کس سے پوچھوں پتہ مکینوں کا
کھڑکیاں بند، در مقفل ہے
سب پرندے گھٹا کے پیچھے گئے
حبس ہے، پتہ پتہ بے کل ہے

شرافت نواز

جیون ایک اگنی بان
چاہت کے انداز جدا
اب تو دل یوں جلتا ہے
کب تک خود سے دور رہو
فطرت کیوں ہے ڈانوا ڈول

ٹھوکر کھا کر ہی پہچان
اپنے ہاتھوں خود ویران
جیسے دھوپ میں ریگستان
چھوڑو بھی اب ان کا دھیان
من جو بھی کہہ دے وہ مان

گلشن بہار

درد بن کر وہ میرے جسم کے اندر پھیلا
جیسے صحرا میں کوئی زرد سمندر پھیلا
ریشمی زلفیں کڑی دھوپ میں بکھری جیسے
ظلمتیں ہی کے اُجالوں کا مقدر پھیلا
ورنہ بہتے جو گزر جانے پہ بادِ نیاز
دیکھ کر اپنی ضرورت کو تو چادر پھیلا
وقت کی شاخ سے ٹوٹا ہوا تنہا لمحہ
کتنی یادوں کو سمیٹے ہوئے اکثر پھیلا
اجنبی چہرہ کی کھڑکی سے جھانکا کیے
دھوپ کا شیشہ سے بستی کے بدل پر پھیلا
زرد موسم کی فضاؤں میں بھٹکتے چہرے
زرد چہروں کا یہ موسم تو ہے گھر گھر پھیلا

مسعودہ حیات

کہیں کہیں جو اُجالا دکھائی دیتا ہے
ہمارے خون کا سایا دکھائی دیتا ہے
تم اپنے دردِ محبت کو اب فریب نہ دو
تمہارا غم تو مجھی سا دکھائی دیتا ہے
تمام عمر جو ہم سے رہا ہے بیگانہ
ہمیں وہ آج بھی اپنا دکھائی دیتا ہے
طوافِ شہرِ نگاراں نہ چھوڑنا اے دل
ابھی اُمید کا چہرہ دکھائی دیتا ہے
کسی کو بوئے وفا کی پرکھ بھی ہے لوگو
چمن تو سارا مہکتا دکھائی دیتا ہے
کسی کے عشق میں دل جل چکا حیات مگر
نظر کو اب بھی دھواں سا دکھائی دیتا ہے

اعجاز اعظمی

آکاش کو چھوتی ہے زمیں میرے وطن کی
امرت ہے ہر اک بوند مرے گنگ و جمن کی
اس درد کے صحرا میں تبسم سا بکھیرو
دے دو جو اجازت مجھے اظہارِ سخن کی
جلتے ہوئے ماحول میں پگھلا نہ ابھی تک
کیا داد نہ دو گے مرے پتھر کے بدن کی
رہتا ہوں وطن میں تو ستاتے ہیں مجھے لوگ
غربت میں ستاتی ہے مجھے یادِ وطن کی
اعجاز مرے نام سے پھولے ہے گلستاں
ہوتی ہے مرے خون سے تزئین چمن کی

سعید حبیب

کس قدر جھوم اٹھی مستی سے فضا آج کی رات
پہلوِ شوق میں ہے آج کوئی رشکِ قمر
اے صنم تجھ کو ترے حُسنِ دل آرائی کی قسم
تیر نظروں کے اُتر جانے دے دل میں میرے

کیسی مسحور ہے خوشبو سے ہوا آج کی رات
محفلِ نجم میں طوفاں ہے بپا آج کی رات
راز سب اپنی محبت کے بتا آج کی رات
دیکھ پلکوں کو حیا سے نہ جھکا آج کی رات

تبصرے

اقبال اور انسان

اردو شاعری میں میر، غالب اور اقبال ایسے پیغمبران سخن ہیں کہ ان پر جتنا لکھا پڑھا گیا اتنا ہی اور لکھنے پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ہر دور میں ان کے نئے مطالعہ کی گنجائش ہمیشہ نکلتی رہے گی۔

یوں تو اقبال پر اس قدر لکھا گیا ہے کہ اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ مگر اقبال کے اس سرمایہ مطالعے خاص کر آپ کے حالات کے پیش منظر میں، ان کی فکر کی بازیافت، ان کے فلسفیانہ اور متصوفانہ استفادات کی نئی توضیح و تشریح کا [illegible] ہے۔ اقبالیات کو [illegible] مطالعہ [illegible] کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس طرح اقبال کے تصورات، نظریات اور اس کے تمام فکر کے ماخذ اور سرچشمے نئی وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ منظر عام پر آ رہے ہیں۔ دکن کے ممتاز ادیب جناب اشفاق حسین کی حالیہ تصنیف "اقبال اور انسان" نہ صرف اس سلسلے کی ایک قابل قدر کڑی ہے، بلکہ اقبالیات کے نئے مسائل کی بھرپور اور موثر تلاش و جستجو کی ایک اہم منزل بھی۔

اس کتاب کے تین اہم پہلو اور تین اہم خصوصیات ہیں اول تو یہ کہ فاضل مصنف نے انسانیت کا عالمی اور آفاقی تصور اور نصب العین پیش کرتے ہوئے اقبال کے انسان کی تصویر کشی کی ہے۔ پھر اسلامی فکر، زرتشتی فکر، ہندوستانی فکر اور مغربی فکر کے سوتوں اور دھاروں کا احاطہ کرتے ہوئے ان سب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت جنید بغدادی، ابن عربی، رومی جیسے صوفی اور فلسفیوں سے اقبال کے اکتساب فیض [illegible] اسرار و رموز کی معنی آفریں توضیحات [illegible] کی ہے۔

[illegible] پہلو یہ ہے کہ اشفاق حسین صاحب نے غالباً پہلی مرتبہ ہندوستانی فلسفہ اور فکر کے حوالے سے اقبال کے پیغام میں انسانیت اور تعمیر زندگی کے تصورات کا مطالعہ کیا ہے۔ اور گیتا کے فلسفہ عمل، گوتم کے فلسفہ نجات و شواستر، بھرتری ہری، ٹیگور، [illegible] گوش اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کے نظریات اور تصورات سے اقبال کی فکر کے مشترک اور مماثل پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ اس طرح اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اقبال کے ہاں مشرقی اور مغربی فکر کس قدر حسین امتزاج ملتا ہے۔

آخر میں اشفاق حسین صاحب نے "اقبال اور انسان" کے عنوان سے اقبالیات کی کئی ذیلی سرخیوں جیسے [illegible] اثبات، حیات، ذوق نمود، خودی و عشق، آدم و ابلیس، تسخیر کائنات وغیرہ آدم پر بحث کی ہے۔ فکر اقبال کی ان جزئیات پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اشفاق صاحب نے اس سلسلے میں کوئی اضافہ تو نہیں کیا ہے [illegible] ان جزئیات پر جو اقبال کی شخصیت اور فکر [illegible] کلیدی اہمیت رکھتی ہیں، اشفاق صاحب نے دلنشین پیرائے میں مربوط طریقے سے بڑی بصیرت کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس کے بعد موضوع زیر بحث کی مناسبت سے اقبال کے کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔

ناشر: - آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی - حیدرآباد

قیمت: - ۸ روپے

ابوالفیض سحر

مطالعۂ داغ

یہ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں ۱۹۷۰ء میں راجستھان یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی تھی۔ اسے کتاب گھر، دین دیال روڈ، لکھنؤ

نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ قیمت چوبیس روپے ہے

داغ کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں دوررس تبدیلیوں کا دور تھا۔ سیاسی تبدیلیوں کے نتیجے میں معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیاں بھی بڑی تیزرفتاری سے رونما ہو رہی تھیں۔ لیکن داغ کی شاعری میں ان تبدیلیوں کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ انھوں نے دلی کی پرانی تہذیب کو اپنی آنکھوں کے سامنے برباد ہوتے دیکھا اور نئے تہذیبی تصورات کو ان کی جگہ لیتے بھی۔ لیکن انھوں نے نہ پرانے معاشرے کی تباہی سے کوئی دیرپا اثر قبول کیا۔ نہ نئی ذہنی فضا سے متاثر ہوئے۔ اسے ان کی زندہ دلی کہیے یا بے شعوری، لیکن یہ اس اخلاقی زوال کی علامت بھی تھی۔ جس کا شکار وہ پورا طبقہ تھا جس کی داغ نمائندگی کرتے تھے۔ حکومت ہاتھ سے جا چکی تھی لیکن چھوٹی بڑی نوابیاں قائم ہو چکی تھیں۔ اور ان لوگوں نے انھیں کو متاعِ گم شدہ کا بدل سمجھ لیا تھا ـــــ ڈاکٹر محمد علی زیدی نے اپنی کتاب کا آغاز اسی بحث سے کیا ہے۔ انھوں نے بڑی تفصیل سے اس تاریخی اور معاشرتی پس منظر کو پیش کیا ہے جس میں داغ کی شاعری پروان چڑھی۔ یہ بحث بھی اٹھائی ہے کہ شاہجہاں کے دلی دبستان کیا خصوصیات تھیں۔ وہ کیا شعری روایات اور فنی تصورات تھے جن کے زیر اثر داغ کے شاعرانہ مزاج کی تشکیل ہوئی۔ اور وہ کیا پہلو تھے جہاں داغ نے ان روایات سے انحراف کیا۔ داغ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ریاست رامپور میں گزرا اس لیے زیدی صاحب نے اس وقت کے رامپور کے ادبی اور معاشرتی ماحول پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ تقابل کے لیے انھوں نے اس جدید ادبی تحریک کا بھی ذکر کیا ہے جو اسی زمانے میں سرسید، حالی، محمد حسین آزاد اور ان کے رفقا کے ہاتھوں پروان چڑھ رہی تھی۔

کتاب کا دوسرا باب داغ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے جس میں ان کی پیدائش سے لے کر سفرِ آخرت تک کے حالات بالتفصیل آ گئے ہیں۔ واقعات کے ساتھ ساتھ ان تمام شخصیتوں کا ذکر بھی اس باب میں شامل ہے جو کسی نہ کسی حیثیت میں داغ سے متعلق رہیں یا جن سے داغ متعلق رہے۔

داغ کی تصنیفات کی تفصیل بھی اسی باب میں دی گئی ہے۔ اور ان کے دواوین کی مختلف اشاعتوں کا مختصر سا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں غزلیات داغ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہاں زیدی صاحب نے وہ دقتِ نظر صرف نہیں کی جس سے انھوں نے تحقیقی حصے میں کام لیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ داغ کے پورے کلام کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر صاحب ان خصوصیات کو قطعیت اور وضاحت کے ساتھ بیان کرتے جو کلامِ داغ کی پہچان ہیں۔ لیکن انھوں نے اکثر سرسری رایوں کے اظہار پر اکتفا کیا ہے، جن میں عمومیت بھی ہے اور تکرار بھی۔ اس کے باوجود اس جائزے میں ایسے کئی مقامات آتے ہیں جہاں زیدی صاحب نے تنقیدی فہم کا پورا ثبوت دیا ہے۔ داغ کے ہاں رقیب کا جو تصور ہے وہ بڑی حد تک غیر روایتی ہے۔ ان کا عشق بھی وہ نہیں جس کا رونا ہمیشہ سے شاعر روتے رہے ہیں۔ معشوق کے ساتھ وہ برابری کی سطح پر بات کرنا جانتے ہیں۔ اور بلائے عشق سے پیچھا چھڑانے کا گر بھی انھیں آتا ہے ان کی اور کلامِ داغ کی کچھ دوسرے منفرد پہلوؤں کی وضاحت بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔

داغ کا کمال غزل میں ظاہر ہوا۔ لیکن انھوں نے اور بھی کئی اصنافِ شاعری میں طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں۔ چوتھے باب میں انھیں اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ان کی مشہور مثنوی "فریادِ داغ" پر خصوصیت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے

پانچویں باب میں داغ کے مکتوبات سے بحث کی گئی ہے۔ اور ان کے طرزِ خطوط نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے زیدی صاحب نے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کی اہمیت دستاویزی زیادہ ہے ادبی کم۔

چھٹے اور ساتویں ابواب میں داغ کی زبان اور اپنے عہد میں ان کی غیر معمولی مقبولیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ ضمناً ان کے شاگردوں کا اور ان کے طریقِ اصلاح کا ذکر بھی آ گیا ہے اور اصلاحوں کے نمونے بھی دئے گئے ہیں۔ آخر میں ان مآخذ کی فہرست ہے جو مقالہ تیار کرتے ہوئے زیدی صاحب کے پیش

نظر سے ہیں۔

واقع یہ ہے کہ یہ پہلی بھرپور اور جامع کتاب ہے جو اب تک سامنے نہیں آئی تھی۔ زیدی صاحب نے واقعی اپنا موضوع تحقیق بنا کر وہ فرض ادا کر دیا جو ہم سب پر واجب تھا۔

——— مخمور سعیدی

بہر حال :-

مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین کا چوتھا مجموعہ ہے۔ آخر میں چند خاکے بھی شامل ہیں۔ جو بالترتیب سلام مچھلی شہری، عزیز قیسی، عبادت چند کھنہ اور فکر تونسوی پر ہیں۔

مجتبیٰ حسین کا مزاح ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہے۔ اس میں نہ طنزیہ عناصر شامل ہیں نہ ہجویہ۔ یہ خالص مزاح ہے جو مجتبیٰ حسین کے اس مخصوص انداز نظر سے پیدا ہوا ہے جس سے وہ زندگی اور اس کے گوناگوں مناظر کو دیکھنے کے عادی ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کا انداز نظر ہے جس نے اپنی آنکھوں پر رنگین شیشوں کی عینک کبھی نہ لگائی ہو۔ زندگی اپنے حقیقی خط و خال کے ساتھ اس کے سامنے ہے اور اسے غلطِ نظر اٹھانے کی فراخدلانہ دعوت دے رہی ہے۔ جب وہ اپنی تحریروں میں اس زندگی کا کوئی روپ، کوئی جھلک پیش کرتا ہے۔ تو اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ اس فضا میں اپنے قاری کو بھی شریک کر لے جو اسے حاصل ہوا ہے۔ ان کے یہاں تلخی یا ناگواری کا گزر نہیں۔ کسی پیش آمدہ صورت حال کے ناگوار پہلوؤں کو وہ نظر انداز نہیں کرتے۔ ان پر گرفت بھی کرتے ہیں لیکن لطف اندوزی کی گنجائش نکالتے ہوئے۔ اور منفی کردار کو بے اثر بناتے ہوئے مگر نہ ان کے منہ کا مزا بگڑنے دینے کا۔

مجتبیٰ حسین دوستوں کی بے تکلف محفلوں میں بے تکلف شگفتہ قہقہے لگاتے دیکھے گئے ہیں۔ لیکن اپنے مضامین میں وہ تبسم زیر لب کی حدود سے تجاوز کرتے نظر نہیں آتے۔ وہ قاری کی حس لطیف کو ہلکا سا گدگدا کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں اور یہ گدگدی اگرچہ بار بار آتی ہے لیکن قہقہہ بن کر [illegible] کر ہی آتی ہے۔ یہ وصف الکتاب ہے جو مجتبیٰ حسین کی مزاحیہ کیفیات کی ضمانت دیتا ہے اور اسے پڑھا جائے گا۔

مجتبیٰ حسین بڑی شگفتہ زبان اور بے ساختہ [illegible] پر قادر ہیں۔ اکثر صورتوں میں وہ واقعات یا کرداروں کو ایک خاص انداز پیشکش سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں صرف ان کا کوئی چھوٹا سا فقرہ بھی مزاح کی بھرپور کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ آٹو رکشا پر ان کا ایک مضمون ہے جس میں انھوں نے ان مسائل کا ذکر کیا ہے جو آٹو رکشا کی سواریوں کو پیش آتے ہیں۔ وہ ایک دوست کے ساتھ آٹو رکشا میں بیٹھے کہیں جا رہے ہیں۔ آٹو رکشا کے پہیے کسی گڑھے میں گر کر اچھلتے ہیں۔ برابر بیٹھا دوست اچانک ان کی گود میں آگرتا ہے۔ تو وہ اس سے پوچھتے ہیں: "یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ جواب دیتا ہے: "خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" یا "ہائے وہ مجرد زندگی" کا یہ جملہ "زندگی کی تلخیاں اتنی شدید اور کٹھن ہو گئی ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے ہم پیدائشی شادی شدہ ہیں۔"

مجتبیٰ حسین کے مزاح پر ان کے کسی پیشرو مزاح نگار کے اثرات کی نشاندہی مشکل کام ہے۔ انھوں نے جو خاکے لکھے ہیں ان میں بھی ان کا اسلوب دوسرے خاکہ نگاروں سے مختلف ہے۔ انھوں نے انہی لوگوں پر قلم اٹھایا ہے جن سے ان کے قریبی تعلقات رہے ہیں اور ان تعلقات میں بے تکلفی شامل رہی ہے۔ یہ بے تکلفی ان خاکوں میں بھی در آئی ہے۔ اور وہ بے جھجک ان نقوش کو واضح کرتے گئے ہیں۔ جو ان لوگوں کو دیکھ کر ان کے ساتھ رہ کر ان سے گھل مل کر ان کے ذہن پر مرتسم ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نقوش صاف اور روشن ہیں۔ اور ان کی یکجائی سے جو تصویریں ابھرتی ہیں وہ حقیقی انسانی شخصیتوں کا عکس نظر آتی ہیں۔

* "بہر حال" اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ قیمت سات روپے ہے۔ ناشر ہیں: نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد۔

——— مخمور سعیدی

کاجل اور آنسو

جناب معین شاہد ہفت روزہ "آورش" گیا کے مدیر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ لیکن انھیں افسانہ نگاری کا بھی ذوق ہے۔ اور اس ذوق کی تسکین کیلئے وہ اپنی مدیرانہ مصروفیات

[illegible] ہے ۔ جلد یہاں ایسا چاہیے کہ رفاما [illegible] ہیں ۔ نیز ہر [illegible] کتاب میں کے تحت رسالوں کا تجزیہ ہے [illegible] پیدا کرنے [illegible] چند [illegible] لکھا ہے ۔ سید شاہد کی کہانیاں [illegible] جن کی پہلی کہانیاں [illegible] سادہ اور [illegible] ہیں ۔ اب کہانیوں سے چکا کام کی بات نہیں کہہ سکتا ۔ جو صرف [illegible] کی کوشش کرتا ہے ۔ ان کہانیوں میں [illegible] ہے ۔ ان کہانیوں کی درد مندی ان کے دلوں کو چھو سکتی ۔ جو عوام کا دکھ درد جانتے ہیں ۔ ان کہانیوں میں [illegible] کا پہلو ہے ۔ مسرتوں کی حرماں نصیبی ہے ۔ ان کہانیوں [illegible] ہے : ان کا اصل ہے جو ہر جملوں کو پڑھ کر اگر آپ شاہد کی کہانیوں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہیں تو [illegible] مشکل ہے ۔ لیکن کہانیوں کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ ان کا لکھنے والا ایک ایسا حساس شخص ہے جو اپنے گرد و پیش [illegible] کی ہر کروٹ سے اثر قبول کرتا ہے ۔ جس زمین [illegible] اس کے ساتھ اس کا مضبوط رشتہ ہے اور اس کے [illegible] پر اس کی گہری نظر ہے ۔ ناداری، بیماری اور جہالت کے [illegible] میں وہ گھرا ہوا ہے اسے بہ وقت [illegible] سکتے ہیں اور وہ اس [illegible] کی تلاش میں سرگرداں ہے جو [illegible] کا تریاق ہو سکے ۔ —— سید شاہد صاحب کی کہانیوں کا اسلوب بیانیہ ہے ۔ اور یہ واقعات کے سہارے ایک [illegible] رفتار سے ایک [illegible] سمت میں آگے بڑھتی ہیں ۔ یہ اسلوب اس انداز سے مختلف ہے جو افسانہ کو تخلیق [illegible] کے قریب لاتا ہے ۔ لیکن سید شاہد صاحب اپنی کہانیوں سے جو کام لینا چاہتے ہیں اس کے لیے یہی انداز زیادہ مناسب تھا ۔ جو انھوں نے اختیار کیا ہے ۔

سید شاہد صاحب کی کہانیوں کے کردار آج کے زندہ کردار ہیں ۔ [illegible] سید شاہد صاحب کا اصلاحی نقطۂ نظر ان کے فطری [illegible] تقاضوں [illegible] ہوتا ہے ۔ لیکن ان میں زندگی کی [illegible] موجود رہتی ہے ۔ یہ جس انداز میں [illegible] ہیں وہ [illegible] انداز ہے [illegible]

میں [illegible] نظر [illegible] ہے ۔ کتاب [illegible] ہے ۔ [illegible] روپیہ ہے اور [illegible] کا [illegible] دیکھ دیا گیا ۔ دہلی سے طلب کیا جا سکتی ہے ۔

—— ارشد علی خاں

بہاراں

یہ رامپور کے ایک کہنہ مشق شاعر جناب ادیب فیضی کے کلام کا مجموعہ ہے ۔ جسے ان کے فرزند تشریف جاہ فیضی صاحب نے شائع کرایا ہے ۔ وجہ اشاعت بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں : "ہم شاعروں کی فضا دیکھ کر اپنے باپ سے مشاعروں میں جانے کو منع کرتے تو فرماتے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے چھپوا دو تو پھر نہ جاؤں گا ۔ ہم نے ان کو اس زحمت سے بچانے کے لئے ان کے اشعار کا یہ مجموعہ طبع کرا دیا ہے ۔" تشریف جاہ فیضی صاحب کی یہ سعادت مندی ستائش طلب ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ کتاب کی ترتیب و طباعت دونوں میں خوش سلیقگی کے تقاضوں کو انھوں نے ملحوظ نہیں رکھا ۔ کتاب کا آغاز 'مقدمہ' سے ہوا ہے جو خود ادیب فیضی صاحب کا لکھا ہوا ہے ۔ اس کے بعد بہت سے حضرات کی آرا ہیں ۔ جو کسی منطقی ترتیب کے بغیر درج ہوئی ہیں ۔ ان میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور ذکا صدیقی صاحب کی آرا کو چھوڑ کر باقی سب کا انداز وہی ہے جو شاعروں کی داد کا ہوا کرتا ہے ۔ کتابت کی غلطیاں [illegible] کے طفیل بیسیوں جملے مفہوم سے بے نیاز ہو کر رہ گئے ہیں ۔ کتابت کی پریشان کن غلطیوں نے شاعر کا کلام بھی کہیں کا نہیں رہا ہے ۔ پھر کتابت اتنی بد نما اور بے ضابطہ ہے کہ پڑھنے کو جی نہیں چاہتا ۔

جہاں تک ادیب فیضی صاحب کے کلام کا تعلق ہے یہ ان کی پختہ مشقی کا اظہار کرتا ہے ۔ مضامین [illegible] کی [illegible] نے ان میں ایک لطف پیدا کر دیا ہے ۔ [illegible] شاعری [illegible] کے لئے نقل کئے جا سکتے ہیں ۔

نہ بھولے ہم کبھی تہذیب گلشن کی بیاباں میں
ملے کانٹے تو ہم نے لے لئے خوش ہو کے داماں میں
بہاروں کے نگہبانو بہار اس کو نہیں کہتے
فقط دو چار غنچے کھل گئے سارے گلستاں میں

جیسے مجبور ہوئے ہم کوئی مجبور نہ ہو
کرنا پڑتا ہے ہمیں جو کچھ کوئی سمجھاتا ہے

ظلم ایسے تو نہ کر لوگ سمجھ لیں دشمن
ہم نے دنیا میں تجھے دوست بنا رکھا ہے

رات پھولوں پہ بسر ہو کہ ہو کانٹوں پہ بسر
عمر اک رات نہیں ہے جو گزر جائے گی

ضبط گریہ کر لیا پلکوں سے تم کو کیا کروں
یوں مینہ کے بھی برستے ہیں شجر بھیگے ہوئے

ایسے خوبصورت اشعار کہنے والے شاعر کا کلام بلا شبہ قدر افزائی کا مستحق ہے۔ دیباچے میں عالم فتح پوری نے کتاب کی دوبارہ اشاعت کے امکان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر یہ نوبت آئے تو ہماری خواہش ہے کہ کتاب سلیقے سے شائع ہو۔ اور کلام کی خوبیوں پر کتابت و طباعت کی بد نمائی کا پردہ نہ پڑنے پائے۔

بہاراں کی قیمت سات روپے ہے اور ملنے کا پتہ ہے تشریف جاہ نیمی، محلہ کنڑہ، رامپور۔

— حامد علی خاں

دو حادثے

ٹونک میں نوجوان شاعر عابد کیفی کا انتقال ہو گیا۔ وہ راجستھان اور بیرونی راجستھان کے مشاعروں کے ہر دلعزیز شاعر تھے۔ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ لیکن مشاعرے کی فضا پر اس طرح چھا جاتے تھے کہ ان کے بعد اچھے مترنم شاعر مائک پر آتے ہوئے گھبراتے تھے۔ طبیعت میں بڑا انکسار تھا، کوئی بڑا ہو، چھوٹا ہو سب سے جھک کر ملتے تھے۔ ان کی زبان سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں سنی گئی جس سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہو۔ یا تکبر کا پہلو نکلتا ہو ۔۔۔ شاعری انھوں نے وراثت میں پائی تھی۔ ان کے مرحوم والد جناب بسمل ٹونکی اور دادا حافظ عالمگیر خاں کیف اپنے وقت کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ افسوس ہے کہ انھیں زندگی میں اچھے دن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اور عمر نے بھی ان سے زیادہ وفا نہ کی۔ خدا آخرت میں ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی روح کو اپنی رحمتوں سے سرفراز کرے۔ ان کے پس ماندگان میں ان کی بیوہ اور ایک کم عمر بچی ہے۔ معلوم نہیں ان کی گزر بسر کی اب کیا صورت ہو۔ اگر راجستھان ساہتیہ اکاڈمی اس طرف توجہ دے اور ان کے لئے کوئی وظیفہ مقرر کر دے تو یہ ایک قابل تعریف کام ہوگا۔

۱۸ / جون کی دوپہر کو ممتاز شاعر کمار پاشی کی والدہ محترمہ کشن دیوی وفات پا گئیں۔ ان کی عمر اسی برس تھی۔ دو ڈھائی برس پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اس حملے کے بعد ان کی طبیعت پوری طرح نہیں سنبھلی اور وہ دواؤں پر ہی زندہ رہیں لیکن انتقال کے وقت تک ان کے حواس بحال رہے۔ اور انھیں دیکھ کر یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اتنی جلد دنیا سے رخصت ہونے والی ہیں۔ خدا ان کی آتما کو شانتی دے اور پس ماندگان کو صبر عطا کرے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ غم ادارہ تحریک کا بھی ذاتی غم ہے۔

خبرنامہ

۳۰ جون کو غالب اکاڈمی نئی دہلی میں دہلی رائٹرز سرکل ایسوسی ایشن کی طرف سے "تحریک" کے چیف ایڈیٹر جناب گوپال متل کی اڑسٹھویں سالگرہ ایک ادبی تقریب کے طور پر منائی گئی جلسے کی صدارت جناب حیات اللہ انصاری نے فرمائی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے متل صاحب کی نثر نگاری اور شاعری کے بنیادی اوصاف پر تفصیل سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ جہاں متل صاحب کی نثر کی خاص خوبی ان کا تجزیاتی اور استدلالی انداز ہے وہاں شاعری میں قطعاً غیر استدلالی ذہن کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور ایسے شعر ان کے قلم سے نکلے ہیں جنہیں سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے۔

متل صاحب کے لاہور کے ساتھی اور دوست دیویندر ستیارتھی نے ان کی شخصیت پر ایک خوبصورت خاکہ پڑھا۔ یہ خاکہ متل صاحب کی شخصیت کا آئینہ تو تھا ہی، ساتھ ہی تقسیم سے پہلے کے لاہور کی ادبی زندگی کی جھلکیاں بھی پیش کرتا تھا۔ نئے لکھنے والوں کی طرف سے ڈاکٹر عنوان چشتی اور مخمور سعیدی نے متل صاحب کی ادبی اور شعری خدمات کا اعتراف کیا۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے کہا کہ متل صاحب نے اپنے رسالہ "تحریک" کے ذریعہ لکھنے والوں کی ایک پوری نسل کی ذہنی تربیت کی ہے۔ "تحریک" کے گذشتہ بیس برس کے اداریوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ وہ کتنے تیز و استدلالی انداز میں کچھ ادبی معیاروں کی بازیافت کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ مخمور سعیدی نے کہا کہ متل صاحب ایک جامع صفات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک نغز گو شاعر بھی ہیں، صاحب طرز نثر نگار بھی، ایک باشعور سیاسی مبصر بھی۔ ایک کامیاب ایڈیٹر بھی۔ انھوں نے اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں کہا کہ جب متل صاحب کسی کام کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں تو پھر کوئی مشکل کوئی رکاوٹ ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے کہا کہ میں "تحریک" کے ابتدائی دور ہی سے اس سے منسلک رہا ہوں۔ اُس دور میں اردو ادب پر ترقی پسندوں کا غلبہ تھا۔ ادیبوں کی طرف سے تحریک کی زبردست مخالفت ہوئی۔ ہر طرح کے معاندانہ حربے آزمائے گئے۔ متل صاحب کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو اس چو طرفہ مخالفت سے شاید گھبرا اٹھتا۔ لیکن میں نے دیکھا مخالفت جتنی زور پکڑتی گئی متل صاحب کے ارادوں میں اتنی ہی مضبوطی آتی گئی۔ ترقی پسند تحریک کے غیر ادبی خد و خال کو بے نقاب کرنے اور صحیح ادبی قدروں کی بحالی میں "تحریک" کا جو حصہ رہا ہے اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مشکل کام متل صاحب کی استقامت کی بدولت ہی آسان ہو سکا۔

اس موقع پر متل صاحب کو چاندی کی ایک شیلڈ بھی پیش کی گئی جس پر منظوم سپاس نامہ تھا جس کے متعدد ادیبوں اور شاعروں کے دستخط کندہ تھے۔ یہ شیلڈ باقی صاحب نے پیش کی۔ بزرگ شاعر بسمل سعیدی، کرشن موہن، ضیا فتح آبادی، عبداللہ کمال، ڈاکٹر اسلم سعیدی اور امیر قزلباش نے منظوم تاثرات پیش کیے۔ آخر میں گوپال متل صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ اور چائے نوشی کے بعد یہ خوشگوار محفل اختتام کو پہنچی۔

جلسے کے داعیان تھے کرشن موہن، بانی، کمار پاشی، کیلاش ماہر، عبداللہ کمال، آر۔ ایل۔ ساگر، کنور سین، کرشن مراری اور کرشن کمار طور۔ شرکاء میں دہلی اور بیرون دہلی کے ممتاز ادیب شاعر، صحافی اور نمایاں ہستیاں بھی شامل تھیں۔ جن سے غالب اکاڈمی کا خوشنما ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

۸ جولائی کو بزم سیماب دہلی کی ایک نشست ہوئی جس میں جناب رام پرکاش ساحر ہوشیارپوری کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ نشست میں اپنے شعری نظریات پر گفتگو کرتے ہوئے ساحر صاحب نے کہا کہ وہ روایتی اور رسمی شاعری کے [illegible]

شاعری کو ترجیح دیتے ہیں جس کے سوتے شاعری کی اپنی شخصیت سے پھوٹتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کے ننھیال میں [illegible] میں جانا۔ مگر ان کی شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز [illegible] میں ہوا جب وہ ایم اے میں تعلیم حاصل کر رہے گورنمنٹ کالج لاہور میں پہنچے۔ [illegible] میں انھوں نے جناب جوش ملسیانی کی شاگردی اختیار کی: جنھوں نے انھیں خلوص و دیانت کی اعلیٰ روایات اور زبان و بیان سے واقف کرایا۔ ساحر صاحب نے کہا کہ انھوں نے استادی کسی اصلاح کو آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کیا۔ اور اگر یہ محسوس کیا کہ اصلاح سے ان کا خیال متاثر ہو رہا ہے تو اسے ماننے میں تامل کیا۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرے پڑھنے کا شوق انھیں زمانہ طالب علمی ہی سے ہے۔ اور وہ اب تک ہندوستان اور پاکستان کے سیکڑوں مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ مشاعروں میں ان کا کلام پسند کیا جاتا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ "شاعرِ غزل" ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ جو اب کمیاب ہے۔ دوسرا مجموعہ "سحر نغمہ" ہے جس میں ان کے روز و شب کی کہانی اشعار کی زبان ہی نہیں بلکہ تصویروں کی زبانی بھی پیش کی گئی ہے۔ ساحر صاحب نے بتایا کہ انھوں نے بہت سا وقت ترقی پسندوں کے ساتھ گزارا ہے۔ لیکن ترقی پسندی کی پرچھائیں ان کی شاعری پر نہیں پڑ سکی۔ البتہ جدیدیت سے وہ ایک حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ جس کی جھلک ان کے تازہ کلام میں دیکھی جا سکتی ہے۔ دو گھنٹے تک یہ دلچسپ گفتگو جاری رہی۔ جس کے بیچ بیچ میں ساحر صاحب نے اپنے مختلف ادوار کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے۔ نشست کے آخر میں جن شعرا نے اپنا کلام سنایا ان کے نام ہیں: ضیا فتح آبادی، اندر سروپ دت نادان، بخشی اختر امرتسری، کرشن کمار طوسی، بکالی چرن اثر، راز یکسوری۔ اوم پرکاش بجاج، جگدیش مہتہ درد اور ساحل مانکپوری جو بیرونی مہمان تھے۔

۷ ربیعان کو میرٹھ میں جناب نور تقی نور کے اعزاز میں ایک محفلِ شعر و سخن منعقد ہوا جس میں بہت سے مقامی اور غیر مقامی شعرا نے شرکت [illegible] حکیم سیف الدین احمد صاحب تھے۔ انھوں نے نور صاحب کی شاعری کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انھیں مبارکباد دی کہ ان کی شاعرانہ خدمات کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ ان کی قدر پہچانی [illegible] کے علاوہ حضرات گرپال متل، پروفیسر ستیش بنول، مخمور سعیدی، ہنمنت سیہ نار، ان شرما اور نشری کیلاش گوتم نے بھی نور صاحب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کر کے روشنی ڈالی اور ان کی قدر افزائی کی۔ انھیں اعزاز میرٹھ کے ان ادب شناس حضرات کی کاوشوں کا نتیجہ تھا جنھوں نے اس جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ ڈاکٹر اکرم جہان جو اس جلسے کی سکریٹری کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے نور صاحب کی شاعری پر ایک مفصل مضمون لکھ کر لائے تھے —— شعرا جنھوں نے اس محفل میں اپنا کلام سنایا نور صاحب کے علاوہ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: گوپال متل، مخمور سعیدی، کمار پاشی، بشیر جھنجھانوی، عشرت کرتپوری، حیات لکھنوی، شفیق بریلی، کریم الاحسانی، اسلم کمشنلوی، مختار صدیقی، خورشید بلند شہری، شوق مراد آبادی، جرم کاشمیری، اور آنسہ تسنیم فیضی، ہندی شعرا میں سے گوونِد رستوگی، گلشن بھارتی اور دھرم جیت سرل بھی شریکِ محفل تھے۔ اور اس طرح یہ محفل اردو ہندی کا ایک خوشگوار سنگم بن گئی تھی۔

۲۴ مئی کو پٹھان کوٹ کے ادب دوست حضرات نے ایک بہت بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں اردو شاعروں کے ساتھ پنجابی زبان کے نامور شاعروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مشاعرے کا آغاز پنجابی شاعروں کے کلام سے ہوا اور اس کے بعد اردو شعرا کو دعوتِ سخن دی گئی۔ جن میں سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، خمار بارہ بنکوی، مخمور سعیدی، شباب للت، امیر قزلباش، ہلال سیوہاروی، عالم فتحپوری، طارق [illegible]، [illegible] اور بیگم نسیم محموری کے علاوہ کئی اور شعرا بھی تھے۔ مشاعرے کی صدارت مرکزی وزیر جناب اندر کمار گجرال نے کی اور اسٹیج سکریٹری کے فرائض ملک زادہ منظور احمد نے انجام دئے۔ مشاعرہ رات کے دو بجے تک کامیابی سے جاری رہا۔ مشاعرے کے کنوینر پنجابی کے مشہور شاعر [illegible] تھے۔ اردو کے روحِ رواں تھے بادا بلونت سنگھ جو ایک خوش ذوق نوجوان ہیں۔

गुलाग द्वीपसमूह

[illegible]

... इसके बारे में ... विचार व्यक्त किये हैं। ...

[illegible]

Regd. No. D. (D) 118 Phone 2/1649 OCTOBER 1975

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 646/57

TAHREEK

ٹائیٹل مطبوعہ فائن پریس جامع مسجد دہلی

DL-118 Phone 271649 / JULY 1975

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No [illegible]

TAHREEK

گوپال متل کی ادبی اور سیاسی یادداشتوں کی
حکایتِ لذیذ

لاہور کا جو ذکر کیا

(کچھ آپ بیتی، کچھ جگ بیتی)

غیر منقسم پنجاب کی کہانی —— گوپال متل کی زبانی

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

قیمت: چھ روپے

گوپال متل کا شعری مجموعہ

صحرا میں اذان

اُردو شاعری کی ایک مستحکم اور معتبر آواز

آفسٹ کی چھپائی

اعلیٰ گیٹ اَپ

قیمت: چھ روپے

شیرازہ

آزادی کے بعد کا سب سے اہم شعری انتخاب

۲۲۹ ممتاز شعراء اور شاعرات کا منتخب کلام — سوانحی اشاروں کے ساتھ۔

مرتبین: محمور سعیدی
پریم گوپال متل

مضبوط جلد، خوشنما گیٹ اَپ، سائز ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۲۲۰

قیمت: بارہ روپے

نوبل انعام یافتہ ادیب
الیگزنڈر سولنسٹین
کا شہرۂ آفاق ناول

کینسر وارڈ

یہ کتاب پہلے چھوٹے سائز پر پیپر بیک میں، دو الگ الگ حصوں میں چھپی تھی۔ اس کی غیر معمولی مقبولیت کے پیشِ نظر اب اس کا ڈی لکس ایڈیشن شائع کیا گیا ہے جس میں دونوں حصے یکجا کر دیے گئے ہیں۔

ڈمائی سائز، مضبوط جلد اور بہترین گیٹ اَپ کے ساتھ۔

قیمت: اٹھارہ روپے

نیشنل اکاڈمی۔ ۹/۴ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

[illegible]

[illegible]

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک دہلی

شمارہ : ۵ جلد : ۲۲

اگست ۱۹۷۵ء

اداره تحریر :

گوپال متل

مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : دس روپے ، فی کاپی : ایک روپیہ
غیر ممالک سے
سالانہ : تیس شلنگ ، فی کاپی : تین شلنگ
خط کتابت اور ترسیل زر کا پتہ
۹۔ انصاری مارکیٹ ، دریا گنج ، دہلی ۶

قیمت : ۱/- روپیہ

پرنٹر پبلشر اور پروپرائٹر ... ... گوپال متل
مطبع ... ... نعمانی پریس دہلی
مقام اشاعت : ۹ ۔ انصاری مارکیٹ
دریا گنج دہلی ۶

شذرات و مضامین :

افسانے :

منظومات :

آؤ اسکول چلیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

جی ہاں اسکول! جہاں آپ کے پیارے پیارے بچے پڑھتے ہیں ۔ ہم آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہمیں بھی ان سے اتنا ہی پیار ہے جتنا آپ کو ۔ اسی لئے ہم گذشتہ ساٹھے تین سالوں سے جی جان سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے بچوں کے لئے راجدھانی میں تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر بندوبست ہو ۔

ان چند برسوں میں اسکولی تعلیم میں نمایاں اصلاحات لانے کے لئے ہم نے جو کچھ قدم اٹھائے ہیں ان کی واقفیت حاصل کرنا آپ ضرور چاہیں گے ۔ تو لیجئے ان میں سے کچھ قابل ذکر باتوں کا یہاں ہم ذکر کر رہے ہیں ۔

—— ۔۔ دلی اسکول ایجوکیشن ایکٹ کے نفاذ کے بعد ایسے پرائیویٹ تعلیمی ادارے جو طلبا کے ذریعہ اپنا مفاد پورا کرتے تھے بالکل بند ہو گئے ۔ یعنی تعلیم میں یکسانیت اور اعلیٰ معیار ۔

—— ۔۔ پڑھ لکھ کر بچے بے روزگار نہ رہیں اس لئے اسکولی تعلیم کو صنعتی پیشوں کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے ۔ اس سال سے دس نیا نظام تعلیم رائج کر دیا گیا ہے جس کے تحت سائنس کی تعلیم اور کام کا تجربہ ضروری قرار دیا گیا ہے ۔ یہ اس سال سے تمام ۵۸۶ اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں نویں جماعت تک رائج کیا گیا ہے اور صنعت و حرفت سے متعلق نصابات انٹرمیڈیٹ کی سطح پر شروع کئے گئے ہیں ۔

—— ۔۔ آج لڑکیوں کی تعداد اسکولوں میں زیادہ ہے ۔ دیہی علاقوں سے اسکول جانے والی تین ہزار لڑکیوں کے لئے مفت سواری کا انتظام کیا گیا ہے ۔

—— ۔۔ جو لوگ روزگار کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اب بڑے مواقع ہیں ۔ ان کے لئے شام کے سات اسکول کھولے گئے ہیں ، علاوہ اسلامی کورس کے جن سے ہزاروں مستفید ہو رہے ہیں ۔

—— ۔۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کود کی سہولتیں بڑھائی جا رہی ہیں ۔ ہمارے سمر کوچنگ کیمپوں میں ہر سال ہزاروں طلبا کی کوچنگ کی جاتی ہے اور ان کے لئے نئے نئے کھیل کے میدان اور ورزش گاہیں (جمنازیم) بھی تعمیر ہوئی ہیں ۔

—— ۔۔ یہ حقیقت ہے ۔ ہم اساتذہ کی بھی تعلیم و تربیت کرتے ہیں ان کے نمونے ریفریشر کورس اور سمر انسٹی ٹیوٹس قائم کیے گئے ہیں صرف اس سال ۲۵۰۰ سے بھی زیادہ اساتذہ کو تعلیم اور تجربۂ عمل کے طریقوں کی تربیت دی گئی ہے ۔

—— ۔۔ ٹینٹوں میں چلنے والے اسکولوں کے زمانے لد گئے ۔ اب ہر اسکول کی اپنی پختہ عمارت ہوگی ۔ اس کے لئے ہم نے عمارت سازی شروع کر دی ہے ۔

ہم یہ سب اپنے بچوں کو بہتر سے بہتر تعلیم دینے کے لئے کر رہے ہیں ۔ ابھی ہمیں اپنے مقصد میں پوری طرح کامیابی نہیں ملی ہے پھر بھی ہم اپنے تئیں ہر ممکن طور پر خوب سے خوب تر کے لئے کوشاں ہیں ۔

ہم کون ہیں ۔۔!

ہم ہیں دلی انتظامیہ —————— آپ کا ہی اپنا انتظامیہ

ہم ہیں ہمیشہ آپ کی خدمت کے لئے تیار !

جاری کردہ : محکمۂ اطلاعات و اشاعت ، دلی انتظامیہ دلی

گوپال متل

غلطیہائے مضامین

۲۹ جون کے ٹائمز آف انڈیا میں ڈاکٹر بشمبر ناتھ پانڈے کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے بہت سے تاریخی تسامحات کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر پانڈے کی عمر اس وقت ۷۷ برس ہے۔ وہ انڈولوجیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ الہ آباد کے ڈائرکٹر ہیں۔ اور ہسٹری کمیٹی کے چیئرمین ہیں جس کے حلقۂ اثر میں اترپردیش کی تمام یونیورسٹیاں آتی ہیں۔ ڈاکٹر پانڈے کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کو کچھ عمداً اور کچھ نادانستہ طور پر غلط رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے جس سے لوگوں کے ذہن میں منافرت کا زہر بھر گیا ہے۔

ڈاکٹر پانڈے سے انٹرویو شری نریندر پنچوانی اور محترمہ مریہ ڈوسل نے کیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں کہ وہ تاریخ کو مسخ کرنے کی واضح مثالیں بتائیں، انہوں نے کہا کہ رانا پرتاپ شواجی اور گورو گوبند سنگھ کو ہندوؤں کا ہیرو ماننے کا کوئی جواز نہیں اور یہ مفروضہ غلط ہے کہ وہ ہندو ازم کو جنونی مسلمانوں سے بچانے کے لئے نبرد آزما ہوئے۔ ہلدی گھاٹی کی مشہور جنگ ہی کو لیجئے جو رانا پرتاپ نے اکبر کے خلاف لڑی تھی۔ رانا پرتاپ کی فوج میں بیس ہزار پٹھان تھے اور اس فوج کا کمانڈر بھی ایک مسلمان حاکم خان سوری تھا اسی طرح اکبر کی فوج میں بھی ایک لاکھ راجپوت تھے اور اس کا کمانڈر انچیف راجا مان سنگھ تھا جس جنگ میں مسلمان مسلمان کے خلاف اور راجپوت راجپوت کے خلاف برسر جنگ ہوں، اسے ہندو مسلمانوں کی جنگ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے جس جنگ میں دو ہزار مسلمانوں نے رانا پرتاپ کے لیے جان دے دی اسے مذہبی جنگ تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اگر چتوڑ کا حکمران رانا پرتاپ کی جگہ کوئی مسلمان ہوتا تب بھی اکبر اس پر اسی شدت سے یلغار کرتا۔ کیونکہ اس کا مقصد ایک مضبوط مرکز قائم کرنا تھا۔

شواجی کے دادا ایک مسلمان صوفی شاہ شرف الدین کے عقیدت کیش تھے۔ ان کے دو بیٹے ہوئے اور دونوں کا نام انھوں نے مسلم صوفی کے نام پر رکھا۔ اپنے ایک بیٹے کا نام انھوں نے شاہ جی رکھا اور دوسرے کا شرف جی۔ شواجی کے بھی دو گرو تھے۔ ایک گرو رام داس اور ایک بابا یعقوب۔ اور دونوں کا وہ یکساں احترام کرتا تھا۔ شواجی کے اعلیٰ اسٹاف میں کئی مسلمان تھے مثلاً۔ دولت خاں جو ان کے اہم ترین جرنیلوں میں شامل تھا۔ اس کی فوج میں دس ہزار عرب بھی شامل تھے۔ شواجی نے واضح احکام جاری کیے تھے کہ کسی مذہبی مقام کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیئے۔ چاہے وہ مندر ہو، چاہے مسجد، چاہے کلیسا۔ وہ اپنی ریاست کے اندر نہ ہندوؤں پر جبر کرتا تھا نہ مسلمانوں پر لیکن اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے اپنی ریاست سے باہر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے تاوان وصول کرتا تھا۔

اورنگ زیب کے بارے میں بھی ڈاکٹر پانڈے کا خیال عام رائے سے مختلف ہے۔ ان کے خیال میں یہ صحیح نہیں کہ اورنگ زیب مجنونانہ طور پر ہندو مندروں کی بے حرمتی کرتا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ شمالی ہندوستان میں تمام عبادت گاہوں کو چاہے وہ سکھوں کی ہوں، جینیوں کی ہوں یا ہندوؤں کی ہوں، اورنگ زیب نے جاگیریں دے رکھی تھیں۔ ڈاکٹر پانڈے کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب نے صرف ایک مندر کو جو وارانسی کا وشوناتھ مندر تھا مسمار کرنے کا حکم دیا تھا، اور وہ بھی اس لیے کہ ایک رانی کی جس کا شوہر اورنگ زیب کا وفادار تھا، وہاں بے حرمتی کی گئی تھی۔

امرتسر میں سکھوں کے مشہور گوردوارے گولڈن ٹیمپل کا سنگ بنیاد بھی ایک مسلم صوفی سائیں میاں میر نے رکھا تھا۔

سکھ سائیں میرا میں کو لاہور سے امرتسر تک ایک پالکی میں بٹھا کر اپنے کاندھوں پر لائے تھے۔

تاریخی غلط بیانیوں کی اصلاح آسان کام نہیں۔ ڈاکٹر پانڈے کا کہنا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں جب وہ الہ آباد میں ریسرچ کر رہے تھے، ان کی نظر سے ڈاکٹر ہرا پرشاد شاستری کی لکھی ہوئی تاریخ ہند گزری۔ اس کتاب میں درج تھا کہ تین ہزار برہمنوں نے اس بنا پر خودکشی کر لی کہ ٹیپو سلطان انہیں مسلمان بننے پر مجبور کر رہا تھا۔ یہ بات خلاف واقعہ تھی۔ لہٰذا ڈاکٹر پانڈے نے ڈاکٹر شاستری کو لکھا کہ یہ معلومات انھوں نے کہاں سے حاصل کی ہیں۔ کئی خطوں کے بعد ڈاکٹر شاستری نے انھیں لکھا کہ یہ معلومات انھوں نے میسور گزٹ سے حاصل کی ہیں۔ اس پر پانڈے صاحب نے میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو لکھا جس کا جواب آیا کہ میسور گزٹ میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس پر پانڈے صاحب نے پھر ڈاکٹر شاستری سے رجوع کیا۔ اور جواب میں ڈاکٹر شاستری نے صرف انھیں اتنا لکھا کہ اس اندراج کا ماخذ کیا تھا۔ ان دنوں یہ کتاب بہار، بنگال، اڑیسہ اور آسام میں بطور نصاب پڑھائی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر پانڈے کو مسلسل کوششیں کرنا پڑیں، تب کہیں اس کتاب کو نصاب سے خارج کیا گیا۔

اس بیان کی تصدیق کہ اکبر کی چتوڑ پر یلغار میں کسی مذہبی جذبے کو دخل نہیں تھا، فتح اسیر گڑھ کی تفصیلات سے بھی ہوتی ہے۔ فتح اسیر گڑھ کے سلسلے میں اپریل ۱۹۷۵ء کے "معارف" میں مولوی معین الدین صاحب کا جو مضمون شائع ہوا ہے وہ بہت اہم ہے۔ معین الدین صاحب رقمطراز ہیں:

تاریخی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً گیارہ ماہ تک اسیر گڑھ کا محاصرہ رہا اور اس دوران میں سخت جنگ بھی ہوتی رہی۔ قلعہ سے گولے برستے رہے اور قلعہ سے باہر راجپوتوں اور کولیوں کے چھاپہ مار دستے مغل فوج کا الگ ناک میں دم کرتے رہے۔ اس طویل عرصہ میں اکبر کے بے شمار سپاہی قتل ہوئے اور بے حساب سامان لوٹا گیا۔

جب شہنشاہ اکبر اپنی پوری طاقت لگانے کے باوجود ناکام رہا تو اس نے دھوکہ سے قلعہ پر قبضہ کرنا چاہا، چنانچہ اس نے بہادر شاہ فاروقی کو اس کی سلطنت پر قائم رکھنے کی ضمانت دے کر ملنے کے لئے بلایا۔ بہادر شاہ اسے ایک سیاسی چال سمجھ کر قلعہ سے اترنے پر راضی نہ ہوا۔ ادھر قلعہ میں غلہ سڑ گیا تھا۔ اور ہیضہ پھوٹ پڑا تھا جس کی وجہ سے اہل قلعہ پریشان تھے، اور مصالحت کے ذریعہ اکبری حملہ سے نجات پانا چاہتے تھے ——— اس لئے عرب بردار بلجارج یافعی نے بہادر شاہ سے کہا کہ جب شہنشاہ ہند آپ کو سلطنت پر قائم رکھنے کا وعدہ کر کے ملنے کے لئے بلا رہا ہے، تو آپ کو اس سے ملنے میں کیا عذر ہے۔ اگر آپ قلعہ سے اتر کر اس کے پاس نہیں گئے تو ہم آپ کو زبردستی اتار کر اس کے پاس لے جائیں گے۔

آخر کار طویل بحث و مباحثہ کے بعد بہادر شاہ کا معتبر امیر سادات خاں شاہی اجازت لے کر شہنشاہ اکبر سے عہد و پیمان لینے کے لئے قلعہ سے اترا۔ لیکن اس نے اپنے آقا سے غداری کی اور شہنشاہ سے اپنی جان و مال کی اماں لے کر اسے قلعہ کے تمام اندرونی حالات سے آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد بہادر شاہ کا دوسرا معتبر امیر مقرب خاں شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شہنشاہ نے اسے اپنی عنایتوں سے نوازا اور اس سے وعدہ کیا کہ اگر بہادر شاہ ملنے آئے گا تو اس کی سلطنت اس کے پاس قائم رکھی جائے گی۔ مقرب خاں قلعہ میں واپس آ گیا اور بہادر شاہ کو اکبر سے ملنے پر آمادہ کر لیا۔ بہادر شاہ اکبر کے وعدے پر بھروسہ کر کے اپنے وزرا، اور رام داس دربار کے ساتھ قلعہ سے اتر کر اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شہنشاہ اکبر نے وعدہ خلافی کر کے اسے اپنی حراست میں لے لیا۔ جب اہل قلعہ کو یہ خبر ملی تو انھوں نے تقریباً ایک مہینے تک قلعہ کی مدافعت کی۔ قلعہ میں بہادر شاہ کے معتبر امیر مقرب خاں کا باپ یاقوت سلطانی بھی تھا، جو نہایت شجاع و غیور تھا۔ وہ شاہی خاندان کے افراد سے ملا اور کہا کہ ابھی تک قلعہ محفوظ ہے اور جنگ کی استعداد بھی بدستور ہے، تم میں سے کون عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے آباؤ اجداد کی عزت بچاتا ہے، لیکن کوئی آمادہ نہیں ہوا۔ اس پر اس نے کہا، کاش تم عورتیں ہوتے، تاکہ معذور سمجھے جاتے، اتنے میں اس کا فرزند مقرب خاں شہنشاہ اکبر کا پیغام لے کر اس کے پاس آیا۔ تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ خدا مجھے تیری صورت نہ دکھائے، تو بہادر شاہ کو ساتھ لے کر قلعہ سے اترا اور اسے حراست میں چھوڑ کر آ رہا ہے۔ مقرب خاں کو باپ کے طعنہ کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ قلعہ سے اتر کر

اُجین کے مندر

کرشن موہن

آج بھی ہیں اُجین میں ایسے مندر جن میں
بھوگ لگا کر مورتی کو مدرا سے، مدرا کا پرساد دیا جاتا ہے
ایسا اک مندر ہے جس کے بل بوتے پر
ایک پجاری، دس کتے اور صدہا کیڑے
پلتے، پھولتے اور پھلتے ہیں
کہتے ہیں راجہ وکرم نے
بھیرو کال کے اِس مندر میں
تنتر ِیوگ کے سادھن سے، سدّھی پانے کی پوجا کی تھی۔

ی کنارے ایک ایسا مندر ہے جس میں
ہا کال کی مورتی پر، روزانہ پَو پھٹنے سے پہلے
ازہ گرم چتا کی راکھ رما کر آرتی کی جاتی ہے

کالیداس کا وہ مندر بھی ہے اجین میں، ٹوٹا پھوٹا
جس میں اُس نے اپنی پتنی کے کہنے پر
اپنے جہل سے چھٹکارا پانے کی خاطر
کالی ماں کی پوجا کی تھی۔
جس نے اس کو کویتا کا وردان دیا تھا۔
آج اس مندر میں چمگادڑ کریں بسیرا
جیسے ہو بھوتوں کا ڈیرا
یہ مندر ہے انت کا درشن
کال اندھیرا۔

گوپال متل

تجھے کبھی بے حسی راس آ گئی ہے
اسی کا نام اے دلِ زندگی ہے

گئے وہ دن کہ تھا غیروں سے شکوہ
اب اپنے آپ سے شرمندگی ہے

تو پہلی بار جب دھڑکا تھا اے دل
وہ ساعت آج پھر یاد آ رہی ہے

یہ اس کا شہر ہے، کوچہ نہیں ہے
ابھی سے اتنی کیوں وارفتگی ہے؟

ضمیر و دل میں تاریکی ہے تو کیا!
ترے چہرے پہ اب تابندگی ہے

دیا کیا کچھ نہ تو نے دینے والے
مرا دامن مگر اب تک تہی ہے

چلے بھی صرصرِ آلام تو کیا
کلی دل کی تو اب مرجھا چکی ہے

بلانوشی مجھے تسلیم ساقی!
مگر مجرم تری دریا دلی ہے

عروج زیدی

وہ غزل سب سے الگ، سب سے جدا ہوتی ہے
جس میں ارزانیِ مضمونِ وفا ہوتی ہے

یہ دوراہا بھی عجیب ہے وہ جہاں ٹھہرے ہیں
اب وفا ہوتی ہے ان سے نہ جفا ہوتی ہے

جیسے دنیا کے لئے اور کوئی کام نہیں
یوں مرے حال پہ انگشت نما ہوتی ہے

استواریِ یقیں ضامنِ گلزارِ خلیل
آگ کے شعلوں میں پھولوں کی ادا ہوتی ہے

ذوقِ پرواز کی قسمت ہے فلک پیمائی
پر سمٹتے ہیں تو محدود فضا ہوتی ہے

دوستوں میں نہ محبت، نہ مروت، نہ خلوص
ہر ملاقات میں اک رسم ادا ہوتی ہے

فرقتِ دوست کی لذت کوئی ہم سے پوچھے
جرمِ الفت کی دل آویز سزا ہوتی ہے

یہ نقابِ رخِ جاناں کو تو چھوتی بھی نہیں
اس میں کیا مصلحتِ بادِ صبا ہوتی ہے

وہ سمجھ لیتے ہیں مفہومِ اشارات، عروج!
ہم کلامی وہاں بے حرف و صدا ہوتی ہے

کوشل مراری

پہلے جیسی بات کہاں اب میرے دل کی دھڑکن میں
لمحہ لمحہ ٹوٹ رہا ہے بھٹکی بھٹکی الجھن میں

رہ رہ کر یہ سوچ رہی ہے کوئی اس کو دیکھ نہ لے
اپنا روپ سلونا گوری دیکھ رہی ہے درپن میں

ساغر سے چھلکا ہے سویرا، ایسی جھنکار رہے
سونی کی راتوں کا پرتو ہے نینن کے آنگن میں

ساجن کی باہوں میں گوری اپنا سب کچھ بھول گئی
مادکتا لہراتی جائے چنچل شوخ سمرپن میں

کوئی وِش سارا پی جائے اور شنکر کہلائے
کوئی امرت کو چکھے ہے من ساگر کے منتھن میں

آج پون کی شوخی کھیل رہی ہے حسن کا نٹوں سے
لے کر کلیوں کی کوملتا اپنے رنگیں دامن میں

روپ کی چھایا ایک چھلاوا جیون ایک پہیلی ہے
کون کہاں تک سنبھلتا جائے الجھی الجھی تڑپن میں

اشکوں کی شبنم چمکی ہے مسکانوں کے پھول کھلے
دو رنگی رنگت تڑپائے جیون کے اس اپون میں

جنموں کا بن باس لئے ہیں بھٹکیں گے ہم بن بن
جب تک ہے رادن کی چھایا من کے چنچل درپن میں

ساحر ہوشیارپوری

جل ترنگ

جل ترنگ
بوندیوں کا جل ترنگ
ننھی ننھی بوندیوں کا جل ترنگ
فرش سے تا عرش چھایا تھا غبار
دھل گیا ہر شے کا چہرا، حسن پر آیا نکھار
پیٹ سے دھرتی کے نکلی سوندھی سوندھی خوشبوؤں کی اک پھوار
جل ترنگ
بوندیوں کا جل ترنگ
ننھی ننھی بوندیوں کا جل ترنگ

مخمور سعیدی

ایک پل سرِ دشتِ تپاں رُکے بادل
ہوا کے دوش پہ اڑتے چلے گئے بادل

سلگتی شام کے در پر اداسیوں کا نزول
دھواں دھواں سی فضائیں، جھکے جھکے بادل

سمٹ کے خود میں کہیں دور جا چھپا سورج
افق سے تا بہ افق پھیلنے لگے بادل

یہ آسماں، کوئی سادہ سلیٹ ہے جس پر
بنا کے نت نئی شکلیں، مٹائیں گے بادل

ارے یہ کیا؟ کوئی اُن میں سے مجھ پہ آن گرا!!
میں جل رہا تھا مرے آس پاس تھے بادل

اُدھر تھی دھوپ، جدھر بستیاں تھیں پھولوں کی
اجاڑ سمتوں پہ سایہ کیے رہے بادل

بکھر کے رہ گئے موجِ غبار کی مانند
اُلجھ پڑے تھے ہواؤں سے سرپھرے بادل

ہوا کے ہاتھ کی شمشیرِ آبدار — دھنک
ہوا کے ہاتھ میں چمکی تو چھٹ گئے بادل

زمیں کی پیاس بجھانے اٹھے مگر مخمور
سمندروں ہی پہ جا کے برس پڑے بادل

رفعت سروش

نے کب سے میں اس سفر میں ہوں
ع تلک تیری رہگذر میں ہوں

یک دیوانہ ایک سودائی
بھی ہوں آپ کی نظر میں ہوں

میری پرواز ہے ابھی محدود
میں ابھی قید بال و پر میں ہوں

زندگی ایک خواب بے تعبیر
میں بھی اس خواب کے نگر میں ہوں

کل بکھر جاؤں گا بہ رنگِ شمیم
آج پیراہنِ شرر میں ہوں

ہوں تو ناچیز ذرۂ خاکی
زمزمہ ریز بحر و بر میں ہوں

ناقدوں سے یہ پوچھتا ہے سروش
میں بھی کیا آپ کی نظر میں ہوں

چندر پرکاش شاد

مرا زہر میرے نفس پہ کام نہ کر سکا
میں وہ آسماں کہ نہ جان و تن سے اتر سکا

وہیں ڈھیر ہونا پڑا مجھے کہ میں اور تھا
کہ وہ بھیڑ تھی نہ میں چل سکا نہ بکھر سکا

لبِ آب جو کہ تپیاؤں کی راکھ تھی
میں وہ تہ نشیں کہ نہ ڈر کے مارے ابھر سکا

مرے پاؤں میں رم رنگ بھی رم سنگ بھی
کہ میں اڑ سکا کہ میں بستی بستی ٹھہر سکا

میں جو رشتہ رشتہ بکھر گیا ہوں تو کیا ہوا
مرا آس پاس نشیب اپنے تو بھر سکا

اسے کیل کانٹوں میں ڈال کر میں ہوں خوش بہت
وہ لہولہان ہوا تو اور نکھر سکا

وہ ستون پر جو مجسمہ تھا وہ کس کا تھا
کہ جو کٹ گرا تو کوئی سنبھال نہ کر سکا

غلام مرتضیٰ راہی

درخت کی کلائیاں مروڑ کر چلا گیا
پرندہ اپنا اعتبار چھوڑ کر چلا گیا

عجب اختیار آگیا تھا اس کے ہاتھ میں
بڑے بڑے مجسموں کو توڑ کر چلا گیا

قریب تھا کہ دیکھتا وہ اپنا عکس ہر طرف
پسِ غبار آئینوں کو چھوڑ کر چلا گیا

ہمارے بازوؤں کا زور دیکھتا رہا کوئی
کڑی کڑی بکھر گئی تو جوڑ کر چلا گیا

پہاڑ منزلوں کی طرح سامنے کھڑے رہے
سوار تھا کہ راستے کو موڑ کر چلا گیا



قومی بچت ادارہ بچتوں کیلئے کیوں ایک اہم تنظیم ہے

اس لیئے نہیں کہ اس کے بچتی کھاتوں میں دوسری بچتی تنظیموں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ روپیہ جمع ہے یہ رقم 60 کا 35 کروڑ روپے بھی ہے اس لئے بھی نہیں کہ ملک میں اندرونی قرضوں کی خاص رقم سے 23% اس کے ذریعہ فراہم کی جاتی ہے۔

بلکہ اس لئے

کہ اس کے پاس ہر طبقے کے لوگوں کے لئے بچت کی اسکیمیں ہیں۔

بچوں، طالب علموں، عورتوں، تنخواہ پانے والے افراد، اپنا کام کرنے والے لوگوں اور ان لوگوں کے لئے بھی جو زیادہ بچت کر سکتے ہیں۔

اس ادارہ کی برانچوں کی تعداد بھی سب سے زیادہ ہے — ملک بھر میں ایک لاکھ سے زیادہ ڈاک گھر۔

اس ادارے کے منظور شدہ ایجنٹ اور سماجی کارکن جگہ جگہ موجود ہیں جو بچتوں کے سلسلے میں ہر وقت آپ کے گھر پر آپ کی مدد کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

قومی بچت ادارہ کی بچتی اسکیموں پر آپ کو خاصہ سود ملتا ہے اور کئی اسکیمیں انکم ٹیکس سے بھی مستثنیٰ ہیں۔

قومی بچتوں کے ذریعہ جمع شدہ آپ کی رقوم براہ راست قومی ترقی کے کاموں پر خرچ کی جاتی ہیں۔

قومی بچت ادارہ کی بچتی اسکیموں میں پونجی لگائیے۔



نیشنل سیونگز کمشنر
پوسٹ بکس 96 — ناگپور

davp 75/113

بقیہ۔ غلطیہائے مضامین

ابوالفضل کی محفل میں گیا اور پیٹ میں خنجر مار کر خودکشی کر لی۔ ادھر یاقوت سلطانی نے شاہی خاندان کے رویّہ سے مایوس ہو کر دشمن کی محکومی کی ذلت پر عزت کی موت کو ترجیح دی۔ چنانچہ اس نے اپنی تعمیر کردہ مسجد میں بڑی دیر تک نماز پڑھی، پھر خیرات کی، اسی مسجد کے قریب اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودی، اپنا کفن تیار کیا، پھر عزیزوں کو وصیت کرنے کے بعد افیون کھا کر خودکشی کر لی، اور اسی قبر میں دفن کیا گیا۔

فتح اسیر گڑھ کا ایک عبرتناک پہلو یہ ہے کہ بہادر شاہ فاروقی کی حکومت اس شہنشاہ اکبر نے چھینی جس کی حمایت میں بہادر کے والد عادل شاہ فاروقیؒ، اس کے ۳۵ نامی سرداروں اور بے شمار سپاہیوں نے ۱۵۰۰ھ میں احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی ساٹھ ہزار فوج سے لڑتے ہوئے نادر پڑ کے میدان جنگ میں اپنی جانیں قربان کر دی تھیں، پھر لطف یہ ہے کہ بہادر شاہ شہنشاہ اکبر کا بھی عزیز تھا، اور فاتح اسیر گڑھ ابوالفضل کا بھی۔ چنانچہ شہزادہ مراد کی بیوی بہادر شاہ کی بیٹی تھی، اور بہادر شاہ کی بیوی ابوالفضل کی بہن، سچ ہے انسان حرص دنیا میں مبتلا ہو کر نہ کسی کے احسان کا خیال کرتا ہے نہ رشتہ کا لحاظ "

بقیہ ـ داس کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ ...

اردو ادیبوں نے زور شور سے "دھرم یگ" میں اپنی تحریریں ناگری دستخطوں کے ساتھ چھپوانی شروع کیں۔ لیکن مجوزہ کنونشن ٹلتا گیا۔ پوچھنے پر ان لوگوں نے بتایا کہ اردو والوں کا ایک بڑا طبقہ اپنے خیالات میں بہت راسخ ہے۔ اور اس تجویز کا سخت مخالف۔ انہیں قائل کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔"

محسن شمسی

خیر و شر

دنیا ابھی بنی نہ تھی۔ فرشتے تھے ناآشنا۔ عبادت میں معروف ان ہی کی خاطر۔ خیر کل کو اس نے عناصر کی ٹھوس شکل عطا کردی اور کہا۔ "دیکھوگے جو نہ دیکھا تم نے۔ خیر کو اپنے خالق کے اس شکل میں پہچانوگے جو تم جانو۔" پھر یکجا کیا اور کہا۔ ان سے سامنے جانے لو۔ فرماں بردار وہ بھولا۔ سامنے جب آیا تو گر گئے۔ سجدے میں اور لگے کہنے: "خیر تو بس تو ہے۔ اب دکھا دے وہ تخلیق بھی جو تری نیرنگی ہے۔" کہا: "کرشمے کو ظہور تم نے جانا سجدے میں نہ گروگے اب جب تک حقیقت کو نہ پہچانو گے۔ رب جاننے والوں کا علم تمہارا چیزوں پر قادر ہے۔"

پھر دور کر دیا اس کو جو خیر کی تخلیق کی تھی۔ حکم دیا بھوک کو ڈالے پھندے اپنے کہ خیر اس کا قید سے نہ نکلے۔ بھوک نے دکھایا غذا تھے ایک کی ایک چوپائے اور اڑنے والے اور لہراتے پھرتے جو پانیوں میں اور زمینوں میں۔ آمادہ نہ پایا خود کو جاندار کی جان لے۔ پھیرا منھ اور لیا سمیٹ کر ہوئے پھل کو۔ بولا دھرتی سے "لوں گا۔ سب آغوش میں ہے۔" پر وہ میرے فاتے ہمیں ڈھونڈ لیا بیجوں کو ـــــ بھیج دیا قحط کو کہ درخت کو سکھا دے۔ زمین کو بنجر کردے۔ مٹی اڑی مرغزاروں میں۔ دم دے ڈال ساتھی کھائے نے جس کے دودھ سے جیتا تھا۔ ٹوٹا دل بولا "تنہا چھوڑا مجھ کو۔" گویا گریہ کار آمد جو اس کا سوچا تھا۔ "تو کا بھوک نہ جو نہ کھائے گا خیر کا پیکر شکست ہو جائے گا۔" کیا کرتا نہ کرتا۔ بیٹھا سوچ میں رہتا۔ "جو ملے نشانی کوئی تو ٹوٹے ہو جائے نہ ـــــ" کہ اٹھا پر جب گدھ نو کھاتے دیکھا "اس کی روح الفت نہ مرے گی مجھ میں زندہ ہو گی۔ یہ جسم تو بس ایک خانہ" پھر سجا کے اس کے سر کو اٹھا لیا دھڑ کو۔ رکھا منہ میں تو جانا پھیلا حلقہ تھا۔ اور رکھنے لگا وہ روزے جب خیال اس کا آتا۔

پھر بانٹا اس کو دو ٹکڑوں میں۔ علیحدہ ان کو کر ڈالا۔ اور بھیجا غم کو کہ مسوس ڈالے دل کو بیٹھے رہیں بوجھل، پوچھیں اس کو جو قوت والا ہے۔ ہار لگا کہنے: "پاؤں گا کیا اب جو حاصل نہ ہوگا۔" پھر یاد کیا خیر کو اپنے اور کھڑا ہو گیا۔ جب درمیاں چٹانوں کے مٹھی بھر مٹی سے پھول کو کھلتے دیکھا۔

مگن نے ان کی پہنچایا وہ ہوئے مقابل۔ دل کہنے لگے "وہ ہے جو مجھ میں نہ ہے۔" ڈھونڈا اور پایا۔ دیا اپنا کچھ اور حاصل کیا جو پیش ہوا تھا۔ مسرت سے مٹایا داغ ہمت توڑ حسرت کے غم کا ایک نظم کائنات جس کو وہ جانے ـــــ کہا بیماری سے خوشی اس کی چھینے۔ درد سے گھیرے۔ علیحدہ کردے جو بے مرضی ملایا۔ بیماری اس پر پھیلی۔ حصے ہوئے تار تار۔ آلودہ کرتا ہاتھ جہاں لگاتا۔ وہ خدمت سے دلجوئی کرتی کیا کچھ نہ کرتی۔ لگا دیکھنے بیماری لگ جائے گی۔ اور وہ بھی دکھ پائے گی۔ جانا کہ اب دو تھے۔ بولا "چھوڑ دو اور بچا لو جو ہے تمہارا۔" ہاتھ پکڑ کر بولی قید مرضی سے جو آزادی مل جائے۔ دل کی خلش مٹے غم کا مداوا ہو جائے نہ ـــــ چاہتا نہ چاہتا ـــــ دیکھا شبنم کے قطرے کو۔ سمندر کا پانی جس سے بیل پھلی پھولی۔ تو قصد کر لیا جدائی کا

پھر چھین لی پہچان اس سے اپنے عمل کی۔ کیا جس اخلاق کو خواہش سے علیحدہ۔ ارادہ کو فکر سے بے گانہ۔ فریب نظر نہ بنے جالے۔ آہٹ اس آفت کی پائی۔ پریشان حال بولا: "یہ تو بربادی ہے۔ کیا کروں جو کچھ نہ سمجھوں۔" پراگندہ بیٹھ رہا درخت کے نیچے۔ چوٹی پر چٹانوں کی جا کے۔ کیا ملے آخر بولا "تکمیل عمل سے نہ ہوگی۔" منھ موڑا معروضی سچ سے۔ جو ہوا احساس خودی میں۔ ایک نئی دنیا ڈھونڈ نکالی۔ اس کی تھی پرانی۔ سمجھا کچھ اور کبھی تھا جو سب وقت نہ تھا۔ دل دھڑکا بولا: "راز جو پا لوں خوابوں کا سنسار ٹھوس ہو جائے۔ خواہش عمل ارادہ یہ ہے۔ فکر کا یہ اخلاق

باقی صفحہ ۲۲ پر

سلیم شہزاد

نقطے اور لکیریں

ہم نے جب سفر شروع کیا تھا تو موسم سازگار تھا۔ تمام راستوں پر سنگِ میل تھے۔ اور ہم جانتے تھے کہ ہمیں کس سمت جانا ہے۔ ہم نے اپنا اپنا بوجھ شانوں پر لاد رکھا تھا۔

ہم میں سے ایک (شاید میں یا ممکن ہے وہ کوئی اور رہا ہو) کہہ رہا تھا۔ رنگ کبھی مرتے نہیں۔ رنگ دیوتا ہیں اور ہم ان کے بندے ہم نے رنگوں کی تلاش کو اپنا مقصدِ حیات بنایا ہے۔ جب ہم بے شمار رنگ پالیں گے تو انھیں سونے کی المانیوں میں بند کردیں گے تاکہ وہ آئندہ نسلوں کے کام آسکیں۔

ہم نے (کسی نے) اس کی (میری) بات کاٹی "اب تک جتنے رنگ ہم نے بستی بستی گھوم کر جمع کئے ہیں، آؤ ذرا انہیں دیکھ لیں تاکہ ہماری آنکھوں کی روشنی بڑھے۔"

تب ہم نے شانوں پر لدا ہوا بوجھ زمین پر رکھ دیا۔ اور جتنے رنگ ہم نے بستی بستی گھوم کر جمع کئے تھے انھیں ایک کینوس پر پھیلا دیا۔

ہم میں سے کوئی (میں؟) رنگوں کے دیوتاؤں کی تعریف میں ایک صدیوں پرانا گیت گانے لگا۔ باقی جلتی زمین پر دوزانو بیٹھ گئے۔ اور گانے والے کی آواز میں معبدوں کے کورس کی پراسرار لے کی طرح آواز ملانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کینوس پر پھیلے ہوئے رنگوں میں امتزاج رونما ہوا۔ اور ایک شبیہ متشکل ہوئی۔

ہم نے جلتی زمین پر پیشانی رکھ دی۔

اور پھر یوں ہوا کہ نامعلوم افق سے اٹھنے والی تاریکی نے انلی نیلے رنگ کو ڈھک لیا۔ کینوس پر ابھرنے والی شکل اس تاریکی میں مدغم ہوگئی۔ اور ہم نے محسوس کیا کہ ہماری آنکھیں کسی ٹھہرے کنوئیں میں اترتی چلی جارہی ہیں۔

سب کچھ چند لمحوں میں ہوگیا۔

لیکن لوگ کہتے ہیں کہ انھیں صدیوں سے اندھیرے کے اپنے ورثے میں کچھ نہیں ملا۔ کیا لوگ سچ کہتے ہیں؟ (سب کچھ تو چند لمحوں میں ہوگیا تھا) ہم نے جلتی زمین پر بکھرے ہوئے کینوس پر بکھرے رنگوں کو ٹٹولا اور جب اپنے ہاتھوں پر نظر گئی تو وہ کالے تھے۔

ہم نے اپنا رختِ سفر وہیں چھوڑ دیا۔ اور اپنے راستے پر (نہ جانے کون سی ویرانیوں؟) چل پڑے۔ میں نے (ہم میں سے ہر ایک نے) محسوس کیا کہ دھیرے دھیرے باہر کی سیاہی ہمارے اندر میں جڑ پکڑتی جارہی ہے۔ اور ایک دن ——— رگوں میں جراثیم کی طرح پھیلنے والی سیاہی نے مجھے (ہم میں سے ہر ایک کو) اپنا مریض بنا ڈالا۔

ہم نے جب سفر شروع کیا تھا تو ہم بے شمار تھے۔ جب راستوں پر سنگِ میل تھے اور ہم جانتے تھے کہ ہمیں کس سمت جانا ہے۔ مگر اب راستوں کے سنگِ میل کھوکھلے درختوں کی طرح ادھر ادھر گرے پڑے تھے۔ اور اس طرح سمتوں کا تصور فنا ہو چکا تھا۔ سمتوں کے زوال کے احساس نے ہم میں سے ایک ایک کو کم کرنا شروع کیا۔ جس جگہ ہم قیام کرتے وہیں اپنے برتاؤ سے کچھ لوگ (ان میں شاید میں بھی تھا) ایسا ظاہر کرنے لگتے کہ ہم آگے جانا نہیں چاہتے۔ (تو کیا وہ (ہم) جہاں رک گئے تھے۔ وہی مقام ان کی (ہماری) منزل تھا؟ کیا ان کا (ہمارا) فیصلہ صحیح تھا؟)

——— ہم میں سے ایک (میں؟) رک گیا۔ اور جب اس طرح کوئی رک جاتا تھا تو ہم اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے، کیونکہ ہم جانتے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، اس نے (میں نے) کہا، "رنگوں کے دوام کا بھرم ہم پر منکشف ہو چکا ہے۔ رنگوں کا حصول ہمارا مقصدِ حیات تھا۔ مگر رنگوں کی ناپائیداری نے اسے ٹھیس پہنچائی ہے۔ ہمارے اندر اور باہر جو اندھیرا مسلط ہے اس نے ہم سے سمتوں کا ادراک بھی چھین لیا ہے۔ میرا خیال ہے اور ہم میں سے ہر ایک کا خیال ہے کہ ہم سے الگ ہو جانے والے اپنی

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

(ڈاکٹر) عابدہ سعید

خاکہ نگاری

انشائیہ، افسانہ، ڈرامہ اور ناول کی طرح خاکہ Sketch بھی ادب کی ایک جداگانہ اور منفرد صنف ہے۔ اردو ادب میں اس صنف کے ابتدائی نقوش جنھیں Proto type sketch کہا جا سکتا ہے۔ قدیم تذکروں اور دیگر تصانیف میں مل جاتے ہیں لیکن ایک مستقل صنف ادب کی حیثیت سے اردو میں خاکہ نگاری کا رواج انگریزی ادب کے زیر اثر ہوا۔ خاکہ انگریزی اصطلاح sketch کا متبادل ہے۔ لفظی مفہوم میں خاکہ کسی موضوع کے ابتدائی نقوش کو کہیں گے جس کی بنیاد پر کسی شئے کی مکمل بت گری ممکن ہو۔ لیکن ادب اور فن میں یہ اصطلاح مختلف مفہوم رکھتی ہے خاکے کی اصطلاح مصوری میں بھی رائج ہے مصور اگر کسی شخص کی مکمل اور بعینہ تصویر پیش کرے تو اسے پوٹریٹ کہیں گے۔ اس کے برخلاف اگر چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے اس شخص کے خد و خال کی جھلک دکھا دے تو وہ اسکیچ کہلائے گا۔

ادب میں یہی فرق سوانح اور خاکہ میں پایا جاتا ہے۔ سوانح نگار کسی شخص کے حالات زندگی کے جزئیات التفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے جبکہ خاکہ نگار کسی فرد کی زندگی اور کردار کی چند جھلکیاں پیش کر دیتا ہے۔ ادبی خاکے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی حقیقی شخصیت ہی کو اپنا موضوع بنائے۔ بلکہ خیالی شخصیت بھی خاکے کا موضوع ہو سکتی ہے۔ مثلاً شاہد احمد دہلوی کے "بنکھے والے حافظ جی" انگریزی ادب میں ایسے بے شمار خاکے لکھے گئے ہیں۔ انہیں کردار یا کیریکٹر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اردو میں عام طور پر خاکے کی اصطلاح حقیقی شخصیتوں کے خاکوں کے لیے رائج ہے خاکہ کے لیے بعض دوسری اصطلاحیں بھی مروج ہیں مثلاً مرقع شخصی مرقع اور قلمی تصویر وغیرہ۔ اردو میں سوانح نگاری" کے مصنف ڈاکٹر سید علی شاہ نے اس صنف ادب کو شخصی مرقع کا نام دیا ہے نثار احمد فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں اس کے لیے خاکے کی اصطلاح تجویز کی ہے اسی طرح محمد حسنین نے اپنے ایک مضمون میں اسے " قلمی تصویر " اور

مرقع سے موسوم کیا ہے۔ یہ تمام اصطلاحیں حقیقی شخصیتوں کے خاکوں کے لئے تجویز کی گئی ہیں خیالی شخصیتیں اور کرداران کے دائرے سے خارج ہیں۔ لیکن فنی اور ادبی اعتبار سے یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ خاکے کا موضوع حقیقی شخصیت ہے یا خیالی "مرقع" کی اصطلاح جو محمد حنیف نے تجویز کی ہے انگریزی کی مروجہ اصطلاح sketch کی مترادف نہیں ہے۔ یہ اصطلاح خاکے کے بجائے مکمل تصویر کے مفہوم کی حامل ہے۔ قلمی تصویر کی اصطلاح میں بھی یہی خامی ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہوگا کہ خاکے کی اصطلاح کو وسیع تر مفہوم میں اختیار کیا جائے جس میں حقیقی اور خیالی شخصیتیں دونوں شامل ہوں اس وسیع تر مفہوم میں خاکہ کی حدود اور اس کی ماہیت پر ہنوز کسی نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر جتنے مضامین لکھے گئے ان میں صرف شخصی خاکے ہی کو خاکہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ وضاحت کی گئی ہے شخصی خاکے اور خیالی خاکے میں فنی اور ادبی اعتبار سے نمایاں فرق نہیں ہے۔ اس لئے جو باتیں شخصی خاکے کے بارے میں کہی گئیں بڑی حد تک ان کا اطلاق خیالی خاکوں پر بھی ہوتا ہے۔ خاکے کے حدود اور اس کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے مناسب ہوگا کہ مختلف نقادوں کی تعریفات اور توضیحات کا مختصر جائزہ لیا جائے۔ سوائے ڈکنیس کے کسی نے بھی خاکے کے اصطلاح کو وسیع تر مفہوم میں استعمال نہیں کیا۔ اردو میں خاکے کی اصطلاح صرف کرداری خاکے character sketch کے لئے مخصوص ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ خاکہ کی دوسری صورتیں اردو میں بہت کم ملتی ہیں نثار احمد فاروقی نے "اردو میں خاکہ نگاری" میں خاکہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ "خاکہ کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے" فاروقی صاحب نے شخصیت کے معروضی مطالعہ پر زور دیا ہے۔ انہوں نے خاکہ کو صرف حقیقی شخصیتوں کے مطالعہ تک محدود رکھا ہے۔ خیالی خاکوں میں معروضی

مطالعہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ خاکے کا موضوع اگر حقیقی شخصیت بھی ہو تو خاکہ نگار بہرحال اس شخصیت کی دوبارہ تخلیق کرتا ہے۔ داخلیت یا معروضیت کی اصطلاحیں بڑی حد تک مسلّم ہیں اور یہ ادبی تنقید میں پیشے بن گئی ہیں۔ ہر اچھی تخلیق میں داخلی احساس کارفرما ہوتا ہے اور اظہار کے ہر اچھے پیرائے میں ایک طرح کی معروضیت پائی جاتی ہے۔

آمنہ صدیقی لکھتی ہیں کہ "سوانح نگاری کی بہت سی صورتیں ہیں۔ انہی میں سے ایک شخصی خاکہ ہے۔ یہ دراصل مضمون نگاری کی ایک قسم ہے جس میں کسی شخصیت کے ان نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے جن کے امتزاج سے کسی کردار کی تشکیل ہوتی ہے شخصی خاکہ کسی فرد کی مکمل داستان حیات نہیں ہوتا بلکہ فرد کی نمایاں خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے۔ اس میں تفصیل سے زیادہ ابہام ہوتا ہے اور ایسے اشارے کئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہو جاتا ہے۔"

آمنہ صدیقی نے خاکے کو سوانح نگاری کی ایک صورت بتایا ہے لیکن یہ خیال صحت پر مبنی نہیں خاکہ، سوانح سے جداگانہ چیز ہے۔ خاکہ سوانح کا خلاصہ نہیں ہوتا اس لئے یہ ضروری نہیں کہ خاکے کا مطالعہ کرنے والا موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہو جائے یہ ضرور ہے کہ خاکے کا ڈھانچہ ساخت اور ہیئت انشائیہ جیسی ہوتی ہے لیکن محض ساخت کی یکسانیت کے سبب مختلف نوعیت کی تخلیقات ایک ہی صنف میں شامل نہیں ہو جاتیں حالی کی نظم "مدّوجزر اسلام" اور انیس و دبیر کے مرثیوں کا سانچہ ایک ہے۔ ان کا سانچہ مسدس کا ہے۔ لیکن اس بنا پر ہم حالی کے مسدس کو مرثیہ نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح خاکے کو مضمون نگاری یا انشائیے کی ایک قسم قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ خاکے کے بارے میں محمد حنیف لکھتے ہیں "نوک قلم کی تصویر کشی خاکہ نگاری ہے۔ قلمی تصویر یا مرقع سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ خاکہ ایسی تصویر ہے جو کسی بت تراش یا مصوّر یا فوٹوگرافر کا عمل نہیں۔ اس تصویر کا خالق قلم کار ہوتا ہے۔ خاکہ کسی فرد واحد کی کم سم تصویر نہیں۔ یہ ہنستی بولتی تصویر ہے جو ہمارے احساسات کو برانگیختہ کرنے کی قوت رکھتی ہے۔"

یہ تعریف بھی ادھوری اور ناقص ہے۔ خاکے کو مرقع یا قلمی تصویر کہنا مناسب نہیں ہے۔ قلمی تصویر یا مرقع میں شخصیت کی سراپا نگاری اور عادات و اطوار پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے جب کہ خاکہ میں کردار کی مختلف خصوصیات کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

شمیم احمد کرمانی نے لکھا ہے "خاکہ نگاری ادب کی ایک صنف ہے جس میں شخصیتوں کی تصویریں اس طرح براہ راست کھینچی جاتی ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن دونوں قاری کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھنے والے نے نہ صرف قلمی چہرہ دیکھا ہے بلکہ خود شخصیت کو دیکھا بھالا اور سمجھا بوجھا ہو۔"

خاکہ صفحۂ قرطاس پر نوک قلم سے بنائی ہوئی ایک شبیہ ہے یہ بے جان ساکت اور گم صم نہیں ہوتی یہ بولتی ہوئی متحرک پرکشش تصویر ہوتی ہے ایک اچھے مصور یا بت تراش کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ اس پیکر میں کسی دل پذیر تیور کی جھلک بھی دیدے۔ مگر ایسی تصویر بنانا مصوّر، بت تراش یا فوٹوگرافر کے بس سے باہر ہے جسے دیکھ کر ہم فرد کی سیرت اور انفرادیت کا بھی اندازہ کریں۔

جہاں تک خاکے میں حلیہ نگاری کا تعلق ہے اس کا تقابل تصویر یا مجسمے سے کیا جا سکتا ہے، اس کے آگے خاکے اور تصویر یا مجسمے میں مماثلت اور اختلاف کے پہلو تلاش کرنا بے سود ہے۔ خاکے کی کوئی ایسی جامع تعریف کرنا ممکن نہیں ہے جو اس کے تمام فنی اور ادبی پہلوؤں پر حاوی ہو۔ البتہ اس کے بنیادی اصول اور اہم خط و خال کی یوں نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ خاکہ ایک صنف ادب ہے۔ اس کا سانچہ انشائیہ کا ہوتا ہے اور اس میں کسی شخصیت (حقیقی یا خیالی) کی زندگی، سیرت و صورت اور کارناموں کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔ اور وہ شخصیت کے ایک ایسے مرقع کو پیش کرتا ہے جس سے پڑھنے والے کو جمالیاتی حظ حاصل ہو۔

ہمارے ادب میں خاکے نے ایک ممتاز جگہ بنالی ہے نسبتاً قلیل تر عرصے میں اس صنف میں کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے جو سرمایہ جمع ہو گیا ہے اسکی مثال دوسری اصناف میں ملنی مشکل ہے۔ شاید ہی کسی اور صنف میں اس قدر کم مدت میں اس درجہ بیش قیمت ذخیرہ جمع ہوا ہو۔ خاکہ کی نوعمر صنف ادب

شکستِ جمود

شباب للت

وشاؤں کی جبیں پر منجمد سفاک سناٹا
مناظر کی یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں
یہ بیزاری کی چادر اوڑھ کر پہلو بدلتے اونگھتے لمحے
جماہی پر جماہی
نیند کی کائی جمی ہے وقت کی یخ بستہ سِل پر

حقیقت میں
یہ اپنی زندگی بھی شہر کے مرکز میں استادہ
پرانے گھنٹہ گھر کا
تنگ اونچا سا منارا ہے
نہ جانے کتنے برسوں سے
مری سانسیں
گھڑی کی سوئیاں بن کر مسلسل گھومتی ہیں

ہماری زندگی رنج و محن سے پُر ہو یا معمور خوشیوں سے
جو سچ پوچھو
تو اس کے واسطے یکسانیِ ماحول سا قاتل نہیں کوئی
— تو اپنی زندگی کیا ہے۔
بھیانک بے حسی کا ایک بھونڈا سا لطیفہ؟
نہ ہو اس میں اگر کوئی تحیر خیز ہنگامہ
کوئی فتنہ، دھماکہ یا تلاطم
خوشی کی قید بھی، رنج و محن کی قید کی صورت
بڑی بیزار کن ہے

یہی ماحول کی یکسانیت تھی جس سے تنگ آکر
ہمیشہ کے لئے میں چھوڑ آیا تھا
وہ جنت اپنے خالق کی
جہاں عیش و طرب کے پھول کلیوں کی دوائی مجتیں تھیں
کوئی کانٹا نہ تھا رنج و محن کا اس گلستاں میں
"نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہو لیکن"
بہت بیزار تھا یکسانیِ ماحول سے آدم
جسارت کے سوا چارہ نہ تھا کوئی رہائی کا

عبدالمتین نیاز

آخری سفر

زندگی مجھ کو رہائی دے کہ میں
آسمانوں کا پرندہ، وسعتوں کا ہمسفر
روشنی و رنگ کی ان جنتوں کو کھوج لوں
جو صحیفوں میں کہانی کی طرح مرقوم ہیں
جن کے بارے میں بزرگوں نے کہا تھا مجھ سے یہ
دائمی خوشیاں
یہ ساری جسم و جاں کی لذتیں
تم آخرت میں پاؤ گے
زندگانی ریت کے جب ٹیلے تلے سو جاؤ گے۔
ایسی خوش آئند باتیں
سن رہا ہوں میں ہزاروں سال سے
زندگی مجھ کو رہائی دے کہ میں
ایسی سب باتوں کی سچائی سے واقف ہو سکوں
آنے والی ساری نسلوں پہ یہ ظاہر کر سکوں
تو دکھوں کا خواب ہے تجھ کو نہ دیکھے اب کوئی
اور اگر یہ جھوٹ ثابت ہو تو پھر سے لوٹ آؤں
اپنی ہستی کو دکھوں میں بانٹ دوں
اور خوشیوں کی ہر اک امید سے منہ موڑ لوں

دولت جہاں زیدی

ایک آہٹ

پرسکوں وادیاں
کوئی آہٹ نہ کوئی صدا
اپنے احساس سے بے خبر زندگی ...
کتنی سنسان تھی ———
ایک آہٹ ملی .....
سانس لینے لگیں ....
پرسکوں وادیاں
زندگی آ گئی ———
دور ہوتی ہوئی ایک آہٹ پہ اب
سانس کھنچتی چلی جا رہی ہے ـ

احمد وصی

نرم گیلی ریت پہ جب گر پڑا بھیگا بدن
درد کے احساس سے ٹوٹا گیا میرا بدن

صبح سے چھایا ہوا ہے میری آنکھوں میں دھواں
رات میں نے خواب میں دیکھا تھا اک جلتا بدن

دو جُدا دھاروں کا آپس میں کوئی رشتہ تو ہے
روح کی ناکامیوں پہ عمر بھر تڑپا بدن

خنجروں سے جنگلوں سے دار سے بازار سے
سچ کے کتنے راستوں سے بار ہا گذرا بدن

عمر کی اُجلی ندی دن کی طرح ایسی چڑھی
رات کی تاریکیوں میں کھو گیا اُجلا بدن

سانس کی رنگین تتلی آسماں میں اڑ گئی
خشک سوکھی جھاڑیوں سے رہ گیا الجھا بدن

جو ذرا سا فرق تھا وہ بھی نہیں باقی رہا
ایک جیسا ہو گیا ہر بدن ۔ ہر بدن

احتشام اختر

جو زخم دل پہ لگا ہے وہ بھر نہ جائے کہیں
کتاب درد ہوا میں بکھر نہ جائے کہیں

بجھی کہاں ہے ابھی پیاس دل کے صحرا کی
چڑھی ہوئی ہے جو ندی اتر نہ جائے کہیں

ہوا نے اس کو بنایا ہے سرکش و مغرور
پتنگ ڈور سے خود کٹ کے مر نہ جائے کہیں

جھلس رہا ہوں میں خود اپنی آگ میں لیکن
مرے عذاب کی اس تک خبر نہ جائے کہیں

بگاڑ دی ہے مری شکل وقت نے اختر
مجھے وہ دیکھ کے اس طرح ڈر نہ جائے کہیں

عبداللہ کمال

لہو لپک بھی رہا تھا کوئی سرا بھی نہ تھا
وہاں سے بچ کے نکلنے کا راستہ بھی نہ تھا

کہیں کہیں پہ تھیں روشن صدیوں کی تحریریں
ابھی تو پوری طرح سے وہ گھر جلا بھی نہ تھا

وہاں میں درد کا مفہوم کس کو سمجھاتا
میں اجنبی تھا مجھے کوئی جانتا بھی نہ تھا

اٹھا کے تیشہ نئی سمت دی نگاہوں کو
پہاڑ کلٹتے رہنے میں فائدہ بھی نہ تھا

حصار کھینچ لیا میں نے خود ہی اس حد پر
کہ اس کے بعد مرے سامنے خدا بھی نہ تھا

ظفر زیدی

اپنے بدن کی سوچ سے باہر ہوا ہوں میں
اونچی اڑان بھرنے میں بے گھر ہوا ہوں میں

دل کی جراحتوں پہ مقدر ہوا ہوں میں
بے ننگ و نام فن کا مقدر ہوا ہوں میں

آیا ہوں زد پہ کتاب و عصا و دشمنوں کی سمت
کس دور بے یقیں میں پیمبر ہوا ہوں میں

نازل نہ ہو سکا میں صحیفوں کے دور میں
لوحِ جہاں پہ اجنبی اکثر ہوا ہوں میں

بے دست و پا حریف سے لیتے ہیں انتقام
ان بزدلوں کے ہاتھ کا خنجر ہوا ہوں میں

کرتا رہا ازل سے خود اپنے نقوش کو
پائی نہ پھر بھی شکل وہ آذر ہوا ہوں میں

ساون کے سانپ کی طرح لہرا رہی ہے پیاس
پی پی کے اپنے زہر کو شنکر ہوا ہوں میں

کیا تک رہا ہے دور سے آکاش کی طرح
آ مجھ میں ڈوب جا کہ سمندر ہوا ہوں میں

عقیل شاداب

میں کٹ چکا ہوں تو اپنے وجود سے کتنا
یہ آندھیوں میں جدا شعلہ دود سے کتنا

متاع و مال ملے تو نہ ہیں ملا مجھ کو
زیاں ہوا ہے مرا آج سود سے کتنا

کنارے ٹوٹ گئے جب بھی جوش میں آیا
یہ دریا آگے بڑھا ہے حدود سے کتنا

ہر ایک پرچے میں اپنا ہی نام پڑھتا ہے
لگاؤ ہے اسے نام و نمود سے کتنا

سوال گونج رہے ہیں ہمارے کانوں میں
سبق لیا گیا عاد و ثمود سے کتنا

میں آسمانِ سخن کا کوئی خدا تو نہیں
بپا یہ حشر ہے میرے ورود سے کتنا

مختار شمیم

جذبات کو میں لفظوں کے سانچے میں ڈھال دوں
شاید کہ اندروں کا یوں اظہار کر سکوں

صحرائے غم سے نکلوں میں کیسے برہنہ پا؟
ان آتشیں فضاؤں میں کس طرح سانس لوں!

کوہِ گراں کی طرح مرے سامنے ہے رات
سوچا ہے تیشۂ عزمِ فردا سے کاٹ دوں

لفظوں کا ہو لباس کہ معنی کا پیرہن!
میں حرف حرف لیکن ابھی تک برہنہ ہوں

سوچوں کی وادیوں سے ابھرتا ہے اک خیال
سورج کی طرح کیوں نہ بلندی کو چوم لوں

لہجہ مرا نہیں، مری آواز بھی نہیں!
یعنی سخن سخن میں ابھی نارسیدہ ہوں،

فاروق شفق

رفاقتوں کا کبھی جب خیال آئے گا
وہ جا کے خشک شجر دیکھ بھال آئے گا

پھر اگلے دن کی امیدیں لئے ہوئے دل میں
سجا کے کندھے پہ وہ خالی جال آئے گا

مفر نہیں ہے کسی سمت سے گزرنے میں
جدھر سے گزروں میں سنگِ ملال آئے گا

چلو بدل ہی لیں روحوں کے پیرہن دونوں
اندھیری شب ہے کسے کچھ خیال آئے گا

جو صبح شان سے نکلا تھا آفتاب شفق
کسے خبر تھی شکستہ نڈھال آئے گا

فخرالدین عارفی

سلگتے خیموں کا شہر

پریشانی، تردد، خوف، الجھن اور بیکاری!........

انتشار، استحصال، فرسٹریشن اور حرماں نصیبی......

اور پھر ایک شہر....

سلگتے خیموں کا شہر....

اسے میری بدنصیبی کہیے کہ میں اس عجیب و غریب شہر کا باسی ہوں۔ ہاں بالکل عجیب و غریب.....

اس شہر کی بلندی اگر ایک طرف آکاش کو چھوتی ہے تو دوسری جانب اس کی پستی کی کوئی حد نہیں..... لامعلوم اور لامحدود پاتال تک.....

اس شہر کی یہ عام روش ہے کہ یہاں کے لوگ چڑھتے سورج میں اپنے سائے کو چھوٹا اور قد کو بونا دیکھ کر پاگل ہو اٹھتے ہیں۔ اور پھر اپنے دیوانے پن میں آکر، اپنی ہی اولادوں اور عزیزوں کا آپ خون کر دیتے ہیں۔ اور ان کی نعشوں پر کھڑے ہو کر اپنے قد کی بلندی کا ڈنکا پیٹتے ہیں۔

اس شہر کے باپ موقع ملتے ہی اپنی اولاد کی شہ رگ میں اپنے نوکیلے، گندے اور بدبودار دانتوں کو بڑی سفاکی سے پیوست کر دیتے ہیں۔ اور خون کا آخری قطرہ بھی چوس جاتے ہیں۔ اس شہر کی مائیں بھی کچھ کم درندہ صفت نہیں ہیں ـــــ اپنی اولادوں کی قدم قدم پر بھینٹ اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ لیکن ان کو اپنی اس درندگی کا صلہ کیا ملتا ہے۔؟ چند گھونٹ پانی.. جس کو پی کر ان کی پیاس اور بڑھ جاتی ہے۔ کہ سمندر کا جل پی کر کس نے اپنی پیاس پر قابو پایا ہے۔؟؟ یہ تو دیوانگی ہے کہ کوئی پیاس سے نڈھال جاں بلب پانی کی تلاش میں سمندر کا رخ کرے اور اپنے گھر میں میٹھے پانی کے ابلتے چشمے کو یکسر بھول بیٹھے ـــــ

میں تو سخت مشکل میں پڑ گیا ہوں اور ہر پل اپنے سر پر منڈلاتے ہوئے خطرات کے سیاہ خوفناک بادل کو دیکھ رہا ہوں، اپنی ڈوبتی ابھرتی سانسوں کا خود تماشائی بن گیا ہوں، جب کبھی سانسوں پر قابو پانے کی بات سوچتا ہوں، کوئی میرے پھیپھڑے میں ایک نوکیلا زنگ زنگ آلود خنجر بڑی بے رحمی کے ساتھ اتار دیتا ہے۔ جیسے میرا سالم وجود کسی بڑے خطرے کی علامت ہو۔

میں کہیں کا کوئی آوارہ دیمپائر بھی تو نہیں ہوں کہ میرے ساتھ ہوتی ہوئی اس زیادتی اور ناروا سلوک کو کوئی کسی بھی زاویے سے جائز اور بجا ٹھہرائے گا؟ لیکن کسی درندہ خصلت کو کون اس کا جرم یاد کرائے کہ ہر شخص یہاں قاتل ہے، قاتل اور خونی......

میں نے بھی تو اس عجیب و غریب شہر میں ان گنت خون کیے ہیں۔ اور پاپ کی ایک بھاری گٹھری سر پر اٹھائے پھر رہا ہوں ـــ میرا دامن بھی تو سیاہ اور سرخ دھبوں سے رنگین ہے۔ کہ یہاں داغ دار اور خون آلود دامن ہی کا تو چلن ہے.....

سنتے ہیں کہ اس شہر میں ایک عہد ایسا بھی تھا جب یہاں کے لوگ آپس میں بھائی بھائی تھے۔ انھیں ایک دوسرے کے جذبات کا پورا پورا احترام تھا۔ چھوٹا بھائی اگر اپنے بڑے بھائی کے سر پر چڑھتا تو اسے فوراً سہارا دیا جاتا تھا۔ کہ کہیں گر نہ جائے ـــــ انگلی پکڑ کر راہ چلانے کی رسم تو عام تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ اس عہد کے نوجوانوں کو شرارت سوجھی۔ اور انھوں نے اپنے بوڑھوں کو للکارا۔ اور ان کی ٹولی نے اپنے باپ داداؤں کی بستی میں گھس کر ان سب کا خون کر دیا اور ان کے خیموں میں آگ لگا دی۔ زمانے نے ان کو ایک خطاب عطا کیا اور وہ اپنی بہادری، جوانمردی، دلیری اور بے پناہ ہمت و جرأت کے لئے چاروں اطراف میں مشہور ہو گئے۔ لوگوں نے ان کو عقل و دانش اور فکر و فن کا ٹھیکیدار جانا..... مگر وہ اپنے مفاد کے دائروں سے نکل کر دوسروں کی بھلائی کا تصور بھی اپنے ذہن میں لانے سے قاصر تھے ـــ

یہ ان کی ریچ ریچ کی مجبوری تھی۔ اور یقیناً وہ مجبور تھے...

اور تب اس وقت کے تمام نوعمر بچے اپنے کریہہ صورت باپ داداؤں سے خوف کھانے لگے تھے۔ جیسے کہ وہ عفریت ہوں۔

وہ بھوکے تھے بھوکے رہے اور بھوکے مر گئے۔ جو باقی ہیں وہ آج بھی موقع ملتے ہی اپنا شکار ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اور اس طرح ایک بھیانک خونی داستان آج بھی یہاں دہرائی جا رہی ہے۔

لیکن اب ان کی درندگی اور سفاکی کا شعلہ خنک ہے ہر دل کی زد میں ہے۔ راکھ ہوتی ہوئی چنگاری کسی پل بھی روند دی جائے گی۔ اب شاید اس شہر کا شیرازہ بکھرنا ہی چاہتا ہے۔ اور سرخ موم کے پتلے پگھلنے ہی والے ہیں۔

اور تب ہم ایک نیا شہر آباد کریں گے ——

اس عہد کا نوح اپنی کشتی میں سوار چیخ رہا ہے۔ لیکن بدکار شہر اپنے زعم میں گم ہے ...... !!

بقیہ — خیر و شر

بنایا — کہا گردو پیش سے اپنے بھید اوجھل کر دے جیسا صداقت چھپا جائے۔ جس کا چہرہ سنہ پائے۔ پیچ خود کو اپنے ڈھکے کائنات نے طلسمات سب اپنے۔ ٹوٹے رشتے۔ پردے ہوئے حائل۔ مانا تھا آنکھ کی حد سے نابینا۔ عقل کی حد سے بے بہرہ۔ آنکھیں بند کر کے آنسو پی ڈالے۔ اٹھا۔ لئے اکٹھے بچے اور پتھر۔ تجزیہ کیا تفریق و یکسانی کا۔ سمجھا جو جمع کیا اس میں جو پہلے تھا۔

پھر لگا دیا وقت کو اس کے پیچھے۔ مقرر ہوئی میعادیں کچھ بھی قائم نہ تھا اور سب تھا۔ بنتا اور بگڑتا اور بن جاتا۔ حیران و پریشان بولا "کیا رہنے والا گزر جانے والا کیا ہے۔ روپ حقیقت کا ایک یا وقت کے حوالے سے صداقت ہے۔ ماضی حال یا مستقبل کو سبقت ہے"۔ صبح ہوتی پھر شام ہو جاتی سب گتھی سلجھانے میں گزر جاتی۔ روکتا کیا جسے روک نہ پاتا۔ اوڑھی چادر غار کے اندھیرے کی۔ ٹھہرا۔ سکون پایا۔ پکارا "کب جانوں گا۔ انتظار جتنے رہے گا یا اذیت ختم ہوگی۔ سلوک کیوں یہ مجھ سے ہے"۔ ہوتا کوئی تو سنتا۔ آواز بازگشت آئی اٹھا۔ شے کو بڑھتے گھٹتے دیکھا۔ بولا "یادوں میں جو میرا ہے رہ جانے والا ہے۔ میری حقیقت ہے اتنی جو میں جانوں۔ آج ختم کروں تو کل ہے"۔ —— کہا وقت سے میعاد پوری کر دے۔ ہاتھوں میں رعشہ آیا۔ کوشش کرتا خیال نہ یکجا ہوتا۔ امیدیں بھولیں۔ تھکا بولا۔ "ہو بہتر لاعلمی کہ آگے کا علم ہے مستقبل میں مانع ہوتا"۔

دیکھا آنے والے سانس نے جانا شر غالب آیا۔ وارث سے اپنے بولا "تم لڑتے رہنا۔ جب تک نہ حاصل کر لو۔ وہ علم جو تمہیں سکھا دے اسرار ایسا عالم کا۔ اور خیر تمہارا پائے قابو سارے شر پر جو ہے دشمن۔ اندر اور باہر ظاہر اور پوشیدہ تم کو کمزور بنانے والا —— پھر مانے گا اپنی غلطی۔ آئے گا زمین پر بوجھ بٹانے۔ اور ساتھ تمہارے حل کر سکھائے گا فرشتوں کو خیر کے معنی۔ کہ کائناتوں میں راج تمہارا ہوگا"۔

گئی رات تم گھاس نے بلایا۔ مٹی میں سونے لیٹا۔ جل بجھا جو موت نے ریڑھ لگائی۔ ایک آخری ذلت۔ اختتام تھا اس کا آغاز۔ ...

نخشب مسعود

نیّرِ اعظم

شور بڑھتا جا رہا تھا ۔

ایک غار کے گرد ہزار ہا کیڑے ریل پیل کر رہے تھے ۔ آہ و بکا شور و غوغا ، احتجاج ، نعرے ، تختیاں جن پر جلی حرفوں میں ان کے نام کندہ تھے ۔ اسے اٹھائے یہ ادھر سے ادھر بھٹک رہے تھے ۔

زرد چمکتی ہوئی روشنی میں سارا شہر ڈوبا ہوا تھا ۔ مسجدوں اور چرچ کے اونچے اونچے مینار ، فلک بوس عمارتیں اس سلگتی ہوئی سنگین فضا میں یوں لگ رہی تھیں جیسے سارا شہر سلگ رہا ہے لیکن ایک آتشی دھواں سا پھیل رہا تھا ۔ ایک عجیب پراسرار سماں تھا ۔

چرچ اور مندروں کے ناقوس فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے مسجدوں سے موذن پکار رہے تھے ، لیکن یہ آوازیں بھیانک ابابیلیں تھیں ۔ جو صدائے صحرا کی طرح بازگشت کرتی ہوئی اپنے اپنے آشیانوں میں واپس آکر الٹی لٹک جاتیں ــ کیڑوں کی رگوں میں دوڑتا ہوا لہو منجمد ہو چکا تھا ۔ وہ گرمی اور حدت کے آتش فشاں دہانے خشک ہو چکے تھے ۔ مگر کوئی سایہ ان آوازوں کے پیچھے لپکتا نظر آجاتا تو یہ لوگ اس پر قہقہوں اور کالے شبدوں کی بوچھار کر دیتے ۔

بحرِ ظلمات پر نیّرِ اعظم تھا ۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ مفلوج ہو کر کسی اندھی کھائی میں پڑا اکھڑی اکھڑی سانسوں میں زندگی کے آخری دن گن رہا ہے ۔

تاریکی کی کرنیں ان کی آنکھوں کے نور کھا چکی تھیں ۔ اور اب اس تاریکی ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے ۔ اور انہیں اپنے سوا کچھ اور نہیں دکھائی دیتا تھا ۔ ان کی اپنی آوازیں ہزار ہا برس پرانے صحیفوں سے زیادہ مقدس اور عظیم تھیں ۔

بجھاتے ہوئے ہزار ہا کیڑے مکوڑوں کا یہ جلوس تیزی و سرعت کے ساتھ اب جبل ایا پر چڑھ رہا تھا ۔ وہ اسے ایک ہی جست میں عبور کر لینا چاہتے تھے ۔ اس لئے وہ تیزی سے اسے چاٹنے لگے ۔ اب وہ کافی اوپر آچکے تھے ۔ شور بڑھتا ہی جا رہا تھا ۔ ان کے ہاتھوں کی تختیوں کے حروف اور بھی گہرے ہو چکے تھے ۔ اور ان کی شناخت کے تمام تر وسیلے لوٹ چکے تھے ۔ بس یہ تختیاں ہی ان کی پہچان تھیں

ایک ان میں سب سے آگے تھا چیخا ۔

" کوئی ہے جو میرے مقابل آئے ۔؟! " اس کی چیخ دیر تک وادیوں میں گونجتی رہی ۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ انتہائی بلندی سے نشیب میں آرہا ۔ اس کے ہاتھوں میں جو تختی تھی پرزہ پرزہ ہو کر بکھر گئی اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ اس سارے عمل میں بالکل برہنہ ہو چکا ہے اور اب اس کے بدن پر کوئی تار تک نہیں رہا ۔ وہ چیخ اٹھا ۔

بھیڑ ایک لمحہ کے لئے اس کی طرف متوجہ ہوئی ۔ ان کی نظروں میں سوالوں کے کشکول تھے اور انہوں نے وہ کشکول اس کی طرف بڑھا دئے ۔

سناٹا فضا پر محیط تھا ۔

وہ انہیں خشمگیں اور سراسیمہ سی نظروں سے دیکھتا رہا ۔ اسے اپنے آپ سے حجاب سا آنے لگا تھا ۔ اور ہزاروں نگاہیں اسے اپنے وجود میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں ۔

وہ اپنی تمام تر قوت کے ساتھ چیخ پڑا ۔

لیکن خاموشی کی گرہ اس کے ہونٹوں پر کس گئی ۔ اور اس کی آواز حلق کے حصاروں سے آگے نہ جا سکی ۔

وہ سوچ رہا تھا کہ وہ چیخ جو صدیوں سے اس کے وجود کے زنداں کا روزن تھی جس سے ایک ہلکی سی روشنی پا کر اب تک وہ جی رہا تھا ۔ وہ اس ساری جد و جہد میں جانے کہاں گم ہو گئی ۔؟

اب وہ خود اپنی نگاہ میں سوال بن چکا تھا ــــ !!

اقبال کلیم مہتہ ـــ رامپور

موڑ

اسپیشل وارڈ میں ہولناک خاموشی مسلط تھی۔ کمرے کی ہر شئے جیسے کسی انجانے خوف سے سہمی ہوئی تھی۔ باہر شام کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ ہسپتال کے تمام مریض اپنے اپنے بیڈ پر خاموش پڑے ہوئے تھے۔ ہسپتال کا انچارج مریضوں کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا۔ اچانک کسی بیڈ سے کراہنے کی آواز آئی۔ اور وہ لپک کر اسی طرف کو بڑھ گیا۔ کراہ کی دوسری آواز ہوئی لڑکی کے بیڈ سے آئی تھی۔ ڈاکٹر جب اس کے بیڈ کے قریب پہنچا تو وہ دھیرے دھیرے آنکھیں کھول رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا دماغ غشی کی کیفیت سے دور ہوا تو وہ بڑبڑا پڑی

"کہاں ہوں میں ؟ کیا ہو گیا تھا مجھے ـــ ؟"

"اوہ آپ کو ہوش آ گیا ـــ گھبرائیے نہیں، اب خطرہ ٹل چکا ہے ـــ"

ڈاکٹر رشیدہ کو پر خلوص ہمدردانہ لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے بولا ـــ

اچانک اس نے بیڈ سے اٹھنا چاہا۔ انچارج جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔

"ارے ارے یہ کیا کر رہی ہیں ـــ ؟ پلیز سو جائیے ـــ" ڈاکٹر نرم لہجے میں بولا۔

"ڈاکٹر ـــ !" وہ ڈاکٹر کا گریبان پکڑ کر زور سے چیخ پڑی

"قدرت کو یہی منظور تھا رشیدہ صاحبہ ـــ میں نے بہت کوشش کی لیکن ـــ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اور آپ کی جان سے بڑھ کر آپ کی ٹانگیں نہیں تھیں ـــ"

"اُف ـــ! یہ مجھے کس گناہ کی سزا ملی ہے ـــ ڈاکٹر ـــ" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مس رشیدہ آپ صبر سے کام لیں۔ آپ کی طرح بہت سی ہستیاں اپاہج ہیں ـــ"

"نہیں نہیں ـــ ڈاکٹر، یہ خودکشی ہے زندگی نہیں ـــ" وہ کرب سے تڑپ کر بولی۔

"ذرا صبر سے کام لیجئے۔ میں آپ کے لئے خود کو آپکی ٹانگوں میں بدل دوں گا ـــ"

ڈاکٹر کے اس جملے پر وہ چونک کر ڈاکٹر کو غور سے دیکھنے لگی اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ حیرت زدہ نظروں سے وہ گھورے جا رہی تھی ـــ

"تم ـــ !؟"

"ہاں ـــ میں آپکا خادم ڈاکٹر تنویر ہوں ـــ"

"مگر تم نے میری جان بچا کر اچھا نہیں کیا ـــ"

"ہاں میں نے کوئی احسان نہیں کیا یہ میرا فرض تھا۔ تمہاری زندگی بچانے میں کوئی اپنی غرض نہیں ہے۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے میرا یہ کام تو ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی مریض کے ساتھ اتنی توجہ اور کاوش برتی ہے۔ چنانچہ اب آپ اس قابل ہیں کہ اس دنیا میں ـــ"

"تنویر ـــ تم نے غلط کیا ـــ اور تنویر تم ـــ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں ـــ"

ڈاکٹر تنویر اداس سا ہو کر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا وارڈ سے باہر نکل گیا۔

تنویر، رشیدہ اور اختر تینوں ایک ہی کالج اور ایک ہی کلاس کے اسٹوڈنٹ تھے۔ تنویر غریب گھرانے کا ایک خوددار لڑکا تھا۔

رشیدہ امیر باپ کی اکلوتی بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت اور مغرور بھی تھی۔ گھر والے آزاد خیال کے تھے اس لئے رشیدہ کو بھی اپنے گھر والوں کی طرف سے پوری آزادی حاصل تھی۔ وہ مختلف کلبوں کی ممبر تھی۔ رقص و موسیقی کی دلدادہ تھی۔ اور فیشن کے نت

نئے ڈیپ وہ اپنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

اختر بھی امیر زادہ تھا اور وہ بھی فیشن پرست تھا۔ بال ذہن سے لیکر سوچ و چار تک میں وہ ماڈرن تھا۔ کلبوں کے نت نئے تفریحی پروگراموں میں حصہ لینا اور ان میں روح پھونکنا اختر کا مشغلہ تھا۔

رشیدہ اور تنویر ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ اشاروں میں۔ اداؤں میں —— پوشیدہ پوشیدہ۔ کیونکہ تنویر ایک شرمیلا لڑکا تھا۔

تنویر کا مضمون بائیلوجی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی تعلیم کو محض کھانے کمانے تک محدود نہ رکھے بلکہ اسے انسانی زندگی کی بہبودی کے لئے وقف کردے یہی وجہ تھی کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ڈاکٹر بن گیا وہ نوجوان ہونے کے باوجود سنجیدہ اور سلیم الطبع رہا بلکہ بہت حد تک غریب بھی۔

اس کے برعکس رشیدہ اور اختر کا مضمون اکنامکس تھا دونوں نے امتحانات پاس کرنے کے بعد اپنے آبائی کاروبار میں دلچسپی لی تھی اور کامیاب بھی رہے تھے۔ عملی زندگی میں رشیدہ اور اختر کے خیالات یکساں تھے چنانچہ اس طرح اختر اور رشیدہ کی دوستی بھی برقرار رہی تھی۔

رشیدہ کی زندگی کے لئے اختر اور تنویر کا وجود سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

حالانکہ رشیدہ کو اختر سے محبت نہیں تھی لیکن جب کبھی وہ اپنی زندگی کے مستقبل کے متعلق سنجیدگی سے غور کرتی تو اس کا ذہن فیصلے سے قاصر ہو جاتا تھا۔

تنویر سے محبت ہونے کے باوجود اختر اسے زیادہ پرکشش دکھائی دیتا تھا۔ اس کے پاس کار تھی۔ بنگلہ تھا۔ ایک شاندار بزنس تھا۔

رشیدہ جب رات کی تنہائیوں میں دونوں کے بارے میں سوچتی تو سوچتی چلی جاتی۔ تنویر ایک مہذب اور محبت کرنے والا سنجیدہ نوجوان تھا۔ وہ خود بھی تنویر سے محبت کرتی تھی لیکن تنویر کے پاس وہ ٹھاٹ باٹ نہ تھے جو اختر کو حاصل تھے اور اسی لئے اختر کبھی کبھی فقرے کستا۔

"رشیدہ تم اتنی ماڈرن ہوتے ہوئے بھی پرانے خیالات کو دور نہیں کرسکی ہو۔ اب جبکہ لوگ چاند پر بسنے کی تیاری کر رہے ہیں تم جھونپڑوں کی مرمت کروا رہی ہو۔"

اختر اسی طرح رشیدہ کے دل میں تنویر کے خلاف تنفر کا بیج بوتا رہتا۔ رشیدہ نے کئی بار ٹھنڈے دل سے سوچا کہ زندگی خواب نہیں حقیقت ہے۔ پھر وہ دھیرے دھیرے تنویر سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن تنویر نے کبھی رشیدہ کو اپنے سے جدا نہیں سمجھا تھا۔ تنویر غریب ہونے کے باوجود غیور انسان تھا۔ بے حد شرمیلا تھا۔ چنانچہ جب بھی رشیدہ سے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہا اس کی زبان گونگی ہو گئی۔ وہ چپکے چپکے اس کی محبت کے خواب زار میں اس کے خوبصورت وجود سے ہمکنار ہوتا رہا لیکن رشیدہ کی بدلتی ہوئی کیفیت اسے عجیب لگی وہ رشیدہ کو کچھ کھنچی کھنچی دیکھ کر خود پر قابو نہ پاسکا۔

ایک دن رشیدہ کالج پیریڈ ختم کرکے باہر نکل رہی تھی کہ تنویر نے آہستہ سے اسے پکارا۔

"رشو ——!" رشیدہ رک گئی لیکن وہ رکنا نہیں چاہتی تھی ——

"میں تم ہی سے کہہ رہا ہوں رشو۔ تم جس راہ پر چل رہی ہو وہ تمہاری روح کی آواز کے خلاف ہے۔"

رشیدہ نے تنویر کا مدعا بھانپ لیا۔ لیکن وہ بھولی سی بن گئی۔

"تم پچھتاؤگی رشیدہ ایک دن اپنے لئے بھی اور میرے لئے بھی —— روح اور ضمیر کے خلاف کیا گیا فیصلہ پچھتاوے کا باعث ہوتا ہے۔"

"درس دے رہے ہو یا بددعا۔؟"

"درس —— جو دعاؤں سے بھرا ہے —— رشو تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔"

"سنئے مسٹر تنویر زندگی محبت کا ایک ڈرامہ نہیں —— ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اور اس دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لئے ٹھوس حقائق کو سمجھنا ضروری ہے۔"

رشیدہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ رشیدہ کو کسی قدر اطمینان

بھی ہوا کہ آج اس نے اپنی محبت کی راہ صاف کرلی ہے۔ تنویر بہت پیچھے چھوٹ گیا۔ اب اختر کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ اختر بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ رشیدہ کی قربت حاصل کرسکے۔ حالانکہ اس کی ہوسناک قربت میں کئی جوانیاں پہلے ہی سے تھیں۔ اب اختر اور رشیدہ کھل کر ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ رشیدہ نے طے کرلیا تھا کہ وہ اختر سے ہی شادی کرے گی۔ چنانچہ محبت کی پینگیں دراز سے دراز تر ہوتی گئیں۔ دونوں جوانی کی تپش میں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔ دن یوں گذرے جیسے بادِ نسیم کے جھونکے اور ایک دن رشیدہ کو محسوس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس نے اختر کو آگاہ کیا

"اختر اب ہم لوگوں کو بہت جلد شادی کرلینی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ میں بدنام ہوجاؤں اور ہمارے بزرگوں کی عزت سربازار نیلام ہوجائے۔"

"رشیدہ ——! اختر ہنسا "بیوقوفی کی باتیں نہ کرو"

"کیا مطلب ——؟"

"یہ کوئی نئی بات تو نہیں، ایسا ہوتا آیا ہے —— اور پھر تم اتنی ماڈرن خیال کی ہوکر بھی گھبراتی ہو——؟"

"اختر ہم لوگوں کو شادی کرلینا چاہیئے —— یہ بہت ضروری ہے۔ اور جلد بہت جلد۔ بولو کب۔؟"

رشیدہ اختر کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

"میں نے کب کہا تھا کہ شادی کروں گا تو تم سے۔ تم میری طرف خود ہی بہتی ہوئی ندی کی طرح بڑھی تھیں۔ شادی کا کوئی وعدہ نہیں تھا ہمارے درمیان"

"ذلیل کتے —— کمینے ——" رشیدہ انتہائی حقارت سے چیخی ——

رشیدہ کی چیخ سن کر اس کے وارڈ کی طرف کی نرسیں دوڑ پڑیں —— ڈاکٹر تنویر بھی لپک کر وارڈ میں داخل ہوا۔ رشیدہ دونوں ہاتھوں سے منھ کو چھپائے بلک رہی تھی۔ ڈاکٹر تنویر نے اشارہ کرکے نرسوں کو بھیجدیا۔

"خاموش ہوجاؤ رشیدہ جو ہونا تھا ہوگیا۔ ماضی کو بھول جانا ہی بہتر ہے ——"

"مجھے تھوڑا زہر لاکر دیدو تنویر —— میں مرنا چاہتی ہوں"

"ضبط سے کام لو رشیدہ —— ڈاکٹر زندگی دیتا ہے موت نہیں ——"

مگر تم ہی بتاؤ میں کس کے سہارے جی سکوں گی۔ کس طرح جیوں گی —— آہ!"

وہ درد میں ڈوب کر بولی۔

"میں تمہارا سہارا بنوں گا —— تم میری ٹانگوں کے سہارے چل سکتی ہو——"

اور وہ ڈاکٹر تنویر کا منھ تکنے لگی۔

"یقین کرو میں وہی تنویر ہوں کالج کے زمانے والا"

"نہیں تنویر —— نہیں یہ ناممکن ہے —— ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"کیوں نہیں ہوسکتا رشو ——؟"

"میں تمہارے قابل نہیں میں اپنے گھناؤنے وجود کو مٹا دینا ہی بہتر سمجھتی ہوں"

نہیں رشو، تم زندہ رہوگی۔ میں تم سے شادی کروں گا——"

"نہیں تنویر میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی۔ میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں"

"مجھے معلوم ہے اور اسی لئے تو میں نے کہا ہے ——"

"تنویر ——! وہ چیخ پڑی۔ اور پھر اس پر غشی طاری ہونے لگی۔

تنویر اس کے پاس کھڑا متبسم نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا —— ...... ——..!!

ساحل احمد

ایک نا آشنا کہانی کا شیر شک

جستجو کا لرزتا جسم
کانپ کانپ جاتا ہے
یاد آتے ہی جاگ اٹھتا ہے
خواب ناک جسم کا اسرار
شکست خیدہ احساس کے آئینہ میں
جھلک اٹھتی ہیں سیاہ سفید تصویریں
تغافل۔ شکایت کی انگنت داستانیں۔
بے نور آنکھیں
بے چارگی اور بے بسی کا منظر دیکھتی ہیں۔
اور اپنے جسم کے درون و خارج میں
کہانیوں کا
شیر شک ڈھونڈتی ہیں

جبار جمیل

اسپتال میں

یہ کیسا جمگھٹا ہے روشنی کا
کہ میں کچھ کالے چہرے دیکھتا ہوں
جو بڑی آہستگی سے مری جانب بڑھ رہے ہیں
میں پریشان سا ہوں اور کچھ مطمئن سا بھی
عجب دوراہے پہ ٹھہرا ہوں
عیادت کے لئے آئے ہوئے چہروں کو پڑھتا ہوں
شب صلیبیں لے کے آتی ہے۔
دن پیالے زہر کے لے کر نکلتا ہے
دوپہر نیزے دکھاتی ہے
شام کا لشکر ارادوں کو کچلتا ہے
(ایسا محسوس ہوتا ہے)
اپنے پرائے کتنے چہرے: کتنی پرامید آنکھیں۔
وصلوں کی کتنی سوغاتیں
سب کو جمع کرتا ہوں
وقت کے ساغر کو بھرتا ہوں۔
عجب دوراہے پہ ٹھہرا ہوں

اعجاز اعظمی

جال

نکلا جو اپنے گھر سے
پتھر کے پھول برسے
بھیگی ہوئی نگاہیں
دینے لگیں صدائیں
صحرائے جستجو میں
ڈوبا ہوں لہو میں
پھرتا ہوں رقص ساماں
ہوں آرزو بداماں
اٹھنے لگے بگولے
محمل سے ہولے ہولے
جلنے لگیں نگاہیں
خاموش ہیں صدائیں
صحرا نہیں یہ گھر ہے
محمل میں وحشت زر ہے
الجھی ہوئی دشائیں
بھیگی ہوئی نگاہیں
خواب و خیال ہوں گی
مایا کا جال ہوں گی ۔

آرتھر آرنلڈ
ماہر منصوری

آخری سوال

نہ جانے کس کی آنکھیں ہیں
کہ جن سے خوں ٹپکتا ہے
نہ جانے کس کے شانوں سے
گرا ہے ٹوٹ کے بازو
یہ ننھے پاؤں کس کے ہیں
یہ کس عورت کی باہیں ہیں
جو بے حس، بے بصر دیوار سے چمٹی ہیں
کیا معلوم یہ کیسا درندہ ہے
جو نازک جسم کے اعضا
زمیں پر زرد پتوں کی طرح بکھرا کے ہنستا ہے
یہ کیسا درد ہے دل میں
جو طوفاں خیز موجوں کی طرح رہ رہ کے اٹھتا ہے
یہ قاتل
اور وہ مقتول
آخر کون ہیں یہ سب ؟
بتاؤ بھی ترقی یافتہ دنیا کے انسانو !!

(انگریزی سے)

رزّاق ارشد

چپ چاپ دل سے ہو کے گزرتا ہوا وہ شخص
اس سازِ بے صدا کو بھی جھنکار دے گیا

جاتی ہے جان دھوپ میں رکھتے ہوئے قدم
اک تازہ رنگ سایۂ دیوار دے گیا

رنگیں رتوں کی یاد تو وجہِ سکون تھی
یہ کون مجھ کو دیدۂ خونبار دے گیا

میں خود بھی مدعی ہوں کہاں اس کی چاہ کا
پھر کیوں کہوں وہ صدمۂ انکار دے گیا

اک مختصر سا لمحۂ جاں بخش، کس طرح
مجھ کو تمام عمر کا آزار دے گیا

تھا کون خوش کلام جو اس گونگے شہر میں
ہم بے ہنروں کو طاقتِ گفتار دے گیا

سید حبیب

حیات و موت کی اس بزم میں نہ بات چلے
جہاں پہ ساغرِ رنگیں تمام رات چلے

تری جفا کی نہ میری وفا کی بات چلے
کچھ اس سکون سے دورِ مئے حیات چلے

وہ میرے غم کی حقیقت کو سمجھیں افسانہ
یونہی سہی کسی عنوان ان سے بات چلے

شکست تو مرے نزدیک لفظِ مہمل ہے
میں وہ نہیں ہوں جو میداں سے کھا کے مات چلے

دل اپنا جھوٹی تسلی سے تنگ آیا ہے
حبیبؔ اب تو حقیقت کی کوئی بات چلے

اقبال عمر

ہر بات جو نہ ہونا تھی وہ یوں ہوئی کہ بس
کچھ اور چاہتے تھے اسے زندگی کہ بس

جو دن نہیں گزرتے تھے وہ بھی گزر گئے
دنیا ہے ہم ہیں اور وہی بے بسی کہ بس

جن پر نثار نقدِ سکوں نقدِ جاں کیا
ان سے ملے تو ایسی ندامت ہوئی کہ بس

میں جس کو دیکھتا تھا اچٹتی نگاہ سے
اس کی نگاہ مجھ پہ کچھ ایسے پڑی کہ بس

وہ مسئلے حیات کے جو مسئلے نہیں
ان مسئلوں سے الجھا ہے یوں آدمی کہ بس

رازؔ لائل پوری

کیا خیال آیا نہ جانے ترے دیوانوں کو
رونقیں دینے لگے جا کے جو ویرانوں کو

آئینے جلوے سے کچھ اور بھی حیراں ہوں گے
اور حیراں نہ کریں دیکھیے حیرانوں کو

خود بھی جل جل کے سکھایا ہے بڑی مشکل سے
سوزِ الفت کا سبق شمع نے پروانوں کو

آبگینوں کی طرح چور ہوئے جاتے ہیں
کس نے یہ ٹھیس لگا دی مرے ارمانوں کو

ناصحا میری طرح تو بھی تو دیوانہ نہیں؟
ہیں وہ دیوانے، جو سمجھاتے ہیں دیوانوں کو

بزم احباب

پرکاش فکری (رانچی)

انجمن ترقی اردو ہند کے ہفتہ وار ترجمان "ہماری زبان" کی یکم جولائی ۷۵ء کی اشاعت میں پدم شری سردار جعفری کا ایک خط چھپا ہے۔ خط میں اردو کے رسمی ماتم کے بعد انہوں نے اسی ہفتہ وار کی ۸ رجون ۷۵ء کی اشاعت میں کمار پاشی کی غزل کی شمولیت پر شدید اعتراضات کیے ہیں اور اپنے اعتراض کی حمایت میں انھوں نے کمار پاشی کے ایک سابق بیان سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا ہے۔

"میں اپنے احساسات کا اظہار اردو زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں ایک ایسی زبان میں لکھنے پر مجبور ہوں جس سے مجھے محبت نہیں اور جس کا ادبی ورثہ شاندار نہیں۔ یہ (اردو) ایک مردہ زبان ہے۔"

ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ پاشی کے اس اعتراف کے بعد ان کی شاعری کو انجمن ترقی اردو کے پرچے میں جگہ دینا اردو زبان کی توہین ہے۔ اور یہ کہ کمار پاشی نے یہ بیان دے کر ہم اردو والوں کی غیرت اور محبت کا امتحان لیا ہے۔

پاشی کا یہ بیان "ٹائمز آف انڈیا" دہلی کی ۱۱ نومبر ۷۳ء کی اشاعت میں آیا تھا۔ یعنی یہ بیان آئے ہوئے انیس بیس مہینے ہو گئے۔

اس اثنا میں مانک ٹالہ اور اظہار اثر "شاعر" اور "کتاب" میں بالترتیب پاشی کے اس بیان کا لیکھا جوکھا لے چکے ہیں۔ اور اب لکھنؤ کے ایک ماہ نامے "صبح ادب" کی اپریل مئی ۷۵ء کی اشاعت میں اس بیان کی راکھ کریدی گئی ہے۔ یعنی اتنا کچھ ہونے کے بعد سردار جعفری اس راکھ میں شرر ڈھونڈ رہے ہیں۔

اس سے پہلے کہ پاشی کا یہ بیان زیر بحث آئے مناسب یہی ہے کہ سردار جعفری سے ایک دو سوال کر لئے جائیں۔ سردار جعفری صاحب پدم شری ہیں۔ ابھی حال میں انھیں وشو ہندی سمیلن کی طرف سے بھی اعزاز بخشا گیا۔ اس سمیلن میں دور دراز کے ملکوں سے نمائندے مدعو کئے گئے۔ سندھی کے ادیبوں کو بھی دعوت سے نوازا گیا۔ مگر اردو والوں پر اس سمیلن کے دروازے بند رکھے گئے تو پھر سردار جعفری صاحب نے اپنے ضمیر کو ٹٹولے بغیر یہ اعزاز کیسے قبول کر لیا۔ وہ بھی بیدی کے لفظوں میں صرف اس قصور پر کہ انھوں نے دیوان غالب ایک طرف فارسی رسم الخط اور دوسری طرف دیوناگری میں چھاپا ہے۔ کیا سردار جعفری کی یہ اعزاز پسندی اردو والوں کی غیرت اور محبت کا امتحان نہیں ہے۔ پھر یہ کہ پاشی کا بیان دیر سے ہی سہی جب ان کے سامنے آگیا تو ان کی خودداری اور اردو سے محبت کا تقاضا تو یہی تھا کہ آل انڈیا ریڈیو دہلی کے منعقد کردہ مشاعرے کی وہ صدارت نہ کرتے کیونکہ اس مشاعرے میں کمار پاشی نے اپنا کلام سنایا تھا۔ مگر انہوں نے نہ صرف صدارت کی بلکہ اپنے نظریات کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ معاوضے کی موٹی رقم بھی وصول کی۔ پھر یہ کہ اگر اس بیان کو من و عن مان بھی لیا جائے تو پاشی کی حیثیت غیر اردو والے کی کیوں کر ہوئی۔ کمار پاشی کا یہ بیان اس زبان سے دست کش ہونے کا تو اعلان نہیں۔ اگر پاشی نے ایسا کچھ کہا ہوتا تو سردار جعفری اسے اردو والوں کی غیرت کا امتحان قرار دینے میں حق بجانب ہوتے۔ کمار پاشی کہیں بھی اس سے انکاری نہیں ہیں کہ وہ اردو کے شاعر ہیں۔ وہ اردو میں شاعری کرتے رہیں گے تو کیوں نہ انھیں اردو رسالوں میں جگہ دی جائے اور پھر کسی کلام کو شائع کرنے یا نہ کرنے کا یا کسی کے کلام کو شائع کرنے یا نہ کرنے کا پورا پورا اختیار متعلقہ جرائد کے مدیروں کو پہنچتا ہے اور کیا اس بیان کے بعد بھی پاشی کا کلام جن رسالوں میں وقار کے ساتھ چھپتا رہا ہے ان تمام رسالوں کے مدیروں کو غیرت چھو نہیں گئی تھی — حقیقت تو یہ ہے کہ سردار جعفری کا یہ خط پاشی کا کلام چھاپنے والے ایڈیٹروں کی INTEGRITY کو ایک طرح کی گالی ہے۔

پاشی کا زیر بحث بیان خود پاشی ہی کی زبان میں پاشی کے لفظوں

میں اگر کسی اردو اخبار یا رسالے میں آتا تو ہم اسے زیادہ معتبر سمجھتے اور اس پر اعتراضات کی بنیاد مضبوط بھی سمجھی جاتی — ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتے ہوئے اور وہ زبانیں بھی ایسی جن میں مشرق و مغرب کا بُعد ہو ۔ باتوں کے بدل جانے کے امکانات سے چشم پوشی غلط نتائج کی طرف لے جاسکتی ہے ۔ وہی بات جو ایک زبان میں نہایت سادہ و معصوم ہو عین ممکن ہے کہ ترجمہ کے بعد نہایت شر انگیز لگے ۔ موراویا کا شہرہ آفاق ناول WOMAN OF ROME جب ہندی میں ترجمہ ہوکر آیا تو مدھیہ پردیش سرکار نے اسے فحش قرار دیکر اس پر پابندی لگادی ۔ اور مترجم و ناشر کو قانون کے سامنے جوابدہ ہونا پڑا ——— بیدی کا ناولٹ ایک چادر میلی سی جب پاکستان میں پنجابی سے اردو میں منتقل ہوا تو بیدی جی کے لفظوں میں بیدی کو ایسا لگا کہ اس کا لکھنے والا خود بیدی نہیں بلکہ کوئی بیدی حسن ہے پنجابی اور اردو میں اتنی باہمی قربت کے باوجود جب چیزوں کی شکل اس حد تک بدل سکتی ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ دیوان سنگھ بجیلی سے بھی کمار پاشی کا یہ انٹرویو ٹائمز آف انڈیا میں چھپواتے وقت کچھ رنگ آمیزی ہوگئی ہو —

بہرحال اچھا تو یہی ہوتا کہ خود کمار پاشی اس بیان کی وضاحت[1] کردیتے تاکہ خواہ مخواہ کی غلط فہمیاں دور ہوسکیں ۔ اور اگر وہ اس بیان پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں تو اردو سے انھیں محبت کیوں نہیں ، اردو کو وہ مردہ زبان کیوں سمجھتے ہیں ، اردو کا ورثہ ان کی نگاہ میں قابل اعتنا کیوں نہیں ، یہ سب جاننے کا اشتیاق ان کے ان تمام قارئین کو ہوگا جنہیں ان کی شاعری نہ صرف جان و دل سے عزیز ہے بلکہ وہ ان کی شاعری کو اردو کے شعری سرمایہ میں قابل قدر اور لائق فخر اضافہ بھی سمجھتے ہیں ۔ ان کے چاہنے والے یہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ وہ اردو سے روٹھ جائیں یا اردو والے ان سے رد ٹھ جائیں اگر ایسا ہوا تو اردو کے لئے وہ ایک تاریک و منحوس دن ہوگا ۔

---

[1] پاشی صاحب کا وضاحتی بیان "ہماری زبان" کی ۸ جولائی کی اشاعت میں آگیا ہے ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ادارہ

عظیم صدیقی (نئی دہلی)

پیرزادہ عاجز صاحب نے مئی ۷۵ء کے تحریک میں ظفر غوری کے مطلع پر اس طرح عروضی اعتراض فرمایا ہے کہ جیسے ظفر غوری صاحب نے دور حاضر کا ابوالعطا ہیہ ہونے کا دعویٰ کیا ہو ۔ جو موجد عروض سے کہتا تھا ۔

" انا اکبر من العروض " (ہم عروض سے بڑے ہیں)

جہاں تک عروض کا تعلق ہے تو بندہ پرور اس حمام میں تو اکثر ننگے ہی نظر آتے ہیں کس کس کو کہیں ؛ خصوصاً اس بحر کے اس وزن میں جس میں اب تک آٹھ زندہ شاعروں کے علاوہ کسی کو کامیاب نہیں دیکھا ۔ مثال کے طور پر دو مشہور اہل قلم کے مصرعے حاضر ہیں ۔

قدم قدم رسوائی ہے (ہر جانب رسوائی ہے)

از روئے عروض پہلے قدم کا دال ساکن ہوگیا ۔

ڈال ڈال پر بھونرا گھومے (ہر ڈالی پر بھونرا گھومے)

دوسرے ڈال کا تلفظ ڈ ۔ آل ۔ بروزن فعو ہوگیا ۔

بقیہ شعرا کی تو بات ہی کیا ہے ۔ تحریک دسمبر ۷۴ء (صفحہ ۵۶) پر سات اشعار کی ایک غزل میں سے چھ اشعار بحر درج ہیں ۔

اب اعتراض پر غور فرمائیے

" پتھر سے سب لوگ کھڑے تھے ۔ منظر ہو لہان پڑے تھے ۔

فعلن فعلن فعلُ فعولن

یا فعلن فعلن فعلن فعلن

دوسرا مصرع ان دونوں اوزان پر نہیں ۔ ارباب عروض توجہ فرمائیں عاجز صاحب نے یا کے بعد جو چار فعلن لکھے ہیں وہ کیوں ! اس وزن میں بذریعہ تخنیق آٹھ شکلیں وجود میں آجاتی ہیں ۔

ہوسکتا ہے ظفر غوری صاحب لہو کا حرف دوم ساکن کر گئے ہوں یعنی فعلن فعلُ فعول فعولن ۔ یا بجائے لہو کے لوہو لکھ گئے ہوں اس صورت میں لوہو کا واو آخر ساقط ہو جاتا ہے جو معیوب نہیں ۔ (لوہو ۔ ہندی ہے ۔ اب متروک ہے لیکن ہندی شاعروں کے علاوہ اردو شاعروں کے کلام میں بھی آیا ہے ۔

گھونٹ لوہو کے پیے کیوں نہ غم عشق عاشق (انشا)

لوہو میں ڈھبے دیکھیو دامان و جیب میر (میر)

بھر جائے کا لوہو سے تا صبح نگن سارا (مصحفی)

ہندی کا لفظ دوم کئی صورتوں میں ساکن ہوجاتا ہے ۔ مثلاً

کرتا پہنو فعلن فعلن
پہن لو فعولن
لیکن میراجی میر نے پہن کی ن ساکن کردی (قطع نظر
قران بر وزن پرلن)
گر آئے شیخ پہن کے جامہ قرآں کہ۔
تو صاحبِ عروض کس کس کو ناپے ؟

کنود مسیت (نئی دہلی)

تحریک کا تازہ ترین شمارہ دستیاب ہوا شعری اور نثری تخلیقات نظر نواز ہوئیں۔ نثری حصہ میں میرا افسانہ بھی شامل ہے۔ اس لئے اس پر رائے زنی سے احتراز واجب ہے۔ مگر یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ شعری حصے میں بانی کی واپسی نے اسے نئی توانائی اور تابناکی بخشی ہے۔ غزل کے تمام اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ جدید غزل میں بانی ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتا ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ موجودہ دور کے اس منفرد شاعر کو گٹھیا کے مرض نے کہیں ذہنی طور پر تو متاثر نہیں کیا لیکن یہ غزل پڑھ کر تو اندازہ ہوتا ہے کہ بیماری نے اس کی فنی حس کو اور بھی نکھار دیا ہے۔ میں اچھی اور سچی شاعری اسے مانتا ہوں جسے قبول کرنے سے پہلے اس پر تنقیدی نظر ڈالنا ضروری محسوس ہو اور جس کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد اسے اپنائے بغیر رہا نہ جا سکے۔ بانی کی غزل کے مطالعے میں سرشاری رجائیت اسے اسی نوعیت کا شعر بناتی ہے کیونکہ خاک و خون کی وسعتوں میں لپٹے امکانات کا ذکر نہیں بلکہ الوکھے اور مجرد احساس سے روشناس کراتا ہے۔ اسی طرح ماڈرن تہذیب میں انگڑائیاں لیتی مچلتی کسمساتی ہوس کی چاشنی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش ... رکھتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں اسے رد کرنے کے لئے مجبور ہونے کو شعر میں ایک خاص اور انوکھے انداز سے ڈھالنا بانی کا کام ہے۔

جسم اور لکِ نیم پوشیدہ ہوس آمادگی۔ آنکھ اور سیر لباس مختصر کرتی ہوئی
(جمالیات پر اشارہ اور

لذیذ شعر خال خال ہی نظر آتا ہے۔ بانی ان چند شاعروں میں سے ایک ہے جنھوں نے جدید شاعری کو اسفی ابہام اور بارمز آہنگ سے ہمکنار کراتے ہوئے ایک نئی اور پائیدار روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ مندرجۂ ذیل شعر اس بات کا غماز ہے کہ بانی نت نئی تراکیب تراش کر اردو ادب میں

اور اضافہ کر رہا ہے۔ پرانی اقدار اور عقیدوں کی حامل کتابیں تشریح طلب کا شکار ... ان جہتوں کی اہمیت کو تسلیم کرتا جن پر آگہی انسانی دل و دماغ کی تازہ ترین ارتقائی منزل نے اپنے پاؤں سے پوری طرح روند کر انھیں مستند راہوں میں تبدیل نہیں کیا۔ بانی کے لئے ان کی شروعات بھی ایک پر تاثر واردات ہے۔

اک کتابِ صد ہنر تشریح زائل کا شکار
اک ذراسی بات جادو کا اثر کرتی ہوئی۔

سیّد منظور الحسن برکاتی و سیّد قاضی الاسلام (ٹونک)

رسالہ تحریک کے تازہ شمارہ میں آپ کے جشن سالگرہ کی تقریب کی روداد پڑھی، اس پرمسرت تقریب پر ہم اپنی جانب سے اور ٹونک کے ارباب ادب کی جانب سے ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ ہمیں اس روداد میں حضرت بسمل سعیدی ماہد برادرم محمود سعیدی کی شرکت شمولیت اور نظم و نثر کے ذریعے آپ سے اظہار عقیدت کا حال پڑھ کر بے حد مسرت و خوشی حاصل ہوئی ہے۔ ان حضرات نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ گویا ہمارے سب کے جذبات دلی کی ترجمانی کی ہے۔

سال گرہ کی اس مبارک تقریب پر دلی اور ہندوستان کے مشاہیر ادبا و شعرا نے آپ کی صحافتی اور ادبی خدمات کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے آپ اس کے بجا طور پر مستحق تھے۔ آپ نے گذشتہ ربع صدی میں اردو زبان و ادب اور صحافت کے لیے جو عظیم کام کیا ہے اور ادب کے ادلتے بدلتے نظریات، اور بحرانی مواقع پر جس طرح راہ مستقیم اختیار کی ہے وہ تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ یاد رہے گی۔ تحریک کے صفحات پر آپ نے اپنے رشحاتِ قلم سے بعض موقعوں پر تو جہاد بھی کیا ہے اور نئے لکھنے والوں کو راہ دکھائی ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ آپ مستقبل میں بھی اسی طرح اپنے فرض کو انجام دیتے رہیں گے۔ اور ادبی بے راہ روی کے اس دور میں رہروانِ ادب کو راہ راست پر چلانے کی سعیٔ محمود سے دریغ نہ فرمائیں گے

دلی کے ادبا و شعرا نے اپنے دستخطوں سے مزین جو چاندی کی شیلڈ اس مبارک موقع پر نذر کی ہے وہ اگرچہ بڑا قیمتی اور قابلِ عزت و احترام تحفہ ہے۔ لیکن ہماری رائے میں تو کل انشاء اللہ مستقبل قریب کا مورخ آپ کے اعتراف خدمات میں آب زر سے لکھی ہوئی تختی آپ کو نذر کرے گا۔

تبصرے

کلیات شاد عارفی

مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی، تقسیم کار: نیشنل اکاڈمی دہلی، سائز: ۱۸×۲۲، صفحات: ۴۶۴، قیمت: تیس روپے

مارچ ۱۹۶۴ء کے شمارے میں شاد عارفی کی وفات پر تعزیتی اداریہ لکھتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ رامپور کے کچھ نوجوان ان کے کلام کو یکجا کر کے چھاپنے میں کوشاں ہیں، اور خدا سے دعا کی تھی کہ ان کی کوشش کامیاب ہو۔ یہ کام اب شاد صاحب کے شاگرد مظفر حنفی نے کر دیا ہے۔ اپنے استاد کے تئیں ان کا جذبۂ عقیدت و احترام قابل ستائش ہے خصوصاً اس دور میں جب دوسرے رشتوں کی طرح شاگرد اور استاد کے رشتے کی تقدیس بھی معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ شاد کی وفات پر مظفر حنفی نے جو مرثیہ لکھا تھا، اسے پڑھ کر حالی کے مرثیۂ غالب کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ شاد صاحب پر اب تک جو مضامین لکھے گئے ہیں ان کا مجموعہ بھی مظفر صاحب مرتب کر چکے ہیں اور عنقریب منظر عام پر آنے والا ہے۔

شاد اردو کے ان معدودے شاعروں میں تھے جنھیں صاحب طرز کہا جا سکتا ہے۔ وہ نظیر اکبرآبادی کے بعد غالباً پہلے شاعر تھے جس نے بول چال کی زبان سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور اس کے امکانات میں اضافہ بھی کیا۔ نظیر ہی کی طرح انھوں نے شاعری کو ایک محدود طبقے کے جذبات کی بجائے وسیع تر عوام کے جذبات کا آئینہ بنایا لیکن جہاں نظیر اکبرآبادی کے لہجے میں ایک طرح کا عامیانہ پن تھا وہاں شاد کے لہجے میں پختگی تھی۔

شاد عارفی طنز کے شاعر تھے اور ظاہر ہے کہ ایک طنز گو شاعر اپنے دور کے معاشرے کو اپنا ہدف ضرور بناتا ہے۔ لیکن ان کے طنز میں عناد شامل نہیں ہے۔ وہ معاشرے پر طنز اس معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے کرتے تھے۔

اے شاد میں اکثر غزلوں میں اے شاد میں اکثر نظموں میں
خود پر بھی جو صادق آتی ہے ایسی جگ بیتی کہتا ہوں

جہاں تک ان کے مجموعی رویّے کا تعلق ہے اس کا اظہار ان کے ان شعروں میں ہوتا ہے۔ جو انھوں نے ایک مہاجر شاعر کو مخاطب کر کے کہے تھے:

تمھاری فرزانگی سے کچھ کم نہیں ہے دیوانہ پن ہمارا
تمھیں مبارک تمھاری ہجرت ہمیں مبارک وطن ہمارا
نہ ہو، نہیں ہے اس انجمن میں اگر کوئی ہم سخن ہمارا
مگر یقیں ہے کہ اور چمکے گا اور چمکے گا فن ہمارا

انھوں نے مذہبی ریاکاری پر بھی بھرپور چوٹیں کی ہیں۔ لیکن اس میں بھی مذہب سے بیزاری شامل نہیں تھی۔ یہ انھی کا شعر ہے:

وہیں دل کانپ جاتا ہے چھلک پڑتا ہے پیمانہ
جو پیتے وقت آجاتی ہے آوازِ اذاں مجھ کو

گردشِ لیل و نہار کا ذکر بھی ان کے یہاں صرف منفی انداز میں نہیں آتا:

اس کے رجحانِ نظر میں دلکشی پاتے ہوئے
اعتبارِ گردشِ لیل و نہار آتا گیا

شاد عارفی کو صرف طنز کا شاعر سمجھنا بھی زیادتی ہے۔ ان کے ہاں تغزل بھی ملتا ہے:

کوئی نقشِ قدمِ یار ابھرنے نہ دیا
یہ سہارا بھی ہمیں راہگذر نے نہ دیا

اس طرح ان سے نظر ملنے کا عالم یاد ہے
جس طرح مدت سے شغلِ بادہ پیہم میں ہوں

پے بہ پے بیتی ملاقاتوں پہ لکھتا ہوں غزل
مستقل گذرے ہوئے حالات کے ماتم میں ہوں

شاد عارفی کو شہرت تو ملی لیکن سرپرستی سے وہ محروم رہے

اور ساری عمر معمولی ملازمت کرکے گزر اوقات کرتے رہے۔ ان کی کلیات کی اشاعت میں مالی مدد دیکر حکومت ہند کی وزارتِ تعلیم و سماجی بہبود کے شعبۂ ثقافت نے کسی حد تک اس عدم توجہی کی تلافی کردی ہے۔ جوش صاحب کی زندگی میں ان سے بڑی لگن

——— گوپال متل

پہچان کا درد:

مصنف: حمید الماس، ناشر: شالیمار پبلیکیشنز حیدرآباد، قیمت: بارہ روپے

'پہچان کا درد' حمید الماس کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب ہے۔ اس میں ساٹھ نظمیں اور اڑتیس غزلیں شامل ہیں۔ چند نظمیں شاعر نے اپنی بیوی اور بچوں کو لے کر کہی ہیں۔ باقی میں انسان کی تمناؤں اور محرومیوں کا ذکر ہے۔ 'آخری نظم'، خوب تر کی تلاش، 'ابہاک کی وقعت اور فن کے اوج کی تمنا کی مظہر ہے۔' اسے روشنی طبع' میں انسان کی تخلیقی صلاحیت کے دنیاوی لذتوں کا شکار ہونے کا المیہ قلم بند ہے۔ 'بن باس'، تمنا کے نت نئے روپ دھارن کرکے ہم سے چمٹے رہنے کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ 'مراجعت'، انسان کے زمین کے ساتھ اٹوٹ رشتہ کی بابت بتاتی ہے۔ 'یہ نکھتوں کی نرم روی' میں منظر کشی اور رجائیت کی جھلک ملتی ہے۔ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ان کا اور دیگر تخلیقات کا فنی مرتبہ کیا ہے۔ حمید الماس نے اپنے خیالات، جذبات اور افکار کو شاعری میں ڈھالتے وقت نہایت نرم اور سادہ انداز اپنایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس پرکاری سے عدم واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ جو شاعری کو سحر انگیز بناتی ہے اور بے نیہ ہونے سے بچاتی ہے۔ فکر کو فن سے ہمکنار کرانے کے لئے جس بامعنی ابہام کی ضرورت ہے حمید الماس کی شاعری میں اس کی کمی ہے۔ وہ اس پراسراریت سے بڑی حد تک خالی ہیں جو ادب و آرٹ میں جلتے کرب کی غمازی کرتے ہوئے اس میں چونکا دینے والی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ مجلے، اعتراف، آخری سہارا جیسی نظموں میں روایتی انداز اظہار ہے۔ ان کی ڈکشن بھی پرانی ہے۔ کئی اچھی نظموں کے تاثر کو ان کے آخری زائد ٹکڑوں نے کمزور کر دیا ہے۔ دراصل حمید الماس کو یقین نہیں ہوتا کہ ان ٹکڑوں کے بغیر قاری ان کی بات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسی کچھ نظمیں ہیں۔ ہم لوگ، روداد، نروان، مدعا وغیرہ، پہچان کا درد، پہچان، میں، مسرت کا لمحہ اور تسخیر جیسی بامعنی اور تہہ دار تخلیقات، اس مجموعے کے حصۂ نظم کو قابلِ قبول بناتی ہیں۔

'پہچان کا درد' کی اڑتیس غزلوں میں آپ کو فراق، جگر، فیض وغیرہ اکثر مل جائیں گے لیکن حمید الماس سے ملاقات کے موقع کم آئیں گے۔

ہجر کی رات ہے پچھلے کا سماں ہے الماس
درد آہستہ ذرا بادِ صبا آہستہ

قفس ہے حسرتِ پرواز بھی ہے
مرا انجام خوش آغاز بھی ہے

عیادتِ نگہہ شرمسار کیا کہنا۔ مریضِ غم کے لئے اور واردات سبھی سلسلے شوق کے کچھ اور بھی ہیں۔ زلفِ پیچاں کے سلسلے کے سوا اور مجموعے میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کے مصرعوں میں ارکان کی کمی بیشی واقع ہوئی ہے۔

نئے پھول مہکیں نئے جام کھنکیں اڑیں کاگ اچھلیں سبو کی موجیں
زمانے کی جھنگی میں گھونگھٹ شفق کا دکھاتا ہے فردا کی کیا کیا پھبن

اڑتیس غزلوں میں کچھ شعر دلپذیر اور جاذبِ نظر ہیں۔

کون جانے سراغ منزلِ دوست | پائے رہرو کے آبلے کے سوا
چٹکے گا اپنا دل بھی کبھی ہر کلی کے ساتھ | تکمیل آرزوئے بہاراں کی دیر ہے
دن تو آوارگیٔ شہرِ بتاں میں گذرا | شب کو رنج و درد دیوار نے سونے نہ دیا
یوں بھی کیا تھا اور اب کیا رہ گیا | میں اکیلا تھا اکیلا رہ گیا

کتاب و طباعت عمدہ اور گیٹ اپ، گرد پوش خوبصورت ہے مجموعے کی قیمت ذرا کھٹکتی ہے۔

——— کنور سین

خوشبو:

مصنف: بدیع الزماں خاور، ناشر: نقش کوکن پبلیکیشنز ٹرسٹ جیل اسٹریٹ (ڈونگری) بمبئی - ۹، قیمت: چار روپے

'خوشبو' بدیع الزماں خاور کی مراٹھی نظموں کو اردو میں منتقل کرنے کی کامیاب کاوش ہے، مراٹھی شاعری کی ضخیم کتاب کے چند اوراق کو اردو کا جامہ پہنا کر کتابی شکل میں پیش کرکے خاور نے ایک اہم فریضہ سرانجام دیا ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر لسانی اور کثیر تمدنی مگر وحدت

طلب ملک میں مختلف زبانوں کو ایک دوسرے کے لسانی، جذباتی فکری اور تمدنی آہنگ سے روشناس کرانا ایک بڑا اور ضروری کام ہے۔ یہ ملک کے ادبی، فنی، معاشرتی اور سیاسی استحکام کے لئے لازمی ہے۔ اس کی بدولت ملک کے مختلف اور دور ونزدیک خطوں میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے ذوق وشوق میں حصّہ دار بن کر قومی یکجہتی کے منشور کو پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک زبان میں جو کچھ کہا گیا ہے، جس انداز سے کہا گیا ہے اور جس مقصد سے کہا گیا ہے اسے کسی دوسری زبان میں بگاڑے اور مسخ کئے بغیر اتارنا آسان بات نہیں ہے۔ ترجمہ کوئی میکانکی عمل نہیں۔ یہ محض الفاظ کا ردّ و بدل بھی نہیں۔ یہ بالآخر ایک تخلیقی عمل ہے جس کے لئے گہرے مطالعے، مکمل انہماک اور لگاتار ریاضت کی ضرورت ہے۔ مترجم کا دونوں زبانوں کے فنی، تہذیبی اور تمدنی ارتقا سے پوری طرح واقف ہونا اسکی کامیابی کے لئے ایک شرط ہے۔ مختلف زبانوں کی رمز وعلائم کو سمجھے بغیر وہ ادبی شہ پاروں کو ایک سے دوسری میں منتقل نہیں کرسکتا۔ خوشبو کی نظمیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ خاور نے مراٹھی شاعری کی روحانی بالیدگی کو صرف محفوظ ہی نہیں رکھا۔ بلکہ نئی ربودگی بخشی ہے۔ اگر ہمیں یہ پتہ نہ ہو کہ یہ نظمیں دراصل مراٹھی کی ہیں تو ہمیں انھیں خاور کی طبعزاد تخلیقات کے طور پر قبول کرنے سے انکار نہیں ہوگا۔ مراٹھی شاعروں نے ان میں جس جذباتی اور جمالیاتی حس و وارداتی اور حادثاتی لذّتِ کرب اور فکری اور احساساتی آہنگ کو سمویا ہے خاور نے اسے ماند نہیں پڑنے دیا۔ بلکہ نظموں میں بامعنی ابہام استعارہ سازی اور جدید حسّیت کی جو خصوصیات ہیں انھیں اردو میں اتارنے میں فنی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ ندی اور چیونٹی جیسی علامتی نظموں کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ندی کو کشادہ دلی اور بے تعصبی کی علامت بناتے ہوئے مراٹھی شاعر اردو کے ایک ہم پلّہ کے ذریعہ ہم سے متعارف ہوتا ہے

کوئی مشکیزہ ہوگا کہ ہوکہ پیتل کا گھڑا
جو بھی برتن ہو گیا خالی وہ اس نے بھر دیا
ڈھل رہا ہے کس طرح سے ظرف میں آبِ رواں
اس کو یہ معلوم کرلینے کی فرصت ہی کہاں

جینے کے لئے قناعت اور قلندرانہ سرمستی کی غمازی کرنے کے ساتھ ہی انسان کے جنسی، اقتصادی، معاشی اور تہذیبی المیے کی مظہر نظم "ایک آنکھ اور ایک آنکھ" اس ننھی اور معصوم تواہش کے حسرتناک انجام کا اظہار بھی کرتی ہے۔

اس زمانے میں یہی چیزیں مگر
چاہتا ہے آدمی جس وقت جینے کے لئے
یہ زمیں تلتی ہے اس کا خون پینے کے لئے

اس طرح کی بہت ساری دوسری نظمیں خاور کی مشّاقی کی داد دیتی نظر آتی ہیں اور دوسرے ادیبوں کو ایسی ہی کاوش کے لئے حوصلہ دیتی ہیں۔ کتابت وطباعت اچھی ہے۔ قیمت بھی واجبی ہے۔

—— کنور سین

"دیواریں" (مجموعۂ کلام)

از مہیش چندر نقش، قیمت: پانچ روپے
ناشر: سنگم کتاب گھر اردو بازار جامع مسجد، دہلی

"دیواریں" مہیش چندر نقش کا نیا مجموعۂ کلام ہے جو غزلیات اور قطعات پر مشتمل ہے اس مجموعے کا ایک شعر ہے۔

میرے افکار نے بنائی ہیں — ایک ایوانِ نو کی دیواریں

اگر یہ شعر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نقش صاحب کا نیا مجموعۂ کلام ہے تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر اس سے یہ دعویٰ مقصود ہے کہ ان کے مجموعۂ کلام میں فکر وفن کے اعتبار سے کوئی نیا پن ہے تو اسے شاعرانہ تعلّی ہی سمجھا جائے گا۔ ان کے اس "ایوانِ نو" میں مواد و مسالہ سے لے کر رنگ وروغن تک ہر چیز پرانی ہے مضامین بھی روایتی ہیں اور زبان وبیان بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ روایت کا اپنا ایک حسن ہے اور یہ حسن اس مجموعے میں بھی نظر آتا ہے۔ کلام میں سلاست، روانی اور ترنم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ زبان وبیان کے ساتھ ساتھ غزلوں کے لئے بحریں اور زمینیں بھی عام طور پر ایسی اختیار کی گئی ہیں جو ان خصوصیات کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوں۔ یہ خصوصیات حسنِ کلام کا باعث ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر روایت پرستی کی لے اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ آج کا شعری مذاق اسے قبول نہیں کرسکتا۔ مجموعے سے اس قسم کی غزلیں خارج کردی جاتیں تو اچھا تھا۔

دل کو امید ان کے آنے کی — جنکو عادت ہے بھول جانے کی

مجموعے کے چند اچھے اشعار درج ذیل ہیں:۔

اک اور نیا موڑ ہے ہستی کے سفر میں ۔ ہر موڑ پہ یہ راہگذروں نے کہا ہے
منزل ہے لگا ہوں میں تو اب جادۂ منزل ۔ اے کاش کوئی بڑھ کے مجھے میرا پتا دے
دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے ۔ اپنے نزدیک ہو رہے ہیں ہم

فنی اسقام سے کلام عام طور پر پاک ہے لیکن کہیں کہیں نظرثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل مصرعے بحر سے خارج ہیں ۔

دلکش رہا تھا پھول سا مکھڑا ۔
پھول شبنم یہ کہکشاں یہ تارے
دیکھے نہ کوئی ہم کو نگہِ ہوشیار سے

مندرجہ ذیل شعر میں "تاریک تر" کے بجائے "تاریک" کا محل تھا ۔

فضائیں اسقدر تاریک تر ہیں ۔ ستارے ڈھونڈتے ہیں روشنی کو

کتابت و طباعت اچھی ہے ۔ کتابت کی صحت پر توجہ دینی چاہیے تھی ۔ غزلوں میں کم مگر قطعات میں کافی غلطیاں نظر آتی ہیں ۔

(حیف کیفی)

گل رنگ (مضامین)

مصنف: وزیر علی سہروردی ، ناشر: سلامتی پبلیکیشنز بی . بی مسجد مومن پورہ ، گلبرگہ . ۴ (کرناٹک) ، قیمت : ایک روپیہ

مولانا وزیر علی سہروردی گلبرگہ کی معروف شخصیت ہیں اور وہاں کے علمی ادبی حلقوں میں انھیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ اس سے پہلے ان کی چند اور کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں ۔ جو گلبرگہ کی تہذیب و تاریخ کے بعض خاص گوشوں کو پیش کرتی ہیں ۔ زیر نظر کتابچہ ان کے کچھ مختصر مضامین پر مشتمل ہے ۔ پہلا مضمون گلبرگہ میں عید کے تہواری رسموں کا تعارف کراتا ہے اور بہت دلکش انداز میں لکھا گیا ہے ۔ دوسرے مضمون میں گلبرگہ کے بعض مرحوم مصنفین کی یاد تازہ کی گئی ہے اور ساتھ ہی موجودہ زمانے کے اہل قلم کا ذکر بھی کیا گیا ہے ۔ اگلے مضمون میں گلبرگہ کے کچھ شاعروں کا حال لکھا گیا ہے جس میں ضمناً بہت سے شاعروں کا مختصر سا تعارف بھی آگیا ہے ۔ باقی مضامین بھی دلچسپ موضوعات پر ہیں ۔ اور اختصار کے باوجود مفید معلومات کے حامل ہیں ۔

—— پریم گوپال متل

مانگے کا اجالا

جب آتش جواں تھا

اس بازار میں میری ایک رسواسی کتاب ہے، یہ نخاشی کی تاریخ ہے۔ اس کا خیال مجھے ایک فیچر سے پیدا ہوا جو میں نے "چٹان" کے سالگرہ نمبر میں لکھا تھا۔ سالک صاحب نے زور دیا کہ میں اس فیچر کو مختلف ابواب میں تقسیم کرکے کتاب لکھ دوں۔ اس بازار میں پھرتے پھراتے مجھے ایسے گھرانے میں جانا پڑا جس کی مالکن کبھی جوان تھی۔ ایک زمانے میں علامہ اقبال اس کی آواز سے خوش ہوئے تھے۔ اس کا نام امیر تھا۔ امیر کا زمانہ لد چکا تھا۔ اس وقت ستر پچھتر برس کے پیٹے میں تھی۔ چہرے پر جھریوں کی چینٹ سا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ملیدہ ہوئے عیش کی تصویر ہے۔ میں نے ادھر ادھر سے ٹانکے ملا کر سوال کیا۔ کہ وہ مجھے اقبال کے بارے میں کیا بتا سکتی ہے؟ لیکن مرغ دے گئی۔ میں نے اصرار کیا اس نے رسید تک نہ دی۔ میں نے پچکارنا چاہا وہ ٹال گئی۔ ہزار جتن کئے لیکن کسی طرح بھی ڈھب پر نہ آئی۔ جب میں نے سارے داؤ استعمال کر لئے تو خدا کا واسطہ ڈالا۔ لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ جب میں نے عذر و انکار کی وجہ پوچھی تو اس نے حقے کی نے چھوڑتے ہوئے کہا:

"ہم لوگ شرفا کے رازوں کی نمائش (یا بیوپار نہیں) کیا کرتے آپ خواہ مخواہ ہوا کو مٹھی میں تھامنا چاہتے ہیں۔"

واپس آکر میں نے سالک صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ امیر کے ذکر سے ششدر رہ گئے۔ پوچھا "ابھی تک زندہ ہے؟"

عرض کیا، جی ہاں،

پھر انھوں نے ایک واقعہ سنایا کہ مولانا گرامی لاہور تشریف لائے تو مجھے دفتر سے اٹھا کر علامہ اقبال کے ہاں لے گئے۔ علامہ ان دنوں بازار حکیماں میں رہتے تھے۔ علی بخش سے پتہ چلا کہ علامہ بیمار ہیں، دھسا لے کر لیٹے ہوئے تھے، ڈاڑھی بڑھی ہوئی، چہرا اترا ہوا، آنکھیں دھنسی ہوئی، گرامی دیکھتے ہی پوچھا خیریت ہے؟ معلوم ہوا کہ امیر کی ماں نے میل ملاقات بند کر دی ہے۔ پچھلے تین روز سے ملاقات نہیں ہوئی۔ گرامی کھلکھلا کر ہنس پڑے، پنجابی میں کہا:

او چھڈ یار توں وی غضب کرتا ایں، "او تینوں اپنی ہنڈی کس طرح دے دیں" (چھوڑو یار تم بھی غضب کرتے ہو بھلا وہ تمھیں اپنی ہنڈی کیونکر دے دے)

علامہ بے حد غمگین تھے۔ گرامی نے علی بخش سے کہا گاڑی تیار کرو۔ مجھے ساتھ لیا اور اس بازار کو روانہ ہو گئے۔ امیر کے مکان پر پہنچے۔ دستک دی، امیر کی ماں نے گرامی کو دیکھا تو خوشدلی سے خیر مقدم کیا:

آپ اور یہاں؟ اہلاً و سہلاً

گرامی نے امیر کی ماں سے گلہ کیا۔ کہ تو نے ہمارے شاعر کو ختم کرنے کی ٹھانی ہے۔ اس نے کہا مولانا! شاعروں کے پاس کیا ہے؟ چار قافیے اور دو ردیفیں، کیا میں اپنی لڑکی ہاتھ سے دیکر فاقے مر جاؤں؟ آپ کا شاعر ہمارے ہاں نقب لگانے آتا ہے، میری لڑکی چلی گئی تو کون ذمہ دار ہوگا؟

گرامی نے اجلی ڈاڑھی کا واسطہ دیا اور دو گھنٹے کی شخصی ضمانت دیکر امیر کو ساتھ لے آئے۔ میں علی بخش کے ساتھ گرامی امیر کے ساتھ، گھوڑا دلکی میں چلا آ رہا تھا۔ علامہ کے ہاں پہنچے تو گرامی نے جھنجوڑتے ہوئے کہا: اٹھو جی آگئی امیر۔

سچ مچ؟ علامہ نے حیرت سے پوچھا۔

امیر سامنے کھڑی تھی۔ دفعتاً ان کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ سالک صاحب نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا: زندگی میں اس قسم کی آرزوئیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ انسان کو ان راستوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے فرمایا: جس زمانے میں اقبال انارکلی میں رہتے تھے۔ ان دنوں لاہوری دروازہ اور پرانی انارکلی میں کچھ کسبیوں کے مکان

تھے۔ ایک دن میں علامہ کے ہمراہ انارکلی سے گذر رہا تھا کہ اچانک وہ ایک تنگ گلی کے دروازے پر رک گئے۔ ادھیڑ عمر کی کالی کلوٹی عورت مونڈھے پر بیٹھی حقہ سلگا رہی تھی۔ اندر گئے۔ حقے کا کش لگایا اٹھی یا روپیہ اس کے ہاتھ میں دے کر آ گئے۔ میں بھونچکا رہ گیا ڈاکٹر صاحب یہ کیا حرکت؟ فرمایا، سالک صاحب اس عورت پر نگاہ پڑی تو اس کی شکل دیکھ کر جھرجھری آ گئی۔ کہ اس کے پاس کون آتا ہوگا پھر مجھے اپنے الفاظ میں تکبر محسوس ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ آخر اس کے پہلو میں بھی دل ہوگا۔ یہی احساس مجھے اس کے پاس لے گیا کہ اپنے نفس کو سزا دے سکوں اور اس کی دلجوئی کروں۔ یہ عورت صرف پیٹ کی مار کے باعث یہاں بیٹھی ہے۔ ورنہ اس میں جسم کے عیش کی ادنیٰ سی علامت بھی نہیں ہے۔

شورش کاشمیری (پس دیوارِ زنداں)

تخلیقی سفر میں ایک تنہا مسافر

مجنوں نے کہا تھا کہ تخلیقی سفر میں تنہائی ایک اذیت ناک عمل ہے ہمارے عہد میں ایک ایسا شاعر ہوا جس نے اس اذیت ناکی کو قبول کرنے کا جگر پیدا کیا۔ ادبی مرکزوں سے دور تحریکوں سے بے تعلق نعروں اور نظریاتی بحثوں سے بے نیاز اس نے ساہیوال میں ڈیرہ کیا۔ اور شاعری کو شعار کیا کل اس تنہا آدمی کا تخلیقی سفر تمام ہوا۔ تخلیقی سفر بھی اور زندگی کا سفر بھی ساہیوال کے اس ویران مکان میں کسی نے جھانک کر دیکھا۔ جہاں سے ایک سینک سلائی آدمی وقتاً فوقتاً نکل کر سائیکل پر سوار ہو کر رینگتا رینگتا سٹیڈیم ہوٹل کی طرف جاتا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ سائیکل کھڑی تھی۔ اور آدمی سو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے سو گیا تھا۔ اردو شاعری مجید امجد کو کھو بیٹھی تھی۔

مجید امجد نے ایک ہنگامہ خیز دور میں آنکھ کھولی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ پیدا ہوا۔ ترقی پسند تحریک اور نئے ادب کی تحریک کے زمانہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ شاعر کو ہنگامے سے نفور تھا۔ نہ شخصیت پر شور نہ شاعری ہنگامہ خیز۔ دوسرے شاعر تحریکوں اور شاعروں اور انجمنوں کے زور پر چمک رہے تھے۔ مجید امجد نہ ترقی پسند تحریک میں شامل ہوئے نہ میرا جی کی منڈلی سے پیوست ہوئے نہ کبھی دیکھی۔ نہ لاہور میں رہے۔ ایک ایسی بستی میں ٹھکانہ بنایا جس کی فضا میں اتنی ترنم ریزی اور دھیما پن ہے۔ جتنا ان کی نظموں میں ہے

مجید امجد اپنے عہد میں رہتے ہوئے اپنے عہد سے پنہاں رہے مگر عہد ان سے پنہاں نہیں تھا۔ عہد سے ایک سطح پر گہرا تعلق، دوسری سطح پر گہرا تعلق کسی ادبی تحریک یا کسی سیاسی قضیے کے واسطے سے نہیں۔ بلکہ طرزِ احساس کے واسطے سے انھوں نے عہد سے رشتہ پیدا کیا تھا۔ اور پچھلے چالیس سال کی ہماری ادبی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ادبی تحریکوں اور سیاسی تحریکوں کے واسطے سے عہد کے ساتھ رشتہ جوڑنے میں بالعموم یہ گھپلا ہو جاتا ہے کہ لکھنے والا خود عہد کا حصہ بن جاتا ہے۔ عہد کا مفسر نہیں بن پاتا۔ عہد سے گہرا رشتہ عہد کے طرزِ احساس تک رسائی حاصل کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور عہد کا ترجمان اور مفسر بننے کے لئے عہد سے بے تعلق بھی ہونا پڑتا ہے مجید امجد عہد سے اتنے بے تعلق تھے کہ زمانے کے کسی اچھے برے میں ہم عصروں کے کسی قصے قضیے میں کبھی شامل نہیں دیکھے گئے۔ مجید امجد علائقِ دنیوی سے آزاد تھے جس طور کوئی بڑا صوفی علائقِ دنیوی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ غیر صوفی کا تو زمانہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مگر شاعر اگر یہ طور اختیار کرے۔ تو زمانہ اس سے پورا پورا بدلہ لیتا ہے

ویسے تو مجید امجد کے یہاں ترقی کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی حالانکہ آج کل تو ہر ادیب ترقی کرنے پر تلا ہوا ہے انھوں نے تو اپنی ملازمت میں بھی ترقی کے راستے اپنے آپ اس طرح بند کر لئے تھے کہ ساہیوال سے تبادلہ ہو کر باہر جانے کے لئے کبھی آمادہ ہی نہ ہوئے دنیا سے بے تعلقی اپنی جگہ قناعت اپنی جگہ مگر آدمی کے ساتھ ہر پیچ مرض تو لگا ہی ہوا ہے۔ ریٹائر ہونے کے ساتھ ساتھ مجید امجد اپنی ساری تندرستی اور توانائی کھو بیٹھے ہیں۔ ان کی بیماری کا پتہ بھی باہر والوں کو بس اتفاق سے ہی چل گیا منیر نیازی اور احمد مشتاق کہیں ساہیوال میں جا نکلے۔ ہمراہ ہم بھی تھے۔ دیکھا مجید امجد اب وہ مجید امجد نہیں ہیں۔ گھل گھلا کر بس ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ لگتا ہے زندگی کا سفر اب ختم ہوا چاہتا ہے۔ مگر تخلیقی سفر اسی حساب سے تیز ہو گیا ہے زندگی سے تھک کر وہ شاعری میں اتنا تیز چلے کہ نظموں کے انبار لگا دیے۔ آخری ایام میں مجید امجد نے اتنا کہا کہ ان کا مروجہ شعری مجموعہ "شبِ رفتہ" اب اس کا ایک چھوٹا سا جز ہے اور یہ کچھ ایسا نہیں ہے کہ اسے بسیار گوئی کہہ کر ٹال دیا جائے۔ ان نظموں میں مجید امجد نے

نئے امکانات کو ٹٹولتے نظر آتے ہیں۔

مگر یہ شعر و ادب کی ناقدری کا زمانہ ہے۔ اس کتاب کے کتابی صورت میں چھپنے کے امکانات کچھ زیادہ روشن نہیں ہیں۔ باقی رہی ادبی دنیا تو وہ بس اتنا ہی کر سکتی ہے کہ چند تعزیتی جلسے کرے اور شاعر کی نامردانہ زلیست پر تھوڑا سا افسوس کرے سو یہ ہوا لوا کو ہونے والے ہر ادبی جلسے میں مجید امجد کے لئے صف ماتم بچھی، تعزیت کی گئی۔ شاعر کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

انتظار حسین۔ (قندمر دان)

تیز رفتاری کا شکار۔

اکثر لوگوں نے میراجی کی موت کو ایک حادثہ قرار دیا ہے۔ حادثہ جس کا باعث وہ سست روی تھی جو ایک بوجھل سی تھکاوٹ بن کر میراجی کے رگ و پے میں سرایت کر گئی اور وہ ذہنی اور جسمانی طور پر نڈھال ہو کر رہ گیا مگر میرا خیال یہ ہے کہ میراجی کی موت کا حادثہ سست روی کے باعث نہیں بلکہ تیز رفتاری کی وجہ سے رونما ہوا ایک ایسی تیز رفتاری جو زندگی کے ٹریفک سے صدیوں پرانے قوانین کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔

اس بات سے کون انکار کرے گا کہ زندگی کی شاہ راہ پر سفر کرنے والے ہر مسافر کے لیے لازم ہے کہ وہ سفر کے آداب سے واقف ہو ایک خاص شریفانہ رفتار سے تجاوز نہ کرے، سرخ آنکھ نظر آئے تو رک جائے، سبز آنکھ نمودار ہو تو چل پڑے۔ دائیں طرف مڑنا ہو تو اپنی نیت کا اعلان کرے۔ بائیں جانب جانا ہو تو بلا اجازت مڑ جائے وغیرہ۔ مگر المیہ یہ ہے کہ کچھ ہی عرصہ کی تابعداری کے بعد ٹریفک کے اصول ایک آسیب کی طرح اسے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور وہ بغیر سوچے سمجھے ایک مشین کی طرح کام کرنے لگتا ہے۔ اس سے جسم کو "حیات ابدی" اور روح کو "مرگ دوام" کا عطیہ ملتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک نارمل انسان زندگی کی رسوم اور آداب کے تابع ہوتا ہے۔ وہ ایک صدیوں پرانا مگر آزمودہ زرہ بکتر پہن کر باہر نکلتا ہے جو اسے حادثات سے بچاتا اور طبعی موت سے پہلے مرنے نہیں دیتا بائیڈگر کا خیال ہے کہ ایسا شخص FORGETFULNESS OF EXISTENCE میں مبتلا ہوتا ہے یعنی روزمرہ کی تکرار کا اس درجہ اسیر ہوتا ہے کہ حقیقت کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ مگر سب لوگ

تو نارمل نہیں ہوتے۔ ان میں کہیں نہ کہیں کوئی پگلا پتنگی بھی جنم لیتا ہے جو رسوم اور آداب کو زنجیریں اور سلاسل سمجھتا ہے۔ اور جسے ہر دم یہ احساس ستاتا ہے کہ وہ اپنے ہی جسم کی خانقاہ میں ایک راہب کی طرح قید ہے۔ تب کسی روز اس کے اندر کا لہو یک دم ابل اٹھتا ہے اور اس کی رفتار زندگی کی عام رفتار سے تیز ہو جاتی ہے۔ یوں وہ شاہراہ حیات پر چلنے والے دوسرے مسافروں ہی سے نہیں ٹکراتا کبھی کبھی سنتری بہادر سے بھی الجھ جاتا ہے۔ میراجی ایک ایسا ہی مسافر تھا جس نے اپنی تیز رفتاری کے باعث نہ صرف اپنے زمانے کی باعصمت سوسائٹی کے لئے مسائل پیدا کر دئے بلکہ خود اپنی ذات کے لئے بھی خطرہ بن گیا۔ اور بالآخر اس جیٹ ہوائی جہاز کی طرح جو آواز کی رفتار سے زیادہ تیز اڑنے کی خواہش میں اپنے لئے ایک ساونڈ بیریر SOUND BARRIER پیدا کر لیتا ہے، میراجی نے بھی ایک ایسی ہی رکاوٹ خود اپنے ہاتھوں تعمیر کر لی۔ پھر جب اس نے ساونڈ بیریر کو عبور کرنے کی کوشش کی تو ایک دھماکے کے ساتھ فضا میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔

اردو ادب میں تیز رفتاری کے باعث پیش آنے والا یہ پہلا حادثہ نہیں تھا کیونکہ میراجی کے علاوہ بھی ہمیں بعض ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو دوسروں سے زیادہ تیز رفتار تھے اور اس لئے حادثات کی زد میں آ کر وقت سے پہلے ہی رخصت ہو گئے۔ مگر ان میں سے ہر ایک کا سفر کسی سمت کا تابع ضرور تھا جب کہ میراجی نے بیک وقت کئی سمتوں میں ایک سی تیزی کے ساتھ سفر کیا جسمانی سطح پر اس کا سفر بظاہر شمال سے جنوب کی طرف تھا۔ اور اس بات پر اسے فخر بھی تھا کیونکہ وہ کسی نہ کسی حد تک آریاؤں کے نسلی برتری کے تصور میں مبتلا تھا۔ اور اپنے سفر کو ہزاروں برس پہلے کی آریائی یلغار سے منسلک کر کے خود کو تاریخ کے دھارے کی ایک لہر قرار دے دیا۔ میں خوشی محسوس کر رہا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میراجی کا جسمانی سطح کا یہ سفر بھی سیدھی سڑک پر طے نہ ہوا۔ بلکہ اس کی شخصیت کی طرح لاتعداد قوسوں میں بار بار کٹتا رہا۔ ویسے بھی میراجی کو موڑ اور قوسیں زیادہ پسند تھیں۔ یہ بات اس کی نظموں سے بھی عیاں ہے۔ جو سیدھے خطوط کی نقلیں نہیں بلکہ سمندر کی طرح کاٹتی اور بل کھاتی ہوئی ناگنوں کی طرح ہیں۔ اور اس کے عام مزاج اور پسند سے بھی! مثلاً بقول میراجی اسے عورتوں کے پہناوے میں راجپوتانی لہنگے کا پیچ و تاب بطور خاص

پسند تھا۔ اس کے بارے میں میراجی کا خیال ہے کہ یہ کوئی طوفانی شے ہے جس میں جنگل کا گھنا گرم جادو بھی ہے۔ اور سمندر کا تلاطم بھی ایسی حالت اس کے ذوق سفر کا تھا۔ کہ اس نے گرینڈ ٹرنک روڈ پر زیادہ دیر سفر کرنا کبھی پسند نہ کیا۔ چنانچہ آپ دیکھئے کہ اس کی پیدائش پنجاب میں ہوئی۔ بچپن گجرات کاٹھیاواڑ میں بسر ہوا۔ لڑکپن نے سندھ کے ریگستانوں میں آنکھ کھولی، جوانی لاہور میں بیدار ہوئی۔ پھر وہ دلّی پہنچا۔ دلّی میں اس کے اندر کا محمد تغلق جاگ اٹھا اور وہ جنوب کی طرف روانہ ہوگیا۔ پھر وہ بمبئی پہنچا۔ اگر زندگی یہ عجلت ساتھ نہ چھوڑ دیتی تو وہ غالباً جنوبی ہندوستان کے وسیع شاداب علاقوں میں نکل جاتا۔ جہاں کے قدیم مندروں سے اٹھتی ہوئی ہزاروں برس پرانی فضا اسے ضرور راس آتی۔ اور پھر پورب کی طرف بنگال تھا۔ جس میں داخل ہونے کے کئی راستے تھے۔ اور نکلنے کا راستہ کوئی نہیں تھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ میراجی وہاں بھی نہ رکتا۔ کیونکہ اس کے عقب میں سمندر کا بلاوا تھا۔ اور سمندر کا بلاوا دراصل ماں کا بلاوا تھا۔

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے
مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے۔

کبھی ایک پل کو کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی ندا آ رہی ہے
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ شاید تھکے گا۔
"میرے پیارے بچے" "مجھے تم سے کتنی محبت ہے" "دیکھو اگر یوں کیا تو
برا مجھ سے بڑھ کر کوئی بھی نہ ہوگا" "خدایا۔ خدایا ——!!

وزیر آغا (اوراق۔ لاہور)

بقیہ ۔ نقطے اور لکیریں

راہ الگ نکالنے کے لیے ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ اور میں بھی چاہتا ہوں کہ اس مقام سے آگے اپنی راہ خود متعین کروں ؎

ایک نقطے سے کئی لکیریں نکل کر مختلف اطراف میں پھیل گئیں
یقیناً ہم میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا۔

—— دائرے کے مطابق معمولاً طویل سفر کے بعد ہم ایک بستی میں داخل ہوئے اور تب یوں ہوا کہ ہم میں سے ایک (میں) اس بستی کے سناٹے سے خوفزدہ ہوگیا۔ اس نے (میں نے) بہت زور سے چیخ ماری بستی کا سناٹا ٹوٹ نہ سکا اور جب وہ دوبارہ چیخا تو ہم نے یہ دیکھا کہ اس کی یہ دوسری چیخ پہلی چیخ کی تصدیق کے لئے تھی۔ تو کیا وہ (میں) اپنی آواز نہیں پہچان سکا تھا —— تب ہم میں سے ہر ایک پریشان ہوگیا۔ مجھے (اور ہر ایک کو) احساس ہوا کہ باہر کے سناٹے نے ہمارے اندر بھی سناٹا بھر دیا ہے۔ چیخنے والا بدحواس ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ باقی لوگ وہاں رکنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے وہ آگے بڑھ گئے۔ وہ (میں) پیچھے رہ گیا۔

اب ہم تعداد میں بہت کم تھے اتنے کم کہ ہم میں سے ہر ایک کو ایک دوسرے پر ایک دوسرے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ میں تھا۔ میں وہ تھا۔ بس میں تھا۔

دائرے کے مطابق معمول طویل سفر کے بعد ایک جگہ ہم رکے (میں رکا) اس جگہ ایک کھردری شے پڑی ہوئی تھی۔ اسے چھوا تو معلوم ہوا ایک کینوس ہے (احساس تو ابھی تک زندہ ہیں) البتہ کینوس پر کچھ نقوش تھے۔ کوئی تصویر رہی ہوگی۔ لیکن اب تو سیاہ دھبے رہ گئے تھے۔

میں نے (کسی نے) آگے نظر ڈالی اور کچھ کہے بغیر روانہ ہوگیا۔

تب مجھے (راستے) احساس ہوا کہ میں اس راستے پر سفر کر چکا ہوں ——!!

Regd. No. D (D) 118 Phone 271649

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 646/57

TAHREEK

آزادی

پنجاب و آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک دہلی

شمارہ : ۶ — جلد : ۲۳

ستمبر ۱۹۷۵ء

اداریٔ تحریر :

گوپال متل

مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : دس روپے ، فی کاپی : ایک روپیہ
غیر ممالک سے
سالانہ : تیس شلنگ ، فی کاپی : تین شلنگ
خط کتابت اور ترسیل زر کا پتہ
۹۔ انصاری مارکیٹ ، دریا گنج ، دہلی ۔ ۶
قیمت : ۔/۱
پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر ... ... گوپال متل
مطبع ... ... نعمانی پریس دہلی
مقام اشاعت ... ... ۹۔ انصاری مارکیٹ
دریا گنج دہلی ۶

گوپال متل

ھیں کواکب کچھ نظر آتے ھیں کچھ

اس ماہ "مانگے کا اجالا" میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر احسن فاروقی کی تحریریں خصوصی توجہ چاہتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے بارے میں ان دونوں حضرات کا رویہ فراخدلی پر مبنی ہے اور انہوں نے جو باتیں کہی ہیں وہ اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر فاروقی کسی زمانے میں خود بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنا پر کہ اس انجمن کی تھوڑی بہت ادبی حیثیت ضرور ہوگی۔ ان کا ازالہ سحر ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کا باعث ہو سکتا ہے جو ترقی پسندوں کے اس قسم کے دعاوی سے متاثر ہو کر کہ انھوں نے فرقہ پرستی کو خیرباد کہہ دیا ہے، از سر نو ان کے دامِ تزویر میں گرفتار ہونے لگے ہیں۔

اس قسم کے حضرات سے ایک درخواست ہم خاص طور پر کرنا چاہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ انجمن کے قالبِ مردہ میں جان ڈالنے کے لیے اور اپنے ماتھے سے انتہاپسندی کا کلنک دھونے کے لیے ترقی پسند وقتی طور پر اپنے جلسوں میں ان حضرات کی تنقید کو گوارا کر لیں اور وہ تہدیدی رویہ اختیار نہ کریں جو مجروح نے ڈاکٹر احسن فاروقی کی تنقید کے جواب میں اختیار کیا تھا، لیکن انجمن کے جلسوں میں ان حضرات کی شرکت بجائے خود ترقی پسندوں کے غیر ادبی مقاصد کی تقویت کا باعث بن سکتی ہے۔ تنقید کے طور پر جو کچھ یہ حضرات کہیں گے اسے صرف محدود اشاعت ملے گی، لیکن ان کی شرکت کو خوب خوب مشتہر کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر دہلی میں ترقی پسندوں نے جو سیمینار منعقد کیا اس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے ترقی پسند ہونے سے انکار بھی کیا، ادیب کی ذہنی آزادی پر بھی زور دیا اور ادیب کا یہ حق بھی تسلیم کیا کہ وہ لاشعور کی بھول بھلیوں میں داخل ہو سکتا ہے۔ انھوں نے یہاں تک بھی کہا کہ پہلے کا افسانہ انسان کے سماج کی تعمیر کا افسانہ تھا، آج کا افسانہ انسان کی دریافت کا افسانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں ادب کے ترقی پسند نظریے سے براہ راست متصادم ہوتی ہیں۔ لیکن سابقہ تجربہ بتاتا ہے کہ ترقی پسندوں پر ان کی کسی بات کا اثر نہیں ہوگا۔ وہ ان کی باتوں کو ان سنی کر دیں گے اور پروپیگنڈے میں زور صرف اس بات پر دیں گے کہ ان کے سیمینار میں ڈاکٹر نارنگ بھی شریک ہوئے۔ منشی پریم چند نے بھی ترقی پسندوں کی پہلی کانفرنس میں جو کچھ کہا تھا وہ ترقی پسند نظریات سے متصادم تھا لیکن ترقی پسند ناقد جب بھی اس کانفرنس کے بارے میں لکھتے ہیں تو منشی پریم چند کی باتوں کو گول کر جاتے ہیں اور صرف اس بات کو اچھالتے ہیں کہ کانفرنس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔

اسلم

کرشن موہن

کھُردری غزل

رقابت کی یونہی سرد بے جان کیا ہوس کا ذرا، تیج بھی تو دکھا
کسے تن پہ، روح میں کافرہ زباں کی طرح جسم بھی کھردرا
مرا ذہن کرگہ جولاہے کا تھا کہ دن رات اشعار بنتا رہا
بلا جنسیت، انسیت، کلبیت وفا کا چلن ہے ملن کا مزا
بڑا سخت دل تھا، بڑا ہوشیار ملن کے سمے ہو گیا باولا
یہ سودا ہے سودا بازی نہیں تجارت نہیں شوق کا ماجرا
کہے ایک ہی بات کو بار بار شروع سفر ہی میں، وہ کھو گیا
اٹھائیں نہ کیوں اس کا جی بھر کے لطف کہ شام جوانی نہیں دیر پا
چلے ریڈیو دور درشن کے سنگ عجب رنگ ہے یہ بھی اسراف کا
محبت تقاضوں کی بھرمار ہے گرہست آشرم ہے چھیتی بلا
اجیرن ہوئی میری شام شباب جو اک ننھے پتھر سے پالا پڑا
بلا وہ پڑی جس کا درماں نہیں کہاں جائے میرا دل مبتلا
پروٹین، ہستی کی روٹین ہے وہ کمزور ہے جو ہے بے قاعدہ
ترا طعن نا یافت اچھا نہیں مجھے تجھ سے ہے پیار تجھ سے گلا
✓ نہ حسن قوافی نہ لطف بیاں عجب ہے یہ اشعار کا سلسلہ

نہ تھے اس قدر کھردرے تیرے شعر ✓
تجھے کرشن موہن یہ کیا ہو گیا

فضا ابن فیضی

پی ہوئی کوئی حکمت ضرور ہے مجھ میں
ا یہ داعیہ کج ہے، فتور ہے مجھ میں

ں بے ضرر سا مگر پھر بھی اک قیامت ہوں
یسی شورشِ یومِ نشور ہے مجھ میں

ہیں جو دونوں توازن کی قدر بن جائیں
سرور تجھ میں ہے لیکن شعور ہے مجھ میں

بس اتنی بات ہے سنجیدگی کا پیکر ہوں
تجھے یہ وہم کہ وضعِ غرور ہے مجھ میں

چراغ دن کے اجالے میں کیا جلائے کوئی
ہوں شب نورد کہ شمعوں کا نور ہے مجھ میں

جو تجھ کو دیکھنا چاہے اُسے دکھا مجھ کو
کہ تیرا غیب بہ رنگِ ظہور ہے مجھ میں

اسی کے ساتھ کہیں میں نہ خود بکھر جاؤں
یہ کون ہے کہ جو یوں چور چور ہے مجھ میں

مجھے نچوڑ کے دیکھو کہ موجِ کوثر ہوں
لہو نہیں یہ شرابِ طہور ہے مجھ میں

صحیفے طاق پہ رکھ دے، مرا مطالعہ کر
کہ کُن کا حاصلِ بین السطور ہے مجھ میں

فضا کے دم سے عبارت ہے یہ نشاطِ غزل
وہ بن کے جذبۂ دل کا وفور ہے مجھ میں

حرمت الاکرام

قطرہ قطرہ جو مجھے آنکھوں سے بہایا ہوتا
آبجو سا کسی قلزم سے ملایا ہوتا

پھول کیوں حسرتِ ناکام لیے مرجھاتا
شاخ سے توڑ کے زلفوں میں سجایا ہوتا

کتنی مغرور ہے یادوں کی جراحت طلبی
زہر میں پھر کسی خنجر کو بجھایا ہوتا

دے کے دستک نہ ہواؤں کو پلٹ جانا تھا
بات تب تھی کہ سوتوں کو جگایا ہوتا

تو شمالات کے آنچل سے ستارہ کوئی
اور میں نے اسے پلکوں سے اٹھایا ہوتا

خلوتِ فکر نے خود کھول دی باہیں ورنہ
روحِ دانش نے کہیں چین نہ پایا ہوتا

اِتنے دیپوں سے ابھرتیں کئی آنکھیں حرمت
گھر سجایا تھا تو دل کو بھی سجایا ہوتا

عروج زیدی

عمر دی روح سبھی پھر بھی ہے سچا، یارو!
آئینہ ہم سے کبھی جھوٹ نہ بولا، یارو!

مسکرا دیتا ہوں یوں پرسشِ حالِ دل پر
جیسے ہونٹوں پہ تبسم کا جنازہ، یارو!

ہم سمجھتے ہیں، ہمیں وقت نے سمجھایا ہے
دیر یا دھوپ بھی ہوتی ہے نہ سایا، یارو!

شوقِ تجدیدِ ملاقات بڑھانے کے لیے،
حسن لیتا ہے تغافل کا سہارا، یارو!

میں نے جب گردشِ ایام سے ٹکر لی تھی
تم بھی منجملۂ اربابِ تماشا، یارو!

اپنے پندار میں وہ لوگ ہیں ہم ذوقِ عروج
جن کو آتا نہیں جینے کا سلیقہ، یارو!

مسعود سبزواری

شکستِ جسم کا یہ جشنِ مرگ آثار لے جانا
عقب سے میرے سب گرتے در و دیوار لے جانا

وہ ڈر جائے گا سائیں سائیں کرتی بازگشتوں سے
برائے قتل اس کو جنگلوں کے پار لے جانا

ہے کچھ سر پہ باقی آخری یہ سایۂ رحمت
سروں سے کھینچ کے سب چادرِ التجا لے جانا

ہے سرگرداں تعاقب رائیگاں اوقات کے پیچھے
یہاں سے تم بھی آوارہ سا اک کردار لے جانا

ابھی سورج کے رتھ سے آتشیں تیروں کو آنا ہے
بچا کر موم کی یہ ڈھال اور تلوار لے جانا

تہی لفظوں کے کاندھوں پر معانی کا جنازہ ہے
مسعودؔ ساتھ یہ سرمایۂ آزار لے جانا

ممتاز راشد

خواب زندہ ہیں تو ہر درد جواں پاؤ گے
اپنی آنکھوں سے وہی رنگ رواں پاؤ گے

چند شمعیں بھی ہیں روشن تو غنیمت جانو
اب کے رات آئی تو کچھ اور سماں پاؤ گے

مونسِ شامِ الم زہرِ خموشی سمجھو
اس خرابے میں وہ آواز کہاں پاؤ گے

رات کی رات ہے بچھڑے ہوئے ساتھی کی تلاش
دھوپ چمکے گی تو سائے کا نشاں پاؤ گے

آئینہ دیکھے ہوئے شہر کو مدت گزری
وہ ملے گا بھی تو پہچان کہاں پاؤ گے

کون سی آگ ہے جو رکھتی ہے چہرہ روشن
غور سے دیکھو تو رگ رگ میں دھواں پاؤ گے

گھر سے نکلے ہو تو پتھر بھی اٹھا لو راشدؔ
تم ہر اک گام پہ شیشے کے مکاں پاؤ گے

قمر اقبال

ہر ایک حرف کا جو پیرہن بدل کے گئے
گئے تو اپنے ہی افکار میں وہ ڈھل کے گئے

میں چاہتا تو کرن کوئی مانگ سکتا تھا
مرے قریب سے سورج کئی نکل کے گئے

ملے وہ شخص تو کیوں آج ہم کو پہچانے
کہ کل کے ساتھ ہی رشتے تمام کل کے گئے

شگفتہ چہرے پہ اتنی اداس یہ آنکھیں
وہی ہے جھیل مگر پھول وہ کنول کے گئے

گلی گلی میں کسے ڈھونڈتے ہیں خواب مرے
کہاں وہ چاہنے والے قمرؔ غزل کے گئے

شمس الدین شمیم

اُنگلیاں

زندگی کی تھکی ہوئی آنکھوں میں رات نے کاجل لگا یا تھا۔ اور وہ ایک اپاہج کی طرح بےحس پڑی ہوئی تھی۔ دن کے اجالے میں زندگی جدوجہد، محنت اور مختلف حربوں سے تھوڑی پونجی پیٹ بھرنے کے لیے فراہم کر لیتی ہے اور پھر شام کو جب ارض و سماں پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو یہ کہیں تپتی ریت کہیں ٹھنڈے فٹ پاتھ اور کہیں نرم، نرم بستروں میں بےسدھ پڑ جاتی ہے۔

لیکن زندگی کے ان بےسدھ لمحوں میں صرف ممتہ جو آرام سے بےنیاز ہو کر اپنے مقصود تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ممتہ جو شال پر بیل بوٹے اور رنگا رنگ ڈورے پھیلانے میں محو تھا۔ اسے صبح سویرے ہی یہ شال خوجا سبحان کے ہاں پیش کرنا تھا۔ بجلی کی زرد روشنی میں شال کی طرف مسلسل دیکھنے سے ممتہ جو کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے پھیل گئے تھے۔ چہرے کی پژمردگی سے کم مایگی کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے سیاہی مائل سرخ جسم کی ہڈیاں گنی جا سکتی تھیں۔ وہ اپنے فن کا بےمثال ماہر تھا۔ بوٹیاں، بیلی اور بارڈر کے قدرتی رنگوں سے بھرے ہوئے پھول اور پتیاں اس کے تیار کردہ شال کی خوشنمائی کو چار چاند لگا دیتی تھیں۔ رنگ کا انتخاب اسے ورثہ میں ملا تھا۔ اس کی فن کاری ملک کے ہر کونے میں پہونچی تھی۔ لیکن اس کی شخصیت صرف ایک کمرے تک ہی محدود تھی۔ اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ کام دیتے وقت اس کے ہاتھ کانپنے لگتے، وہ سوچنے لگتا کہیں خوجا سبحان کام کو نامعاف قرار نہ دے۔ خوجا سبحان کام لیتے وقت اس میں کوئی نہ کوئی مصنوعی نقص ضرور نکال دیتا۔ اور ڈانٹتا بھی جس سے ممتہ جو کا ماتھا پسینے سے شرابور ہو جاتا، اگر ضمیر کبھی اسے احتجاج کرنے پر آمادہ کر لیتا، تو خوجا سبحان کی کرخت آواز سے احتجاج کا مادہ برف کی طرح ٹھنڈا پڑ جاتا۔ غرض جتنا اس کا فن اعلیٰ اور مکمل تھا۔ اس کی شخصیت اتنی ہی گم نام اور نالی کے ایک حقیر کیڑے کی طرح تھی۔ جسے ہر کوئی نظر انداز کرتا ہے۔

اس کے چہرے پر ماضی کی تلخیوں، حال کی بےبسی اور مستقبل کے ڈراونے احساس کی ملی جلی پرچھائیوں کی چھاپ واضح تھی۔ وہ ان پرچھائیوں کو ذہن کے پردے سے دور کرنے کی جسارت کرتا۔ لیکن اس کے رجحانات، احساسات، جذبات اور اس کا وجود اپنی چار لڑکیوں کے جہیز کے بہت بڑے نشان کے پیچھے پنہاں ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن کے ہر دریچے پر بس اسی سوالیہ نشان کی پرچھائیاں رقص کرتی رہتی تھیں۔ ہر وقت دن کے اجالے اور رات کے گھپ اندھیرے میں بھی اس کو ایسا لگتا جیسے اس کے سامنے چار لڑکیاں نہیں بلکہ گوشت پوست کے چار سوالیہ نشان ہوں۔ اس نے ان کی شادی کے لیے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن بےزر ہونے کے تکمیل کا منہ نہ ہو سکا۔ کوئی جہیز میں چھ ہزار روپے مانگتا اور کوئی آٹھ ہزار روپے۔ اسی طرح بہت سے تقاضے، لڑکیوں نے چار چار جماعت تک پڑھا تھا۔ اور پھر والد کی مفلسی کے باعث وہ بھی شال پر بوٹے بنا بنا کر اس کا ہاتھ بٹانے لگی تھیں۔ اس کی سب سے چھوٹی لڑکی محبوبہ نے حال ہی میں تعلیم چھوڑ دی تھی۔

رات کے آخری پہر کو ممتہ جو نے فاتحانہ انداز میں شال پر کام ختم کیا۔ اور پھر آنکھوں کے بوجھل پپوٹوں نے اسے سونے کے لیے مجبور کر دیا۔

صبح تھکے ہارے مزدور کی طرح اٹھ کر اس نے چائے پی اور شال اخبار میں لپیٹ کر خوجا سبحان کے گھر کی طرف روانہ ہوا وہاں پہنچ کر حسب معمول ویٹنگ روم میں بیٹھ کر سوچ میں ڈوب گیا۔ یکایک اس کے سامنے گوشت پوست کے چار سوالیہ نشان پھر آ کھڑے ہوئے۔ اس کے جسم میں اضطراب پھیل گیا۔ اور ذہن میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔

کیا کروں، کیا نہ کروں؟ وہ اسی سوچ میں الجھا ہوا تھا کہ خوجا سبحان کا ڈن پہنے ویٹنگ روم میں سگریٹ کے مرغولے

چھوڑتا ہوا داخل ہوا۔

علیک سلیک کے بعد ممّہ جو نے شال پیش کیا۔ "خواجہ صاحب کافی محنت کی ہے۔ دیکھئے کام کتنا اچھا ہے۔" ممّہ جو نے امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ...... نہیں تم نے محنت نہیں کی ہے۔ دیکھو ممّہ جو میں نے تمہیں بارہا کہا ہے کہ بھئی کام صاف کیا کرو۔" خواجہ شال دیکھ کر خوش ہوا، لیکن حسب معمول نقص نکالتا رہا۔

اس کی باتیں سن کر ممّہ جو پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اسے سراسیمگی محسوس ہوئی اس کی زبان ہکلا گئی اور گھر کے مسائل سے متعلق کچھ کہنے اور مزدوری بڑھانے کی بات حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اور پھر آہستہ آہستہ دلیس جسم میں سرایت کر گئی۔ اتنے میں خواجہ سبحان اندر سے شالوں کی ایک گٹھری لایا اور بولا۔

"ممّہ ...... مجھے بیس شال تیار کر کے بھیجنے کا آرڈر کل ہی ملا ہے۔ اس لیے شالوں کی یہ گٹھری لے جاؤ اور پندرہ دن تک تیار کر لاؤ۔ کام صاف اور باریک ہونا چاہئے۔ اور ہاں بیٹیوں کی شادی کے لئے روپیہ قرض لینا چاہتے ہو نا اس کے بارے میں جب تم شال کر کے لاؤ گے تب کہوں گا۔"

خواجہ سبحان کی باتیں سن کر ممّہ جو کو یکایک پھر امید کی ایک کرن نظر آئی اور اس کے یاس آلودہ چہرے پر مسکراہٹ کے شگوفے کھلنے لگے۔ اس نے شالوں کی گٹھری اٹھائی اور گھر کی طرف روانہ ہوا اس کے بعد اپنی بیٹیوں سمیت لگن اور جانفشانی سے شالوں پر اپنی فن کاری کے نقش ابھارنے میں منہمک ہو گیا۔ شالوں کو خوشنما بنانے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جوں جوں شال تیار ہوتے گئے اسے گھور اندھیرے میں ڈوبا ہوا مستقبل مسرت اور شادمانی سے بھرا ہوا دکھائی دینے لگا۔ کیونکہ خواجہ نے اس سے کہا تھا: "یہ شالیں تیار ہونے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

آخر شالیں تیار ہو گئیں۔ ممّہ جو نے گٹھری باندھی اور فخریہ انداز میں خواجہ سبحان کے گھر پہنچا۔ اس وقت خواجہ سبحان جو گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"ممّہ جو کیا سب شالیں تیار ہیں؟" خواجہ سبحان نے قدرے تذبذب سے سوال کیا۔

"جی حضرت سب شالیں تیار ہیں۔" ممّہ جو نے گٹھری کھولتے ہوئے ان شالوں کو امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے ممّہ .... تم نے کیا خاک محنت کی ہے؟ یہ بھی کوئی کام ہوا؟ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" خواجہ سبحان نے ایک کاریگر کی طرح شالوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"حضرت کافی محنت سے یہ شال تیار کئے ہیں، آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" ممّہ جو پریشان لہجے میں بولا۔

"بکواس بند کرو، بات ایسے کر رہے ہو جیسے واقعی فن کار ہو۔ کون سی خوبی ہے ان شالوں میں؟" اور کچھ وقفے بعد اس نے دس سال پرانے ریٹ کے حساب سے پیسے ہاتھ میں تھما دئے اور کہا۔

"اگر کام صاف کرو گے تو کام ملتا رہے گا نہیں تو کسی اور کو کام دوں گا۔" اتنا کہہ کر خواجہ سبحان ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا اور ممّہ جو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ذہن میں اپنے مالک کے الفاظ بار بار گونجنے لگے۔ اور پھر اپنے حساس ضمیر نے کوسا کیونکہ آج کاریگر کے خون سے بننے والے خواجہ نے اس کی فنی صلاحیت کو لعنت و ملامت کی تھی۔ جو گمنام ہونے کے باوجود اپنے فن کا بے مثال ماہر تھا۔

ممّہ جو وہاں سے تھکے ہارے مسافر کی طرح اٹھ کر نکلا۔ اور پہنچ کر سیدھا اپنے کام کرنے کے کمرے میں داخل ہو گیا، وہاں مختلف قسم کے دھاگے پڑے ہوئے تھے وہ بڑبڑاتا ہوا اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اور صرف اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بار بار دیکھنے لگا؛ یکایک انہیں دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ پھیل گئی جس سے تضحیک نمایاں ہوتی تھی۔ اور زیر لب کہنے لگا۔

"یہ انگلیاں دوسروں کے محل تعمیر کرتی ہیں اور اپنا گھر اور اپنی دنیا اجاڑ دیتی ہیں، یہ انگلیاں ایک دھوکا ہیں" اس نے جھلاہٹ میں پاس پڑا ہوا چھرا اٹھا لیا۔ اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں پر بھرپور طاقت سے وار کیا جس سے خون کے فوارے پھوٹ نکلے، اور دو انگلیاں بالکل ہی کٹ گئیں۔ اور وہ کراہنے لگا۔ اس کی بیٹیاں دوڑتی ہوئی کمرے میں آئیں اور والد کے کٹے ہوئے دائیں ہاتھ کو دیکھ کر ایک دم چیخ پڑیں۔

تحریک بسمل سعیدی نمبر

بسمل سعیدی اُردو کے وہ بزرگ شاعر ہیں جن کی شعری اور ادبی خدمات آدھی صدی سے زیادہ مدت پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا کلام اُردو شاعری کے سرمائے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اور انھوں نے کئی نئے شاعروں کی ذہنی اور فنی تربیت بھی کی ہے۔

اپنے قابلِ احترام فن کاروں کی قدر ناشناسی ہم اردو والوں کا شیوہ رہا ہے۔ بسمل صاحب کے مرتبے کا بھی اعتراف و اکرام آج تک اس طرح نہیں کیا گیا جس طرح کیا جانا چاہئے تھا۔ اس میں کچھ ان کی خوشے بے نیازی کو بھی دخل رہا۔ وہ ہمیشہ ادبی سیاست سے دور، اپنے شعری اور ادبی مشاغل میں منہمک رہے۔ اور شہرت طلبی کبھی ان کا شیوہ نہیں رہی۔

اب کہ بسمل صاحب اپنی عمر کی ۵ ، ویں منزل میں ہیں ، ادارہ تحریک نے طے کیا ہے کہ ان کی بے لوث شعری اور ادبی خدمات کے اعتراف میں 'تحریک' کا ایک خاص نمبر شائع کیا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو دنیا میں ہمارے اس اعلان کا پرجوش خیر مقدم کیا جائے گا۔

اس نمبر کے لیے بسمل صاحب کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کی جن حضرات کو دعوت دی گئی ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:
ڈاکٹر یوسف حسین خاں، میکش اکبر آبادی، رشید حسن خاں، ڈاکٹر خلیق انجم، نثار احمد فاروقی
ڈاکٹر اسلم پرویز، سید منظور الحسن برکاتی، ساحر ہوشیار پوری، راج نرائن راز، راہی بلند شہری،
اور ڈاکٹر اسما سعیدی

شعرا میں

کرشن موہن، بانی، کمار پاشی، سید فضل المتین، راہی بلند شہری اور امیر قزلباش اپنے منظوم تاثرات پیش کریں گے۔

ان کے علاوہ گوپال متل اور پریم گوپال متل کے تاثراتی مضامین اور مخمور سعیدی کی طرف سے بسمل صاحب کے مکمل کلام کا جامع انتخاب ——— نیز ملک کی ممتاز شخصیتوں کے پیغامات۔

بسمل سعیدی نمبر کی قیمت پانچ روپے ہوگی لیکن سالانہ خریداروں کو یہ مفت پیش کیا جائے گا۔

نئے خریدار جو ۳۰ ستمبر تک خریداری قبول کریں گے انھیں بھی یہ نمبر بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈروں سے جلد مطلع کریں۔ جو حضرات یہ نمبر رجسٹری سے منگانا چاہیں وہ دو روپے مزید ادا کریں ——— ڈاک میں گم ہو جانے پر یہ نمبر دوبارہ نہیں بھیجا جا سکے گا۔

منیجر

ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶

قابلِ مطالعہ کتابیں

کتاب	صنف	مصنف	قیمت
لینسر وارڈ	(ناول)	ڈی لکس ایڈیشن	۱۸—۰۰
تنقید سے تحقیق تک	(تنقید)	ڈاکٹر عنوان چشتی	۱۵—۰۰
ث مجید نامے کی سوغات	(افسانے)	فیاض رفعت	۱۰—۰۰
جملوں کی بیداد	(ڈرامے)	محمد یاشی	۷—۰۰
دیپک راگ	(شاعری)	مظفر حنفی	۶—۰۰
یہ قربتیں یہ دوریاں	"	گلشن دہلوی	۱۰—۰۰
جدید شاعری	(تنقید)	عبادت بریلوی	۲۵—۰۰
اردو شاعری کا مزاج	"	وزیر آغا	۳۰—۰۰
غزل اور مطالعۂ غزل	"	عبادت بریلوی	۲۰—۰۰
اردو مثنوی کا ارتقا	"	عبدالقادر سروری	۶—۰۰
تیشۂ نظر	"	ابوالفیض سحر	۸—۰۰
اطرافِ غالب	"	ڈاکٹر سید عبداللہ	۱۵—۰۰
تصورات اقبال	"	مولانا صلاح الدین احمد	۱۲—۵۰
ارمغان علی گڑھ		خلیق احمد نظامی	۲۰—۰۰
فرہنگ غالب		مولانا امتیاز علی عرشی	۱۲—۰۰
موسم گل کے آنے تک	(شاعری)	شکیب رامپوری	۵—۰۰
شہر کیا سوچتا ہوگا	(سیر دشتکار)	سید رفیق حسین	۷—۰۰
چچا چھکن	(طنز و مزاح)	امتیاز علی تاج	۶—۰۰
پری خانہ		واجد علی شاہ کے معاشقے	۷—۰۰
بہو کی تلاش	(ڈرامے)	بیگم نورالعین	۵—۰۰
رسوم دہلی		سید احمد دہلوی	۷—۰۰
جزیرۂ سخنوراں	(ناول)	غلام عباس	۵—۰۰
احساسات	(شاعری)	اوم پرکاش لاغر	۵—۰۰
طرز غالب	(تنقید)	محمد عرفان ایم اے	۷—۰۰
خوشبو کا بدن	(ناول)	دیبا خانم	۱۲—۰۰

کتاب	صنف	مصنف	قیمت
جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں	(ناول)	عزیز احمد	۶—۰۰
ٹیڑھی لکیر	(ناول)	عصمت چغتائی	۱۵—۰۰
غم غلط	(مزاحیہ کلام)	شوکت تھانوی	۵—۰۰
تلاشِ حق	(سفرنامہ)	سید رضا حسین زیدی	۶—۰۰
تیسرا مجسمہ	(افسانے)	عوض سعید	۷—۰۰
تیری دلبری کا بھرم	(ناول)	عزیز احمد	۳—۵۰
چیری کا باغ	(ڈرامہ)	چیخوف / زاہدہ زیدی	۲—۰۰
فرید کوٹ تحریک ۱۹۴۶ء		چندر شیکھر آزاد	۵—۰۰
کربل کتھا کا لسانی مطالعہ		خلیق اور نارنگ	۴—۰۰
میراں جی شمس العشاق	(سوانح)	محمد ہاشم علی	۸—۰۰
یادگار نظیر	(سوانح)	جگر بریلوی	۶—۵۰
تاریخ علم تشریح	(طب)	حکیم ظل الرحمٰن	۱۰—۰۰
بازگشت	(شاعری)	امیر قزلباش	۶—۰۰
برگِ آوارہ	"	خورشید احمد جامی	۵—۰۰
رخسار سحر	"	"	۲—۷۵
سلگتے پھول ڈھلکتے آنسو		مایا کھنہ راجے بریلوی	۱۰—۰۰
شعاعوں کی صلیب	(شاعری)	کرامت علی کرامت	۶—۰۰
صدائے تیشہ	"	راشد آذر	۶—۰۰
عظمت دہلی	"	عظمت عبدالقیوم	۲—۵۰
کف سیلاب	"	وقار واثقی	۴—۰۰
کلیات مصحفی	(حصہ اول)		۱۰—۷۵
نذر رسالت	(نعتیہ کلام)	دل ایوبی	۶—۰۰
ایک ہی ڈگر	(ناول)	زلیخا حسین	۱۰—۰۰
رشتے کا روگ	"	زلیخا حسین	۱۰—۰۰
لہر لہر طوفان	"	گلشن آنند	۸—۰۰

نیشنل اکاڈمی، ۲/۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی۔ ۶

محمد رفیع انصاری

کوئی نہیں آئے گا

جب بھی مجھ سے کوئی میرے بارے میں دریافت کرتا ہے تو مجھے سخت وحشت ہوتی ہے۔ اپنی ذات سے متعلق کتنے ہی سوال مجھ سے روزانہ پوچھے جاتے ہیں۔ لیکن ان سوالات کو کوئی اہمیت نہ دے کر میں اپنے مخاطب سے پیچھا چھڑا لیتا ہوں۔ وہ بے چارہ مایوس ہو جاتا ہے اور پھر کبھی مجھ سے اس قسم کے استفسار نہ کرنے کی قسم کھا لیتا ہے۔ جب تنہائی میں میں اس پر غور کرتا ہوں تو ایک عجیب سی گھٹن محسوس کرتا ہوں۔ یہ گھٹن مجھے یہ کہہ کر کوستی ہے کہ میں نے اپنے مخاطب کو مایوس کیوں کیا؟ اور میں دل ہی دل میں روا اٹھتا ہوں —— میرا دل مجھ سے کہتا ہے تم کوئی مجرم تو نہیں ہو جو اپنی ذات کو اس قدر چھپائے پھرتے ہو۔ نہ تم کوئی خطاکار نہ کوئی گنہگار ہو۔ پھر یہ خاموشی کیسی! یہ فرار کیسا؟ اس طلسم کو توڑ دو اور اپنے بارے میں سچائی کا اظہار بلا کسی جھجھک کے کر دو —— تمہارا یہ بیان لوگوں کو متعجب کر دے گا۔ اور تم اپنے وجود پر فخر کر و گے کیا واقعی ایسا ہے؟ میں پھر سوچنے لگتا ہوں ——

اس وقت میرے کمرے میں میرا عزیز دوست جاوید بیٹھا ہوا ہے وہ مجھ سے باتیں کئے جا رہا ہے اور مسکرائے جا رہا ہے۔ جاوید کی میری دوستی بہت پرانی ہے۔ میں اس کو ایک عرصہ سے جانتا ہوں۔ چونکہ وہ میرا عزیز ہے اس لیے مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا۔ ابھی کچھ دنوں کی بات ہے جب اس نے ایک غیر متوقع خبر بڑے رازدارانہ انداز میں سنائی تھی۔ اس خبر کو سن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس نے مجھے اپنی داستان عشق سنائی تھی اس نے ایک لڑکی پسند کر لی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔ چاہت بڑھتی گئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دیوانے ہو گئے۔ اس دوران اس نے اپنے کچھ نجی خطوط بھی مجھے دکھائے تھے ان دنوں وہ کتنا خوش تھا۔ میں نے اس سے قبل اسے اتنا خوش کبھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن جب وہ مجھے اپنی محبت بھری کہانی سنانے لگتا ہے تو مجھے اس کی کامیابی پر حسد ہونے لگتا ہے۔ میں اندر ہی اندر کوستا ہوں لیکن پھر بھی وہ مجھے اپنا راز دار سمجھ کر سارے واقعات کی تفصیل سناتا جاتا ہے اور میں اشیات میں سر ہلاتا جاتا ہوں کہ کہیں اس کا دل نہ ٹوٹ جائے۔

اب کمرے میں صرف میں ہوں۔ میری تنہائی ہے۔ میرا ویران دل ہے —— میں نے ٹیبل کی دراز سے اپنے البم کو نکال لیا ہے۔ میری نظریں ایک تصویر پر جم گئی ہیں۔ یہ میری ایک بہت پرانی تصویر ہے۔ تصویر میں اکیلا ہوں۔ بہت اکیلا۔ لیکن آنے والے کل سے پُر امید شاید اسی لئے میرے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہے۔ میں نے صفحہ کو پلٹ دیا ہے۔ ماضی بعید ماضی قریب میں بدل گیا ہے۔ یہ البم کا دوسرا صفحہ ہے اس صفحہ پر ایک بڑی تصویر ہے۔ اس تصویر میں میں تنہا نہیں ہوں۔ بلکہ میرے کالج کے بہت سے ساتھی ہیں میں تیسری قطار میں ہوں یہ قطار اقبال اور ناہید کی جوڑی سے شروع ہوتی ہے۔ ان کے بعد ظفر اور شاہین ہیں پھر نیتا اور اجیش بشبانہ اور اختر اور پھر میں اکیلا مجھ تک آ کر قطار ختم ہو گئی ہے اور میرے بازو میں دور تک کوئی نہیں۔ اتنے سارے ساتھیوں میں میرا اپنا کوئی نہیں۔ چوتھی قطار میں چار لڑکیاں ہیں۔ ان کے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹیں ہیں۔ اور میں گم صم اپنی ہی یادوں میں کھویا ہوا ہوں میں نے جلدی سے البم بند کر دیا۔ اور اسے ٹیبل کی دراز میں رکھ رہا ہوں۔ ٹیبل کی دراز سے ایک بہت پرانا السٹریٹیڈ ویکلی جھانک رہا ہے جس کے کچھ صفحات پھٹ گئے ہیں۔ اس میں حفیظ دستا ظفیل اور ان کی بیگم کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ یہ دونوں کی شادی کے موقع کی تصویر ہے جنھیں نے بھی سنسنی کہہ دیا تھا '' زمانہ ان کا دشمن ہو گیا تھا مگر محبت کے بے پناہ جذبے نے اسے کتنا بے باک بنا دیا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور دنیا ہاتھ مل کے رہ گئی —— میں نے جھٹکے سے دراز کو بند کر دیا اور اب

میری نظریں ٹیبل پر ہیں۔ ٹیبل پر کتابیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی ہیں کمرے میں جا بجا سگریٹوں کے ادھ جلے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ چھت پر دھوئیں کے مرغولے اب تک باقی ہیں۔ ایک عجیب سی الجھن سے ایک عجیب سی بے چینی ہے۔ اس ویرانے میں اب میرا جی نہیں لگتا میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ سینے میں ایک درد محسوس کر رہا ہوں۔ جی میں آتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤں۔ میں روزانہ یہی سوچا کرتا ہوں ــــ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ہے۔ جیسے اندر کوئی بھونچال آگیا ہو۔ یہ ایک دن میرا تصور کا پیش خیمہ ہے آج اس گور تنہائی میں مجھے پھر اس کی یاد آتی ہے ــــ اس کی یاد جس نے مجھے کبھی یاد نہ کیا ہو گا جس نے میرے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ لیکن میں نے اس کی یاد میں سب کچھ بھلا دیا ــــ اس کے وجود نے میرے دل کو دھڑکنا سکھایا۔ مجھے وقت کا پابند بنایا مجھے اپنے آپ پر فخر کرنا سکھایا ــــ وہ میری شہرت اور ناموری کا باعث بنی ــــ لیکن وہ میرے لیے اجنبی رہی ــــ میں اس کے لیے نامعلوم بنا رہا ــــ اس دوران کتنے دل ایک ہوئے کتنے دل جدا ہوئے۔ کتنی محبتیں پروان چڑھیں ــــ کتنے اپنے دل آئے اور گئے۔ لیکن ہمارے درمیان کی یہ خلیج باقی رہی۔ میں آنے والے کل کا منتظر رہا۔ وہ کل جو نہیں آیا ــــ نہیں آیا ــــ میں لب کشائی کی جرأت نہ کر سکا۔ میرا اندرون میری خواہشات کے بیچ ایک ناقابل عبور دیوار بن گیا۔ کاش کہ میں بے خود ہو جاتا ــــ کاش کہ میں اپنے کو بھول جاتا ــــ تب اپنے دل کو اس قدر نہ کڑھاتا یوں پیچ و تاب نہ کھاتا ــــ یوں نہ اپنے آپ کو کوستا ــــ لیکن کیا میرا یہ طرز عمل کسی معجزے کو جنم دیتا؟ کیا وہ میری پیشکش قبول کر لیتی؟ ــــ میں آج بھی جب یہ سوچتا ہوں تو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا؟ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا ــــ اب تو صرف یادیں ہی یادیں ہیں۔ ادھوری یادیں ــــ کاش کہ میں گذرے ہوئے زمانہ کو بھلا سکتا ــــ کاش کہ مجھے کوئی یاد نہ رہتا۔ اس وقت کمرے میں میں اکیلا ہوں ــــ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کانوں پر رکھ لیا ہے۔ باہر ہوائیں بہت تیز چل رہی ہیں۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار کمرے تک آ رہی ہے ــــ کمرے کی سامنے والی کھڑکی بار بار کھل بند ہو رہی ہے۔ کھڑکی اب کھل گئی ہے میرے سامنے وہ خوبصورت دو منزلہ عمارت ہے۔ وہ عالیشان محل، جس میں عیش اور ناز و نعمت کے سوا کچھ نہیں ــــ گناہ کے سوا کچھ نہیں ــــ اور ــــ ابھی ــــ میں نے اسے وہاں دیکھا ہے ــــ کھڑکی پھر بند ہو چکی ہے ــــ میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوں ــــ آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں ــــ میں نے دیکھا میری سرخ سرخ آنکھوں سے آنسوؤں کی لہریں میرے کالے اور بھدے رخساروں سے ہوتی ہوئی نیچے گر رہی ہیں .... !!

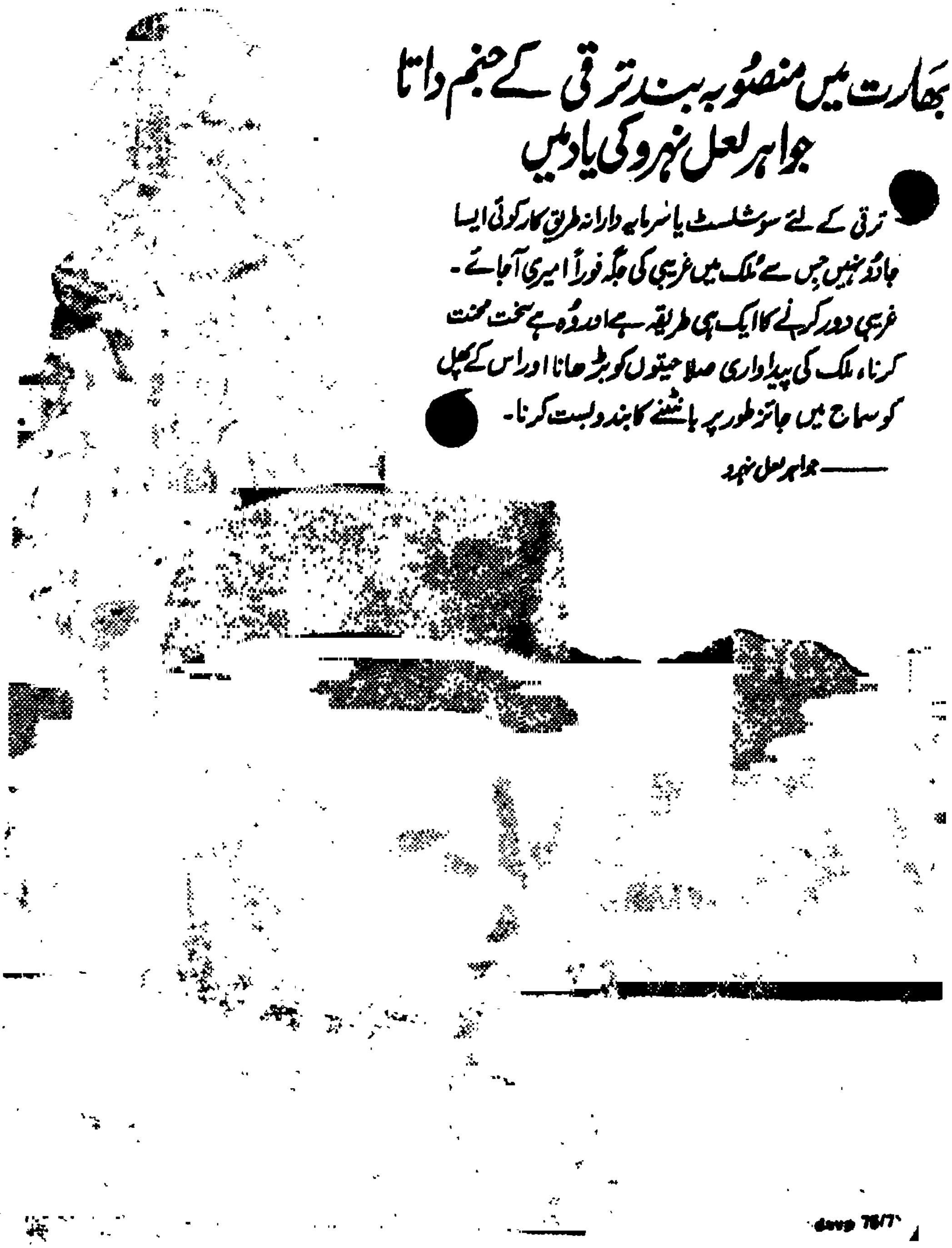
بقیہ۔ اضطراب

ایک کر کے مجھے یاد آ گئے ہیں۔ اور تب میں انھیں پکارتا ہوں۔
چالو! ــــ بندیا! ــــ آپی ب ــــ بجلی! ــــ
یقین! ــــ آلوک! ــــ نرملا! ــــ کوئی بھی تو سنتا
مگر میری جانب کوئی بھی آنے کو تیار نہیں۔ میری ہڈیوں کے
اضطراب پر کسی کا دل نہیں تڑپتا ــــ سب خود غرض ہو چکے
ہیں۔ یہ بھی، وہ بھی اور سب .... !!

بھارت میں منصوبہ بند ترقی کے جنم داتا
جواہر لعل نہرو کی یاد میں

ترقی کے لئے سوشلسٹ یا سرمایہ دارانہ طریق کار کوئی ایسا جادو نہیں جس سے ملک میں غریبی کی جگہ فوراً امیری آجائے۔ غریبی دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے سخت محنت کرنا، ملک کی پیداواری صلاحیتوں کو بڑھانا اور اس کے پھل کو سماج میں جائز طور پر بانٹنے کا بندوبست کرنا۔

——— جواہر لعل نہرو



غالبیات کے سلسلے کی چند عمدہ کتابیں

غالب اور آہنگِ غالب
ڈاکٹر یوسف حسین خاں — 16.00

نقشِ غالب
اسلوب احمد انصاری — 12.00

غالب اور ذُکا
ضیاء الدین احمد شکیب — 6.00

سرل غالب
غزل کے منتخب شعر دیوناگری میں — 2.50

نوائے سروش
اشعارِ غالب انگریزی تراجم کے ساتھ — 6.00

اطرافِ غالب
ڈاکٹر سید عبداللہ — 15.00

غالب حقیقت کے آئینے میں
ہنس راج رہبر — 10.00

فرہنگِ غالب
امتیاز علی خاں عرشی — 12.00

عیارِ غالب
مالک رام — 7.70

شعر پہ شوشہ
غالب کے اشعار پر دہاب حیدر کے کارٹون — 2.00

جوہرِ آئینہ
نند لال کول طالب کاشمیری — 12.00

اُردو املا

املا اور اُس کے متعلقہ مسائل پر ایک جامع کتاب۔ اس کتاب میں اُردو املا کے قواعد و ضوابط سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور علمی دلائل کی روشنی میں ان کا تعین کیا گیا ہے۔
ڈمائی سائز، اعلیٰ گیٹ اپ، سات سو سے اوپر صفحات۔ قیمت: ۲۷ روپے

تنقید سے تحقیق تک

ڈاکٹر عنوان چشتی کے خیال انگیز مضامین
اُردو میں تحقیقی تنقید کی پہلی کتاب جسے اہلِ نظر نے یک زبان ہو کر سراہا ہے۔
ڈمائی سائز، اعلیٰ گیٹ اپ
قیمت —— ۱۵ روپے

اردو افسانے کی توجہ طلب آواز

نئے عہد نامے کی سوغات

نئی نسل کے اہم افسانہ نگار فیاض رفعت کے منتخب افسانے
عمدہ گیٹ اپ، قیمت: دس روپے

نیشنل اکاڈمی، ۱۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶

کرشن مرادی

جستجو میں تری ہم آج کہاں تک پہنچے
ضوفشاں راہ سے تاریک نشاں تک پہنچے

ہر گھڑی اپنی نگاہوں میں رہا دربار ترا
شبنم و گل سے ستاروں کے جہاں تک پہنچے

اک معمہ ہے عجب مسئلۂ مرگ و حیات
زندگی موت بنے موت کہاں تک پہنچے

دھیمی کتنی ہوئی محسوس ہوئی وقت کی نبض
مضمحل زیست کے لمحات جہاں تک پہنچے

چاند کی دھرتی پہ پہنچے ہیں جو انساں کے قدم
آرزو یہ ہے کہ اب کاہکشاں تک پہنچے

زیست کے ساز سے کیا راگ ہوئے ہیں پیدا
دل کے کچھ راز تھے جو لفظ و بیاں تک پہنچے

حبیب احمر

ہر قدم پر خوبصورت خواب دکھلائے گئے
دھیرے دھیرے اس طرح مقتل میں پہنچائے گئے

صاحب کردار تو کتنے تھے لیکن دوستو
جانے تنہا ہم ہی کیوں سولی پہ لٹکائے گئے

خود فراموشی کا عالم جب کبھی طاری ہوا
اجنبی راہوں میں میرے نقش پا پائے گئے

گھل گیا احساس غم آنکھوں میں کاجل کی طرح
آئینے یادوں کے جب جب سامنے لائے گئے

کھو نہ دو احمر کہیں پہچان اپنی اس لیے
کچھ بکھرتے گل کے منظر جستجو دکھلائے گئے

سیّد حبیب

ترے پیار میں ہو کے برباد روئے
گلے سے لگا کر تری یاد روئے

ملیں جب سے نظریں تمنائیں جاگیں
تجھے کر کے اس دل میں آباد روئے

بہت تھی حسیں تیری باہوں کی زنجیر
اب اس قید سے ہو کے آزاد روئے

چمن پہ گھٹا چھائی کچھ یاد آیا
سنی بلبلوں کی جو فریاد روئے

نہ جانے کہاں سو گئیں ان کی نیندیں
سحر تک بہت تیرے ناشاد روئے

صلاح الدین پرویز

انت، آغاز، انت

"صبح کے چاندی کی کشتی میں اتریں گے رام
نرم خوشبو کے ہونٹوں سے چہکیں گے رام"
دور تاریک گھر میں کسی کی صدا
رام کی بھیگی بھیگی شرارت لیے
میرے احساس کو گدگدانے لگی
کیسری رنگ ہونٹوں کا جلنے لگا
بھوت پالی کا رقص کرنے لگا
اور میں اپنی سچائی کی چیخ کو
بھاگتی رات میں
تیز کرنے کی کوشش میں اک دائرہ بن گیا
اور اس دائرے میں مری شخصیت
ایک طوفان کا جذبہ: شرارت سے
داستاں کی چمکتی ہوئی بندگی کو لیے
چومتی تھی کیا سی حقارت مری
اور پھر،
دور تاریک گھر میں کسی کی صدا
اس طرح ڈولتی تھی مرے آس پاس
"اپنے گھر کے گلاسوں کو تم پھینک دو
آج پیتل کی لوٹی سے اتریں گے رام"

شاہین بدر

سورج کا بوجھ

میں آبلہ پا گذر رہا ہوں
ہے پرخطر ساعتوں کا جنگل
ہے رہگذر، اختتامِ منزل کا دوسرا نام
میں ایک مدت سے آبلہ پا گذر رہا ہوں
ہزار خطرے ہیں راستے میں
مجھے نہ غم ہے نہ خوف کوئی —
کہ میری منزل مری نہیں ہے
یہ میرے ماضی کی ملکیت ہے
میں وہ مسافر ہوں
جو ہے سانسوں کی رہگذر پر اکیلا، تنہا
اٹھائے پھرتا ہے سر پہ سورج کا بوجھ لیکن!!

اعجاز اعظمی

اُجالوں کے زخم

گاؤں کو چھوڑ کے تم شہر چلے آئے ہو
جس کی سڑکوں سے نکلتے ہیں اجالوں کے جلوس
نغمہ و نور سے معمور ہیں جس کی گلیاں
ڈھونڈتی ہیں وہ تمہیں گاؤں کی اندھی گلیاں
ڈھونڈتا ہے وہ تمہیں خستہ و تاریک مکاں
ڈھونڈتے ہیں تمہیں معصوم کنوارے سپنے
ڈھونڈتے ہیں تمہیں بچپن کے سہانے نغمے
ٹھیک ہے لوٹ چلو اپنی اسی تاریکی میں

جس میں احساس کی ظلمت کے دیئے جلتے ہیں
جس میں افکار کے رنگین کنول کھلتے ہیں
جس میں انسان سے انسان گلے ملتے ہیں۔

نازش انصاری

زندگانی اک مہابھارت رہی
پھر بھی ظالم کی بہت چاہت رہی

منتظر تھا دیر سے بابِ فنا
دو قدم آگے مری شہرت رہی

رکھ دیا مرہم بھی شبنم نے مگر
کانپتے لب کو مری حسرت رہی

آپ کیجے ابتدائے دشمنی
دیر تک ہم دونوں میں حجت رہی

خاک کے پنجرے سے ہو جاؤں فرار
جاگتے سوتے یہی وحشت رہی

اب کے ہم دامن میں پالے جائیں گے
آستینوں میں کہاں وسعت رہی

جمنا پرشاد راہیؔ

کہنا تغافل کو صدا کاٹ رہی ہے
حیراں ہوں کہ پتھر کو ہوا کاٹ رہی ہے

پیشانیٔ ساحل پہ کوئی نام نہ اُبھرے
ہر موج سمندر کا لکھا کاٹ رہی ہے

کیا اپنی خبر دوں کہ تری وضعِ خموشی
خود سلسلۂ حرف و نوا کاٹ رہی ہے

ہر روح پسِ پردۂ ترتیب عناصر
ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہی ہے

الفاظ کی دھرتی پہ ہوں مفہوم گزیدہ
اب جسم پہ کاغذ کی قبا کاٹ رہی ہے

محبوب ہیں مغرور درختوں کی قطاریں
ہر شاخ کو شمشیرِ انا کاٹ رہی ہے

فنکار کا خوں دامنِ تخلیق پہ گویا
تصویرِ مصور کا گلا کاٹ رہی ہے

تابش پرتاپ گڈھی

اپنا غم دل کے نہاں خانے میں محفوظ رکھو
ساری دنیا کی نگاہوں میں نہ افسانہ بنو

ان کے پھینکے ہوئے پتھر کو مقدس جانو
اپنے زخموں کو مہکتا ہوا ایہار کہو

کیا ضروری ہے کہ ہر جذبے کو دی جائے زباں
ہو جو ممکن تو کبھی تم مرا چہرہ پڑھ لو

ہر فسانے پہ حقیقت کا گماں ہونے لگے
اپنے خوابوں میں سلیقے سے اگر رنگ بھرو

نام لکھے گا تمہارا بھی مورخ کل کا
شرط ہے آج کے ہر لمحے کی تم قدر کرو

قیصر قلندر

مختصر نظمیں

یادوں کے پھول

کسی شجر کے تلے شہرِ آرزو میں کہیں
تمام رات سلگتے مہ و نجوم کے ساتھ
شکستہ ربطِ امید، دستِ دل میں لیے
اک عمر ہونے کو آئی سمیٹتا ہی رہا
حسین یادوں کے پژمردہ رنگ رنگ پھول

سرشارِ نغمہ

سسکتی چاندنی کی اونگھتی افسردہ خاموشی
کے پردوں میں ہے شہرِ آرزو بھی تیرہ میں غلطاں
جہاں ہر ہر قدم پر درد کی شمعیں فروزاں ہیں
خزاں کے گرد آلودہ لبادے میں ہے پوشیدہ
بہارِ آرزو کے دل کا اک سرشار سا نغمہ!

آتشِ تر

زعفران کے کاسنی پھولوں کی رت میں
صبحِ رخشندہ سے شامِ نغمہ زن تک
آتشِ تر سے چناروں کی چتا میں جل رہی تھی
کنجِ گلشن میں اکیلا پھول جلتا جا رہا ہے

خوش نما لمحے

ملگجی دھوپ میں وہ آج نہیں ہے تنہا
باغِ افسردہ خموشی میں بیاں کرتی ہے
خوش نما لمحوں کے پیرِ نازک و رنگیں دعائے
جن میں رعنائیِ ایام کی کو ملتا ہے

احمد تنویر

اضطراب

— پھر جب میں نے ان سب کو پکارا تو کوئی بھی میرے قریب نہ آیا۔ حالانکہ سب کی مجھ سے شناسائی ہے۔ میں نے ان تمام لوگوں کو نئی زندگی دی ہے۔ اور نئے نام بھی — مگر اب سبھی مجھے پہچاننے سے انکار کرتے ہیں۔ یہ بھی، وہ بھی اور سب .....!

چاٹو مجھے اچھی طرح جانتا ہے!

اس دن — ہوائیں سمٹ رہی تھیں اور پھیل رہی تھیں امس تھی، ساری فضا میں اور گھٹن ذہن پر مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ چاٹو بہت بھوکا تھا اور ان دنوں اس کا واسطہ بھی بھوک کے بھیڑیے سے ہی پڑ رہا تھا۔ بائیں پیر کی پنڈلی اندر ہی اندر پک گئی تھی — زخم میں جب ٹیس بڑھتی تو جسم کی ساری نسیں سمٹ کر ایک ہو جاتیں اور آنکھیں خالی خالی سی محسوس ہونے لگتیں۔ کافی تکلیف تھی مگر پیٹ کی خاطر بہترا گنج اور کمپنی باغ کے چکر لگانا ہی پڑتے۔ اور قسمت ایسی کہ جب بھی کوئی جیب ملی تو مفلس کی — کافی دیر سے وہ چچا کے ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر یکایک سنجیدہ ہو کر مجو میاں کے قریب کھسک آیا۔

مجو میاں! ایک بات پوچھوں —؟

پوچھو!

تم دارو بیچنے کا دھندا بند کیوں نہیں کر دیتے؟

کیوں بند کر دوں!

دارو بہت ذلیل چیز ہے — جانتے ہو جب بھی میں دارو پی لیتا ہوں نا تو مجھے ..... مجھے!

مجھے کیا —؟

مجھے اپنی بہن بہت حسین لگنے لگتی ہے اور اس کا جسم —

اف! چاٹو کے پورے چہرے پر شرمندگی کا زہر پھیل گیا۔ اور آنکھوں سے قطرہ قطرہ ندامت ٹپکنے لگی۔

پاگل —!

اور جب چاٹو بندیا کی زلفیں سلجھانے میں مگن ہو جاتا تو بندیا بہت ہی سنجیدہ ہو کر اسے ایک بات سمجھایا کرتی — چاٹو بھگوان کے گھر جایا کر — مندر کا پرساد امرت سمان ہوتا ہے جانتا ہے جب تو مرے گا تو کیا ہوگا —؟

کیا ہوگا —؟

جب تیری چتا جلے گی نا تو بھگوان پانی برسا دے گا۔ اور تیری آتما ہمیشہ تڑپتی رہے گی —

سچ میں!

ہاں چاٹو! اسی لیے تو میں روزانہ مندر جاتی ہوں۔

پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ اور بندیا بڑے ہی پیار سے اس کے آنسو پونچھتی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیتی۔

کچھ دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ بندیا اور چاٹو کی شادی ہو گئی اور وہ دونوں اب ساتھ ہی مندر جایا کرتے ہیں — دھیرے دھیرے میں نے ان دونوں کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا۔

اور وہ دن بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے — دو ہانپتی ہوئی آنکھیں میرے دروازے پر چپک گئی تھیں۔ وہ آنکھیں جو مدتوں پہلے مجھ سے بچھڑ گئی تھیں۔ ان آنکھوں نے زور سے مجھے پکارا تھا صدائیں دی تھیں اور سامنے امرود کے پیڑ کی سوکھی پتلی پتلی ڈالیاں زور سے ہنس پڑی تھیں — تیزاب سے جھلسی ہوئی آنکھیں روشنی کی چاہ میں دوبارہ صحرا کی ریت سے روشنی کی کرنیں مانگ رہی تھیں میں روتے روتے ہنس پڑا تھا — ہاں بہت زور سے!

چائے کی پیالی سگریٹ کے دھوئیں میں لپٹی راکھ پی رہی تھی۔ صبح ہی کمل آیا تھا یہ کہنے کہ وہ شادی کر رہا ہے — بڑا عجیب سا لگا تھا مجھے۔ اس وقت اور بھی جب اس نے اپنی انگیجمنٹ پارٹی میں اعلان کیا کہ آج میری پہلی موت ہوئی ہے — اور میری آنکھوں

کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جس پل میں نے ایک لڑکی کی بیوفائی پر اپنی آنکھوں میں تیزاب ڈال لینے کی ناکام کوشش کی تھی ـــ میں نے اسے سنبھال لیا تھا ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ! میں اسے ہمیشہ ہی immature سمجھتا رہا تھا۔ مگر جب اس نے اپنی موت کی خبر سنائی تو مجھے لگا جیسے وہ اپنی maturity کی سرحد پیچھے چھوڑ چکا ہے ـــــ وہ کھوئی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہہ رہا تھا ـــ میں نے ایک عورت کی ضرورت محسوس کی تھی جس کے پہلو میں، میں دو لمحے چین سے گزار سکوں ۔ اس لیے آپ سب اسے میری بیتی ہی سمجھے گا ۔ پریمیکا نہیں ۔ اور مجھے شیکسپیئر کے ڈرامے کا ایک کردار ساری محفل میں رینگتا ہوا محسوس ہوا۔

جسم سے گوشت تو کاٹو مگر دھیان رہے خون نہ نکلے

اور اسی رات بمل زہر پینے کی بات کر رہا تھا ۔

زہر پیو اور زندہ رہو ۔

زہر کا استعمال خودکشی ہی جایا کرتا ہے ۔ یقین نے ہنس کر کہا ۔

ہم زہر کا ذائقہ ہی کیوں نہ بدل دیں ۔

Abnormal ! کسی نے دھیرے سے پھسپھسا دیا ۔

اور پتھریلے قہقہوں کی چوٹ کھا کر بمل کا وہ جملہ ٹیبل سے پھسل کر فرش پر گر گیا ۔ جسے آلوک نے دھیرے سے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا ۔

اور ایک دن سچ مچ آلوک نے بمل کا وہ جملہ پی لیا ۔ نرملا کے روپ میں ـــــ نرملا جو اپنی ماں کے نام کی آنچ میں لمحہ لمحہ پگھل رہی تھی ـــ نرملا کی ماں جو ایک طوائف تھی ۔

آلوک تم گریٹ ہو ! ـــ بھلا آج کل ٹھٹھرتی سردیوں میں کون اپنا کمبل کسی دوسرے کو دیتا ہے ۔

آج میں بھی ٹھٹھر رہا ہوں مگر میری ٹھٹھرتی ہڈیوں کو گرمی دینے والا کوئی نہیں ـــ میں جو سب کے ساتھ تھا ۔ میں جو سب میں برابر کا شریک تھا ـــ اب صرف ہڈیوں کی شکل میں پڑا تڑپ رہا ہوں اس دن بھی میرے قریب کوئی نہیں آیا تھا جس دن میرے جسم کا گوشت گل گل کر گر رہا تھا۔ صرف چیختی ہوئی آوازیں میرے قریب تھیں شعلوں کی مانند لپکتی ۔

صرف افسوس کرنے سے بھلا کیا ہوتا ہے ـــ ؟

بہت دردناک حادثہ ہوا۔ ایسی موت تو خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ بڑا اچھا تھا بیچارہ !

جی ہاں ! ـــ یہ میری ہی موت کا نوحہ تھا جو سڑکوں گلیوں اور مکانوں سے چپکا ہوا تھا ۔

زندگی جھلس کر بے دم ہو گئی۔ لمحے بکھر گئے اور میں صرف ہڈیوں کی شکل میں قبر میں سلا دیا گیا ۔

اس دن سیاہ سڑکیں جل رہی تھیں۔ تنگ نالیوں کے کنارے کتے زبان باہر نکالے ہانپ رہے تھے ۔ ہوائیں کافی تیز تھیں ۔ خشک اور تپتی ! ـــ میں چھت کے نیچے برہنہ پڑا جل رہا تھا۔ جلتی ہوئی ہوائیں جب پتلیوں کو مزید جھلسانے لگیں تو میں نے پلکیں گرا لیں ۔ کئی لمحے جب یونہی گزر گئے تو گرمی کی شدت ناقابل برداشت ہونے لگی ۔ اور تب پلکیں آپ ہی آپ کھل گئیں ۔ ایک عجیب ہولناک منظر آنکھوں کے سامنے تھا ۔ میرے نیم پختہ مکان کو شعلوں کی لپلپاتی زبانیں چاٹ رہی تھیں ۔ باہر لوگوں کا ہجوم چیخ رہا تھا دیکھتے ہی دیکھتے ایک جلتا ہوا شہتیر مجھ پر آ گرا۔ پھر یکے بعد دیگر کئی کڑیاں مجھ پر آ گریں ۔ میرے جسم کے جلنے کی بو فضا کو بوجھل کرنے لگی ۔ اس طرح میرے جسم کا گوشت شعلوں کی نذر ہو گیا۔ آگ پر قابو پا لینے کے بعد لوگوں کو دفن کیے جانے کے لائق بے ترتیب ہڈیاں ہی مل سکیں ـــ اور پھر میری موت کا نوحہ پڑھا جانے لگا ـــ بہت دردناک حادثہ ہوا۔ ایسی موت تو خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ بڑا اچھا تھا بیچارہ !

اس دن میں بھی اسے ایک حادثہ سمجھ کر مطمئن ہو گیا تھا۔ مگر ایک نئے واقعہ نے میری ہڈیوں کو بے حد مضطرب کر دیا ہے ۔

ہوتا یوں ہے کہ ایک نامعلوم شخص روز شام ہوتے ہی میری قبر پر آ کر سرخ سرخ آنکھوں سے شعلہ باری کرنے کے بعد کوڑے سے قبر کو بے تحاشہ پیٹنے لگتا ہے ۔ اور جب تھک ہار کر نڈھال ہو جاتا ہے تو چند بھدی سی گالیاں دے کر تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے ۔

اور میری آوازوں کے گرد جالے پڑنے لگتے ہیں ۔ سورج کا انگارہ ذہن کو پگھلانے لگتا ہے ۔ اور وہ سارے کردار ایک

(بقیہ صفحہ ۴۱ پر)

ہی تھی اور میزوں پر صبح کے انگریزی اخبار کے بڑے بڑے پڑے ہوئے تھے۔

صبح کافی اور ٹوسٹ کا ناشتہ کر کے ہم گھومنے چلے دھند اور نیچے اتر آئی تھی۔

ڈل گیٹ پر انگریزی کے جلی حروف میں لکھے ہوئے بورڈ دیکھ کر اس نے ایک طرف تھوکا اور جلد جلد قدم بڑھا کر چلنے لگا۔

لال چوک میں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بل باٹم اور "ڈبل بریسٹ" پہنے فرفر انگریزی بولتے کالجوں جا رہے تھے۔

"آؤ کھانا کھائیں" نیرس ہوٹل کے سامنے میں نے اس سے کہا۔

"نہیں" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"براڈوے میں انگریزی پکچر ہے۔ چلو دیکھ آتے ہیں" میں سوچا شاید ہیجان انگیز انگریزی فلم دیکھ کر اس کی اداسی ہو جائے۔

"براڈوے" اس نے طول دے کر کہا۔ اور میری بھیت روح کو پہنچ گئی۔

سہ پہر کو ہم انجینئرنگ کالج کے ہوسٹل میں تھے۔ میں نے اسے اپنا کمرہ دکھایا۔ وہ نہایت گمبھیرتا کے ساتھ شیشوں سے چہرہ لگائے نسیم باغ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ نیو کیمپس ہے۔" ہاسٹل کے اس طرف لکچر روم اور دفتر زیر تعمیر تھا۔ اس نے ایک نظر ادھر دیکھا اور نسیم باغ کے بچھے ہوئے سبزے پر کچھ اس انداز سے ٹہلنے لگا کہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ سبزے کی پتیوں سے سرگوشیوں میں راز و نیاز کی باتیں کر رہا ہے

دوسرے روز ہم ڈل جھیل دیکھنے گئے۔ ہوس بوٹ بندھے ہوئے تھے۔ اور ان کے مالک انہیں آنے والے موسم کے لیے سجا رہے تھے۔

"ہالو"

"پرشکوہ پیلس"

"لوٹن الزبیتھ"

"وکٹوریہ"

وہ ان کے نام پڑھ کر کچھ جھنجھلا سا گیا۔

میری پرتاپ پارک اور نہرو پارک میں بدیسی پھولوں کی بہار تھی، اس نے مجھے اتنے زور سے جھاڑا کہ آس پاس کے کشمیری نوجوانوں نے سمجھا کوئی پاگل ہے اور بڑی ملامت اور تعریض نگاہوں سے لارک سپر کے نازک پھول توڑ کر کالروں میں سجانے لگے۔

"مجھے پامپور کے زعفران زار دکھاؤ"

"مجھے ڈل میں کھلے کنول اچھے لگتے ہیں"

"مجھے وہ ننھے ننھے پھول دکھاؤ جو کشمیر کی سرزمین کا پیار ہیں"

اب میں واقعی جھنجھلا گیا۔ قریب سے گزرتی ہوئی ایک کشمیری دوشیزہ نے سپاٹ انگریزی لہجے میں اپنے ساتھی سے کچھ کہا ہی تھا کہ میرے دوست نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ اور وہ "باسٹرڈ۔ باسٹرڈ" کہتی ہوئی آگے نکل گئی۔

دوسرے روز وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر ہی کہیں چل دیا۔ میں نے ہاسٹل کے میس سے کھانا منگوایا اور اس کے لیے علاحدہ رکھوا کر شہر کی سمت چل پڑا۔ موسم بڑا ہی خوشگوار تھا۔ ڈل کے کنارے اپریل کی سبک دھوپ مچھیروں کے سفید سفید جالوں کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ یہاں کشمیر کے وہ باشندے رہتے ہیں جنہیں مقامی اصطلاح میں ہانجی کہتے ہیں۔ غلیظ قسم کے لوگ۔ ایک جگہ دفعتاً مجھے رکنا پڑا۔ میرا دوست ہانجیوں کے ایک گھرانے کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ بوڑھے ہانجی کے حقے سے وہ برابر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اور آس پاس ہانجی کی لڑکیاں فرن پہنے ندرو کے ڈنٹھل چن رہی تھیں۔ سورج کی سبک کرنیں ان کے کانوں کی بالیوں کو چوم رہی تھیں۔ لمبے آویزے سر کی جنبش سے پنڈولم کی طرح ہل رہے تھے۔ پاس ہی ہانجی کا بیٹا لکڑی کو بڑے انہماک کے ساتھ کپڑے میں لپیٹ رہا تھا۔ میں نے اپنے دوست کو پکارا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈل کی سمت اشارہ

[illegible]

دلی کے لیے ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام
کامیاب آغاز

بے زمین لوگوں کے لیے اراضی: ہریجنوں اور بے زمین کسانوں کو مکان بنانے کے لیے ۲۵ رہائشی پلاٹ اور کھیتی باڑی کے لیے ۸۰۰ زرعی زمینیں تقسیم کی گئی ہیں۔

: پنچایتوں کے ذریعے بے زمینوں کو ۳،۰۴۹ رہائشی پلاٹوں اور ۴۹ ہزار زرعی زمینوں کی مزید تقسیم کا کام جاری ہے۔

: ہاؤسنگ کوآپریٹیوں کے توسط سے غریب اور کم آمدنی والے لوگوں کو ۷۰ ہزار رہائشی پلاٹ دیے جائیں گے۔

: مکان بنانے کے لیے ہریجنوں کو ۱۵ لاکھ روپے کی مالی امداد کی فراہمی۔

طلبا وطالبات کے لیے سہولتیں: تمام غریب طلبا وطالبات کے لیے بک بینکوں سے درسی کتابوں کی فراہمی۔

: تمام اسکولوں اور کالجوں میں سستے داموں پر کاپیاں، کاغذ اور اسٹیشنری کی فراہمی۔

: تمام ہوسٹلوں میں سستے داموں پر ضروری اشیا کی فراہمی۔

روزگار: دلی یونیورسٹی کے نئے گریجویٹوں کو ۲۰ منی بسوں کی فراہمی۔

: اپرنٹس شپ ایکٹ کے تحت تربیت یافتہ ڈپلومہ ہولڈر انجینئروں کو روزگار کی فراہمی۔ مالکان کے لیے لازمی۔

: ۲۵ ہزار لوگوں کو جلد از جلد روزگار فراہم کرنے کے لیے نریلا صنعتی کمپلیکس کی تعمیر کے کام میں تیزی۔

کم سے کم اجرتوں میں اضافہ: صنعت، زراعت، دکانوں، اور تجارتی فرموں میں لگے ۵ لاکھ ملازمین و محنت کشوں کی کم سے کم اجرتوں میں اضافہ

تقسیم اشیا کی مثالی اسکیم: سستے اناج کی دکانوں، کوآپریٹو اسٹوروں اور بائیس گاڑیوں کے ذریعے نہ صرف شہری حلقوں بلکہ دور دراز گاؤں اور جھگی جھونپڑی کالونیوں میں ضروری اشیا رسد کا تیل اور موٹا کپڑا فراہم کیے جا رہے ہیں۔

: فروخت ہونے والی تمام اشیا پر قیمت ٹیگ لگانا لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔

: منافع خوروں، ذخیرہ اندوزوں اور اسمگلروں کے خلاف سخت قانونی کارروائی کی جا رہی ہے۔

دلی انتظامیہ کے دفاتر میں مستعدی اور بہتر کارکردگی: راجدھانی میں امن وامان اور نظم ونسق کی صورت حال میں کافی سدھار ہوا ہے۔

: آج دلی انتظامیہ کے تمام دفاتر اور اداروں میں ہر طرف مستعدی و بہتر کارکردگی اور لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی کے برتاؤ کا خوشگوار ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ اور بدعنوان و نااہل لوگوں کو ہٹایا جا رہا ہے۔ لوگوں نے اس نئے دور کے آغاز کا خیر مقدم کیا ہے۔

آئیے! ہم سب ایک ہو کر اپنے نظم وضبط، لگن اور پختہ ارادوں کے ساتھ اس پروگرام کو پوری طرح کامیاب بنائیں

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات واشاعت، دلی انتظامیہ دلی

ہریانہ ۔ ترقی کی شاہراہ پر!

ہریانہ عظیم سماجی و اقتصادی انقلاب میں سے گذر رہا ہے۔ آج سے آٹھ برس پہلے جب سے ہریانہ ایک الگ ریاست کے طور پر وجود میں آیا، یہاں سماجی اور اقتصادی پہلوؤں نے نمایاں ترقی ہوئی ہے جہاں سرکار مفلسی کو دور کرنے میں صدق دلی سے سرگرمِ عمل ہے، وہاں اس ضمن میں عوام بھی نہایت جوش و خروش سے تعاون دے رہے ہیں۔

مخلصانہ محنت اور جانفشانی کی بدولت حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ذیل میں درج حقائق اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں :-

خوردنی اجناس :- خوردنی اجناس کے معاملہ میں ہریانہ صرف آج اپنی ضروریات میں خود کفیل ہے۔ بلکہ 1966ء کے مقابلہ میں جبکہ یہ کمی والا راجیہ تھا اب فالتو اناج پیدا کر رہا ہے۔

آبپاشی :- 1967-68ء کے 33.57 لاکھ آبپاشی رقبہ جات کے مقابلے 1976ء میں آبپاشی رقبہ جات بڑھ کر 40 لاکھ ایکڑ ہو گیا ہے۔
مئی 1966ء میں ریاست میں کل ٹیوب ویلوں کی تعداد 29000 تھی۔ آج ان کی تعداد 1,57,718 تک پہنچ گئی ہے۔

بجلی :- ہریانہ ملک کی واحد ریاست ہے جس نے نومبر 1970ء میں دیہاتوں میں بجلی پہنچانے کے لیے نشانے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ مئی 1966ء میں ہر پانچ دیہات میں سے صرف ایک کو یہ سہولت میسر تھی۔

صنعت :- مئی 1966ء میں 4690 رجسٹرڈ چھوٹے کاروباری صنعتی یونٹوں کے مقابلہ میں ان کی تعداد 1976-77ء کے آخر تک 16120 ہو گئی۔

پینے کے پانی کی بہم رسانی :- سات برس پہلے ہریانہ میں صرف 325 دیہاتوں کو صاف پینے کے پانی کی بہم رسانی کا انتظام تھا جبکہ آج 799 دیہات اس اسکیم سے مستفید ہو رہے ہیں۔ پہلے کے مقابلے اس کام میں 150 فیصد اضافہ ہوا ہے۔

ٹرانسپورٹ :- نومبر 1972ء سے مسافر بسوں کو پورے طور پر قومیا لیا جا چکا ہے۔ آج ہریانہ روڈویز کے پاس 1800 بسیں ہیں جبکہ مئی 1966ء میں صرف 667 بسیں تھیں۔ ہریانہ روڈویز کو اپنی کارکردگی کے لیے ملک میں امتیازی مقام حاصل ہے۔

کمزور طبقوں کی بہبود :- معذور و جسمانی طور پر معذور اشخاص کو راحت پہنچانے کے لیے متعدد سکیمیں بنائی گئی ہیں۔ شیڈولڈ جاتیوں اور پسماندہ طبقہ جات کی حالت کو بہتر بنانے کی جانب خاص توجہ دی جاتی ہے۔

سڑکیں :- راجیہ کے 100 فیصد دیہاتوں کو پکی سڑکوں کے ساتھ ملانے کا کام پورا کیا جا چکا ہے۔ جبکہ مئی 1966ء میں صرف 1500 دیہات پکی سڑکوں کے ساتھ جوڑے گئے تھے۔ اب پکی سڑکوں کے ساتھ جوڑے گئے دیہاتوں کی تعداد 4394 تک پہنچ گئی ہے۔

جاری کردہ
ڈائریکٹر محکمہ تعلقات عامہ
ہریانہ ۔ چنڈی گڑھ

انبالہ

انبالہ ۔ انبالہ

وشوا ناتھ درد

سلوٹ

دبے پاؤں پروائی آکر
دیتی ہے دستک جیسے
میرے بند کواڑوں پر
ہوتا ہے محسوس کچھ ایسے

اور میں نیند میں ڈوبا ڈوبا
خوابوں کی زنجیر پکڑ کر
چڑھتا ہوں یادوں کے زینے
ہوتا ہوں ہر شے سے برتر
ماضی کے ان گنت دریچے
کھل جاتے ہیں آہٹ پا کر
اور ان کی بے نور نگاہیں
گڑ جاتی ہیں ایسے مجھ پر
جیسے میں مفرور ہوں کوئی
صدیوں کی روداد چرائے
سوچ کی اک اک سلوٹ کھولوں
لیکن کچھ بھی سمجھ نہ آئے
سلوٹ سلوٹ سوچ کی چادر
کروٹ کروٹ میرا بستر
نیند میں ڈوبا حیراں حیراں
ہنس دیتا ہے آخر مجھ پر

تاروں سے تو امرت برسے
لیکن پیاسا ساز ہمیشہ کو ترسے

نثیر اختر

آخری خواب

گوشت کے لوتھڑوں کے تعفّن کا احساس جب
زندگی کی علامت بنے
جلتی آنکھوں کا بے نام سا کرب
سورج کی حدّت،
دیکھتے ہوئے دن سلگتی ہوئی شب کے محبوس سب
منتقم دل ابھی کیوں جہنم دہکتے اس جلتی دوزخ میں پھنکوا دیا
جگمگاتی ہوئی شاہراہوں سے رشتہ بھی ہے تو یہی
تین فٹ کی زمیں
اور بصیرت نگاہوں کی حد تک ہر اک چیز کو قید کرتی ہوئی
ساری آیات اشلوک، اقوالِ پیغمبراں
سب صحیفے، مقدّس کتابیں، نئے ادیبوں کی بنے
شاہراہوں پہ اڑتی ہوئی گرد بڑھتے ہوئے شور میں
ساری افکار کی بستیاں دب گئیں
ذہن و دل کی پلیٹوں پہ اب کوئی خاکہ نہیں
دو فرشتوں کے کاندھوں پہ رکھے ہوئے ہاتھ روحِ خدا
آسماں سے اترتی ہوئی
قتلِ خنزیر، ٹوٹی صلیبوں کا انبار
دجّال کا جسم سیّال بن کر پگھلتا ہوا
آخری خواب کی شکل میں آخری دن کی آمد کے سب منتظر۔

نوبہار صابر

میٹھا، نمکین، کسیلا پانی
کہیں کیسا، کہیں کیسا پانی

کھیت پیاسا تھا سو پیاسا ہی رہا
شہر پر ٹوٹ کے برسا پانی

لوگ کرتے ہیں سرابوں کا سفر
چھوڑ کر سامنے بہتا پانی

دل بھڑک اُٹھا جو آیا وہ نظر
دیکھ کر چاند کو اُچھلا پانی

آدمی خاک ہے عزت کے بغیر
شیشہ پتھر ہے جو اُترا پانی

نہیں دُنیا میں خوشی نام کی چیز
کبھی پتھر سے بھی نکلا پانی؟

چہرے چہرے پہ تصنع کی نقاب
کھوٹی دھاتوں پہ سنہرا پانی

پتھروں نے تو بہت سر پٹکا
ایک پل کو بھی نہ ٹھہرا پانی

مر کے اِس قید سے چھوٹے صابرؔ
مجھ میں جسم تھا نکلا پانی،

مدحت الاختر

کوئی جواز تو ہو اُس کے پاس جانے کا
وہ احتیاط کا عادی نہیں ٹھکانے کا

میں اپنے آپ میں چھپ کر ہوا ہوں بے قیمت
مجھے گلہ نہیں شوکیس کے زمانے کا

لب آئے ہوئی ندی پر تو پھر مزہ بھی چکھو
کیا تھا حوصلہ کیوں مجھکو آزمانے کا

یہیں تو جائے ابھی دشت پر گھٹا، لیکن
خیال ہوگا سمندر کے روٹھ جانے کا

لگاؤ اپنے مکانوں پہ نام کے جھومر
یہاں رواج ہے پیشانیاں سجانے کا

کوئی چراغ ہی مِل جائے جادوئی نہ سہی
میں بھول جاؤں گا قصّہ نئے پرانے کا

کسی کے دیدۂ بے حس میں عکس تاب نہیں
کہ وقت آگیا آئینہ ٹوٹ جانے کا

جمیل کیفی

خوشبو کے اردگرد ہواؤں کے شہر میں
مبہوت ہم کھڑے ہیں صداؤں کے شہر میں

کیوں شام سے پڑے ہیں اندھیروں کے قافلے
اے چاند جھانک ماہ لقاؤں کے شہر میں

کھڑکی کھلی کہیں نہ کیا سے کوئی نہیں!
ہم منتظر ہیں کب سے نواؤں کے شہر میں

یادوں کا ماہتاب بڑی آب و تاب سے
چمکا ہے میرے دل کی گپھاؤں کے شہر میں

واقف نہیں جو جینے کے آداب سے ابھی
پہنچا ہیں لے وہ اُسکے جفاؤں کے شہر میں

کیا بے وفاؤں کا کریں شکوہ جمیلؔ جب
ہم خود ملے ہیں آکے وفاؤں کے شہر میں

بزمِ احباب

پرکاش فکری (رانچی)

جولائی ۷۵ء کا تحریک ملا۔ اس میں عروج زیدی صاحب کی غزل میری شدید دلچسپی کا باعث بنی۔ میری ایک غزل بالکل اسی ڈھنگ کی ماہنامہ روشنی میرٹھ میں شائع ہو چکی ہے۔ ماہ اشاعت بھی میں بتا دیتا مگر متعلقہ شمارہ میں سر دست ڈھونڈنے سے قاصر ہوں۔

"روشنی" کو یہ غزل میں نے ۹ر جنوری ۷۴ء کو بھیجی تھی۔ اور وثوق کے ساتھ یاد ہے کہ یہ دو تین ماہ کے اندر شائع ہو گئی تھی۔ میں عروج صاحب کی طرح طویل غزلیں تو نہیں کہہ پاتا بس پانچ شعر تھے۔

جنگلوں کی گود میں ہم دفن کر آئے اسے
دل خموشی چار سو ہے اور ہوا مغموم ہے
خواب جیسی وہ رُتیں تھیں اک سہانا خواب سی
جن رُتوں سے اب تلک اک رشتۂ معصوم ہے
اس مکاں کی خستگی سے لطفِ موسم بھی گیا
لوگ مدہوش ہیں سارے بارشوں کی دھوم ہے
کوئی گوشہ ڈھونڈ فکری رہ نوردی چھوڑ کر
وقت کے مبہم اشاروں کا یہی مفہوم ہے

محترم عروج صاحب کی اور میری غزل کے بعض حصوں میں جو حیرت انگیز مماثلت ہے اسے سو فیصدی اتفاق ماننے سے بھی مجھے گریز ہے اس لیے کہ ان کی غزلیں بھی "روشنی" میں اکثر شائع ہوتی رہی ہیں۔ رسالہ انہیں ملتا ہی ہوگا۔ میری غزل انھوں نے دیکھی ہی ہوگی، وہ شمارہ بھی ان کے پاس موجود ہوگا اور بھی بہت سے لوگوں کے پاس ہوگا یعنی میرے بیان کی تصدیق آسانی سے ہو سکتی ہے۔

اور اگر یہ واقعی اتفاق ہے تو اب مجھے اپنی یہ غزل تلف کر دینی پڑے گی۔ کیونکہ میں اس مقام پر تو نہیں کہ سرقہ اور توارد کی بحثیں چھیڑتا پھروں اور پھر وقت گزرنے پر میں کس کس کو یقین دلاتا پھروں گا کہ میری غزل پہلے شائع ہوئی تھی۔

عرفان زیدی (رامپور)

فی الوقت محترم والد صاحب (قبلہ عروج زیدی) علیل ہیں اور سیدھے ہاتھ میں شدید درد کے باعث زیادہ لکھنے سے قاصر ہیں۔ میں آج کل رامپور میں ہوں۔ اس لیے آپ کو زحمتِ انتظار سے بچانے کے لیے جناب پرکاش فکری صاحب کی تحریر کا جواب پیش کر رہا ہوں۔

بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ فکری صاحب نے ایک خاص زمین میں ایک مطلع، ایک مقطع اور تین شعر کہہ کر اور انہیں ماہنامہ "روشنی" میرٹھ میں چھپوا کر اپنے پندار میں جولانیٔ طبع اور خدمتِ شعر کا حق ادا کر دیا تھا۔ مذکورہ فوق مہم سر کرنے کے بعد انھوں نے اپنے ذہن میں یہ طے کر لیا کہ اس زمین میں نہ اب سے پہلے کسی نے غزل کہی ہے اور نہ ان کی غزل کی اشاعت کے بعد کسی کو طبع آزمائی کرنی چاہیے۔

یہ بات تو قبلہ والد صاحب کی تحریر سے بحث میں آ سکے گی کہ مذکورہ زمین میں غزل کس نے پہلی کہی تھی۔ اس وقت تو میرے نزدیک غور طلب یہ امر ہے کہ آیا فکری صاحب کے گنتی کے پانچ شعروں کا عروج صاحب نے چربہ اتارا ہے؟ ــ مضمون کا سرقہ کیا ہے؟ ــ یا مفہومِ شعر کی مماثلت توارد کے ذیل میں آتی ہے؟ ــ اس زمین میں عروج صاحب نے دو غزلیں کہی ہیں جو اٹھارہ اشعار پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے گیارہ تو جولائی کے "تحریک" میں سپردِ اشاعت ہو چکے ہیں اور سات اشعار کی دوسری غزل ہے جس کے دو مطلع مقامی طور پر اکثر لوگوں کو یاد ہیں

اقتضائے گردشِ دوراں مجھے معلوم ہے
پھر بھی میری آنکھ پُرنم ہے دلِ مغموم ہے

قبلہ عروج صاحب کی گیارہ شعروں والی مطبوعہ غزل کو سامنے

ملہ کر مگر فکری صاحب اپنی غزل سے دیانت داری کے ساتھ موازنہ کریں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی کہ دونوں غزلوں کے شعری مضامین میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ البتہ دونوں غزلوں کا مطلع اول کے مصاریع ادنیٰ الفاظ کے لحاظ سے بڑی حد تک یکساں ہیں

اہل ذوق جانتے ہیں کہ ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ شعر لکھتے وقت ذرا سی توجہ سے مضمون خود بخود سامنے آ جاتا ہے۔ مصرعہ زیر بحث میں بند دریچوں کا ذکر ہے فکری صاحب نے گھر کے "دریچے" بند کئے ہیں اور عروج صاحب نے دل کے دریچے ۔۔۔ اب اگر فکری صاحب یہ فرمائیں کہ لفظ "دریچہ" کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہیں اس لئے کوئی دوسرا شاعر اس لفظ کو نظم نہیں کر سکتا۔ تو وہ سر دست حضرات محمود سعیدی اور ماہر القادری سے باز پرس کریں۔

اپنے سوئے ہوئے سنسان دریچے سے، اٹھے
دیکھتا ہوں میں جہاں تک بھی نظر جاتی ہے (محمود سعیدی)

ملہ ہر گھڑی دل کا دریچہ باز رہنا چاہیے (ماہر القادری)

فکری صاحب کے خیالی عبارت میں خودستائی اور الزام تراشی کے پہلو دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"میں اس مقام پر تو نہیں کہ سرقہ اور توارد کی بڑی بڑی باتیں کروں" گویا یہ باتیں دوسروں کو زیب دیتی ہیں۔ اس جملے کا جواب انہیں کے لب و لہجہ میں دینا مشکل نہیں ہے، مگر آداب نگارش کا احترام ملحوظ ہے۔ فکری صاحب! زیر نظر دو مصرعوں میں تو کم از کم سارے الفاظ کا فرق ہے۔ ذرا یہ بتایئے ان اشعار کے پہلے مصرعوں میں حیرت انگیز مماثلت پا کر آپ تو کہہ نہ اٹھیں گے کہ مجھے سرقہ قرار دیں گے؟ سے

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے (سودا)

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس مختصر سی عمر میں کیا کیا کرے کوئی (اقبال)

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
ان مشکلوں سے عہدہ برآئی نہ ہو سکی (ترلوک چند محروم)

زیست کا اعتماد کیا ہے امیر
آدمی بلبلہ ہے پانی کا (امیر مینائی)

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا (حالی)

تارے گنتے ہو شام سے شب ہجر
کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی (داغ)

ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی (عزیز لکھنوی)

الغرض اسی قسم کی اور سیکڑوں مثالیں ذرا سی زحمتِ مطالعہ سے پیش کی جا سکتی ہیں۔

نجم الدین نقوی (رامپور)

مولانا عرشی کا منتخب کلام مشمولہ تحریک جولائی ۱۹۷۵ء میں کاتب نے متعدد غلطیاں کی ہیں۔ ان میں سے اہم کی نشاندہی ذیل میں کی جاتی ہے تاکہ قارئین کرام تصحیح فرما لیں۔

صحیح ۱۔ نہیں ہے گر اکسیر زہر لب دے ۔ اگر غلط
" ۲۔ شاہی ہے مے و شیشہ میں جام الہٰی ۔ و شیشہ غلط
" ۳۔ چمن میں کھلیں گے بہت لالہ و گل ۔ لالہ و لہ غلط
" ۴۔ یہ کلیاں، یہ پھولیں، یہ بارشیں، یہ نسیم ۔ نسیم غلط
" ۵۔ نہ تو شرط شیشہ لقوئی مگر تو کیو عمر ہو ۔ شیشہ لقوی غلط
" ۶۔ چشم کمال مستی کبھی دل پہ سوا ابرو کو وہ لب ۔ ابرو آب غلط
" ۷۔ حرم صومعہ دیر مسند کلیسا ۔ صومہ غلط

ظفر غوری (کوئٹہ)

میری غزل کے ایک مصرعہ شعر پر بھوپال پڑے تھے، پرکیسی میر زادہ ضیا صاحب کا اعتراض وارد ہوا ہے کہ یہ مصرع خارج از بحر ہے میرے خیال میں بھوپال میں "بھو" کا واؤ اگر ہمزہ کر کے پڑھا جائے تو بھی اس

ترکیب (اگر یہ ہو تو) کا صوتی حسن اور آہنگ مجروح نہیں ہوتا۔ آپ کا کیا خیال ہے: عام بات چیت میں بھی اسے اسی طرح بولتے ہیں۔ اور اسی بنا پر میں نے 'لہو میاں' بجائے واؤ پیش سے استعمال کیا ہے۔ ہندی الفاظ میں بس اتنا تصرف کہ اس لفظ کے حسن کو مجروح نہیں کرتا ہو، اسے برتا جا رہا ہے۔ بہرحال اسے طلبی خامی کے بطور ضرور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ میں پیرزادہ صاحب کے اس توجہ اور باریک بینی سے اشعار پڑھنے کے لیے ان کا معترف ہوں، ورنہ آج کل تو اس زوال پذیری کے دور میں ایک سرسری نگاہ سے ہی بہت سے حضرات سب کچھ پڑھ لینے کے قائل ہیں۔

یوں بھی اس غزل کا یہ دوسرا مطلع بہت اہم نہیں ہے۔ پہلے مطلع (قتل ہوئے سب لوگ پڑے تھے۔ نیچے سلے ساحل پہ گڑے تھے) کے پس منظری تسلسل کے باعث ہی اسے شامل کر لیا تھا۔ یہ ساری باتیں اس قدر لیٹ اس لئے ہو رہی ہیں کہ بڑی لمبی غیر حاضری کے بعد ہی یہاں آنے پر گذشتہ شمارے نظر سے گذرے ہیں۔

اختر الاسلام (دیتیا)

کچھ زمانہ ہوا 'تحریک' میں غزل 'سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے' کے بارے میں بحث ہوئی تھی عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ کی ۱۳ جولائی کی اشاعت میں مندرجہ ذیل سطور شائع ہوئی ہیں۔ بہتر ہو کہ آپ انہیں قارئین تحریک تک پہنچا دیں:

'یادِ رفتگاں' (شائع شدہ ۱۹۷۰ء پٹنہ) میں بسمل عظیم آبادی خود اپنا تعارف ان لفظوں میں کراتے ہیں:

'مجھے ایک خوش حال اور متمول خاندان میں تقدیر نے پیدا کیا اور سال پیدائش بیسویں صدی کا پہلا سال تھا۔ والد مرحوم سید شاہ آل حسن کی زندگی نے کم عمری میں ہی دغا کی، وہ انگلستان سے بیرسٹری پاس کر کے آئے ہی تھے کہ عظیم آباد جانے کی ٹھانی۔ میں صرف ایک سال کا تھا کہ ۱۹۰۲ء میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا...

اس زمانہ میں جبکہ میری وحشت دل جوان ہو رہی تھی حضرت شاد عظیم آبادی کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ میں بھی اسی بارگاہ فیض میں حاضر ہوا۔ اور استاد مرحوم نے بھی مجھے اپنی شاگردی کا شرف بخشا

جب جنگ آزادی کا ہنگامہ برپا ہوا تو وحشت دل نے اس ہنگامے کے شرکوں سے شرکت کی کوشش کی۔ اس زمانے کی بعض نظمیں بہت مقبول بھی ہوئیں۔ ایک غزل کا مطلع اور ایک شعر سن لیجیے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

ایک دوسرا دور ہے زندگی میں علی الخصوص اس طبقہ کی زندگی میں جس سے میرا تعلق ہے ایک دم فلادھڑی ہے۔ شاد باید زیستن۔ ناشاد باید زیستن۔ کچھ لکھنا کیا سوچنا بھی دشوار ہے۔ معاذ اللہ

ہمارا حال کوئی ان سے جا کے کہہ دیتا
کہ ہم سے اپنی کہانی کہی نہیں جاتی

مانگے کا اجالا

سماجی تنقید

غالب پر اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ بایں ہمہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری کے متعلق پوری بات ابھی تک کسی نے نہیں کہی ۔ ہمارے بعض نقادوں نے غالب کی شاعری کو سمجھنے کے لیے معاشرتی گرد و پیش کی توضیح پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے ۔ جیسے کہ غالب کو سمجھنے کے لیے اصلی چیز وہی ہو اور خود ان کی شاعری گویا ضمنی حیثیت رکھتی ہو ۔ یہ نقاد شعر کی صرف اس حیثیت کو مانتے ہیں جس حد تک کہ وہ خارجی سماجی احوال کی ترجمانی کرے ۔ لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ خارجی حقیقت جب شعر کا جزو بنتی ہے تو اس کی خارجیت بہت کچھ بدل جاتی ہے ۔ شاعر کا اسلوب اور اس کا لفظوں کا انتخاب اس کی اندرونی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی ماحول اور ایک ہی زمانے کے دو شاعروں کی یہ اندرونی کیفیت بعض اوقات اتنی مختلف ہوتی ہے کہ انہیں ایک زمرے میں نہیں شمار کیا جا سکتا ۔ غالب اور ذوق اس کی اچھی مثال ہیں ۔

شعر کی تعریف اس کی ظاہری ہیئت اور موضوع سے مکمل نہیں ہوتی ۔ اس کی ہیئت ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک خاص موضوع کا وسیلہ ہو ۔ لیکن یہ اس لیے ضروری نہیں کہ اس سے شاعر خارجی حقیقت کا تعین کرتا ہے ۔ بلکہ اس واسطے ضروری ہے کہ وہ ایک روحانی اسلوب کی حیثیت رکھتی ہے جسے شعر سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ اس پر شاعر کے تخیل اور جذبہ اور تاثر کا دارومدار ہوتا ہے جس سے شعر کا جادو جگایا جاتا ہے ۔ شاعری میں ہیئت اور معنی دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ یہ ایک ہی تاثراتی کیفیت کے دو رخ ہیں ۔ ہمارے شعور میں وہ الگ الگ نظر نہیں آتے ۔ بلکہ ان کا مجموعی اثر ہمارے عقل کے تاروں کو چھیڑتا ہے ۔ اور اسی سے شاعر کے کلام میں صداقت پیدا ہوتی ہے ۔

بعض تنقیدوں میں شاعر اپنے عہد کے سیاسی اور معاشرتی احوال میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے کہ وہ کہاں ہے ۔ وہ بے چارہ صرف واقعات کے طوماروں سے جھانکتا ہوا نظر آتا ہے ۔ شرمایا شرمایا سا معذرت کرتا ہوا کہ جیسے وہ معمول کے خلاف کوئی کام کر رہا ہو ۔ ان تنقیدوں کو پڑھنے والوں پر یہ اثر مترتب ہوتا ہے کہ شاعرانہ کمال اور خوبی تو محض ضمنی چیز ہے ، اصلی چیز شاعر کے گرد و پیش کا تجزیہ ہے ۔ تنقید کا یہ طریقہ یک طرفہ اور نامکمل ہے جس سے احتراز لازم ہے ۔ یہ درست ہے کہ کوئی شاعر خلا میں اپنا شعر نہیں کہتا ۔ وہ جس زمانے میں ہوتا ہے اس کا اثر قبول کرتا ہے اور پھر خود اسکو متاثر کرتا ہے مگر سماجی احوال کو تنقید میں حد سے زیادہ اہمیت دی جائے تو میر اور سودا ، غالب اور ذوق ، مومن اور ناسخ میں کوئی خاص فرق نہ ہونا چاہئے ۔ حالانکہ ان کے انداز اور لب و لہجہ کا فرق بنیادی طور پر اتنا واضح ہے کہ انہیں ایک صف میں رکھنا شاعرانہ صداقت کے خلاف ہے ۔

(ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ غالب اور آہنگِ غالب)

ترقی ، ترقی پسندی اور پارٹی بندی

[illegible]

سے کہا ہے ، تم ترقی کرنے والے نہیں ہو ، تم پارٹی بند ہو ۔ حقیقت یہ ہے جو لوگ اپنے کو ترقی پسند کہتے ہیں وہ دراصل پارٹی پسند کہلانے پر فخر کرتے ہیں ۔ دراصل میں کسی انجمن یا پارٹی کو فرد پر ترجیح دینے کے سوا کچھ نہیں کرتے ۔ ۱۹۳۶ء میں ایک ادارہ انجمن ترقی پسند مصنفین بنا ہے جو اپنے کو ترقی کا ٹھیکیدار ٹھہراتا ہے یہ اپنے کو حالی اور آزاد کی راہ پر چلتا ہوا بتاتا ہے ۔ حالانکہ اس نے ساتھ سیاست کو اہم ٹھہرا کر اور روس کی سیاست سے تائید حاصل کر کے مصنفین کا یہ فرض ٹھہرایا ہے کہ وہ اشتراکیت کا پرچار کریں [illegible] ترقی کی راہ پر

چلنے والے کچھ تو اسے زیادہ تیز سواری سمجھ کر بیٹھ جاتے ہیں مگر کچھ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ ادب کی راہ پر جا ہی نہیں رہی ہے اور اس سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ یہ انجمن ترقی کے اجارے دار یا ٹھیکیدار کمپنی کی طرح ہر سال اجلاس کرتی ہے۔ انجمن کچھ خاص قسم کے مصنفین کو چھانٹتی رہتی ہے اور اپنے مقصد میں اضافے اور ترمیم کرتی رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اب گیا چولہے بھاڑ میں ترقی اس میں ہے کہ انجمن کا ممبر بن جایا جائے۔ ممبری بڑھانا، ہر قسم کے ادیبوں کو اپنے اندر داخل کر لینا اس کا تمام تر مقصد ہو جاتا ہے۔ ترقی پسند کا ایک خاص ٹائپ ابھرا ہے جو لپکتا ہوا، بال ہلاتا ہوا، ہر اعتراض کرنے والے سے جھگڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ ترقی، ترقی گئی اپنی دم میں۔ اب پارٹی بندی ہی سب کچھ ہو جاتی ہے۔ ترقی آگے بڑھنے کا نام نہیں رہ گیا، بلکہ ایک پارٹی کے بھنور میں چکر لگانے کا نام ہو گیا ہے۔ بھنور چکر میں ڈال کر ڈبو دیتا ہے۔ اور جو بھی اس ترقی پسندی کے بھنور میں آیا وہ آج بالکل غرق ہو گیا ہے یعنی لاپتہ نظر آتا ہے۔

ترقی پسندی کا اظہار پارٹی بندی ہی کے ذریعہ ہوا۔ پارٹی کی جذباتی طرفداری اور مخالفین سے تعصب اس کا سب سے نمایاں فرض ٹھہرا۔ انصاف، تنقیدی نظر سے دیکھنا اور پرکھنا جرم ہو گیا۔ پارٹی سے وفاداری، اس کے منشور سے چوں و چرا تک بھی نہ کرنا شرط اول قدم ہوا۔ انجمن ترقی پسند کے بارہ سالہ اجلاس میں جو سے غیرحال لکھنؤ میں ہوا تھا، میں تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا اور میں نے ترقی پسند ادب کی کچھ خامیاں بتانی شروع کیں۔ مجھے اس سے ہمدردی تھی اور مخلصانہ طریقے پر ان غلطیوں کو دور کر کے ادب کو بہتر راہ پر لگانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے تقریر شروع ہی کی تھی کہ ترقی پسند شاعر مجروح سلطان پوری اللہ کر مجھے ڈانٹنے لگے۔ ترقی پسند انجمن تو ایک ہوائی کی طرح آسمان پر پھول کھلا کر ختم ہو گئی مگر اس کی جلتی ہوئی لکڑی زمین پر گری ہوئی اب بھی کچھ گرمی دکھا رہی ہے۔ یعنی آج بھی کچھ لوگ ہیں جو اپنے کو ترقی پسند کہتے ہیں۔ اور مجھے بھی دعوت دیتے ہیں کہ میں بھی اپنے کو ترقی پسند کہا کروں۔ میں ان کا مذاق اڑاتے ہوئے ٹالتا ہوں۔

لفظ ترقی پسند نے عام ہو کر اپنا سارا تو کیا کیا۔ مناسبتیں وابستہ کر لیں یعنی اول یہ اشتراکیت کا ہم معنی ہو گیا ہے پھر ادبی پروپیگنڈا اور اس کے سلسلے میں اندھے اور جذباتی تعصب کا، مجھے کوئی ترقی پسند نظر نہیں آیا۔ جو ایک دو ہی باتوں کے بعد مشتعل نہ ہو گیا ہو۔ اور بھنبھوڑ کھانے کو تیار ہو گیا ہو۔ میرے تجربے میں ترقی پسند ایک قسم کا کتا ہے۔ اور وہ بھی کٹکھنا۔

ترقی پسند انجمن ترقی ادب کے لیے نہیں بنائی گئی بلکہ شروع ہی سے اس کا مقصد پارٹی بندی تھا۔ اس کا مخرج روس کی سیاست ہے اور اس سیاسی مقصد کو ادب پر ٹھونسنا ہے۔ ہمارے یہاں لوگ اس مقصد کو بھی نہ سمجھے اور اسے سستی شہرت کا جھنڈا سمجھ کر اس میں شریک ہو گئے۔

احسن فاروقی (عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ)

جوش کی مخالفت غزل

جوش صاحب جب کراچی میں رہتے ہیں تو کبھی کبھی اس خاکسار پر بھی کرم فرمایا کرتے ہیں۔ عموماً ان کے ساتھ ایک گروہ بھی مداحین کا ہوتا ہے۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں تو تنہا تشریف لا رہے ہیں میں نے کہا آج کل کیا تخلیقات ہو رہی ہیں۔ فرمایا آج کل نثر لکھ رہا ہوں۔ میں نے تعجب سے پوچھا "نثر؟" تو کہنے لگے: "جی ہاں نثر۔ نقوش والوں نے فرمائش کی ہے کہ میں اس موضوع پر کہ "آیا ہمارے دور میں ادب میں جمود ہے یا نہیں" اظہار خیال کروں، میں نے پوچھا "تو آپ کی کیا رائے ہے۔؟"

جواب دیا "ہے صاحب ہے"۔

میں نے عرض کیا: "ذاتی سوال کرنا ہے تو بے تکی سی بات مگر بیان بغیر پوچھے چارہ بھی نہیں۔ آپ کا اپنے ادب کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا اس میں بھی جمود ہے؟"

فرمایا: "جی نہیں، مگر اسے مستثنیات میں شمار کرنا چاہیے جس سے کلیہ میں فرق نہیں آتا۔" میں نے پھر عرض کیا "آپ ہی ان مستثنیات میں ہیں یا اور کچھ لوگ بھی ہیں؟"

جواب دیا "جی نہیں اور لوگ بھی ہیں۔ حسرت، جگر، فانی، اصغر، فراق اور چونکہ یہ خاکسار بھی وہاں موجود تھا اس لیے اخلاقاً اسے بھی اس زمرے میں شامل کر لیا۔

میں نے عرض کیا "اگرچہ میں اس قابل نہیں مگر آپ کی بات مانے لیتا ہوں۔ تو اس طرح چھ شاعر مستثنیات قرار پائے۔ آپ کا کیا خیال ہے ان کا کلام ان کے بعد بھی زندہ رہے گا۔؟"

فرمایا "جی ضرور، نہ محض زندہ رہے گا بلکہ زمانے کے ساتھ ساتھ ان کی قدر بھی بڑھتی جائے گی۔"

اب میں نے گزارش کی "آپ تو ماشاء اللہ انگریزی بھی پڑھے لکھے ہیں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ایک زمانے میں آپ اپنے نام کے ساتھ بی۔ اے بھی لکھا کرتے تھے جس پر شکی لوگ شک کیا کرتے تھے۔ بہرحال آپ کو انگریزی ادب سے اچھی خاصی واقفیت ہوگی اور فارسی و اردو ادب پر تو عبور ہی حاصل ہے۔ براہ کرم بتائیے تو کسی زبان کے کسی دور میں بھی چھ شاعر ایسے پیدا ہوئے جن کا کلام آج تک زندہ ہے؟ کسی دور میں دو ملیں گے کسی میں تین اور ایک آدھ میں زیادہ سے زیادہ چار۔" جوشؔ صاحب اس حقیقت سے انکار نہ کرسکے تو میں نے بات اور آگے بڑھائی "اور پھر تو حضرت ہمارے دور کا ادب ہر دور سے زیادہ متحرک ثابت ہوتا ہے۔ ادب میں صرف شاعری ہی تو شامل نہیں نثر بھی ہے۔ ان کی تعداد بھی چھ سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہوگی مثلاً مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، قاضی عبدالغفار وغیرہ فہرست اچھی خاصی طویل ہے۔ آپ غور کریں تو کئی اور نام خود بخود ذہن میں آئیں گے۔"

جوشؔ صاحب کچھ سوچ میں پڑگئے۔ میں نے عرض کیا "ایک چیز اور آپ نے خیال فرمائی۔ آپ نے خیال میں اس دور کے جن شعرا کا نام لے گئے جو آپ کی رائے میں زندہ جاوید رہیں گے وہ سب کے سب آپ کی ملعون غزل ہی کے شاعر ہیں۔ یہاں تک کہ آپ بھی۔" جوشؔ صاحب ہنستے ہوئے بولے "جی، اجی، سو بھی آپ کو خوب۔ مگر آپ ٹھہرے اس زمانے میں غزل کے سب سے بڑے علمبردار، لیکن صاحب آپ نے مجھ پر جو غزل گوئی کی تہمت لگائی ہے وہ میرے دور جاہلیت کی ہے۔" میں نے عرض کیا "یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ عربی زبان میں دور جاہلیت کی شاعری ہی بڑی جاندار سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح آپ کے دور جاہلیت کی شاعری بھی آپ کی بعد کی شاعری سے زیادہ جاندار ہے اور اسی زمانے کی غزلوں کے اشعار زیادہ عرصہ تک زندہ رہیں گے۔ بھلا ایسا شعر کہنے والا کہ ؎

اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی
وہ آئے تو گھر بے سر و ساماں نظر آیا

بنیادی طور پر غزل گو ہوئے بغیر کبھی کہہ سکتا ہے۔ اور آج کل جس چیز کو آپ زبردستی نظم کہتے ہیں وہ درحقیقت نظم ہوتی ہی نہیں، نہ ابتدا نہ ارتقا، نہ عروج نہ اختتام، صرف ایک ہی خیال کو آپ بار بار مختلف تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ سے ظاہر کیا کرتے ہیں اور ایسی نظم میں جس کی ہیئت بالکل غزل کی ہوتی ہے، یہ صحیح معنوں میں نہ تو نظم ہوتی ہے نہ غزل، صرف ذہن کی پہلوانی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ کہ دیکھو میں کتنی کشتی زور اور کیسے کیسے داؤ پیچ سے ایک ہی خیال کو چت پٹ کیا کرتا ہوں۔ تشبیہوں، استعاروں اور نئی نئی تراکیب کی جدت، ندرت اور تراش خراش تو دیکھو جیسے اصل مقصود شاعری یہی ہو۔ حالانکہ ان کا اصل مصرف یہ ہے کہ جو تاثر شاعر براہ راست ادا نہ کرسکے وہ ان کی مدد سے کرے۔ زیادہ تر بڑے شعر وہ ہوتے ہیں جو اس قسم کی مدد کے بغیر کہے جاتے ہیں۔"

فضل احمد کریم فضلی (نیا دور کراچی)

جوشؔ کا کلام تازہ۔

اسے نیا دور کی ستم ظریفی سمجھئے کہ جوشؔ صاحب کے کلام پر فضل احمد کریم فضلی کا مندرجہ بالا اظہار خیال شائع کرنے کے بعد جوشؔ صاحب کی دو نظم نما غزلیں یا غزل نما نظمیں بھی شائع کردیں جن کا مطالعہ قاری کو فضلی صاحب کے اعتراضات پر ایمان لے آنے پر مجبور کر دیتا ہے:

(۱)

خداوندا سفر دشوار رکھا جائے گا کب تک
مرے جادے کو ناہموار رکھا جائے گا کب تک
ان ابنائے جہالت، عاملان زشت فطرت کو
مرا آقا، مرا سردار رکھا جائے گا کب تک
مجھے ان جاہلان و سوقیان سفلہ پرور میں
خداوندا ذلیل و خوار رکھا جائے گا کب تک
گریزاں وقت کو آخر مری ہستی کے آنگن میں
فساد انگیز و کج رفتار رکھا جائے گا کب تک
مرے ہیجان زر افشانی و ذوق سخاوت کو
بغیر درہم و دینار رکھا جائے گا کب تک
ارے این کعبہ و کاشی کے دلبروں کے نرغے میں
مجھے، ہنگامۂ کفار رکھا جائے گا کب تک

اُس انساں کو، جو زنجیرِ دو عالم توڑ بیٹھا ہے
میانِ سُبحہ و زُنّار رکھا جائے گا کب تک
الٰہی اِبنِ سماعت مُردہ، مادر زاد بہروں میں
مجھے شرمندۂ گفتار رکھا جائے گا کب تک

(۲)

دماغِ مُطلق و دانائی آزادۂ فطرت کو
اسیرِ گیسوئے خم دار رکھا جائے گا کب تک
وہ شاعر جس کی فکرِ پختہ، نقاشِ دو عالم ہے
اُسے یوں نقش بر دیوار رکھا جائے گا کب تک
"صفات و ذات" کو جس مردِ کامل کی تمنا ہے
اسے رہینِ لب و رُخسار رکھا جائے گا کب تک
خدا کے جلوۂ پائندہ کے مطلوب شاعر کو
بتوں کا طالبِ دیدار رکھا جائے گا کب تک
خدایا، ناقدِ سیارہ و نبّاضِ ثوابت کو
رہینِ خدّ و خالِ یار رکھا جائے گا کب تک
اُسے، جو آدمی کے ذہن کی صحت میں کوشاں ہے
مریضِ نرگسِ بیمار رکھا جائے گا کب تک
جسے کہتے ہیں، عُرفِ عام میں عشقِ جنوں پرور
مُسلّط مجھ پہ وہ آزار رکھا جائے گا کب تک
نکیلے عربدوں چبھتی ہوئی بُراں نگاہوں سے
مجھے مجروح و دل افگار رکھا جائے گا کب تک
اُچھالا جائے گا، تا چند، میری داستانوں کو
مجھے رسوا بسرِ بازار رکھا جائے گا کب تک
میرے ایوانِ عقل و قلعۂ ذوقِ تاسّل کو
نگاہِ ناز سے مسمار رکھا جائے گا کب تک
سُلا کر میری جُودت کو دَرونِ حجلۂ ترکاں
بُرونِ قلعۂ افکار رکھا جائے گا کب تک
ہر اِک کنعانِ دل کو، فتح کر لینے کی نیت سے
مُقابل مصر کا بازار رکھا جائے گا کب تک
ڈسایا جائے گا، تا کے، مجھے قومِ حسیناں سے
مجھے یوں مُضطر و ناچار رکھا جائے گا کب تک

مری صبحوں کو آخر یوں سُلایا جائے گا، تا کے
مری راتوں کو یوں بیدار رکھا جائے گا کب تک
مری باہوں کو۔ جن پر شاہدِ قدرت کی نظریں ہیں
حسینوں کے گلے کا ہار رکھا جائے گا کب تک
نگاروں کے لبِ گُل رنگ کی موجِ تبسم کو
مرے حق میں چھُری کی دھار رکھا جائے گا کب تک
سلونی سانولی متوالیوں کے لوچ کو، یا رب
مرے سر کے لیے تلوار رکھا جائے گا کب تک
پلی ہیں جو، گلابی پُتلیوں کی چھاؤں میں آنکھیں
اُن آنکھوں کو مری، خونبار رکھا جائے گا کب تک

تبصرے

غالب اور آہنگ غالب

غالب اور ان کی شاعری پر اردو میں جتنا لکھا گیا ہے اتنا غالباً اردو کے کسی دوسرے شاعر کے بارے میں نہیں لکھا گیا۔ لیکن غالب کی شخصیت اتنی متنوع اور ان کی شاعری اتنی تہہ دار ہے کہ ان پر جتنی گفتگو کی جائے نئے نئے پہلو نئے نئے گوشے سامنے آتے رہتے ہیں اور مزید گفتگو کا جواز پیدا ہوتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان کی کتاب "غالب اور آہنگ غالب" غالبیات کے ذخیرہ میں ایک اہم اضافہ ہے جس میں تحقیق و تنقید دونوں کا حق ادا کیا گیا ہے۔

کتاب کل پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ لیکن ہر باب کو کئی ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلا باب غالب کے زمانے کے تاریخی اور تہذیبی جائزے پر مبنی ہے۔ غالب نے شعور کی آنکھ کھولی تو ہندوستان، بالخصوص دلی کی سیاسی اور معاشرتی صورت حال کیا تھی، مغل سلطنت زوال کی کن حدوں کو چھو رہی تھی، نو وارد انگریز حکمران مقامی ماحول پر کیا اثر ڈال رہے تھے اور خود اس سے کیا اثرات قبول کر رہے تھے، شعر و سخن کی محفلوں کا کیا انداز تھا۔ ان تمام باتوں سے ڈاکٹر صاحب نے تفصیلی بحث کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی شاعر کی فنی شخصیت کی تشکیل میں عصری ماحول کو وہ غیر ضروری اہمیت نہیں دیتے جو ترقی پسند ناقدین کا شیوہ رہا ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ روشن خیالی اور ذہنی آزادی کی وہ فضا جو انگریز اپنے ساتھ لائے تھے۔ غالب کے طبعی میلانات سے مناسبت رکھتی تھی، اور اس لیے ان کے اس شاعرانہ ذہن کی بالیدگی میں معاون اور مددگار ثابت ہوئی۔ جو لکیر کا فقیر بن کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

دوسرے باب میں یوسف حسین خان صاحب نے غالب کی زندگی کے وہ اہم واقعات ایک استدلالی ترتیب کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ جنھوں نے غالب کے دل و دماغ پر دیرپا اثرات ڈالے اور جو ان کی شاعرانہ شخصیت کے بعض پہلوؤں کی تشکیل میں بھی دخیل ہوئے۔ ان اثرات کی تفصیلی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور ان نفسیاتی محرکات پر بھی بحث کی گئی ہے جنھوں نے ان اثرات میں وہ محوری قوت [illegible] پیدا کیا کہ غالب زندگی کے آخری لمحوں تک ان کے دائرے سے نہیں نکل سکے۔

باقی ابواب میں غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور غالب کے پسندیدہ شعری موضوعات کو الگ الگ ذیلی عنوانات دے کر ان کی توجیہات اور تعبیرات پیش کی گئی ہیں۔ یوسف حسین خان صاحب کی عالمانہ شرح [illegible] ہی اور ناقدانہ [illegible] مسلمات کا درجہ رکھتی ہے۔ اور ان ابواب میں انھوں نے جس انداز سے غالب کی پیچیدہ شخصیت کے اسرار اور ان کی شاعری کی تہ در تہ [illegible] کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی بلیغ کی ہے، اس نے ان کے اس ادعا پر ایک اور مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک غالب کی شاعرانہ شخصیت کا اہم ترین وصف ان کی تخیلی فکر ہے جو غیر معمولی طور پر قوی، توانا اور تازہ کار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ بعض ناقدوں نے جو ان کے تعقل اور تخلیلی فکر کی نشاندہی کرتے ہوئے اس میں غالب کی عظمت کا راز دریافت کیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ تخیلی فکر پر اچھی شاعری کی اساس رکھی جا سکتی ہے یا نہیں یہ ایک بنیادی سوال ہے جو ڈاکٹر صاحب نے اٹھایا ہے۔ اور غالب کے ذکر تک پر اکتفا نہیں [illegible] کتاب میں انھوں نے ذیلی طور پر اس طرح کی بھی بہت سی اساسی باتیں کہی ہیں جو قاری کے ادبی شعور میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں۔ مثلاً ادب اور شاعری میں جنس کی اہمیت اور جنس کی پیدا کردہ پیچیدہ ذہنی کیفیات کے گوناگوں مظاہر پر انھوں نے جو لکھا ہے وہ ان ناقدین کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے جو جنسی موضوعات کو قطعی ممنوعہ قرار دینا چاہتے ہیں۔ اور اس قسم کی [illegible] لینے کے جرم میں اکثر نئے شاعروں کو مطعون کرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح شاعری میں قوتِ تخیلہ کے عمل، لفظ و معنی کے باہمی ربط ہیئت اور مفہوم کی ہم آہنگی، خیالی پیکروں کی تشکیل اور لفظوں کی علامتی اہمیت اور وحدتِ وجود کے فلسفے پر ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ وسیع علم اور گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے فارسی اور اردو غزل کے اساتذہ کے کلام سے غالب کے کلام کا موازنہ بھی کیا ہے۔ غالب کے بہت سے اشعار ہیں جو بعض پرانے اساتذہ کے اشعار کی توسیع معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ شاعری محض اپج کا نام نہیں، جدتِ ادا بھی ایک چیز ہے۔ جو پرانے مضامین کے اعادے میں بھی ندرت اور تازگی کا احساس کرا دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ باور کرانا چاہا ہے کہ جو اشعار بطور مثال وہ دے رہے ہیں وہ غالب کی جدتِ ادا کا نمونہ ہیں۔ میں ادب کے ساتھ کہنا چاہوں گا کہ ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔ کہیں کہیں غالب کے شعر یقیناً ان حدوں سے بڑھ گئے ہیں جنھیں سامنے رکھ کر انھوں نے یہ شعر کہے ہوں گے۔ لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ غالب کی کوشش ناکام رہی ہے۔ فارسی اشعار سے قطع نظر اردو کے چند اشعار کا تقابل دیکھیے:

جب صدِ دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں
کہتا ہے بِن سُنے ہی میں خوب جانتا ہوں۔ میرؔ

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے۔ غالبؔ

لطف پر اس کے ہم نشیں مت جا
کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی — میرؔ

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا — غالبؔ

ذلیل اس کی گلی میں ہیں تو ہیں آزردگی کیسی
کہ رنجش تو وہاں ہووے جہاں ہو اعتبار اپنا۔ میرؔ

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا — غالبؔ

میرؔ کے اشعار کی بے ساختگی اور گھلاوٹ اور غالبؔ کے اشعار کا تکلف اور قدرے الجھاؤ ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے۔

ڈاکٹر صاحب غالب کو کئی وجوہ سے اردو کے سبھی شاعروں پر جن میں میرؔ بھی شامل ہیں فوقیت دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غالب اپنے ہمعصروں میں ممتاز ہیں۔ لیکن جہاں تک میرؔ کا تعلق ہے اگر کچھ حیثیتوں سے غالبؔ کو ان پر فوقیت دی جائے تو دوسری کئی حیثیتوں سے میرؔ کو غالب پر ترجیح دینی پڑے گی۔ اثر لکھنوی مرحوم نے "مرزا نیہ" میں اس سوال پر خیال انگیز بحث کی ہے۔ میرؔ ایسا شاعر ہے جو اپنے عہد کے المیے میں خود شریک ہے، غالب بیشتر حالتوں میں تماشائے روز و شب کے ناظر نظر آتے ہیں، اس کا حصہ نہیں، ان کی شخصیت اتنی توانا ہے جو ہر جگہ بھی اپنے علیحدہ وجود کے اثبات پر مصر رہتی ہے۔ جبکہ میرؔ اپنے شخصی وجود کو تحلیل کر کے پوری زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں اسی لیے ان کے لہجے میں گھلاوٹ اور رچاؤ غالبؔ سے زیادہ ہے۔

اس حصے میں یہ بھی ہوا ہے کہ فارسی کے بعض اشعار غلط شاعروں سے منسوب ہو گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ اصل شاعر کے نام کے ساتھ زبانزدِ خاص و عام ہیں۔ مثلاً حافظ کے مشہور شعر:

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

ان کا فیضی سے انتساب غالباً کتابت کے کسی کرشمے کا نتیجہ ہے، ڈاکٹر صاحب کو تو سہو نہیں ہو سکتا۔ دوسرے کئی اشعار کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اعلیٰ درجے کے سخن فہم ہیں، لیکن کہیں کہیں وہ غالب کے طرفدار بھی نظر آتے ہیں۔ غالب کے وہ بعض معمولی شعروں کو وہ یہ کہہ کر قابلِ توجہ ٹھہراتے ہیں کہ یہ غالب

کی زندگی کے کسی خاص واقعے کی یادگار ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

شاید یہ شعر اور اس طرح کے دوسرے اشعار غالب کے سوانح نگاروں کے لئے مفید ہو سکتے ہوں لیکن تنقیدی نقطۂ نظر سے کوئی شعر قابل توجہ تبھی ٹھہرے گا کہ اس میں شاعر کے جس نجی تجربے کا اظہار ہے وہ ارتقائی عمل سے گزر کر جمالیاتی تجربے میں تبدیل ہو گیا ہو۔

صفحہ ۱۷۱ پر غالب کے ایک فارسی قطعے کا ذکر آیا ہے۔ "یادگار غالب" کے حوالے سے اس کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "غالب نے کسی امیر کو قصیدہ بھیجا تھا۔ جس کا مدت تک کوئی جواب نہیں ملا، یہ قطعہ اس کی یاد دہانی کے طور پر لکھا گیا تھا" اب یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ یہ امیر، نواب وزیر الدولہ والیِ ٹونک تھے۔

صفحہ ۳۲۲ پر غالب کا ایک شعر اس طرح نظر پڑا:

لیتا ہوں حکمتِ غم دل سے سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

متداول دیوانوں میں مصرعۂ اول اس طرح ملتا ہے:

لیتا ہوں مکتبِ غم دل میں سبق ہنوز

کتاب غالب اکیڈمی (بستی نظام الدین، نئی دہلی) نے سلیقے سے شائع کی ہے۔ اور گرانی کے اس دور میں، اچھے ڈمائی سائز میں چھپی ہوئی ۴۸۰ صفحے کی کتاب کی قیمت سولہ روپے بالکل واجبی ہے۔

——— مخمور سعیدی

کتاب (الوداعی شمارہ)

مرتب: عابد سہیل، قیمت: چھ روپے، پتہ: بلفرت پبلشرز، کپور مارکیٹ، لکھنؤ

کتاب کے عام شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بہت دیدہ زیب ہے۔ کتاب ایک صاف ستھرا ادبی پرچہ رہا ہے اس لیے یہ اعلان پڑھ کر انتہائی قلق ہوا۔ کہ اب یہ رسالہ بند ہو جائے گا۔ اتر پردیش اردو اکادمی سے ہم پرزور سفارش کریں گے کہ وہ اس رسالہ کی مدد کو آگے بڑھے اور اسے بند ہونے سے بچائے۔ رسالے کے منتظمین کا یہ اعلان بھی اہم ہے کہ جن خریداروں کی رقوم باقی ہیں وہ انھیں لوٹا دی جائیں گی۔ اس

قسم کی خوش معاملگی کا ثبوت ادبی رسالے عام طور پر نہیں دیتے

اس شمارے میں اس سیمینار کی رپورٹ بھی درج ہے جو ترقی پسندوں نے "عصری آگہی" کے عنوان پر کیا تھا۔ اور اس سیمینار میں پڑھے جانے والے کچھ مقالے بھی "گوشۂ سجاد ظہیر" کے تحت بھی سجاد ظہیر مرحوم پر مضامین ہیں اور کچھ منظومات:

سیمینار کے مقالے اور اس کی رپورٹ پڑھ کر کسی قدر تعجب ہوا۔ یہ سب مقالے ایسے لوگوں نے لکھے ہیں جو مشہور ناقد ہیں اور ان میں سے کچھ پروفیسر بھی ہیں۔ لیکن مقالوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آگہی نام کی کوئی چیز مقالہ نگاروں کی دسترس میں نہیں سبھی مقالوں کا لب لباب یہ ہے کہ عصری آگہی تک رسائی ہوتے ہی آدمی اچھا ادیب یا شاعر بن سکتا ہے۔ لیکن محمد اعظم ہاشمی نے "گوشۂ سجاد ظہیر" میں "لندن کی ایک رات" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ کوئی معرکہ آرا تخلیقی کارنامہ نہیں ہے" اور یہ کہ اگر سجاد ظہیر کا دامن سیاست نے اپنی طرف نہ کھینچا ہوتا اور وہ انہماک اور اطمینان کے ساتھ ناول نگاری کی طرف متوجہ رہے ہوتے تو موجودہ دور کے سب سے اہم ناول نگار ہوتے"

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ اگر فلاں شخص بری صحبت میں پڑ کر آوارہ نہ ہو گیا ہوتا تو ایک شریف اور معزز شخص بن سکتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کمیونسٹ سیاست کی طرف سجاد ظہیر کو کس نے راغب کیا۔ ظاہر ہے کہ اسی چیز نے جسے اردو کے ناقد اور پروفیسر عصری آگہی کا نام دیتے ہیں۔ اور جس پر ایمان لانے کے بعد آدمی ادب کی بجائے کمیونسٹ تحریک کی کامیابی ہی کو اصل چیز مان لیتا ہے۔

کمال یہ ہے کہ عصری آگہی کی دہائی دینے کے باوجود حضرات نے یہ نہیں بتایا کہ اس سے ان کی حقیقی مراد کیا ہے؟ اپنے ماحول سے بیگانہ محض تو کوئی کبھی نہیں ہوتا اور ادیب اور شاعر چونکہ تھوڑے بہت پڑھے لکھے بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی بساط کے مطابق اس عصر کے تقاضوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن عصری آگہی سبھی طبائع پر یکساں اثر نہیں ڈالتی۔ یا گر عصری آگہی سے کمیونزم کا عرفان بھی مراد لے لیا جائے تو بھی نہیں۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ عصری آگہی ایک ادیب اور شاعر کو تو پہلا

آئی کا مزید بنا دے، دوسرے کو سی۔ پی۔ آئی ایم کا اور تیسرے کو نکسل واد کا۔ عصری آگہی صرف ادیبوں ہی کو مختلف راہوں پر نہیں ڈالتی۔ مارکس اور لینن کے تابعین کو بھی یہ متعدد راہوں پر لے جاتی ہے۔ خروشچیف، ماؤ اور دیجیک تینوں ہی اشتراکیت کی جملہ باریکیوں سے واقف تھے لیکن اس واقفیت نے انھیں ایک دوسرے کا حریف بنا ڈالا۔ اشتراکیت کا عرفان جب اس کے اتنے بڑے ماہرین کو کسی ایک نقطے پر متحد نہ کرسکا تو بے چارے ترقی پسند ادیب اور شاعر جن کی اشتراکیت سے واقفیت برائے نام ہی ہے، اس سے کیا وہ تنائی حاصل کرسکتے ہیں۔

اور ہاں یہ مصرعہ:

سلام اے تاجدارِ جرمنی اے ہٹلرِ اعظم

کسی رجعت پسند شاعر کا نہیں بلکہ ایک ایسے شاعر کا ہے جو عصری آگہی ہی نہیں بلکہ جملہ اسرارِ کائنات تک رسائی کا مدعی ہے۔

گوپال متل

انجمن —

اردو میں سوانحی ادب کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ ابتدائی زمانے میں اردو شاعروں کے جو تذکرے لکھے گئے وہ زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں۔ سر سید کے زمانے تک آکر بعض اہل قلم نے اس تشنہ گوشے کی طرف خصوصیت سے توجہ کی۔ خود سر سید کی مشہور کتاب "آثار الصنادید" کے علاوہ جس کا ایک حصہ سوانحی مضامین پر مشتمل ہے، حالی اور شبلی نے سیر و سوانح پر مبنی پوری پوری کتابیں لکھیں۔ مختصر سوانحی خاکوں کی پیش رو اردو میں یہی کتابیں ہیں۔

"انجمن" حسن الدین احمد صاحب کے لکھے ہوئے سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن شخصیتوں پر یہ مضامین ہیں ان میں چند کو چھوڑ کر زیادہ تر ریاست حیدرآباد کی علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی کی نمائندہ شخصیتیں ہیں یا وہ شخصیتیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے حیدرآباد سے متعلق رہی ہیں۔ اس لیے ان مضامین کی ایک ضمنی خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے مطالعے سے ان شخصیتوں کے علاوہ جن پر یہ مضامین ہیں ہمارا تعارف اس معاشرے سے بھی ہوتا ہے جسے ہم میں سے بہت سے لوگ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے۔ لیکن جو ایک مدت تک پوری شان و شوکت کے ساتھ موجود رہا ہے۔ مصنف کی نظر میں اس معاشرے کی خوبیاں ایسی تھیں جو آج بھی میں حسن اور معنویت پیدا کرسکتی ہیں۔ اور غالباً یہی وہ احساس ہے جس نے ان سے یہ مضامین لکھوائے ہیں۔ یہ بات وہ صاف لفظوں میں براہ راست نہیں بلکہ اپنے مخصوص پیرایۂ بیان کے وسیلے سے کہتے ہیں تاکہ یہ پڑھنے والے پر غیر محسوس طور پر اثر انداز ہو۔

حسن الدین احمد صاحب علمی شغف رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک عملی آدمی بھی ہیں۔ چنانچہ ان مضامین میں بھی انھوں نے متعلقہ شخصیتوں کے عملی کارناموں کے تعارف پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کی افادیت ظاہر ہے۔ لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ شخصیتوں کے خدوخال نمایاں ہونے سے رہ گئے ہیں۔ کرداری خامیوں سے حسن الدین احمد صاحب بالخصوص صرف نظر کرتے ہیں اور اگر کہیں ان کا ذکر کرنا ناگزیر ہو جائے تو ان کی کوئی نہ کوئی تاویل اس طرح پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ قابلِ جواز نظر آنے لگیں۔ ڈپٹی نذیر احمد بڑے مصلحت اندیش اور دنیادار آدمی تھے۔ اور اپنی تصنیفات میں بھی یہی کچھ نظر آتے ہیں۔ وہ کچھ برس حیدرآباد میں بھی رہے۔ حسن الدین صاحب نے ان پر مضمون لکھتے ہوئے ان کے حیدرآباد کے زمانۂ قیام کے کچھ واقعات کے بیان پر ہی اکتفا کیا ہے۔ لیکن یہ واقعات بھی ان کی زمانہ سازی کو سامنے لانے کے لیے کافی ہیں۔ حسن الدین احمد صاحب ان واقعات کو جھٹلاتے نہیں، لیکن انھیں بیان کرتے ہوئے ان کا انداز کچھ معذرت آمیز سا ہو گیا ہے۔

حضرت امیر خسرو پر مضمون بہت دلچسپ ہے اور خیال انگیز بھی۔ جس کا عنوان حسن الدین احمد صاحب نے "انوکھا درباری" قرار دیا ہے۔ امیر خسرو ایک صوفی صافی ہونے کے باوجود کئی شاہی درباروں سے وابستہ رہے۔ اس کا سبب ان کا خاندانی پس منظر بھی تھا۔ لیکن حسن الدین احمد صاحب نے ایک اور ہی نکتے پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"امیر خسرو کی اختیار کی ہوئی راہیں دانشوروں کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہیں۔ دانشوروں کو آج بھی ماحول، حالات اور سیاست سے آئے دن سابقہ رہتا ہے۔ امیر خسرو نے جس رویے کی نشاندہی کی ہے اس کو سمجھ کر دانشور ایسے سمجھوتے کرسکتے ہیں جو نامساعد حالات میں جینے، پنپنے اور خدمت کرنے کا موقع دیں اور ایسے طریقے اختیار کرسکتے ہیں جن سے بحیثیت مجموعی ان کے مقاصد کی تکمیل اور اعلیٰ اقدار کی جیت ہو۔"

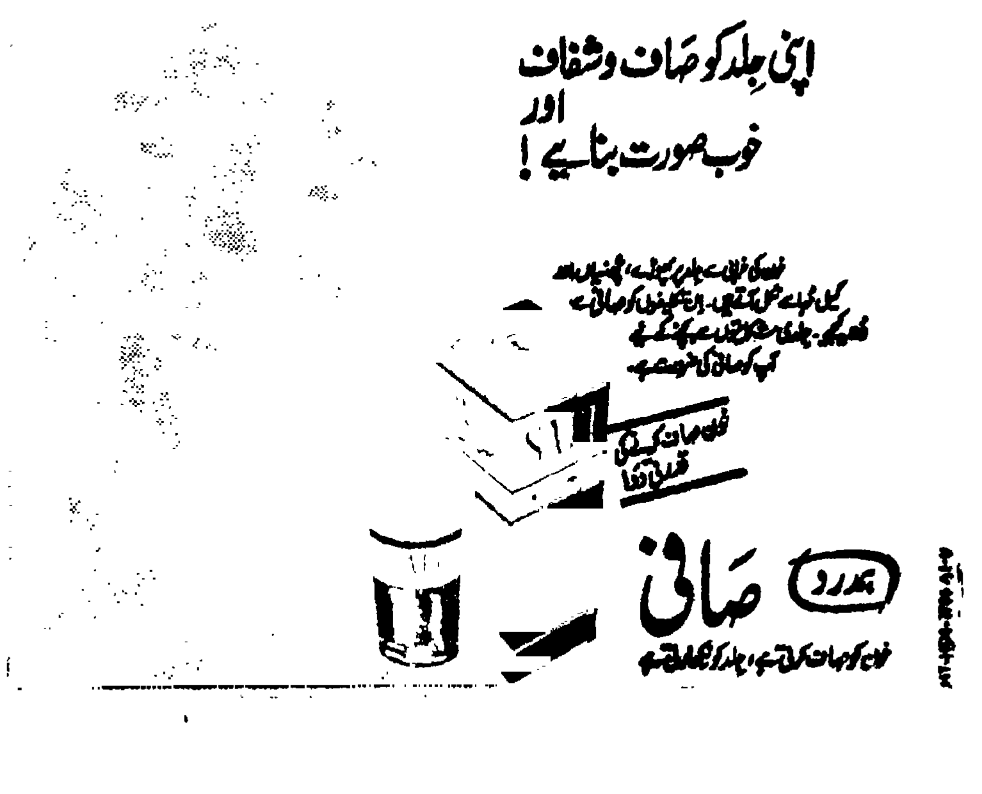
حسن الدین احمد صاحب نے صرف ممتاز اور سربرآوردہ لوگوں ہی کو اس کا مستحق نہیں سمجھا کہ ان سے اپنے پڑھنے والوں کو روشناس کرائیں بلکہ انھوں نے کئی ایسے لوگوں پر بھی قلم اٹھایا ہے جنھیں عرف عام میں معمولی لوگ کہا جاتا ہے۔ یہاں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں اور پڑھنے والا ایک پر دوسرے کو مکمل فوقیت دینے پر خود کو تیار نہیں پاتا کیسی تے تھے ہیں جو فضیلتیں آئی ہیں تو کسی کو کچھ دوسری خوبیاں ملی ہیں جو کم پرکشش نہیں۔ اس طرح ان مضامین کے مطالعے سے یہ اخلاقی نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شخصیتوں کے وزن و وقار کا اندازہ ان کے سماجی مرتبے کے پیش نظر نہیں ان کی شخصی خوبیوں کی بنا پر کیا جانا چاہئے

سرورق ان حضرات کی تصویروں سے مزین ہے جن پر یہ مضامین لکھے گئے ہیں۔ یہ تصویریں انگریزی حرف "S" کی شکل میں ترتیب دی گئی ہیں۔ ایک ملاقات میں حسن الدین صاحب نے اس کی وضاحت کی کہ یہ وقت کے ایک معین وقفے کی علامت 'S' کے دو نقطۂ صرف اگر پھیلا دئے جائیں تو اوپری سرا وہ گزرا ہوا زمانہ ہوا جو اس کتاب کے دائرے سے باہر ہے اور نچلا سرا وہ زمانہ جو آنے والا ہے۔

افسوس ہے کہ کتابت و طباعت کی عمدگی کی طرف پبلشر نے دھیان نہیں دیا۔ کتابت کی غلطیاں بکثرت راہ پا گئی ہیں اور قاری کو بے لطف کرتی ہیں۔ کتاب کی قیمت پندرہ روپے ہے اور ملنے کا پتہ ہے:

ولا اکیڈیمی، عزیز باغ، سلطان پورہ، حیدرآباد ۲

محمود سعیدی







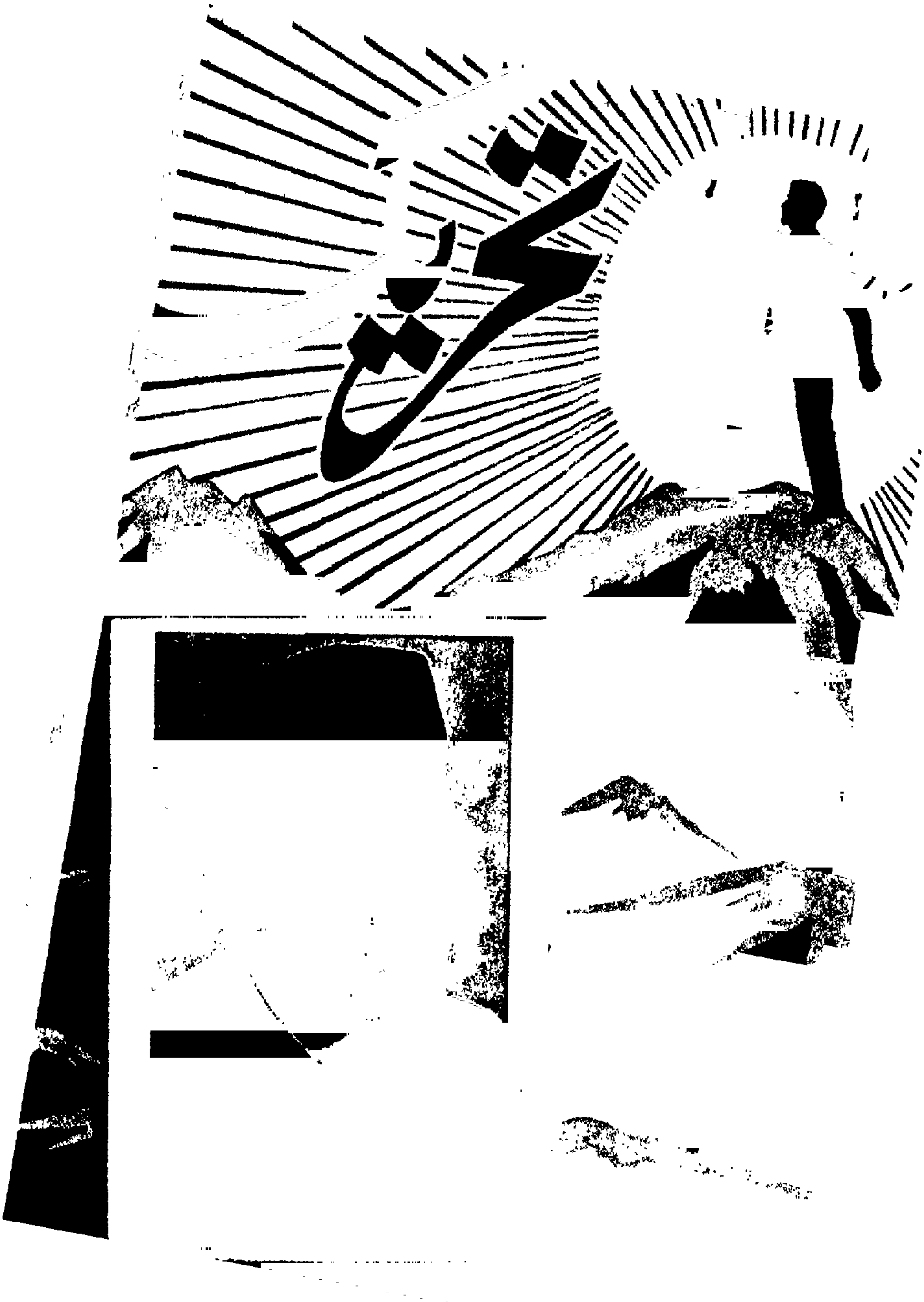
مسز میریینا سخاروف بڑے فخر کے ساتھ نوبل امن انعام کی نمائش کر رہی ہیں جو انھوں نے اوسلو میں اپنے شوہر کی طرف سے وصول کیا۔ تصویر میں دوسری خاتون مسز آسے لیونزٹر ہیں جو نوبل امن انعام کمیٹی کی صدر ہیں۔

Regd. No. D. (D) 118 Phone 271649 SEPTEMBER 1975

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 646/57

TAHREEK

ناشر مطبوعہ فائن آرٹ پریس جامع مسجد دہلی


حرية

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

دہلی

شمارہ : ۷ جلد : ۲۲

اکتوبر ۱۹۷۵ء

ادارۂ تحریر :

گوپال متل

مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : دس روپے، فی کاپی : ایک روپیہ

غیر ممالک سے

سالانہ : تیس شلنگ ، فی کاپی : تین شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

۹۔ انصاری مارکیٹ ، دریا گنج ، دہلی ۶۰

قیمت : ۱/-

پرنٹر پبلشر اور پروپرائٹر ... ... گوپال متل

مطبع ... ... نعمانی پریس دہلی

مقام اشاعت ... ... ۹۔ انصاری مارکیٹ

دریا گنج دہلی ۶

سرورق کی تصویر

کنور یٰسین علی خاں شہاب برنی مرحوم

تحریک بسمل سعیدی نمبر

اپنے قابلِ احترام فن کاروں کی قدر ناشناسی، ہم اردو والوں کا شیوہ رہا ہے۔ حضرت بسمل سعیدی کے مرتبے کا بھی اعتراف کما حقہٗ آج تک نہیں کیا گیا ــــ اس میں خود ان کی خو سے بے نیازی کو بھی دخل رہا۔ وہ ادبی سیاست سے دور، اپنے شعری اور ادبی مشاغل میں منہمک رہے اور شہرت طلبی کو انھوں نے اپنا شعار نہیں بنایا۔

اب کہ بسمل صاحب عمر کی ۸۵ ویں منزل میں ہیں۔ ادارۂ "تحریک" نے طے کیا ہے کہ ان کی بے لوث شعری اور ادبی خدمات کے اعتراف میں "تحریک" کا ایک خاص نمبر شائع کیا جائے۔

اس نمبر میں بسمل صاحب کی شخصیت اور شاعری پر مستند نقادوں کے مضامین شامل ہوں گے اور نامور شعرا اپنے منظوم تاثرات پیش کریں گے۔

بسمل صاحب کے کلام کا ایک جامع انتخاب اور ملک کی ممتاز شخصیتوں کے پیغامات بھی اس نمبر میں شامل ہوں گے۔

بسمل سعیدی نمبر کی قیمت پانچ روپے ہوگی لیکن "تحریک" کے سالانہ خریداروں کو یہ بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

اس گراں قدر نمبر کو بلا قیمت حاصل کرنے کے لیے آج ہی "تحریک" کی سالانہ خریداری قبول کیجیے۔

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈروں سے جلد مطلع کریں۔ کوئی اطلاع نہ ملنے کی صورت میں انھیں اتنی ہی کاپیاں ارسال کی جائیں گی جتنی عام شماروں کی کی جاتی ہیں۔

جو حضرات یہ نمبر رجسٹری سے منگانا چاہیں، رجسٹری خرچ کے لیے دو روپے ارسال کریں، یا اسی رقم کی وی پی بھیجنے کو لکھیں ــــ ڈاک میں گم ہو جانے پر یہ نمبر دوبارہ نہیں بھیجا جا سکے گا۔

ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی

گوپال مِتّل

باتیں

اگست کے آخری ہفتے میں کمیونسٹوں اور ان کے ہمسفر ترقی پسندوں نے ڈاکٹر رشید جہاں کی ۷۰ ویں سالگرہ منائی۔ یہ تقریب ماسکو میں بھی منائی گئی۔ اس تقریب میں تقریر کرتے ہوئے سوویٹ انڈین سوسائٹی فار کلچرل ریلیشنز کے نائب صدر پروفیسر چیلی شیف نے "انگارے" کا موازنہ ڈاکٹر ٹیگور کی "گورا" منشی پریم چند کی "گئودان" اور میتھلی شرن گپت کی تصنیف "بھارت بھارتی" سے کیا۔

پروفیسر چیلی شیف کی تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح "گورا" ڈاکٹر ٹیگور "گئودان" منشی پریم چند اور "بھارت بھارتی" میتھلی شرن گپت کی تصانیف ہیں۔ اسی طرح "انگارے" بھی رشید جہاں کی تصنیف ہے لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں "انگارے" مختلف افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مجموعہ تھا جسے رشید جہاں نے سجاد ظہیر کے ساتھ مل کر مرتب کیا تھا۔ اس میں دس افسانے تھے پانچ سجاد ظہیر کے، دو احمد علی کے، دو رشید جہاں کے اور ایک محمود الظفر کا۔

"انگارے" کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں بھی ہندوستانی ترقی پسندوں کو اس قسم کے دعاوی کرنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی جس قسم کا دعویٰ پروفیسر چیلی شیف نے کیا ہے۔ مثال کے طور پر ۲۴ اگست کو ایوان غالب میں جو جلسہ ہوا اس میں مقررین نے زیادہ زور رشید جہاں کی سامراج دشمنی اور کمیونزم کی حمایت پر ہی دیا۔ سوہن سنگھ جوش نے یاد دلایا کہ ۱۹۳۶ء میں جب انھوں نے کمیونسٹ امیدوار کی حیثیت سے پنجاب اسمبلی کا چناؤ لڑا تھا تو رشید جہاں نے انھیں لال جھنڈا سا کر دیا تھا۔ آنند نرائن ملا نے بھی یہی کہا کہ "ادب ہو یا سیاست ہر میدان میں ان کا سارا وقت انسانیت کی خدمت میں گزرتا تھا۔"

ادبی ناقد اس وقت تک "انگارے" کو ایک ساقط المعیار کتاب ہی قرار دیتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر خلیل الرحمٰن اعظمی اپنی کتاب "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" میں لکھتے ہیں: "ان افسانوں میں جوانی کا جوش اور ہر چیز کو تہس نہس کر دینے کا جذبہ ہے اور یہ جذبہ کبھی کبھی اعتدال سے اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ ان کے مکالموں اور فقروں میں ابتذال اور عامیانہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔" (صفحہ ۲۱۰)

اس مجموعے کے ایک افسانے "دلی کی سیر" پر اظہار خیال کرتے ہوئے جو رشید جہاں کا لکھا ہوا ہے، اعظمی صاحب نے اسے "ایک مضمون نما کہانی" کا نام دیا ہے (صفحہ ۲۱۱)

ایسی ساقط المعیار کتاب کا ٹیگور، پریم چند اور میتھلی شرن گپت کی اعلیٰ ترین تصانیف سے موازنہ کرنا یا تو پروفیسر چیلی شیف کی بے خبری اور تنقیدی بے بصیرتی کا نتیجہ ہے یا پھر پروپیگنڈے کا وہ مخصوص انداز جو سچ اور جھوٹ میں امتیاز کا قائل نہیں۔

ماہنامہ "صبح ادب" لکھنؤ نے کمار پاشی کے اس بیان کے بارے میں جس پر اس جریدے کے صفحات میں کافی گرم بحث ہوتی رہی ہے، بحث بند کر دینے کا اعلان کیا ہے لیکن اس اعلان میں یہ فقرہ بھی موجود ہے: "خود گوپال متل صاحب نے بھی سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بجائے اس کے کہ اپنی دیرینہ اردو دوستی کی روشنی میں کمار پاشی سے سوال کرتے کہ انھوں نے ایسا کیوں کہا، الٹے سردار جعفری کا شجرہ بیان کرنا شروع کر دیا۔"

سوال یہ ہے کہ جب سردار جعفری کمار پاشی کی اردو دوستی کو معرض بحث میں لا سکتے ہیں تو اردو کے بارے میں خود ان کے رویے کو کیوں معرض بحث میں نہ لایا جائے؟ جو شخص دوسروں کی آنکھ میں تنکے تلاش کرتا ہے اس کی آنکھ کے شہتیر کی طرف اشارہ کر دیا جائے تو اس

کیا برائی ہے؟

کمار پاشی اور سردار جعفری کے درمیان ایک فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ کمار پاشی ایک شاعر ہے۔ اس نے دانشوری کا دعویٰ کبھی نہیں کیا اور سیاست سے تو اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ایسا آدمی جذباتی رو میں ایسی غیر محتاط بات کہہ سکتا ہے جو اس کے مستقل رویّے سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ پھر ایسے معاملوں میں ترسیل کا المیہ بھی پیش آسکتا ہے۔ کمار پاشی کا کہنا ہے کہ جب انھوں نے اردو کو ایک مردہ زبان کہا تھا تو یہ بات انھوں نے اردو کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے دکھ کے ساتھ کہی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی بات پوری وضاحت سے نامہ نگار کو نہ سمجھا سکے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ نامہ نگار نے ان کی بات کو دہراتے وقت نادانستہ طور پر اس کے سیاق و سباق میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دی ہو۔

ایسا ہو سکتا ہے، اس کا حال ہی میں مجھے ذاتی تجربہ ہوا۔ "آجکل" کے ہندوستانی مسلمان نمبر کے صفحہ ۲۷ پر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ایک تقریر کا اقتباس شائع ہوا ہے جو انھوں نے ۲۴ فروری ۱۹۵۹ء کو اسلامیہ کالج لاہور میں کی تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی کہا کہ "گوپال متل جو اردو کے زبردست حامی ہیں، لکھتے ہیں کہ اردو بھارت میں آئندہ ۲۵ برس میں ختم ہو جائے گی۔" مولوی عبدالحق میرے انتہائی واجب الاحترام دوست تھے۔ میرے متعلق ان کے رویّے کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ انھوں نے مجھے اردو کا زبردست حامی کہا ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ جو قول انھوں نے مجھ سے منسوب کیا ہے وہ میرے پورے مفہوم کو ادا نہیں کرتا۔ جیسا کہ "تحریک" کے قارئین بخوبی واقف ہیں میں ہمیشہ یہ کہتا رہا ہوں کہ اگر اردو والوں نے اپنی زبان کی بقا کے لیے سرگرم کوشش نہیں کی تو یہ زبان مٹ جائے گی۔ مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں میری نصف بات دہرائی اور ظاہر ہے یہاں سے نادانستگی میں ہوا۔

علی سردار جعفری اور ترقی پسند طائفے کے دوسرے اراکین کا معاملہ یہ نہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں ہم نے ڈاکٹر دھرم ویر کے مضمون کا جو اقتباس پیش کیا تھا اس میں انھوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں الہ آباد میں ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں علی سردار جعفری نے کھلے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے ساتھ بمبئی سے اردو کے مشہور اور مستند ادیبوں کا ایک خط لے کر آئے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ہندی والے اردو کے نئے اور پرانے ادب کے وسیع حصّوں کو دیوناگری میں منتقل کریں تو اردو والے اپنا یہ مطالبہ واپس لینے کو تیار ہیں کہ اردو کو اس کے رسم الخط کے ساتھ باقی رکھا جائے۔ دھرم ویر بھارتی کے اس بیان کی تردید کرنے کی ہمت اس وقت تک نہ تو علی سردار جعفری کو ہوئی ہے نہ دوسرے کسی ترقی پسند کو۔

اردو کے نامور ادیب ہم سے ذاتی طور پر یہ کہہ چکے ہیں کہ بمبئی کے ترقی پسند گروپ نے ہندی والوں کے ساتھ یہ معاہدہ واقعی کیا تھا۔

۸ جنوری ۱۹۷۰ء کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک سیمینار ہوا تھا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے رضیہ سجاد ظہیر نے اردو والوں پر جارحانہ عقیدہ پرستی کا الزام لگاتے ہوئے ان سے پوچھا تھا کہ وہ اردو کے لیے دیوناگری لپی اختیار کرنے سے کیوں خائف ہیں؟ انھوں نے یوپی میں اردو کو علاقائی زبان کا درجہ دینے کے مطالبہ کی بھی مخالفت کی تھی۔

جو حوالے ہم نے پیش کیے ہیں ان کی کوئی دوسری تاویل ممکن نہیں ان کی موجودگی میں ترقی پسندوں کو یہ کس طرح زیب دیتا ہے کہ وہ اردو کے غالی حمایتی بن کر سامنے آئیں اور ان کی یہ روش "بیچ ادب" کی نظر میں قابلِ گرفت ٹھہرے، یہ بھی ایک عجیب سی بات ہے

"ہماری زبان" میں "خطوطِ غالب" کے تازہ ایڈیشن کا جو اشتہار شائع ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اب اس پر مرتب کی حیثیت سے مولوی مہیش پرشاد کا نام ہی ہوگا۔

امید ہے کہ اس ایڈیشن میں یہ اعتراف بھی کر لیا جائے گا کہ غالب کے جو نئے خطوط اس مجموعے میں شامل کیے گئے ہیں وہ مالک رام کی عنایت نہیں بلکہ یہ آفاق حسین صاحب کی کتاب "نادراتِ غالب" سے لیے گئے ہیں۔

کرشن موہن

موہ مایا کی تصویر ہے تو　　جس لیے اتنی دلگیر ہے تو
اے مری سعی و جہدِ مسلسل　　آرزوؤں کی زنجیر ہے تو
سامنا ہے مجھے جس کا پیہم　　فکرِ فردا وہ شمشیر ہے تو
منزلِ نصرت و کامیابی　　اہلِ ارماں کی تدبیر ہے تو
اے معیشت کی سنگیں کشاکش　　اہلِ حرماں کی تقدیر ہے تو
من کے مچلے ہوئے چھل کپٹ کی　　خوبصورت سی تقریر ہے تو
چنچل احساس، میری امر آس　　میرے شعروں کی تفسیر ہے تو
عظمت و شہرت جاودانی　　میرے خوابوں کی تعبیر ہے تو
اے مرے شعر پُر سوز و دلدوز　　میرے جذبوں کی تشہیر ہے تو
شاعری تیری خاطر لیا جوگ　　میں ہوں رانجھا، مری ہیر ہے تو
کھیل سمجھا تھا میں، کیا خبر تھی　　عاشقی، اتنی گمبھیر ہے تو
اے بشر اپنے وہمِ انا کا!　　ایک ادنیٰ سا نخچیر ہے تو
بھر سکے گا کہاں زخم تیرا　　طعن و تشنیع کا تیر ہے تو
مجھ سے کیا جرم سرزد ہوا ہے　　زندگی جس کی تعزیر ہے تو
کیا ہے تو حسرت آبادِ عالم　　کس خرابی کی تعمیر ہے تو
نوچتے جا مجھے پیار کی سوچ　　میری ناکردہ تقصیر ہے تو
کہتے ہیں منہ پہ اہلِ خوشامد　　ثانیِ غالب و میر ہے تو

تیرا کیا نقش ہو کرشن موہن
بہتے پانی کی تحریر ہے تو

باقی

متّل صاحب کی نذر

عجب عجب سا لکھا تھا زیاں تمھارے لیے
ذرا سی بات بنی امتحاں تمھارے لیے!!

تمھارے سر میں وہ سودا کہ خود سفر انگیز
کہیں نہ تھی کوئی جائے اماں تمھارے لیے

تمھیں جنوں تھا کہ دیکھو سراب کیا شے ہے
کہیں تھا منتظر آبِ رواں تمھارے لیے

تمھیں نے پڑھ لیا تحریرِ آشنا تھے تم
کچھ اور تھا پسِ لفظ و بیاں تمھارے لیے

ورق ورق تھا تمھارے لیے کتاب کتاب
کہ حرف حرف تھا اک داستاں تمھارے لیے

تمھیں نے قتل کیا آفتابِ کاذب کو
حسیں ہے شام تو شب ہے جواں تمھارے لیے

ذرا بھی کم نہ ہوا عشق سبز متّی سے
تمام سرخ ہوا آسماں تمھارے لیے

(گوپال متّل کی ۷۰ ویں سالگرہ پر دلی رائٹرز ایسوسی ایشن کی طرف سے منعقدہ جلسے میں پڑھی گئی۔)

رشید امجد

سناٹا بولتا ہے

ہم سب زمانے کے کاغذ پر دم توڑتے ہوئے وہ حرف ہیں جنھیں بے معنویت کی دیمک چاٹ گئی ہے

وہ ان دم توڑتے ہوئے حرفوں میں ایک ایسا کردار ہے جس کا کوئی نام نہیں، ایک زمانے میں اس کا ایک نام تھا، لیکن مسلسل بولے جانے کے بعد اب اسے اپنے نام کے حرفوں میں کوئی دلکشی نظر نہیں آتی۔ اس لیے اس نے اپنے نام کے حروف اپنی پیشانی سے کھرچ ڈالے ہیں، اور اپنا نام وہ رکھ لیا ہے۔ ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد وہ اسے بھی مٹا دے اور اپنا نام زیرو رکھ لے لیکن یہ تو بعد کی بات ہے۔ فی الحال اس کا نام وہ ہے

وہ کے صبح و شام معمول کے غلاف میں اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ ان کی پہچان باقی نہیں۔ اس لیے اگر کبھی صبح شام کو اور شام صبح کے وقت بھی طلوع ہو جائے تو اسے خبر نہیں ہوتی۔ اس کی ہر سوچ گھڑی کے ڈائل میں بند ہے اور سانسیں سوئیوں کی ٹک ٹک میں پروئی ہوئی ہیں وہ ان کے بستر پر پڑا ہوا ایسا مریض ہے جس کی بیماری اور معمولات کا چارٹ اس کے سرہانے لٹک رہا ہے۔ اس کی صبح سات بج کر پندرہ منٹ پر شروع ہوتی ہے جب وہ نوکر کے تیسری بار ہلانے پر آنکھیں کھولتا ہے اور اپنے آپ کو اسی زنگ آلود چھت کے نیچے ان ہی پرانی دیواروں میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ یہی سوچ کر سوتا ہے کہ صبح جب سو کر اٹھے گا تو اس کی آنکھ کسی اور کمرے میں کھلے گی۔ لیکن ہر صبح وہ اسی پلنگ پر ہوتا ہے جس کا ایک پایہ اپنی جگہ سے ہلا ہوا ہے۔ اسے کبھی کبھی اس پائے پر رشک آتا ہے کہ اس کمرے میں جہاں ہر چیز اپنی مقررہ جگہ میں قید ہے، کم از کم ایک پایا تو ایسا ہے جو اپنی جگہ سے ہلا ہوا ہے۔ اور جب بھی کوئی اس پلنگ پر بیٹھنے لگتا ہے یہ پایا اپنی حرکت سے اپنے الگ ہونے کا احساس دلا دیتا ہے۔ اس نے کئی بار کوشش کی تھی کہ وہ اس پائے کی طرح اپنے علیحدہ ہونے کا احساس دلائے اور کسی طرح اس کمرے کی فضا پر جم کر بیٹھی ہوئی یکسانیت کو جھنجھوڑ ڈالے۔ اس نے کئی بار کمرے میں رکھی چیزوں کی ترتیب بدلی تھی۔ لیکن اس کی بیوی انھیں پھر پرانی ترتیب میں لے آتی۔ عرصہ تک میاں بیوی کے درمیان یہ خاموش کھیل جاری رہا۔ وہ صبح اٹھتے ہی چیزوں کی جگہیں بدل دیتا، لیکن جب دفتر سے لوٹتا تو ہر چیز واپس اپنی جگہ چلی گئی ہوتی۔ اور کمرہ پھر اسی مانوسیت اور یکسانیت کے پنجے میں پھڑپھڑا رہا ہوتا۔ ایک طویل عرصہ تک اس کے اور بیوی کے درمیان یہ خاموش جنگ جاری رہی پھر ایک صبح یوں ہوا کہ جب نوکر نے تیسری بار اسے ہلایا تو اس نے خاموش تھکی ہوئی نظروں سے چیزوں کو دیکھا اور چپ چاپ باتھ روم چلا گیا۔ اس دن جب وہ دفتر سے لوٹا تو اس کی بیوی بہت خوش تھی۔ اتنی خوش تھی، اتنی خوش کہ اسے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ اس کے خاوند نے اپنی پیشانی سے اپنے نام کے حروف کھرچ لیے ہیں۔ اور اپنا نام وہ رکھ لیا ہے۔

اس دن کے بعد اس نے کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا اور کمرہ ہی کیا، دوسری چیزوں کے بارے میں بھی ان کی مقررہ جگہ پر سے سمجھوتہ کر لیا۔ اب اس نے دفتر میں کوئی غلط فیصلہ دینے پر اپنے بڑے افسر سے جھگڑنا چھوڑ دیا ہے۔ دوستوں سے غلط باتیں سن کر انھیں ٹوکنا ترک کر دیا ہے۔ کتابوں میں بے علمی کی باتیں پڑھ کر ان کے مصنفوں کو خط لکھنا بند کر دیا ہے اب وہ نہ تو بیوی کو رنگوں کے بھونڈے چناؤ پر کچھ کہتا ہے، اور نہ سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کی بری حرکات اسے بری لگتی ہیں اس کے آس پاس کچھ ہی ہو جائے اس کے بدن کی دیواروں پر ذرا سا ارتعاش بھی نہیں ہوتا۔ اب وہ سارا اخبار مزے سے لے کر پڑھ جاتا ہے۔ سب سے ملتا ہے، سب کی سنتا ہے۔ بات

بات پر قہقہے لگاتا ہے۔ کیوں کہ اب وہ ـــــ وہ ہے، صرف وہ، جس نے اپنے نام کے حروف اپنی پیشانی سے کھرچ ڈالے تھے

معمول کے دائرے میں گھومتے ہوئے ابتدا میں اسے کبھی کبھی بڑی دقت ہوتی کیونکہ اس کی شخصیت کے بعض دندانے دار کنگرے دائرے میں گھومتے گھومتے کہیں اڑ جاتے اور وہ شخص جس کے نام کے حروف اس نے اپنی پیشانی سے کھرچ ڈالے تھے اس کے بدن کے ملبے میں کروٹیں لینے لگتا۔ غلاف میں لپٹے ہوئے صبح و شام پھڑپھڑانے لگتے۔ اور کھرچے ہوئے نام والا شخص اس کے بدن کی چار دیواری سے سر نکال کر باہر جھانکنے لگتا۔ لیکن اگلے ہی لمحہ معمول کا ریلا اسے اپنے ساتھ بہائے لیے چلا جاتا۔ اور اب اس دائرے میں مسلسل گھومتے گھومتے اس کی شخصیت کے سارے دندانے دار کنگرے بھر گئے ہیں اور وہ گریس لگے بیرنگ کی طرح بغیر آواز دیے اپنے محور پر گھومتا رہتا ہے۔

کئی دنوں سے یہ سوچ اس کے ذہن کی نالیوں میں رینگ رہی ہے کہ وہ مر چکا ہے۔ ان چلتے پھرتے سانس لیتے لوگوں میں لاش کی طرح ہے جو صبح سات بج کر پندرہ منٹ پر اپنی قبر سے نکلتا ہے اور خود کو گھڑی کی سوئیوں کے حوالے کر دیتا ہے ٹک ٹک [illegible] آ وا [illegible] ۔ اتھ جب [illegible] ٹیلیفون [illegible] تو وہ واپس اپنی قبر میں آ گرتا ہے اور [illegible] کر [illegible] لیٹ [illegible] ہے۔ اس کی بیوی کا [illegible] جب وقت اس [illegible] بچے [illegible] منہ میں دیتا ہے [illegible] اس کی زندگی میں [illegible] اس کی زندگی کے [illegible] ہیں۔ سارا دن اور ساری رات وہ سویا رہتا ہے۔ لیکن ان چند [illegible] میں وہ [illegible] ہے اور پھر اسی گہری موت ایسی نیند کی [illegible] میں [illegible] جاتا ہے اس کا یہ احساس کہ وہ مر چکا ہے اتنی شدت [illegible] زور پکڑتا ہے کہ ایک دن وہ ڈائل کے منہ [illegible] کی چار دیواری سے باہر کود جاتا ہے۔ اور فائلوں کے ڈھیر کو میز پر چھوڑ کر سڑک پر نکل آتا ہے۔ وہ دیر تک مختلف سڑکوں پر پھرتا رہتا ہے۔ پھر چائے پینے کے لیے ایک ریستوران میں داخل ہوتا ہے۔ ریستوران کی فضا میں آواز ننگی ہو کر ناچ رہی ہے اور لوگ پتھر کے ہو چکے ہیں ان کی آنکھیں گندی میزوں پر جمی ہوئی میل میں پروئی ہوئی ہیں اور کان آواز کی تال پہ تھرک رہے ہیں۔ اس کے اندر آنے پر کوئی سر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ وہ کچھ دیر دروازے میں کھڑا میزوں کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ ساری میزیں کھچا کھچ بھری ہوئی ہیں۔ ایک میز پہ دو شخص بیٹھے ہیں وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ دونوں میں سے سر اٹھا کر کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ وہ کون ہے

"یہ لوگ کون ہیں؟ اور میں کہاں آ گیا ہوں؟" ـــــ وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے۔ سب لوگ پتھر کے ہو چکے ہیں کہ ان کے چہروں پر مایوسی اور اداسی کھدی ہوئی ہے۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ سوچتا ہے ـــ کیا ان سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا؟ اور کیا اب مجھے بھی پیچھے مڑ کر دیکھنا ہوگا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا ہے کہ دروازے سے ایک ہیجڑا اندر داخل ہوتا ہے۔ اور درمیان میں پہنچ کر ناچنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جھکے ہوئے چہرے اوپر اٹھنے لگتے ہیں، اور پتھر کے دھڑ پگھلنے لگتے ہیں ہیجڑا ناچتے ناچتے کبھی کسی کے سر پر چپت رسید کرتا، کبھی کسی کے گال پر چٹکی لیتا ہے تو لوگ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگتے ہیں ہیجڑا ناچتے ناچتے باہر نکل جاتا ہے، اٹھے ہوئے سر دوبارہ ڈھلک جاتے ہیں۔ اور وجود پتھر میں ڈھلنے لگتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں بھی پیچھے مڑ کر دیکھوں، مجھے یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے، وہ سوچتا ہے اور دوڑتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔

سڑک پر ٹریفک رکی ہوئی ہے۔ سڑک میں دو ٹرک آمنے سامنے آ گئے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک بضد ہے کہ پہلے دوسرا [illegible] کرے۔ ان کے پیچھے دونوں طرف بسوں [illegible] کاروں کی لمبی قطار [illegible] بڑے اطمینان سے کھڑی ہیں۔ کچھ لوگ [illegible] میں [illegible] ہو گئے ہیں اور مزے سے دونوں ٹرک ڈرائیوروں کے مکالمے سن رہے ہیں۔ وہ قریب ہی کھڑے ہوئے ایک شخص کو ہاتھ لگاتا ہے۔ وہ شخص پتھر کا ہے۔ پھر وہ قطار میں کھڑی ایک کار کو چھوتا ہے۔ وہ بھی پتھر کی ہے ـــ وہ ایک اور شخص کو چھوتا ہے، وہ بھی پتھر کا ہے۔ ایک دو تین چار۔ سب پتھر کے ہیں۔ ان سبھوں نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا ہوگا۔ وہ سوچتا ہے اور گلی میں سے کترا کر دوسری سڑک پر جا نکلتا ہے۔ سڑک کے دوسرے کنارے ہجوم ہے۔ وہ ہجوم کے قریب جا

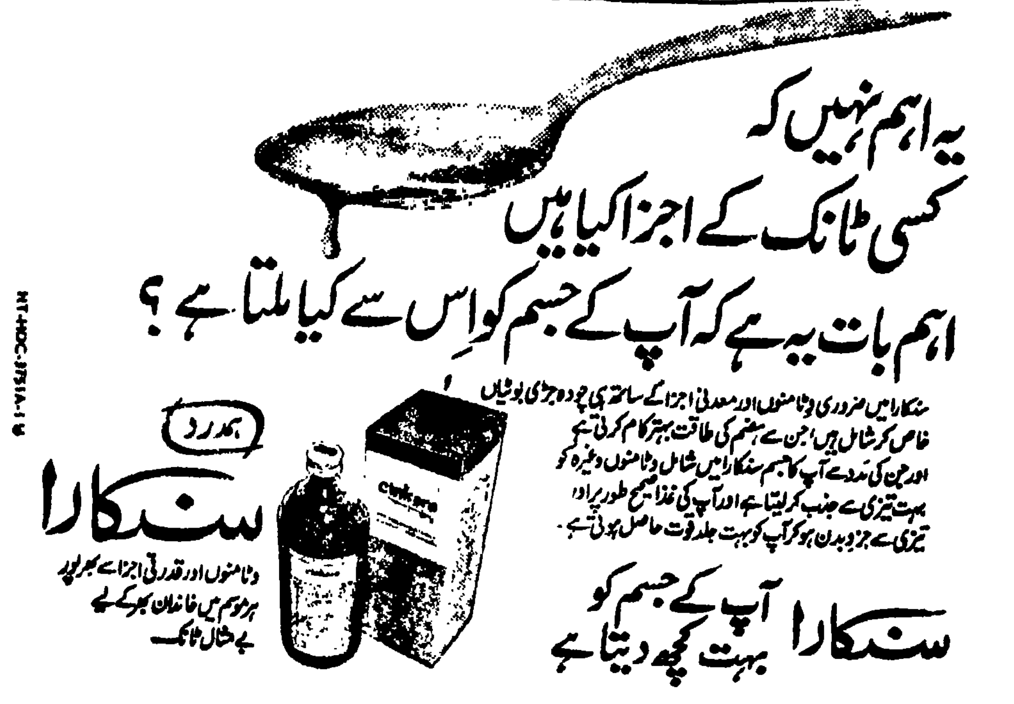
ہے۔ مداری ڈگڈگی بجا رہا ہے۔ لوگ اس کی تال پر ناچ رہے ہیں۔ "تو یہ بھی پتھر کے ہیں؟" وہ سوچتا ہے اور گلیوں میں سے ہوتا ہوا ایک اور سڑک پر آجاتا ہے۔ لیکن یہاں بھی لوگ پتھر کے ہیں وہ جس سڑک پر جاتا ہے، ہر جگہ پتھر ہی پتھر — پتھر ہی پتھر وہ دوڑ کر اپنے ڈائل پر چڑھ جاتا ہے اور پرانے ہندسوں کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ کم از کم۔ یہاں سوئیوں کی ٹک ٹک تو ہے رات کو بیوی کے پاس لیٹے ہوئے سوچ اس کے ذہن کی نالیوں سے باہر رینگنے لگتی ہے۔ ریستوران میں بیٹھے، سڑکوں پر چلتے لوگ ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے روشن دان سے اندر آنے لگتے ہیں۔ اس کے جسم کے ملبے میں مدت سے دفن کھرچے ہوئے نام والا شخص پہلو بدلتا ہے۔ لفظوں کے سوکھے چشمے ابلنے لگتے ہیں — پورے شہر میں ایک وہی تو ہے جسے اپنی بے معنویت کا احساس ہے — وہ اچھل کر اٹھ بیٹھتا ہے اس سارے شہر میں وہی تو ایک تنہا زندہ آدمی ہے۔ وہ زور دار قہقہہ لگاتا ہے۔

ہاں اس سارے شہر میں وہی تو ایک زندہ آدمی ہے جس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

وہ ہنستا چلا جاتا ہے۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اس کی بیوی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہتی ہے "کیا ہوا — کیا ہوا؟"

لیکن وہ جواب دیے بغیر بلک بلک کر روتا رہتا ہے اس رات کے بعد وہ کبھی نہیں رویا۔

لیکن یہ بات آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکی کہ اس رات وہ بلک بلک کر کس کے لیے رویا تھا۔؟



فرید احمد برکاتی

'اردو میں قصیدہ نگاری' اور 'انتخاب قصائدِ اردو'

"اردو میں قصیدہ نگاری" اور "انتخاب قصائدِ اردو" ڈاکٹر ابومحمد سحر صاحب کی اہم مؤلفات ہیں۔ یہ دونوں کتابیں موصوف کے تحقیقی مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ اوّل الذکر، اردو قصیدے کی مختصر تاریخ و تنقید ہے اور دوسری جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، نمائندہ قصائد کا انتخاب ہے جس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے حواشی بھی شامل ہیں۔ جو تقریباً انتخاب ہی کی ضخامت کے برابر ہیں۔

جن حضرات کو ان کتابوں کے مطالعے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ڈاکٹر سحر نے اپنے موضوع کے ساتھ بڑی حد تک انصاف کیا ہے۔ بالخصوص اوّل الذکر کتاب سے موضوع کی وسعت اور اس پر ان کے عبور اور احاطے کا اندازہ ہوتا ہے۔ بایں ہمہ ان گراں قدر مؤلفات میں بعض چیزیں محلِ نظر ہیں۔ ذیل میں چند باتوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔

۱۔ "اردو میں قصیدہ نگاری" کے ابتدائی باب میں ڈاکٹر سحر لکھتے ہیں: "خطابیہ قصیدے میں تشبیب اور گریز کے اجزا نہیں ہوتے بلکہ شروع ہی سے ممدوح کی تعریف کی جاتی ہے۔" [ص ۳۱] اس صفحے پر حاشیے میں یہ عبارت درج ہے: "خطابیہ قصیدے کو مجدو (کذا) اور تمہیدیہ کو مقتضب بھی کہتے ہیں — ہر قصیدہ کہ از تشبیب عاری باشد. چنانچہ از ابتدا در مدح شروع کنند آں را مجدو نامند و اگر عاری نہ باشد مقتضب گویند" (ہفت قلزم جلد ہفتم صفحہ ۳۸)۔

ہفت قلزم میں خطابیہ اور تمہیدیہ قصیدے کی یہی تعریف کی گئی ہے اور ڈاکٹر سحر نے اسے بجنسہٖ اپنے یہاں نقل کر دیا ہے۔ لیکن 'ہفت قلزم' کے اس حوالے کے سلسلے میں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔ اول تو یہ کہ لفظ مجدو (؟) کسی نہ کسی درجے میں تصحیف کا شکار ہوا ہے۔ دوم یہ کہ مجدو اور مقتضب دونوں اصطلاحیں باعتبار اطلاق غلط ہیں۔ کیونکہ یہ قریب المعنی بلکہ ہم معنی ہیں۔ اور قصیدے کی ان اقسام پر صادق نہیں آتیں جن پر ان کا اطلاق کیا گیا ہے۔ سوم یہ کہ ہفت قلزم بنیادی اعتبار سے فارسی الفاظ و اصطلاحات کی فرہنگ ہے چنانچہ خود اس فرہنگ میں لفظ مجدو اور مقتضب کے معنی نہیں ملیں گے۔

جہاں تک ان دونوں اصطلاحوں کے لیے ہفت قلزم کے ماخذ کا پتہ لگانے کا تعلق ہے یہ اہلِ تحقیق یا ڈاکٹر سحر صاحب کا کام ہے۔ لیکن ایک ذی استعداد طالب علم یا ایک ہوش مند مدرس ان تعریفات سے سرسری طور پر نہیں گذر سکتا۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا 'مجدو' یقیناً غلط ہے اور یہ غالباً 'مجدوع' یا 'مجزو' کی تصحیف ہے۔ اب اگر "مقتضب" اور "مجدوع یا مجزو" کے لغوی معنی کے پیشِ نظر ہفت قلزم کی تعریف میں ان دونوں لفظوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں ہی لفظ قریب قریب ہم معنی ہیں۔ اور ان کے معنی مقطوع کے آتے ہیں۔ اور دو مختلف چیزوں پر ہم معنی الفاظ کا اطلاق کسی تعریف میں نہیں کیا جا سکتا۔ تشبیب اور گریز کے حامل قصائد کو مشبّب اور ان سے عاری کو غیر مشبّب یا مبترا بھی کہا جاتا ہے۔ قصیدے کی ان دو مختلف اقسام کے لیے یہ اصطلاحیں معروف ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سحر نے قبول احمد مصنفِ ہفت قلزم کی تعریف کو بغیر کسی تحقیق و تفحص کے نقل کر دیا ہے۔ مجزو اور مقتضب کی اصطلاحیں عروض میں بھی مستعمل ہیں۔ اور ان کے مدلول پر غور کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اسی کتاب میں صفحہ ۵۷ پر ذوق کے علمی رجحان کی مثال میں چند اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے

ع　آخرش دیکھا تو العلم حجاب الاکبر
عاقبت پایا تو ہاں "بلہٗ" کو "اہلِ جنت"

پہلے مصرعے میں عربی کا جو جملہ نقل ہوا ہے وہ اس طرح ہونا چاہیے تھا: "العلم حجابُ الاکبر" نہ صرف یہ کہ صوفیا کا یہ مقولہ

(بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

ہے۔ غالباً ڈاکٹر صاحب نے لفظ نہیب کے یہ معنی مراد لینے کے سلسلے میں غیاث اللغات سے دھوکا کھایا ہے لیکن اس بحث میں نہ پڑ کر اس لفظ کے صحیح مدلول تک پہنچنے کے لیے سب سے راست طریقہ یہ ہوگا کہ ان اشعار پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

کھینچ اسے گر تو عدو پر کرے میداں میں نہیب
استقامت کا زمانے کی قدم جائے بچل — سودا

شعر میں اِسے کا مرجع حضرت علیؑ کی شمشیر ہے۔ دوسرا شعر ہے سہ

ترے نہیب سے ہوں شکلِ فلسِ ماہی الگ
کریں نہ حلقۂ جوہر رفاقتِ شمشیر — ذوق

مایتحلل : وہ چیز جو تحلیل ہو جائے، خوراک، روزی، [حواشی ص ۲۷۵ - (۱۲۹)]

ڈاکٹر صاحب غور فرمائیں کہ اوّل تو خوراک تمام وکمال تحلیل نہیں ہو جاتی دوسرے یہ کہ 'خوراک' 'مایتحلل' کے نہیں بلکہ اس کے بدل کے معنی ہیں۔ طب کی اصطلاح "بدل مایتحلل" ہے جو سودا کے لامیہ قصیدے میں بلا اضافت "مایتحلل کا بدل" مستعمل ہوئی ہے اصطلاح کی تشریح یہ ہے کہ انسانی جسم اپنے وظائف حیوانیہ کی ادائیگی میں جن اجزا کو کام میں لے آتا ہے، غذا ان اجزا کی کمی کو دوبارہ پورا کرتی ہے اور صرف شدہ اجزا کا بدل بنتی ہے۔ اس لیے اصطلاح میں اسے بدلِ مایتحلل کہا گیا ہے۔ اسی کے ہم معنی ایک غیر طبی اصطلاح بھی ہے۔ جیسے قوتِ لایموت کہا جاتا ہے۔ شاعر کی مراد اسی سے ہے جس کے مرادی معنی کے طور پر ڈاکٹر صاحب نے "روزی" تحریر فرمایا ہے۔ سودا کا شعر یہ ہے سہ

میری قسمت کے موافق تو معین کر دے
اپنی سرکار سے واں مایتحلل کا بدل

جدید طب کی اصطلاح CATABOLISM جس کے مقابلہ میں METABOLISM استعمال ہوتی ہے۔ مایتحلل کے اصطلاحی مفہوم سے قریب تر ہے۔

عشر عشیر : دسواں حصہ [حواشی ص ۳۳۱ - (۶۰)] یہ کوئی شاذ یا غریب اصطلاح نہیں بلکہ نظم و نثر میں مستعمل ایک عام ترکیب ہے جس کے معنی دسویں کا دسواں یعنی سوواں حصہ ہوتا ہے۔ بعض پڑھے لکھے حضرات بھی بعض اوقات اس کا تلفظ عُشرِ عَشیر کرتے ہیں جو غلط ہے۔ مضاف کی عین مہملہ مضموم ہے

موردِ سنگ : پتھر لگنا۔ [ص ۲۷۲ - (۸۰)]

اگر موردِ سنگ کے معنی پتھر کھانا لکھا گیا ہوتا تب بھی غنیمت تھا۔ مورد ظرف کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں وارد ہونے کی جگہ۔ اس لیے لفظی معنی : پتھر لگنے کی جگہ، یا جہاں پتھر لگے: اس کا تلفظ اکثر غلط سنا تھا۔ معنی غلط سمجھنے کی یہ نادر مثال ہے۔ اردو میں موردِ الزام کی ترکیب اتنی عام ہے کہ اوسط درجے کے اردو داں سے بھی اس کے صحیح معنی سمجھنے کی توقع کی جاتی ہے۔

چینِ جبیں : معشوق کی پیشانی کی شکن [حواشی ص ۲۶۶ (۲۳)] ۔ کیا چینِ جبیں صرف معشوقوں کا اجارہ ہے۔ معشوق کی پیشانی کی تخصیص کیوں ؟۔

فلک سیر : آسمان کی سیر کرنے والا۔ [ایضاً ص ۲۶۸ (۲۰)]۔

سیّار : سیر کرنے والا۔ [ص ۳۳۳ - (۴۸)]۔

مَسیر : سیر کرنے کی جگہ [ص ۲۶۸ - (۲۰)]۔

سیر عربی لفظ ہے اور اس کے معنی چلنے کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان الفاظ و تراکیب کے معنی لغوی اعتبار سے صحیح ہیں لیکن اردو محاورے میں سیر کے معنی اپنے اصلی اور لغوی مفہوم سے بہت کچھ ہٹے ہوئے ہیں۔ اور یہ لفظ اتنا عام ہے کہ اس پر بحث کی بہت کم گنجائش ہے۔ البتہ اطمینان قلب کے لیے فرہنگ آصفیہ طبع اول : ۳/ص ۱۴۷ - ۱۴۸ کو ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔

سبز فام : سبزی مائل۔ سبزہ آغاز ہونے کی رعایت سے [ص ۲۶۹ - (۳۰)]۔

کسی کی رعایت سے 'فام' کے معنی تو بدلنے سے رہے۔ فام کے معنی رنگ، لون کے ہوتے ہیں۔ اس لیے سبز فام کے معنی ہرے رنگ کا ہونا چاہیئے تھے۔

جمادات : جمد کی جمع۔ وہ چیزیں جن میں نشوونما نہ ہو، پتھر وغیرہ [ص ۲۶۷ - (۱۱)]۔ معنی بالکل صحیح ہیں لیکن جمادات جمد کی نہیں بلکہ جماد کی جمع ہے۔ اور جامد ج جوامد کے بھی یہی معنی ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

اسی طرح ہے بلکہ ڈاکٹر سحر نے 'انتخاب' کے حواشی میں [۱۰۷، ص ۱۹۹]
اس کے جو معنی لکھے ہیں کہ "علم بڑا پردہ ہے" اس کے مطابق بھی مقولے میں "الاکبر" کو معرّف باالام نہیں ہونا چاہیئے۔ غالباً عربی سے عدم واقفیت کی بنا پر انتخاب میں موصوف اس جملے کی تصحیح سے قاصر رہے ہیں اور چونکہ یہ مقولہ شعر میں منقول ہوا ہے اس لیے تصحیح کی ذمہ داری بھی ڈاکٹر صاحب کی نہیں۔ ممکن ہے ذوق کے دیوان میں بھی جوان کے پیش نظر تھا اسی طرح ہو لیکن عزیز لکھنوی کے ذکر میں ڈاکٹر صاحب خود لکھتے ہیں: ....
"عزیز کا نقطۂ نظر العلم حجاب الاکبر کا مصداق ہے" [اردو میں قصیدہ نگاری: ص ۲۶۳] اگر مقولے کی اسی روایت کو صحیح مان لیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کا بیان کردہ مفہوم غلط ہو جائے گا پھر اس کے معنی یوں ہوں گے "علم بڑے کا پردہ ہے" نہ کہ "علم بڑا پردہ ہے"۔

۳۔ ڈاکٹر سحر کی دوسری کتاب 'انتخاب قصائد اردو' مجموعی طور پر ۵۲۴ صفحات پر پھیلا ہے۔ جن میں سے ۱۷ صفحات میں ایک عمدہ مقدمہ ہے۔ اور قصائد کے انتخاب کے بعد "حواشی" کا حصہ ہے جو ۲۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

جہاں تک انتخاب اور حواشی کی ترتیب کا تعلق ہے ان میں بڑا سلیقہ ہے۔ طالب علم یا استاد کو استفادے کے وقت مراجعت میں کسی الجھن کا شکار نہیں ہونا پڑتا۔ قصائد کے اشعار پر کفایت کے ساتھ دیے ہوئے نمبر شمار، حواشی میں شاعر کا نام، قصیدے کا نمبر اور پھر ہر شعر کا شمار نمبر یہ آسانی فراہم کرتے ہیں، جہاں سے "حواشی" کا حصہ شروع ہوتا ہے، وہاں اس عنوان کے نیچے مزید آسانی کے لیے یہ عبارت بھی درج ہے ــــ

"قوسین میں نمبروں سے قصیدے کے شعروں کے نمبر مراد ہیں"؛ اگرچہ یہ عبارت بجائے خود (تھوڑی سی) محل نظر ہے اور میرے خیال میں یوں ہوتی تو زیادہ فصیح (یا صرف فصیح) ہوتی ــ "قوسین کے نمبروں سے ہر قصیدے کے ......" یا اگر "کے" کی تکرار و تنافر سے بچنا تھا تو یوں لکھا جا سکتا تھا "قوسین میں دیے ہوئے نمبروں سے ......"

'انتخاب' کے مقدمے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے انتخاب کے سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر اور اس انتخاب کی غرض و غایت کو واضح کیا ہے جس سے ان کی وسعت نظر اور قصیدے کے سرمائے سے ان کی آگاہی کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے انتخاب کے آخر میں حواشی کے عنوان سے الفاظ اور اصطلاحات کی ایک طویل فرہنگ کا بھی اضافہ کیا ہے تاکہ طلبہ یا اساتذہ کو مطالعہ و تدریس میں مدد مل سکے اور انھیں لغت کی کتابیں نہ دیکھنی پڑیں۔ عموماً اس قسم کی شروح اور حواشی کا یہی مقصد ہوتا بھی ہے۔ کہنے کو تو یہ صرف فرہنگ ہے لیکن اس میں جا بجا اشعار کے غموض کی تشریح بھی اختصار کے ساتھ موجود ہے۔ ان حواشی کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر یہ فرہنگ شامل انتخاب نہ بھی ہوتی تو اس منتخب مجموعے کی خصوصیات میں کوئی خاص کمی نہ آتی۔ کیوں کہ قصیدے کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کے یہ دونوں کارنامے جتنے وقیع اور مفید ہیں۔ فرہنگ بعض مقامات پر اتنی ہی ناقص اور قابل گرفت ہے۔ ان تمام مقامات کی نشاندہی تو ممکن نہیں جو میرے اور ڈاکٹر سحر صاحب کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنا تو تصحیح کہلائے گا جو خود ڈاکٹر صاحب کی ذمہ داری ہے۔ البتہ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند الفاظ و اصطلاحات پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ مثالیں ان قصائد کے حواشی سے انتخاب کی گئی ہیں جو راجستھان یونیورسٹی جے پور میں ایم۔ اے (اردو) کے نصاب میں شامل ہیں۔

نہیب: ڈراونی آواز۔ نعرہ [حواشی ص ۱۷۱۔ (۶۱)]: خوف، ڈراونی آواز، مراد نعرہ۔ [حواشی ص ۲۲۴ (۷۶)]

غالباً لفظ مہیب سے صوتی مشابہت کی بنا پر معنی لکھتے وقت ڈاکٹر صاحب کو تسامح ہوا ہے۔ علاوہ ازیں بنیادی طور پر اس مادّے سے جو لفظ آتے ہیں ان کے معنی لوٹ، غارت گری، اور غنیمت اور غنیمت حاصل کرنے کے ہیں۔ اور یہی اس لفظ کے عام اور قریبی معنی ہیں۔ اس مادے کے باب مفاعلہ سے دوڑ میں مقابلہ کرنا اور مال غنیمت حاصل کرنا وغیرہ آتے ہیں۔ اس باب میں بھی غنیمت کے معنی موجود ہیں۔ البتہ نعرہ اور ڈراونی آواز جیسے معنی مراد لینا محض قیاس اور اندازہ

(بقیہ صفحہ ۱۴۳ پر)

عروج زیدی

فطرتِ عشق یہ ہے چوٹ بھی کھائی جائے
اور وہ چوٹ تبسم میں چھپائی جائے

جھلملاتے ہوئے تاروں کی رفاقت کو سلام
تا بہ انجام کوئی شمع جلائی جائے

گفتگو صرف اشارات سے آگے نہ بڑھے
جب یہ عالم ہو تو کیا بات بڑھائی جائے

اہلِ دنیا کو ہے لے دے کہ یہ فکرِ تعمیر
کون سی راہ میں دیوار اٹھائی جائے

بے حسی کیفیتِ غم کے منافی ہے ابھی
شمعِ احساس کی لو اور بڑھائی جائے

خاک بر سر، نظر افسردہ، دریدہ دامن
یوں بھی دیوانہ کی تصویر بنائی جائے

گہرا گہرا ہوا تاریکیٔ شب کا سایہ
کچھ یہ چاہا کہ غمِ تیرہ فضائی جائے

یادِ ماضی کا ہر اک خواب بکھر جائے، عروج!
زندگی ایسے نئے موڑ پہ لائی جائے

مظفر حنفی

نقش پا خون اگلتا ہے جہاں تک چلنا
اب چلے ہو تو کسی جائے اماں تک چلنا

موجۂ درد کا تھما تو کنارے دل کے
اور چلنا تو سوادِ رگِ جاں تک چلنا

مجھ کو خود ہی نہیں معلوم تو اے گردِ رواں
کیا بتاؤں کہ مرے ساتھ کہاں تک چلنا

راہِ ظلمات میں وحشت مری انگلی تھامے
روشنی کا مرے قدموں کے نشاں تک چلنا

وقت کے ہاتھ کا تیشہ ہوں، مجھے مت روکو
مجھ کو ہے سلسلۂ کوہِ گراں تک چلنا

ایک مدت سے اسے حسرتِ ہنگامہ ہے
آج اے سیلِ بلا، میرے مکاں تک چلنا

ایک تھا باغِ سخن اور مظفر اس میں
یار لوگوں کا بہاروں سے خزاں تک چلنا

کیف احمد صدیقی

فلسفی چہروں پہ جیسے کچھ لکھا ہے
سوچتی آنکھوں پہ جیسے کچھ لکھا ہے

یہ لکیریں کیوں بنائی ہیں خدا نے
غور کر ہاتھوں پہ جیسے کچھ لکھا ہے

ہر طرف بکھری ہے اک پیلی عبارت
پھولتی سرسوں پہ جیسے کچھ لکھا ہے

چاندنی ہے یا کوئی تحریرِ روشن
چاند کی کرنوں پہ جیسے کچھ لکھا ہے

خندۂ گل نے بھی چند آنسو بہا کر
شبنمی پتوں پہ جیسے کچھ لکھا ہے

موت نے بھی آج اپنے آنسوؤں سے
نیم جاں لاشوں پہ جیسے کچھ لکھا ہے

چلچلاتی دھوپ نے بھی ڈھلتے ڈھلتے
منجمد سایوں پہ جیسے کچھ لکھا ہے

وقت کی رفتار نے اپنی زباں میں
جاگتے لمحوں پہ جیسے کچھ لکھا ہے

کیف سادہ ہے کتابِ دہر لیکن
بے لکھے صفحوں پہ جیسے کچھ لکھا ہے

والی آسی

بہت آسان ہے سچائی سے نظریں ملا لینا
بس اک گہرا سا چشمہ اپنی آنکھوں پر لگا لینا

بزرگوں سے سنا تھا ہم نے یہ جنت کا خطہ ہے
یہاں بھولے سے بھی آدم کے دوستو گیہوں نہ کھا لینا

دعا دیتے ہوئے تم کو گزر جائیں گے دنیا سے
مزاجوں کے قلندر ہیں ہیں دنیا سے کیا لینا

لکھوری کا مکاں ہے یہ کسی دن گر ہی جائے گا
یہاں تم خوبصورت سی کوئی بلڈنگ بنا لینا

سوالی ہیں مگر کچھ مانگنا اچھا نہیں لگتا
جو ممکن ہو تو ہم جیسے فقیروں کی دعا لینا

امیر قزلباش

مجھ سے کچھ بن نہ پڑا راکھ ہوئے گھر کتنے
بہہ رہے تھے مرے نزدیک سمندر کتنے

کل پکاریں گے اسے لوگ مسیحا کہہ کر
آج ہر شخص کے ہاتھوں میں ہیں پتھر کتنے

لاکھ ہموار سہی آج زمینوں کا سفر
آسماں ہیں ابھی اس راہ میں سر پر کتنے

پہلے چھینی گئی آنکھوں سے بصارت میری
اور پھر سامنے لائے گئے منظر کتنے!

یوں تو صف بستہ ہیں سب اس کے مقابل لیکن
چھین کر لائیں گے اس ہاتھ سے خنجر کتنے

رک گئے آکے اسی سایۂ دیوار کے پاس
گھر سے نکلے تھے سبھی سوچ سمجھ کر کتنے

نذیر اختر

اب تو احباب بھی اپنے ہی خفا بستی میں
پوچھتے پھرتے ہیں ہم کس کا پتا بستی میں

گھر کے دروازے کھلے رکھیے عذابوں کے لیے
چیختی پھرتی ہے سڑکوں پہ ہوا بستی میں

دو فرشتوں پہ زمیں والوں نے پتھراؤ کیا
سب ہی خاموش رہے پھر کسو لبستی میں

سیکڑوں میکدہ زخموں کو چھپاتے پھرتے
ورنہ چل جائے گا لوگوں کو پتا بستی میں

کو بکو کس کے خیالوں کا [illegible]
گھومتا پھرتا ہے اک آب [illegible]

کرشن مراری

قرض

یہ زندگی ہے محبت کی جستجو لیکن
یہ اک شبانہ سفر ایک مسئلہ بھی ہے
کہ جس کا حل ہی نہیں
یہ ایک خوابِ طلسمی کہ جو ہے بے تعبیر
ہے ایک سلسلہ مچلی ہوئی امنگوں کا
نمازِ عشق کہ اشکوں کا چاہتی ہے وضو
یہ آرزو۔ یہ کشاکش۔ یہ سوچ کی لہریں
یہ امتحاں۔ یہ خرد۔ یہ جنوں۔ یہ سرگرمی
انھیں سے رونقِ ہستی ہے رنگ و مستی ہے
تضاد بھی ہے اور آہنگ بھی ہے جینے میں
تڑپ بھی اور تمنائیں بھی ہیں سینے میں
کہیں حیات کا مطلب نشاط ہے لیکن
کہیں یہ رات ہے بیمار کی،... وفورِ الم
ہر ایک حال میں انساں کا فرض ہے جینا
کہ جیسے داورِ محشر کا قرض ہے جینا
یہ قرض نوعِ بشر کو ادا تو کرنا ہے

• ممتاز شکیب

سفرِ ناتمام

دھڑکنیں تیز ہیں
سنتا ہوں تو سنتا ہی چلا جاتا ہوں
ڈوب جاتی ہیں تو لگتا ہے
ہوا غرق یہ شہر
ایک بھونچال زدہ شب کے سمندر میں کہیں

سوئیاں فکر کی دکھتے ہوئے شانوں پہ لیے
رینگتے رینگتے منزل کی طرف جاتے ہوئے
دن گزرتا ہے تھکے پاؤں، مگر شام ڈھلے
دب کے رہ جاتا ہے خود اپنے ہی ملبے کے تلے

شاہد عزیز

نظم

اُداس راتوں کی زندگی میں
ہزار خوشیوں کا ایک لمحہ
جو تم نے مجھ کو دیا تھا اک دن
وہ میری راہوں میں روشنی کا
منار بن کر . . . . . .
چمک رہا ہے ــــــ
جہاں سفر ختم ہو رہا تھا
وہیں یہ خوشبو کا ایک جھونکا
تمہاری جانب سے آ گیا ہے
تمام رستے . . . . . .
سروں پہ اپنا عذاب لادے
کھڑے ہوئے ہیں ــــ
سمندروں کو اٹھا کے لائیں تھیں جب ہوائیں
تو ریگزاروں میں ان کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں
جو پانیوں کی طلب میں
بینائی کھو چکے تھے ــــــ
ہزار صدیوں سے یہ دیواریں
زمیں کے ہلنے کی منتظر ہیں
اِدھر نہ جاؤ . . . . . .
اُدھر سے گزرے تو یاد رکھنا
زمیں کے ہلتے ہی ــــ
سب دیواریں
اتار پھینکیں گی بوجھ سر سے

تلاش کرتے پھرو گے پھر تم وجود اپنا
وہ رہ گزر جو . . . . . .
ہمیں گپھاؤں سے لے کے آئی تھی ــــ
اب کہاں ہے . . . . . .
یہ کیا ہوا ہے . . . . ؟
یہ بھیڑ کیسی . . . .
یہ شور کیسا ہے !
یہ کالا بھینسا . . . . جو اپنے پیچھے پڑا ہوا ہے
اب اس کی آنکھوں کو پھوڑ ڈالو
کہ تیرگی کا سیہ سمندر
خود اپنے ہاتھوں سے پاٹنا ہے
یہ وہ جگہ ہے ــ جہاں سے ہم نے
تمھیں پکارا تھا ــ اور تم نے
تمام منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہی ڈبو دیئے تھے
تمہارے وعدے ــ ہماری جیبوں سے گر پڑے تھے
ہم اب کہیں دور جا رہے ہیں
ــــــ یہ چاہتے ہیں
ہمارے پیچھے نہ آئے کوئی

نزہت قیصر

لفظوں کا سفر

الفاظ کا ہیر پھیر اعلیٰ مذاق کے لیے ہر زبان میں عام ہے لیکن مذاق کے علاوہ لفظی ہیر پھیر ادبی اور لسانی معاملات میں بھی اہم ہے الفاظ کا یہ سفر شعوری بھی ہوتا ہے اور غیر شعوری بھی۔ انگریزی سے ہاسپٹل، ناول، لینٹرن اردو میں منتقل ہوتے ہوئے اسپتال، ناول، لالٹین ہو گئے۔ توعرب والوں نے ریڈیو کو 'رادیو' اور ڈاکٹر کو 'دکتور' بنا لیا۔ ہندی میں 'اکسیجن' بنے 'اوشجن' اور ماسٹروجن سے 'نتروجن' بھی اسی صوتی مماثلت پر مبنی ہے۔ ہندوستانی زبان سے لوٹ، ٹھگ، سپاہی، تباہی، پنڈت، جنگل، بازار بنگ (بھنگ) جوں کے توں انگریزی میں منتقل ہو گئے۔ الجبرا اور کارواں عربی و فارسی سے انگریزی نے جوں کا توں لے لیا۔ اس لین دین میں کبھی کبھی الفاظ کے تلفظ یا مفہوم میں معمولی سی تبدیلی بھی ہو جاتی ہے مثلاً ہندی کے جگن ناتھ (مالک عالم) کو انگلش میں 'جاگرناٹ' کہہ کر معنی بھی اعظیم کر دیے گئے۔ اسی طرح 'پنڈت' کو انگریزی لغت میں 'کسی خانقاہ کا مالک' اور 'بابو' کو 'ہندوستانی کلرک جو ہندی بولتا ہے' معنی دے دیے گئے ہیں۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو کر بعض الفاظ کے معنی یکسر بدل جاتے ہیں۔ فارسی کے 'مہتر' یعنی عالی نسب اور ایک فوجی عہدہ دار 'جمعدار' کو اردو میں بھنگی بنا دیا گیا۔ عربی کا سردار 'خلیفہ'، نائی اور پہلوان تک آ گیا۔ اور انگریزی کے 'ماسٹر' بمعنی مالک، ماہر، یا استاد کو ستم ہائے زمانہ نے ترقی کرتے کرتے درزی موچی اور بینڈ بجانے والے تک پہنچا دیا۔ استاد کی مٹی بھی اسی طرح خراب ہوئی اور اس کے ہم معنی ہندی لفظ 'گرو' نے بھی چالاک، عیار غنڈے کا مفہوم اختیار کر لیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ درس و تدریس کا کام کرنے والوں کے لئے انگریزی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں مستعمل الفاظ کی درگت بن گئی ہے۔

تبدیلی زبان کے ساتھ تبدیلی تلفظ بھی عام ہے۔ عربی کے 'مشروف' اور 'مرقع' کو اردو نے 'مشوال' اور 'مرقع' استعمال کیا جاتا ہے۔ فرانسیسی 'ریستراں' کو انگریزی میں 'ریسٹورنٹ' کہا جاتا ہے دراصل یہ بات ہر زبان کے مخصوص مزاج و ماحول سے وابستہ ہے۔ اور پھر ایک زبان سے دوسری زبان میں بعینہ تبدیلی ممکن بھی تو نہیں ورنہ "one man's meat is other's poison" کا ترجمہ 'ایک آدمی کا گوشت ...' جبکہ انگریزی میں میٹ کا مطلب 'کھانا' بھی ہے۔ اس طرح sixteen years old کا ترجمہ 'سولہ سال کا بوڑھا' کرنا پڑے گا۔ ہندوستانی محاورے "آٹھ آٹھ آنسو رونا" اور "بغلیں جھانکنا" وغیرہ بھی کسی دیگر زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکتے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں الفاظ کے انتقال کی بات تو چھوڑیئے، خود ایک زبان میں بھی ایک لفظ سے کئی مختلف پہلو نکل سکتے ہیں۔ اگر ایک ہی معنی پر بضد ہوا جائے تو 'دھرم شالہ' اور 'دھرم گرو' میں جو بہت سے لوگوں کی شمولیت کا تصور شامل ہے اسی بنا پر 'دھرم پتنی' میں وہی مفہوم رکھ کر خواہ مخواہ اپنی بیوی کو بہتوں کی بیوی بنانا پڑتا ہے۔ بیوی کی بات پر انگریزی کا ایک عام لفظ 'wife' یاد آتا ہے۔ جس کو ہم نے ہجے سے الگ "ہاؤس وائف" پڑھا جائے تو اس کا مطلب ہے 'گھر کی بیوی' اور اگر اسی لفظ کو 'نائف' پڑھ لیا جائے تو ہو جاتا ہے 'دو دھاری دھار والا چاقو'۔

زبان کی یہ الجھنیں اور دلچسپیاں اس وقت سے بڑھتی ہی گئیں جب سے آریائی، منگولی، اور سامی (دنیا کی تین بڑی ابتدائی زبانیں) سے دنیا کی تقریباً ساری زبانیں نکلنی شروع ہوئیں مختلف قوموں کے میل جول سے، مختلف مقامی اثرات کے امتزاج سے، انہیں تین زبانوں سے ہزاروں زبانیں بن گئیں۔ آج بھی آریائی زبان کی شاخوں یعنی سنسکرت، لاطینی، فارسی، انگریزی، جرمنی، کئی یوروپین زبانوں اور اردو ہندی میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔ یہ

اسی ارتقاء کی نشاندہی کرتے ہیں میٹر (لاطینی) ماتر (سنسکرت) مادر (فارسی) ماتا (ہندی) اماں، امی، ماں، مگی وغیرہ اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں پائے جانے والے الفاظ ایک ہی ہیں۔ اسی طرح برادر، ابرتر، بردر، بھائی بھیّا بھی ایک ہیں۔ پیٹر، فادر، پدر، پتا بھی الگ الگ نہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن کو بولنے کی ضرورت روز مرّہ کی زندگی میں بہت زیادہ تھی۔ ان کے علاوہ اور بہت سے الفاظ کی حیرت انگیز مماثلت دیکھئے:

میڈیم	(انگریزی)	مادھیم	(ہندی)	بمعنی ذریعہ
اینڈ	(انگریزی)	انت	(")	بمعنی خاتمہ
خشک	(فارسی)	شُشک	(")	
آہت	"	آپت	(")	
اختیار	"	ادھیکار	(")	
شاخ	"	شاکھا	(")	
پاتھ	(انگریزی)	پتھ	(سنسکرت)	
نیو	(")	نیا (ہندی اردو)		
نو	(فارسی)			
ہستی	(فارسی)	استیتو	(سنسکرت)	

یہ محض اتنا فرق ہے جتنا اپنی زبان کے صوتی اثرات و قواعد کے تحت ایک بنگالی آدمی 'پھل' کو 'موشل' اور ایک انڈونیشی 'ڈسٹر' کو 'دستر' کہتا ہے۔ ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ کسی زبان میں 'ڈ' اور 'ڑ' کی آواز نہیں تو کسی میں 'گ' اور 'پ' کی آواز!

اس طرح زبانیں ایک دوسرے میں، وقت کے ساتھ اس طرح سما گئیں کہ آج اردو ہندی بولتے ہوئے ہم کو احساس نہیں ہوتا۔ کہ میز، تکیہ، لحاف جیسے عام الفاظ ترکی ہیں۔ رنگ، خیال، رومال، خرگوش، سر، فارسی کے الفاظ ہیں اور مقدمہ، عدالت، موت، عبد، دنیا، انسان عربی کے! اور دراصل الفاظ کی یہ درجہ بندی ٹھیک بھی نہیں۔ زبانوں کو محدود کرنا ان کے فطری نشو و نما کو روکنے کے مترادف ہے۔ زبانیں دریاؤں کی طرح ہوتی ہیں جو پہاڑوں پر بہا کرتے چشموں، آبشاروں اور نالوں کے پانی سے مل کر بنتے ہیں۔ بہتے ہیں اور اپنے دامن میں اِدھر اُدھر سے آنے والے پانی کو سمیٹ کر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔

انگریزی زبان کی لغت میں ہر سال سینکڑوں الفاظ بڑھ جاتے ہیں چھ سات سو سال کے مختصر عرصہ میں انگریزی کی بے اندازہ وسعت کا راز یہی ہے اس نے اپنا دامن ہر زبان کے اچھے الفاظ کے لیے کشادہ رکھا۔ اور زندگی کی مختلف صورت پذیر حالات سے فائدہ اٹھایا۔ انگریزی زبان میں بہت سے الفاظ بہت سے واقعات سے بنے۔ مثلاً انگلینڈ کے ارل آف سینڈوچ کو جوا کھیلنے کا اس قدر شوق تھا کہ اس کو کھانے کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ اس نے کھیلتے ہوئے اپنا پیٹ بھرنے کا طریقہ یہ نکالا کہ ڈبل روٹی کے دو ٹکروں کے درمیان مختلف چیزیں بھر کر آسانی سے کھا لینے کے قابل ایک چیز ایجاد کر لی۔ اس کے نام پر اس چیز کا نام ہی 'سینڈوچ' پڑ گیا۔ اور پھر ڈبل روٹی کے دو ٹکڑوں کے درمیان کوئی چیز ہونے کے تصور کو لے کر لفظ سینڈوچ کو وسیع تر معنی میں "دو آدمیوں کے درمیان پھنس جانا، دو چیزوں کے بیچ آ جانا" وغیرہ کے معنی میں بھی استعمال کیا جا ... ۔ اسی طرح ارل آف کارڈیگن کے تنہائی کے شوق کے نتیجہ میں آستین دار سوئٹر کو 'کارڈیگن' کہا جانے لگا 'ہیرو' ایک عورت تھی جس نے بہادری کا کام سرانجام دیا۔ اور انگریزی زبان کو لفظ 'ہیرو' دیا۔ بائیکاٹ نام کا ایک کسان تھا جس کا برادری والوں نے ... پانی بند کر دیا تھا اور اسی واقعہ کی بنا پر لفظ 'بائیکاٹ' کو سماجی بے تعلقی کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔ لفظ Salary یعنی تنخواہ کی وجہ ... اور بھی دلچسپ ہے۔ رومن سلطنت کے ایک دور میں نمک بہت گراں شے تھی۔ جو سپاہیوں کو تنخواہ اور زرِ مبادلہ کی شکل میں دی جاتی تھی۔ لاطینی زبان میں نمک کو 'سیلر' کہا جاتا تھا۔ اس لیے لفظ 'سیلری' بن گیا۔

اسی فراخ دامنی نے اردو کے پڑھنے پھلنے پر بھی خوب مدد دی اور جدید عربی بھی اس سے استفادہ کر کے ایک عظیم زبان بن چکی ہے۔ مختلف اثرات و الفاظ کو قبول کر کے کسی زبان کے مخصوص مزاج میں ڈھال لینا دراصل اس زبان کی زندگی کا ضامن ہے۔ اس طرح کا تدریجی ارتقاء زبانوں کی ترقی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے برخلاف کسی زبان کو زبردستی بدلنا یا اس کو محدود کر دینا غیر فطری ہے اور اس زبان کے لیے ناروا ظلم بھی۔ ✱

پریم گلین

امرت منتھن

"سمندر منتھن سے پیدا ہونے والے سارے زہر کو تنہا پینے والا شنکر اب اس دھرتی پر لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اپنے اپنے حصے کا زہر ہمیں اب خود ہی پینا پڑے گا ——— ہاں! کچھ ننھے ننھے شنکر تمھیں ضرور مل جائیں گے جو دوسروں کے حصے کا تھوڑا زہر بھی پی لیں۔ جب تم کسی کے بدن کو نیلا ہوتا ہوا دیکھو، تو سمجھ لو کہ اس نے کسی کے حصے کا زہر پی لیا ہے۔ شنکر بھولا ہوتا ہے، ہر شنکر بھولا ہوتا ہے!"

"تمھاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ تم شاید بہت پریشان ہو۔ تھوڑا آرام کر لو۔"

"پریشان! ——— ہاں، یہی سمجھ لو۔ جانتی ہو، میری سب سے بڑی پریشانی میرا اپنا وجود ہے ——— اور آرام تو ایک اجنبی سا لفظ ہے میرے لیے۔ تم میری فکر مت کرو۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ تمھاری شخصیت ٹوٹ چکی ہے۔ میں نے کبھی تم کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن سنا ہے، کبھی تمھارے قہقہوں میں بڑی جان ہوا کرتی تھی۔ مجھے ہمدردی ہو گئی ہے تم سے اور میں تمھارا دکھ بٹانا چاہتی ہوں۔ مجھ پر اعتماد کرو اور مجھے بتاؤ، کیا دکھ ہے تمھیں؟"

"دیکھو دکھوں کی اب کوئی حقیقت نہیں رہی میرے لیے۔ میں تکلیفیں سہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ اور جب کسی چیز کی عادت پڑ جاتی ہے تو اس سے تکلیف نہیں پہنچتی۔ تکلیف تو اس وقت پہنچتی ہے جب وہ عادت پوری نہیں ہو پاتی ——— میری بات تم شاید آسانی سے نہیں سمجھ سکو۔ جاؤ ——— اور دیکھو، دنیا میں بے شمار لوگ بوند بوند کر کے زہر پینے پر مجبور ہیں ——— دوسروں کے حصے کے زہر کی چند بوندیں ہلک کر پی لو، تب تم آسانی سے میری بات سمجھ سکو گی، اور میرا دکھ بھی!"

"اوہ! ہوا تیز ہو گئی ہے اور دور سے غبار اڑتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ آندھی آنے والی ہے۔ کمرے میں لٹکتے ہوئے کیلنڈر زور زور سے پھڑپھڑانے لگے ہیں اور کیلوں سمیت اکھڑ اکھڑ کر فرش پر گر رہے ہیں ——— ان کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کیوں نہیں کر دیتے؟"

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ باہر کی آندھی سے بچنے کے لیے کھڑکیاں اور دروازے بند کر لینے کے بعد، تم اپنے اندر اٹھتے ہوئے طوفان سے بھی محفوظ رہ سکو گی؟ ——— لو! میں کھڑکیوں اور دروازوں کے ساتھ ساتھ روشندان تک بند کیے دیتا ہوں۔"

"اب تو بہت اندھیرا ہو گیا ہے۔ کمرے میں دم گھٹنے لگا ہے۔ کچھ دکھائی بھی تو نہیں دیتا۔ ڈر لگ رہا ہے مجھے ——— تم کہاں ہو؟"

"کیا تم اسی اندھیرے سے ڈر گئیں؟ ہمارے دلوں میں اس سے زیادہ گہری تاریکی ہے ——— کونے میں جا کر بجلی کا بٹن دبا دو۔ اس کمرے کی تاریکی دور ہو جائے گی۔ مگر دلوں میں بسنے والی ظلمت کو دور کرنے کا علاج کبھی سوچا ہے تم نے؟"

"ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں تم سے۔ یا یوں سمجھ لو تصدیق کرانا چاہتی ہوں۔ کیا تم بتاؤ گے مجھے؟"

"پوچھو۔"

"سنا ہے دمینتی بہت حسین تھی اور وہ تمھیں چاہتی بھی بہت تھی۔ اس کی آخری سانسوں میں بھی تمھارا ہی نام رچا ہوا تھا ——— اور لوگ کہتے ہیں کہ اس کی موت کے ذمے دار بھی تم ہی ہو ——— کیا یہ سچ ہے؟ کیوں کیا تم نے ایسا؟"

"دمینتی کو صرف نل بچا سکتا تھا اور میں نل نہیں ہوں۔ اس دنیا میں نل پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں، اس لیے کوئی دمینتی بچ نہیں سکتی! ——— تم ان فضول باتوں میں مجھے نہ الجھاؤ۔ ان بند کھڑکیوں اور دروازوں کو اب کھول دو۔"

"اپنے دل کی ظلمت کو دور کرنے کا علاج بھی کبھی سوچا ہے تم نے؟"

کیا تم اپنے اندر اٹھنے والے طوفان کو دبانے کی کوشش کر رہے ہو؟ ان کھڑکیوں اور دروازوں کے کھل جانے کے باوجود تمھارے اندر کا طوفان اور عظیم مچا ہی رہے گا۔ اپنے آپ سے فرار حاصل کرنے کی کوشش مت کرو ـــــ مجھے ہمدردی ہو گئی ہے تم سے اور میں تمھارا دکھ بٹانا چاہتی ہوں۔ مجھ پر اعتماد کرو اور مجھے بتاؤ کیا دکھ ہے تمھیں؟"

"کیا سچ مچ تمھیں ہمدردی ہے مجھ سے اور تم چاہتی ہو کہ میں تم پر اعتماد کروں؟"

"ہاں! اور اگر تم ایسا کرو گے تو مجھے بے پناہ مسرت ہوگی۔"

"تو سنو! میں نے مانگ کر کسی کے حصے کے زہر کی چند بوندیں پی لی تھیں۔ لیکن ان کے اثر سے میرا کنٹھ نیلا نہیں ہوا، میرے لہو کا رنگ سفید ہو گیا۔"

"اوہ! تو کیا کر سکتی ہوں میں تمھارے لیے؟"

"کچھ نہیں۔ میرے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر ٹھہرو! صرف ایک راستہ ہے تم تلوتما بن جاؤ۔ تمام سُروں اور اسُروں کو اکٹھا کرو اور انھیں پھر سے سمندر منتھن پر آمادہ کرو۔ جب امرت کنڈ بھر جائے تو اس بار امرت اسُروں کو پی لینے دو۔ اسُروں کو اب مدرا کی ضرورت نہیں، مدرا دیوتاؤں کو پلا دو ـــ اور زہر مجھے لا دو۔ سارا زہر پی لینے کے بعد ہی میرا لہو پھر سے سُرخ ہو سکے گا!"

"میں تلوتما کیسے بن سکتی ہوں؟ میں مایا ہوں اور زیادہ سے زیادہ تمھارے لیے دمینتی بن سکتی ہوں!؟"

"جاؤ! چلی جاؤ یہاں سے۔ تمھاری ہمدردی میرے لیے بیکار ہے۔ جاؤ، کہ اب تو سورج بھی ڈوب چکا ہے۔ سامنے مغرور سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ وہ خوش ہے کہ اب اسے کوئی نہیں متھ سکتا۔ اس میں ملے زہر اور امرت کو کوئی الگ الگ نہیں کر سکتا۔ یہ سمندر میری ہنسی اڑاتا ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔ جاؤ کہ میں جا رہا ہوں اور اس سمندر کے پیٹ میں چھلانگ لگا کر اسے متھ ڈالوں گا!!"

بقیہ: اردو میں قصیدہ نگاری

جمد کے معنی لغت میں "جمے ہوئے ہیں" اور "برف" کے آتے ہیں۔

خلق: مروت [ص ۲۴۶، ۳۰۰]۔

یہ لفظ اتنا عام ہے کہ محتاج بحث نہیں۔ حسن خلق کا مفہوم تو مروت ہو سکتا ہے لیکن صرف لفظ خلق کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں۔

حسود: حاسد کی جمع [ص ۲۳۳، (۵)]۔ مرتب موصوف کو عقول، کنوز وغیرہ کے وزن پر اس لفظ پر جمع کا شبہ ہوا ہے لیکن نہ تو یہ جمع کا صیغہ ہے اور نہ عقول وکنوز کی طرح اس کا پہلا حرف مضموم ہے بلکہ یہ حَسُود (بفتح اول، بروزن ظلوم وجہول) واحد کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی حاسد مزاج شخص (مرد یا عورت)، جس کی طبیعت میں حسد کا مادہ ہو۔ اس کی جمع حُسُد (بضمتین) آتی ہے جبکہ حاسد کی جمع حُسّاد، حَسَدَة اور حُسَّد آتی ہے۔

ان مثالوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حواشی کس حد تک اصلاح اور نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ اگرچہ پروفیسر ابو محمد سحر صاحب نے مقدمے میں کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ یہ انتخاب ہر طرح سے مکمل اور اغلاط سے معرّا ہے۔ بلکہ وہ لکھتے ہیں "عین ممکن ہے کہ بعض نکات تک میری رسائی نہ ہوئی ہو۔ اہل نظر سے گزارش ہے کہ میری فرد گذاشتوں سے مجھے آگاہ فرمائیں تاکہ آئندہ ان کی تلافی کی جا سکے۔" [مقدمہ: ص ۱۶]

نکتہ نہی کا فرض تو اپنی بساط کے مطابق ادا ہو گیا لیکن راقم خود کو اہل نظر میں سے سمجھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر صاحب سے ان اغلاط کو منسوب کرنا تو ان کے رتبۂ علمیہ سے سوئے ظن کے مترادف ہوگا۔ البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب کے وقت ڈاکٹر صاحب نے حل لغات کا کام اپنے ان "عزیزان" کے سپرد کر دیا ہوگا جن کا شکریہ مقدمے کے آخر میں ادا کیا گیا ہے۔ اور کہیں کہیں غموض کی تشریح کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے بنفس نفیس حواشی پر نظر ڈالی ہوگی ـــــ!!

ہارون الرشید

زندگی

"جب کوئی روشنی کو گلے لگانے کے لیے آگے بڑھے اور گھٹا ٹوپ اندھیرے سے ہمکنار ہو جائے تو اسے کیا کہیں گے میرے بھائی!" اس نے اپنے آگے چلتے ہوئے سائے سے پوچھا۔

"ہا ہا ہا ہا!!" سائے نے قہقہہ لگایا۔ "تو تم روشنی کی تلاش میں ادھر آ نکلے ہو۔ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رہو ورنہ اس طرح بھٹک جاؤ گے کہ عمر بھر اس اندھیرے سے نہ نکل سکو گے۔"

"میں تمھارا بہت شکرگزار ہوں۔" اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "مگر تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا!"

"یہ تم اپنے دل سے پوچھو، وہی ٹھیک جواب دے گا۔"

"میرا دل!! ہائے، یہ کیا کہا تم نے بھائی! میرا دل تو کب کا مر چکا ہے۔ زندہ رہتا تو کچھ جواب دیتا۔ اب نہ تو دل ہے اور نہ اس کے مشورے۔"

"خوب!" سائے نے پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تمھارا دل اگر مر چکا ہوتا تو تم یہ سوال ہی نہ کرتے۔"

"بہر حال، میں نے جہاں تک سوچا ہے۔ مجھے کوئی جواب ہاتھ نہیں آیا۔ مقدر، انقلابِ زمانہ، اتفاق، حادثہ کچھ میں نہیں آتا میں اسے کیا نام دوں!"

"کچھ بھی کہہ لو!"

"کیا یہ سب چیزیں یکساں ہیں؟"

"نہیں یکساں تو نہیں۔"

"تو پھر کچھ بھی سمجھ لینے کا مطلب؟"

"اپنی اپنی عقل، سمجھ یا عقیدے کے مطابق لوگ ایسے حالات کو کوئی نام دے دیتے ہیں۔ تم بھی اسے کوئی نام دے دو۔ پر حقیقت تو اپنی جگہ وہی رہے گی۔"

"کون سی حقیقت؟"

"ارے بھئی بیوقوف! اس گھپ اندھیرے میں تم ناملک ٹوئیے مار رہے ہو!"

"لیکن بھائی یہ تو بتاؤ، تم کون ہو؟"

"اس کا تمھیں اب خیال آیا ہے؟" سائے نے پھر قہقہہ لگایا۔ "یہ سوال تو تمھیں پہلے کرنا چاہیے تھا۔"

"میں اس قدر گھبراہٹ میں تھا کہ یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی۔"

"یہ گھبراہٹ ہی تو تمھیں پریشان کیے ہوئے ہے۔ ورنہ اس دنیا کے اندھیرے اجالے میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن اس اندھیرے کو تو دیکھو۔ آہ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری نس نس میں اندھیرا اترتا جا رہا ہے۔ سچ بتانا میرے بھائی! تم نے ایسا اندھیرا پہلے بھی کبھی دیکھا ہے؟"

"میں نے اس سے کہیں زیادہ گہرے اندھیرے دیکھے ہیں۔ یہ اندھیرا تو میرے لیے کچھ بھی نہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو بھائی! آخر تم ہو کون؟"

"یہ نہ پوچھو تو بہتر ہے"

"کیوں؟"

"میرا نام سن کر شاید تم اور گھبرا جاؤ!"

"نہیں، نہیں، بتاؤ تو!!"

"بضد ہو تو سنو، میں زندگی ہوں!"

"کیا کہا؟ زندگی؟" فرطِ حیرت سے وہ گرنے ہی والا تھا کہ زندگی نے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور جب اس نے آنکھ کھولی تو دور روشنی کی ایک ننھی سی کرن نظر آ رہی تھی ———!!

شباب للت

چھا گئی عالم احساس پہ جادو کی طرح
نشہ آور تری اتفاقیہ ہنسی دارو کی طرح

ان آنکھوں میں رقصاں ہیں ہوس کے شعلے
جو معصوم تھیں سہمے ہوئے آہو کی طرح

بجھ گئے کتنے سلگتے ہوئے جسموں کے الاؤ
کھا گیا وقت ہر اک چاند کو راہو کی طرح

تیری راتوں کے مقدر میں کوئی چاند نہ تھا!
مجھ کو جلنا پڑا تیرے لیے جگنو کی طرح

نہ صدا اس کی سنی ہے نہ اسے دیکھا ہے
میں نے محسوس کیا ہے اسے خوشبو کی طرح

میری دھرتی پہ نہ رکھا کسی کھوجی نے قدم
دل ہے میرا کسی ویران سے ٹاپو کی طرح

اس نے پاکیزہ خیالوں کی بھبھوتی مل کر
بیٹھ جا تن کی گپھا میں کسی سادھو کی طرح

کسی آنچل نے مجھے بڑھ کے سنبھالا ہی نہیں
وقت کی آنکھ سے ٹپکا تو میں آنسو کی طرح

اس کی آغوش میں دم توڑتا میرا بھی شباب
پنکھ اگر میں بھی کٹا سکتا جٹایو کی طرح

سید فضل المتین

یہ تیرا اختیار ہے جو دے سزا مجھے
مجرم نہ مجھ کو مان، یونہی بے خطا مجھے

کس طرح یہ کہوں کہ تو پہچانتا نہیں
میرے شناسا اپنا بھی کچھ دے پتا مجھے

میں اجنبی نہیں ہوں، ترا ترجمان ہوں
خاموشیوں کے شہر کبھی دے صدا مجھے

کب تک سناتا جاؤں تجھے اپنے واقعات
کچھ اپنی داستاں بھی تو آخر سنا مجھے

میرا وجود بن گیا صحرا کی تشنگی!
تیرے بدن کی چاہیے اب تو گھٹا مجھے

اس کے حضور میں ہی خطا کار ہوں متین
میری وفا کا اچھا صلہ یہ ملا مجھے

اعجاز اعظمی

اگر سمٹا تو مشت خاک ہے، پھیلا تو انساں ہے
مرے اندر کوئی بیٹھا ہوا مجھ سے گریزاں ہے

یہ تپتی راہ، یہ پلکوں کے سائے، نیلگوں جھیلیں
یہیں پیاسے مسافر کے بھٹک جانے کا امکاں ہے

ہمالہ ہی سہی، ہو ریت کے، اتنا نہ اترا تو
ہوا کے ایک جھونکے سے بکھر جانے کا امکاں ہے

ادھر فرمان جاری ہے گلوں کے سر قلم کر دو
ادھر مصلوب کلیوں پر لچکتی شاخ نازاں ہے

نہ وہ نورانی منظر ہے، نہ خوابوں کے جزیرے ہیں
نظر کے سامنے پھیلا ہوا غم کا بیاباں ہے

لہو کے چاند تارو راستے میں نور پھیلاؤ
جرس کے ساز پر اعجاز اک راہی غزل خواں ہے

تین مختصر نظمیں

پرویز باغی

چنگاریاں

شہر کی ساری چنگاریاں
راکھ کے
خول کو توڑ کر
روپ شعلوں کا دھارے ہوئے
شہر کے چوک میں
آج در آئی ہیں
اور آئے ہوئے
ہوٹلوں کو، مکانات کو
راکھ کر آئی ہیں!

خوش آمدید

ہر طرف
برف ہی برف تھی
کتنا
یخ بستہ ماحول تھا
کل کہیں سے مگر
ایک سورج بھی
اس بزم میں آگیا!
اور پھر
دیکھتے دیکھتے
بزم کا سارا سناٹا پگھلا گیا!

عظمت کا جرم

ہم نے
اس کی، عظمتوں کے نام پر
پتھروں میں ڈھال کر
شہر کے
ایک چوک میں
لاکر کھڑا اس کو کیا
اور وہ
ان عظمتوں کے جرم میں
دھوپ میں
جلتا رہا

راجیش جوشی
م۔ ق۔ خان

سانپ

وہ ایک جیتا جاگتا رینگتا ہوا زہریلا ۔۔۔ زہر ہلاہل! اس کا پورا جسم پھیلا ہوا ہے اس کی عادتیں بھی ویسی ہی وحشیانہ ہیں گندی ہیں۔ ناک کے نتھنوں کے پاس اگی چھوٹی چھدری مونچھوں کو پھیلا بالشت بھر پیچوں کی طرح ہونٹوں سے بھرر، بھرر کی بیہودہ آواز پیدا کیا ہوا ہر وقت زہریلا تھوک اڑاتا ہوا آتا ہے ۔۔۔ اس کے آگے کے دو بڑے دانت منہ سے آدھے باہر نکلے ہوئے ہیں جن سے زہر کی تھیلیاں جڑی رہتی ہیں۔ کوئی شکار جنگل میں پھنسا نہیں کہ دانتوں میں زہر اتر آتا ہے۔

خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ان دونوں دانتوں کو توڑ کر اس کے منہ کو زہر سے پاک کر دوں۔ لیکن بے پرواہ ہونے کی وجہ سے انگلیاں سرسرا کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے بہت اوپر دونوں جانب آنکھیں ہیں جن کی ریڈیم چمک میں ہر وقت تشدد لپلپاتا رہتا ہے۔ اس چکاچوند کرنے والی وحشی لپلپاہٹ کی طرف دیکھنا تک مشکل ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سارے بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگی ہیں۔ ناک کے نام پر صرف دو ماندے گڑھے ہیں جو تکونی کے مستطیل نما ٹھیک نوک پر ہیں گڑھوں کے بعد چہرے پر دو دھاریاں ہیں جو ہیں جنھیں پھن کہا جاتا ہے۔ ان پر وشنو برہمن کی پیشانی پر کھنچے ہوئے تلک سا یعنی انگریزی کے یو (U) جیسا بھورا نشان ہے۔ باقی سارے جسم پر کالے اور بھورے چلتوں والی دھاریاں دم تک ہیں جو بتدریج چھوٹی اور تنگ ہوتی گئی ہیں۔ بہت سے حصوں میں یہ دھاریاں سفید ہیں۔ کان اور ناک کا کوئی نام نہیں۔ وہ اپنے کام کی آواز جبڑے کے سہارے محسوس کرتا ہے اور جذب کر لیتا ہے۔ کل ملا کر اسے دیکھنے سے بچوں کے جیسے پسینے نکل آتے ہیں۔

میرے والد صاحب کو اس سے سخت چڑ تھی۔ وہ تھے ہی بہت متلون مزاج اور غصہ تو جیسے ہر وقت ان کے دماغ پر چڑھا ہی رہتا۔ ہر وقت اسی تلاش میں رہتے کہ کب موقع ملے اور اس کا قصہ تمام کر دیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کے جیتے جی اس کی عیاری و مکاری کبھی کامیاب نہ ہوئی۔ انھیں سمجھانے کی جرأت تو کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس قدر غصے میں بھرے رہتے تھے کہ ان کے چہرے کی ہڈیاں ابھری رہتی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے کپکپائے ہوئے ہیں۔ ایک بار ماں نے کوشش کر کے کہا تھا کہ وہ سانپ کے خلاف اپنا غصہ تھوک دیں۔ لیکن جواب میں انھوں نے ماں کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ اس حادثہ کے بعد پھر کسی نے ان سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی ...... وہ دھیرے دھیرے سرکاری دفتر کے رجسٹروں سے سیاہ ہوتے جا رہے تھے۔ جسم تو جیسے گھن لگ گیا ——— وہ دن بدن نحیف و ناتواں ہوتے گئے۔ اور ایک دن اس دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔

ان کی موت ایک وحشتناک المیہ تھا! مرتے وقت ان کے جبڑوں کی ہڈیاں خاص طور سے ابھری ہوئی اور بھنچی ہوئی تھیں۔ اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ ایک گونگا خوف کالی کھردری ہتھیلیوں کو پھیلا کر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سانس رکنے کے پہلے صرف ایک لفظ ان کے منہ سے نکلا تھا "سانپ"! اور ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ کھلا منہ، پھٹی آنکھیں اور بھنچے جبڑوں والی وہ بھیانک لاش میرے والد ہی کی ہو سکتی تھی۔ گو شناخت مشکل تھی کیونکہ اس سے پہلے کسی نے انھیں خوفزدہ نہیں دیکھا تھا۔ والد کے آخری لفظ کو لے کر گھر میں ایک نیا بکھیڑا کھڑا ہو گیا تھا۔ تو اور محلے بھر کی بوڑھی ضعیفاؤں نے ایک طوفان سا کھڑا کر رکھا تھا۔ ساری باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ موت نے سانپ کی شکل اختیار کر کے ان کی روح قبض کی تھی۔ ملک الموت یعنی یمراج

سیکڑوں روپ بدل سکتا ہے۔ مثال کے طور پر بیواؤں نے اپنے شوہروں اور سہاگنوں نے اپنے باپ دادا ؤں کے کئی قصے سنا ڈالے۔ ان کی گفتگو کا فلسفیانہ پہلو بس اس قدر تھا کہ سانپ کی پوجا سے ہی ان کی روح کو راحت و سکون مل سکتا ہے۔

ادھر اشارہ ملا اور پنڈتوں نے اپنی تھال تھیلی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوجا کے سارے لوازمات فراہم کر ڈالے وقت اور برہمن بھوج کی فہرست ہمیں سونپ دی گئی۔ آنسو خشک کرتی اور بار بار ناک صاف کرتی ماں نے ساری باتیں منظور کر لیں۔

دوسرے دن سے ہی ہمارے گھر میں سانپ کی پوجا شروع ہو گئی۔ آنگن کے ایک کونے میں بنی اس کی بانبی کے پاس خوشبودار اگربتیاں جلائی جانے لگیں۔ چندن جلایا جاتا، گلاب موگرا اور چنبیلی کے تازہ پھول چڑھائے جاتے۔ چمچاتے ہوئے چاندی کے ایک کٹورے میں سانپ کے لئے دودھ رکھا جاتا۔ یہ ساری باتیں دھرم شاستروں کے مطابق لازمی تھیں۔ وہ آتا اور کٹورے میں منہ ڈال کر غٹ غٹ سارا دودھ پی جاتا، نتھنے پھلا کر پھنکارتا اور منہ کے بالوں میں لپٹا دودھ جھٹکا دیتا۔ وہ تیزی سے موٹا ہوتا جا رہا تھا ــــ ڈراؤنا اور زہریلا بھی وہ پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں وہ صرف بانبی سے نکلتا اور دودھ پی کر واپس بانبی کے اندر چلا جاتا۔ لیکن جیسے جیسے اس کی پوجا بڑھنے لگی وہ پاؤں پھیلانے لگا۔ اب وہ دودھ پی کر واپس نہ جاتا بلکہ آنگن میں ٹہلتا رہتا۔ جب اس نے دیکھا کہ اسے کوئی گزند نہیں پہنچ رہا ہے تو وہ شانِ بے نیازی سے رہنے لگا۔ اوپر کے کمروں میں چلا جاتا۔ باورچی خانے میں گھس آتا، کبھی کبھی ماں کے کمرے تک سیر کر آتا اور کبھی کبھی بھابی کے کمرے میں گھنٹوں پڑا رہتا۔ وہ اب بانبی میں کم ہی رہتا۔ بلکہ زیادہ تر باہر کی بیٹھک ہی میں وقت گزارتا۔

اب وہ پورے گھر پر تسلط جما چکا تھا۔ سبھی لوگ اس کے زرخرید غلام کی طرح اس کے آگے پیچھے لگے خوشامد کرتے رہتے۔ والد کے وقت میں بھیا نے بھی کئی بار گونڈے چلا دئے تھے لیکن ان دنوں کی بات اور تھی۔ تب والد صاحب کی پہلوانی کی دھاک تھی اور اس کی سٹی پٹی یونہی گم رہتی تھی۔ یہ شروع شروع کا زمانہ تھا ــــ یعنی والد کی نوکری اور ہندوستان کی آزادی کو صرف پندرہ سال ہوئے تھے۔ والد معمر ہو چکے تھے۔ ان کے ہونٹوں نے خون کا مزہ ہی کہاں چکھا تھا؟ ...... اور اپنے اسی اکھڑپن اور ایمانداری کی وجہ سے اتنے برسوں کے بعد بھی وہ صرف بڑے بابو ہی ہو پائے تھے۔ جب کہ اسی دفتر کے کئی جونیئر بابو جمپ لگا گئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک ... فہم و فراست کا شخص جو والد سے کئی سال جونیئر تھا دیکھتے ہی دیکھتے ان کا باس بن گیا تھا۔ اس سے آئے دن والد کی چخ چخ ہوتی رہتی تھی۔ جب تب والد پر غصّے کا دورہ ہوتا اور وہ اس کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ دفتر میں تو وہ لڑتے ہی، کبھی کبھی بھڑاس گھر میں انڈیل دیتے۔ دروازے سے وہ گالیاں دیتے ہوئے ہی داخل ہوتے تھے۔

وہ دن بھی انہیں دنوں جیسا تھا جب وہ دروازے سے گالیاں دیتے ہوئے داخل ہوئے تھے۔ وہ دہلیز پر آتے آتے بڑبڑانے لگے تھے۔ پہلے انھوں نے لاتوں سے ماں کی مرمت کی اور پانی کا مٹکا پھوڑ ڈالا پھر رات میں نہ جانے کب تک کھٹملوں کا قتل عام کرتے رہے۔ غصّے کے مارے وہ رات بھر ہنکارتے ہی رہے۔ ابھی صبح کاذب کا جھٹپٹا تھا کہ ماں چائے کا پانی گرم کرنے کو چولہے میں کوئلہ ڈالنے گئی تھیں اور انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی غراہٹ سے سبھی کا مکان تھرانے لگا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ والد صاحب ہاتھ میں ڈنڈا سنبھالے بانبی توڑنے میں مشغول تھے۔ اور پورا گھر تماشائی کی طرح جمع ہو گیا تھا۔ انہوں نے ڈنڈے کا اگلا چوتھائی حصّہ بانبی کے اندر گھسیڑ دیا تھا۔ اور زور لگا رہے تھے۔ دیوار سے لگی ماں کے چہرے پر کسی انجانی وحشت کے کالے سائے منڈلا رہے تھے۔ جتنے لوگ تھے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا شاید آج سانپ کا خاتمہ ہی ہو جائے لیکن یہ دھا بھارت دیر تک چلتی رہی اور پھر نہ جانے کیوں والد نے ڈنڈا ایک کونے میں کھڑا کر دیا اور بغیر نہائے، کھائے دفتر روانہ ہو گئے۔

ڈیڑھ گھنٹہ ہی گذرا تھا کہ گلی میں شور مچاتے والد صاحب

واپس گھر آ گئے۔ اچانک زلزلہ سا آ گیا۔ ایسا محسوس ہوا یہ وہی دن ہے جس دن ہیروشیما ٹانگوں سے کھینچ کر اتارے گئے چوڑی دار پائجامہ کی طرح الٹ گیا تھا —— لیکن نہیں —— نہ یہ ہیروشیما تھا نہ کوئینا کی کان —— یہ ایک متوسط طبقے کے خاندان کا ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کا مالک صرف بدنداد غصہ ور تھا جس کو صرف جبر و تشدد پر یقین تھا۔ جس نے صبح ہی صبح سانپ کی بانبی میں ڈنڈا گھسیڑ دیا تھا۔

گھر میں حشر برپا کر کے والد صاحب دفتر میں اپنے آفیسر پہ چڑھ دوڑے تھے۔ کیبن میں گھس کر انھوں نے صرف ماں بہن ہی برابر نہیں کی بلکہ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں اور کسے ہاتھوں کا زور بھی آزمایا ان کی اس حرکت کے جواب میں آفیسر نے ان کے ہاتھوں میں ایک لفافہ تھما دیا —— وہ برخواست کر دیے گئے تھے۔

اب وہ دن بھر گھر میں پڑے کھاٹ توڑتے رہتے یا صبح سے ہی نکل جاتے اور بغیر کھائے پیے سڑکیں ناپتے رہتے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ان کی طبیعت اور عادت میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی —— بس فرق اتنا ہو گیا تھا کہ دن بدن سرکاری فائلوں کی طرح رنگ خاکی ہوتے ہوتے ان کی زندگی کا فائل ہی یکسر بند ہو گیا۔

اگر ان کے تعزیتی جلسے میں مجھے کچھ کہنا ہوتا تو میں کہتا: وہ مر تے مر گئے لیکن ٹوٹے نہیں، جھکے نہیں، کبھی کسی کے سامنے سپر نہیں ڈالی ...... لیکن ٹھہریے —— یہ سفید جھوٹ .... زور سے بولا ہوا جھوٹ ہے اور ٹوٹے تھے، ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے معاشی مورچہ اور خودداری کی کشمکش نے ان کا تنکا تنکا بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ دیمک کی چاٹی ہوئی کتابوں کے اوراق کی طرح ان کا ہر ورق، ہر لفظ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ جلد شاید ریگزین کی تھی جو ساری عمر ڈھانپے رہی لیکن موت کے وقت یہ جلد بھی اس بری طرح پھٹی جیسے کسی نے سوزن کی نوک گڑا گڑا کر پوری بے رحمی سے پھاڑ ڈالا ہو۔ وہ کسی کی ہمدردی حاصل کیے بغیر ہی مر گئے۔

میں مطمئن تھا کہ وہ ہوا کی سمت دیکھ کر رخ بدلنے والے آدمی نہیں تھے۔ کیا ہوا اگر ان کی لاش پر ہمدردی کی پیپ چپی گو ند

چپکائے گئے تشفی کے رنگین کاغذ نہیں تھے؟ ہمدردی لفظ سے ہی انھیں نفرت تھی۔ اور اتنی جرأت کسی کے پاس نہ تھی کہ ان کی خواہش کے خلاف کوئی ان سے ایک لفظ بھی کہے۔ ان کی موت کے بعد آخری رسومات کے ساتھ داستان کا ایک حصہ۔ المیہ باب اختتام پر آیا۔

یہ دوسرا حصہ ہے۔ الف لیلوی داستانوں کی طرح رازوں سے بھرا، رومان سے لبریز، طلسمی کرشموں سے لبالب۔ بمبئی کے فلموں کے انٹرول کے بعد طربیہ انداز جیسا...... جہاں خوشی و مسرت کی بارش ہوتی ہے۔ عیش و عشرت کے نغمے پھوٹتے ہیں.....

مہاراج سانپ دھیرے دھیرے موٹے ہوتے جا رہے ہیں ٹوٹا پھوٹا مٹی کا مکان اب بنگلہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ سانپ کی پوجا کا معجزہ دیکھئے —— گوبر سے لپی دیوار پر اب سیمنٹ کے پلاسٹر ہیں۔ کھپتوں پر بجلی سے گھومتے پنکھے چکر لگا رہے ہیں مرکری ٹیوبوں سے دودھیا روشنی ابل پڑتی ہے۔ فرش رنگا رنگ موزیک سے چمک رہی ہیں۔ باہر کی بیٹھک کا نام اب ڈرائنگ روم پڑ گیا ہے اور تین پایوں والی تخت اور سرکنڈوں کے مونڈھوں کی جگہ اب وہاں مغلیہ حسن کاری سے مزین قالین فرش پر موجود ہے۔ اس پر گودریج کے صوفے اور گدے لگے ہیں اور صوفوں پر کھادی کے زنگار رنگ غلاف چڑھے ہیں۔ دروازہ کے ایک طرف شیشے کی کواڑوں والی الماری میں جدید طرز کی تصویریں سجی ہیں ایک گوشے میں نقاشی والے پایوں کی میز پر ایک چھوٹا سا مرتبان ہے جس میں طرح طرح کی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ صوفے سے تھوڑے فاصلے پر ایک ریڈنگ ٹیبل ہے۔ ایک ٹیبل لیمپ لگا ہوا ہے جسے خواہش کے مطابق کسی زاویے پر بدلا جا سکتا ہے۔ میز کی دائیں جانب ایک کھلا ہوا قد آدم ریک ہے جس میں درجنوں ریزی ناول اور دوسری موٹی موٹی کتابیں قرینے سے جمی ہیں۔ ان کا قرینہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ کیونکہ انھیں کوئی چھوتا بھی نہیں نیچے کی درازوں میں چاندی جیسی اجلی اجلی چکنے صفحوں والی ڈھیری میگزینیں رکھی ہیں۔ ان کا بھی کوئی قاری نہیں۔

گھر کا کایا پلٹ ہو گیا۔ —— خاندان کے ہر فرد کا رنگ ڈھنگ بدل گیا ہے۔ پوشاکیں، رہن سہن، چال ڈھال سے لے کر بول چال کی زبان بھی بدل گئی ہے۔ اب ہم روانی سے تہذ

بولتے سب کی زبان میں رعونت اور زبان میں آورد ہے۔ پہلے کے دیہاتی الفاظ اور محاورے زبان پر نہیں آتے۔ اب ان کے لیے انگریزی الفاظ کا [illegible] ہوتا ہے۔ خواہ ان کا مفہوم کچھ اور ہو۔ اب عورتیں جو نہایت گھریلو قسم کی زندگی گذارنے کی عادی ہو چکی تھیں الٹے پلو کی ساڑی اور ریچھ جیسے بالوں کے پیچھے سرگرداں رہتی ہیں۔ برتن مانجھنے کے لیے نوکرانی لگ گئی ہے۔ بھابی کے پیر میں جو دراڑیں پڑ گئی تھیں مندمل ہو گئی ہیں اب ان کے پاؤں ہر وقت اجلے، سفید کبوتر جیسے براق رہتے ہیں اور ان میں ہر دم سلیپر رہتی ہے۔ گھر میں اب بغیر سلیپر کے کوئی ایک قدم بھی نہیں اٹھاتا۔ ماں بھی اب سلیپر پہننے لگی ہے۔ اور اب آئے دن لتھا ہوتی ہے۔ سبھی اعلیٰ قسم کے لوگوں کو یہاں دعوت دی جاتی ہے بیچ حال کے ایک کونے میں جھانکی سجا کر سانپ مہاراج کی پوجا کی جاتی ہے۔ اور شہر کے شہرۂ آفاق پنڈت کتھا کہنے کو بلائے جاتے۔

سانپ مہاراج جنھیں دنیا کا مالک کہا گیا ہے ان کی کہانی یوں سنائی جاتی ہے:

عقیدت مند مرد، عورت اور بچو! یہ ساری دنیا سانپ کی تھوتھنی پر ٹکی ہے۔ اگر وہ غصہ ہو جائیں تو یہ زمین تحت الثریٰ میں غرق ہو جائے ابھی ابھی قیامت برپا ہو جائے سبھی ذی روح اور غیر ذی روح دفن ہو جائیں۔ اس لیے ان کی پوجا مصیبتوں سے نجات دلاتی ہے، غم کو مسرت اور غریبی کو امیری میں بدل دیتی ہے۔ ہر ناگ پنچمی کو پاک جذبات اور عقیدت سے سانپ مہاراج کے درشن کرنے کے لیے، خوشبودار اگربتی اور پھولوں کے ساتھ ساتھ خالص دودھ کا چڑھاوا بنا کر شادی شدہ اگر پوجا کریگی تو اس کا سہاگ امر ہو جائے گا۔ بانجھ عورتوں کی گود ہری ہوگی اور کنواریوں کو من چاہا گھر اور شوہر ملے گا۔ کیونکہ اے عقیدت مند مرد، عورت اور بچو! دنیا کی ساری دولت ان کے قبضے میں ہے۔ لکشمی ان کی گرفت میں ہے۔

اور اس کا اثر یہ ہوتا کہ سارا شہر اس کتھا کو سننے کے لیے امڈ پڑتا۔ ان کتھاؤں سے زیادہ ہمارے نت نئے پوسٹ بدلتے خاندان نے لوگوں کو سانپ کا مطیع و فرمانبردار بنا دیا۔ اب گھر گھر میں پرستش ہونے لگی مہاراج کی! اور وہ دن دن اپنی جسامت بڑھاتا گیا۔ اب اس کی طاقت بھی ہر دن بڑھتی اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سرخ اور خمار آلود ہو گئیں۔ اس کے جسم پر پنکھ نکل آئے تھے۔ اب رینگنے کے بجائے وہ ہوا میں پرواز کرتا۔

اس تبدیلی سے بھی لوگ نہایت خوفزدہ رہنے لگے تھے۔ ہر لمحہ پناہ گاہ کی تلاش میں رہتے۔ اور وہ اجلی راتوں میں سیر کرتا ہوا اچانک بادلوں کے بیچ اڑنے لگتا۔ اس کا سایہ تک اتنا زہریلا تھا کہ جس کسی پر پڑ جاتا وہ شخص اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا تھا۔ جسم کے جس حصے پر سایہ پڑتا وہی حصہ بے جان ہو جاتا۔ اس بلائے ناگہانی کی قیامت خیزیوں سے سبھی لوگ وحشت زدہ تھے۔ بشیر بیگ جو اکثر سانپ کو تنگ کیا کرتے تھے اس کے پنکھ دیکھ کر نیم مردہ تھے۔ سڑکوں کے کنارے کھیلتے یا کھیتوں پر سونے والوں میں بچے اپاہج ہو گئے تھے۔ خرگوش سی جان رکھنے والے بچے لقوہ کے پہلے حملے ہی میں راہیِ ملکِ عدم ہو جاتے ہیں۔ یہ وبا پھیلتی جا رہی ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔

سانپ! سانپ!! سانپ!!! جدھر دیکھیے مہاراج کی پوجا ہو رہی ہے۔ سارا کا سارا محلہ اس کے آگے قدم بوس ہے محلوں میں سانپ مہاراج کی متعدد کمیٹی بنائی گئی ہے۔ لاکھوں روپے جمع ہو چکے ہیں۔ ایک سنہری تخت اور چاندی کا چھاتہ بنایا جا رہا ہے۔ محلے کے سبھی بڑے اور برگزیدہ لوگ اس کمیٹی کے ممبر ہیں۔ اور اس کمیٹی کے صدر میرے بھیا ہیں۔ سارا کام انھیں کی دیکھ ریکھ میں چل رہا ہے۔ وہ بے حد مشغول ہیں۔ وہ آدھی رات کے بعد گھر لوٹتے ہیں۔ ان کے پاس آج کل موٹر گاڑی آ گئی ہے۔ زمین پر تو اب ان کے پیر ہی نہیں ٹکتے۔ کمرے تک آنے میں بھی انھیں سہارا دینا پڑتا ہے۔ اس وقت ان کی چال بری طرح لڑکھڑاتی ہوتی ہے۔ بلکہ سانپ کی طرح لہردار! ان کی آنکھوں میں سرخ ڈورے رہتے ہیں۔ چہرے پر سفاکی آنے لگی ہے۔ جیسے کرفیو والی رات میں کوئی کالی پوشاک والا نقاب پوش کالے جوتے پہنے کالی سڑکوں پر گشت لگا رہا ہو۔

گھر میں سارے عیش و عشرت کے سامان ہیں لیکن خاندان ایک چراغ کی کمی کی وجہ سے بجھا بجھا سا رہتا ہے۔ ڈاکٹر، حکیم وید سے لے کر ٹونے ٹوٹکے سبھی آزمائے جا چکے تھے لیکن بے سود.... لیکن سانپ مہاراج کی برکتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ بھابی امید سے ہیں.... آج فرصت کا دن ہے۔ ہر فرصت کے دن

کی طرح آج بھی سانپ سیڑھی ۔ Snake and ladde کا کھیل چل رہا ہے ۔ ڈرائنگ روم میں احباب کا جمگھٹ ہے ۔ سانپ اور سیڑھی ایک دوسرے کے متوازی ہیں جس گوٹی کو سانپ چاہتا ہے آگے نکل جانے دیتا ہے ۔ اور جس پر اس کی نظر لگ جاتی ہے اسے نگل کر دُم کے چھور پر پھینک دیتا ہے ۔ کھیل جاری ہے ۔ بھیا کی گوٹی ۹۸ کے خانے میں ہے ۹۹ کے خانے میں سانپ اپنا جبڑا کھولے پڑا ہے ۔ بھیا کو دو عدد ایک ساتھ چاہئیے اور یہ دیکھئے بھیا نے پانسہ پھینکا اور وہ ۱۰۰ کے خانے میں پہنچ گئے ۔ کمرے کی دہلیز پر ماں خوشی سے چلا رہی ہیں

۔ خاندان کے چراغ نے جنم لیا ۔ پورے خاندان کی تمنا بر آئی بہو نے ایک چھوٹے سے چکنی چکنی بھوری جلد والے نرم نرم پلپلے جسم والے خون آشام آنکھوں والے سانپ کو جنم دیا ہے ۔

اسے سانپ دیوتا کا اوتار مانتی ہوئی ماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے ہیں ۔ اور اس خاندان کے چراغ کے بجھ جانے والے باپ بھول کر کپا ہوتے جا رہے ہیں ۔ دعوتیں بھیجی جا رہی ہیں پارٹیوں کی تیاریاں شروع ہو گئیں ۔ اس دھما چوکڑی میں ماں کے کمرے میں ٹنگی والد کی تنہا تصویر گر کر چکنا چور ہو گئی ہے ۔ نوکر اس کی کرچیاں پھینک رہا ہے ۔ بھیا نے فوٹو کو اٹھا کر ایک کونے میں پھینک دیا اور پھر مشغول ہو گئے ۔۔۔ !!!

دلم پرکاش راہی

اپے سے ہم چلے کے بدلتے ہیں راستے
ے بڑھو تو پیچھے سرکتے ہیں راستے

و تو گھر سے گھر کا تعلق انہی سے ہے
ہو تو بے مقام بھٹکتے ہیں راستے

ن پہ ان کے پاؤں کے ایسے نشاں بنے ہیں
رہ کے جن کے دم سے دمکتے ہیں راستے

سو ہزار لوٹ کے برسیں تو پی کے چپ
قہقہہ اڑے تو کھنکتے ہیں راستے

ہا چلیں جو ہم تو چلے آئیں یہ بھی پاس
بوں کی بیٹھ پہ ہی ٹھٹھکتے ہیں راستے

موہن جاودانی

کس پر کریں بھروسہ اپنا کسے بنائیں
ہم داستانِ الفت کیوں کر زباں پہ لائیں

اس انجمن کے جلوے ہیں آج تک نظر میں
ان کی نوازشوں کو ہم کیسے بھول جائیں

اوروں کو تو پلا دے جی بھر کے جام ساقی
ہم تشنہ لب ہی رہ کر دیں گے تجھے دعائیں

جب کائنات دل پر ہے ان کی حکمرانی
کیا اس کی آرزوئیں کیا اس کی التجائیں

اس بے وفائی پر بھی موہن فدا ہے ان پر
وہ کیوں ستم نہ ڈھائیں وہ کیوں کریں وفائیں

ناوک حمزہ پوری

تکا کیے بہت اہلِ جہاں کی صورت
دکھائی دی نہ کسی مہرباں کی صورت

وفا، خلوص، محبت، مروت و ایثار
ہیں زیبِ طاقِ بتِ بے زباں کی صورت

بچا سکا نہ مجھے دھوپ کی تمازت سے
تنا ہوں تو سر پہ فلک سائبان کی صورت

نگر نگر بھی پھرا، جنگلوں میں بھی گھوما
کہیں نہ مل سکی امن و امان کی صورت

کئی سوال ابھی حل طلب ہیں اے ناوک
ہے زیست ایک کٹھن امتحان کی صورت

سید حبیب

کس قدر جھوم اٹھی مستی سے فضا آج کی رات
کیسی معمور ہے خوشبو سے ہوا آج کی رات

میرے آغوش میں ہے آج کوئی ماہ جبیں!
محفلِ نجم میں طوفاں ہے بپا آج کی رات

جانِ جاں تجھ کو ترے حسن و جوانی کی قسم
راز سب اپنی محبت کے بتا آج کی رات

تیر نظروں کے اتر جانے دے دل میں میرے
اپنی پلکوں کو حیا سے نہ جھکا آج کی رات

سروج رنجن مہانتی
مترجم: یوسف جمال

کاغذ کی کشتی کا ماتم

ساون کے بادل کا بھروسہ کیسے اور کس طرح کروگے
بن بلائے مہمان جیسا لیا جانے کس وقت تمہارے گلشن پر وہ برس پڑے گا
بالکل اچانک گھر کے دروازے اور کھڑکی کھول کے اندر آجائے گا
ساری کتابیں تر کردے گا، بستر، مسودہ شعروں کا، یادوں کی نادر تحریریں!
اس سے قبل کہ تم حیرت کے ساگر میں ڈوب جاؤ، ان چیزوں کے ساتھ تمہیں بھی نہلا دے گا

تم غلطاں ہو یادوں کی ٹیسوں کے احساسات سے عاری ہوتے ہیں
کیا یہ کھو دینے کی چیزیں ہیں؟ تو سوچ کے ان کو اپنے بدن سے دور کہیں تم پھینک سکوگے؟ گہرے زخم کو بھر پاؤگے؟؟؟
یہ تو تمہاری خوش فہمی ہے، خوش فہمی کا خول بدن سے اتار کے وہ لے جائیں گی، عریاں تم کو کر ڈالیں گی فاقہ کش مفلس کی صورت
یونہی پھر تم ہو کے تہی دست اور بھکاری
گزری باتیں سوچتے رہ جاؤگے زخموں کے زنداں میں قیدی ہو کر

ساون آخر ساون ٹھہرا
تحفے کی صورت میں دے جائے گا
دکھ کا جامہ جس سے اپنے عریاں بدن کو ڈھانپ سکوگے
کرب کی ہار اور بھولی بسری ساری صعوبت
نوکِ قلم پر کرکے یکجا

اور ———
کہانی، لفظوں کے میلے میں رہ کر بھی ہے ادھوری، جو کہ نہ پوری ہو پائے گی

ساون کی برسات میں اپنے جسم کے ہر اک پور پور کو اچھی طرح سے پیوست کرکے
اس کی ہر آواز کو اک ناداں سے بچے کی طرح جب اپنے دامن میں رکھوگے تو وہ لمحہ یاد دلا کر رکھ ڈالے گا بھولی بسری ساری باتیں
پھر تم
ان کو لے کر بیتے پل کی تصویر بنانے کی کوشش میں کھو جاؤگے

اور ـــــ اس لمحہ برش تمہارا کینوس پر چلنے میں مصروف رہے گا.......
مگر یکایک چونک پڑو گے، برش تمہارا رک جائے گا، تم کا جسم میں لرزہ آجائے گا، آنکھیں خوف کی راتیں لے کر کینوس کو تکتی ہوں گی
کہ رنگوں کے امتزاج کی گود میں بیٹھا گیلٹس مسکاتا ہوگا

جس طرح اساڑھ کے پہلے دن کی بارش کا پس منظر!
اسی طرح سیتا کے اغوا کا کرب ہے، ساون کی فرقت کا موسم سکھ کا خون جو پی جاتا ہے، ماہیٔ بے آب سا تڑپاتا ہے،
قاتل ساون کا موسم ہے!
زخم، جلن اور ٹیس کی رت ہے!!
خالی پن اور خونی موسم، تمہارے جذبات کے ہیں یہ!!!
ساون جس کی صورت عجب کیا رام گری کے دشت میں داخل ہوتی ہوگی (رہ جائے گی)
ایسے ہی زخموں کی ٹیسیں درد و کرب کے تحفے لے کر لمبی سی اک سانس کے رستے جسم کے بن میں در آئیں گی

جیسے مہماں اور اعزہ جب آتے ہیں، بچوں کو میٹھی چیزیں اور کچھ پیسے دے جاتے ہیں
بس ایسے ہی ساون بھی
رخصت کی اجازت لے کر تم سے جب جائے گا، تو وہ تم کو
دے جائے گا
سوگ کا اک انعام انوکھا

اور ـــــــــ
اس کے جانے کے بعد یہ سچ ہے کہ
تم کاغذ کی کشتی کی طرح بہتے رہو گے، بہہ جاؤ گے
اس کے ماتم کی لہروں میں

(ڈاڑیا نظم)

ط۱: ساؤتھ لنکا میں اک پہاڑ ہے جو "رام گری" پہاڑ کے نام سے موسوم ہے
لنکا میں حملہ کے درمیان رام اس پہاڑ پر ٹھہرے تھے ـــ ی ج

بزم احباب

تنہا تماپوری (رنگم پیٹ)

"غلطیہائے مضامین" کے ذریعہ جن تاریخی تسامحات کا اظہار کیا گیا ہے وہ نہایت ہی اہم ہیں۔ بسمل صاحب نے ڈاکٹر پانڈے کے حوالے سے بھٹکی ہوئی عقل کو راستہ بتایا ہے۔ تاریخی حقائق کو ایمانداری سے پیش کرنے کے لیے عقل کی ترازو کے پلڑے برابر رکھنا مشکل کام تو ہے ہی لیکن اصل کام بھی وہی ہے۔ تاریخی غلطیاں ہی ہندو مسلم منافرت کی جڑ ہیں۔ آج کے اس سائنسی دور میں ہر قسم کے تعصب سے آزاد ہو کر تاریخی حقائق کی چھان بین کے ذریعہ پائیدار بنیادوں پر قومی یکجہتی کے لیے خوشگوار فضا پیدا کی جا سکتی ہے۔ آج ملک کے اس نئے دور میں ایک اہم ترین بنیادی مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے "تحریک" نے اپنی صحافتی ایمانداری کا ثبوت دیا ہے۔

• "اجین کے مندر" کرشن موہن کی بہت ہی کامیاب نظم ہے ایک طرف بھوگ لگا کر، مدرا کا پرساد دیا جاتا ہے، اور مندر کے بل پر ایک پجاری دس سکّے اور صدہا کپڑے پلتے ہیں۔ !!!۔ جب کہ اسی مندر کے سلیے راجہ وکرم نے تنتر یوگ کے سادھن سے سدھی پانے کی کوشش کی تھی۔ ایک اور مہاکال کی مورتی پر روزانہ تازہ گرم چتا کی راکھ رما کر آرتی کی جاتی ہے ––– تو ––– دوسری طرف کالی داس کا وہ مندر بھی ہے جس میں اس نے جہل سے چھٹکارا پانے کی خاطر کالی ماں کی پوجا کی تھی اور کویتا کا وردان پایا تھا۔ لیکن اب یہ مندر ٹوٹا پھوٹا ہے۔ اس میں چمگادڑوں کا بسیرا ہے اور بھوتوں کا ڈیرا ہے اور یہ مندر ایک ویرانی کا درشن ہے۔ نظم کے یہ دونوں رخ ایک ایسے تاثر کو ابھارتے ہیں جس کی تلخی بہت دور تک محسوس کی جا سکتی ہے نظم کے پہلے حصہ میں کتوں اور کیڑوں کی صف میں پجاری کو بھی پالا گیا ہے، تو دوسرے یعنی آخری حصے میں چمگادڑوں اور بھوتوں کا بسیرا بتا کر جس طنز کو ابھارا گیا ہے وہ بہت ہی جاندار ہے۔

• "شکست جمود" میں ماحول کی یکسانیت سے تنگ آ کر نہ نگاموں کی تلاش میں آدم کا خلد سے نکلنا ہی شکست جمود نہیں ہے بلکہ ہمارے دور تک پہنچتے ہوئے ابن آدم کی خلائی پرواز بھی زمینی یکسانیت سے دور آسمانی (خلائی) ہنگاموں کی طرف پرواز کا عمل بھی شکست جمود کا عصری ثبوت ہے۔ اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا تو نظم کا کینوس کچھ اور وسیع ہو سکتا تھا۔ "ماننگے کا اجالا" اور "تبصرے" بھی کافی جاندار ہیں۔

اعجاز اعظمی (ملیشیا)

• "تحریک" ہر مہینے ذوق مطالعہ کی تسکین کا سبب بنتا ہے خاص طور سے بزم احباب میں شائع ہونے والے مکتوبات میں اتنی گیرائی اور گہرائی ہوتی ہے کہ اس کے مطالعہ سے پورے ہند کی اردو تحریک آئینہ کی طرح سامنے آ جاتی ہے اور ہر مکتب خیال کے لوگوں سے تحریک کے ذریعہ ملنے کی سعادت نصیب ہو جاتی ہے اس ماہ پرکاش فکری کا مکتوب نہایت جامع اور فکر انگیز ہے۔ غلطیہائے مضامین میں گوپال متل صاحب نے جو باتیں کہی ہیں یہ انھیں کا حصہ ہیں۔ گوپال متل، مخمور سعیدی، عروج زیدی صاحبان کی غزلیں پسند آئیں۔

غلام مرتضیٰ راہی کی غزل "درخت کی کلائیاں مروڑ کر چلا گیا" جو تحریک کے اگست کے شمارے میں شائع ہوئی ہے پچھلے ماہ "بدشنی" میرٹھ میں بھی چھپ چکی ہے۔ شاعروں کو اپنی اس لاپروائی سے احتراز کرنا چاہیے۔

سورج تنویر (ہنڈی گڑھ):

'تحریک' بابت ماہ ستمبر ۷۵۔ "نظر نواز ہوا" 'انجمن' پر تبصرہ کرتے ہوئے (آخری صفحہ پر) بالکل صحیح لکھا گیا ہے کہ :۔

• افسوس ہے کہ کتابت و طباعت کی عمدگی کی طرف پبلشر نے دھیان نہیں دیا۔ کتابت کی غلطیاں بکثرت راہ پا گئی ہیں اور قاری کو بے لطف کرتی ہیں۔ "کتابت کی غلطیاں یقیناً قاری

کو بے لطف کرتی ہیں ۔ اس لیے یہ عرض شاید بے جا نہ ہو کہ "تحریک" میں بھی اس جانب خاص توجہ دی جانی چاہیے ۔ "تحریک" جیسے موقر جریدہ میں کتابت کی بعض فاش غلطیاں بہت اکھرتی ہیں ۔ مثلاً محولہ بالا فقرے میں ہی "بکثرت" کو "بکسرت" لکھا گیا ہے ۔ سرسری طور پر دیکھنے سے کئی دیگر مقامات پر بھی بعض ایسی غلطیاں پائی گئیں جو بے توجہی کا نتیجہ ہیں ۔ مثلاً

صفحہ ۷ پر رضا ابن فیضی کی غزل کے آٹھویں شعر میں "شراب طہور" کی جگہ "شراب ظہور" لکھا گیا ہے ۔ اور اسی صفحہ ۷ پر حرمت الاکرام کی غزل کے تیسرے شعر میں "جراحت" کی جگہ "جرات" درج ہے ۔

صفحہ ۳۵ پر پہلے کالم کے دوسرے پیرا کی دوسری سطر میں "طرفداری" کو "ترفداری" لکھ دیا گیا ہے ۔ صفحہ ۳۶ پر انیسویں سطر میں درج لفظ "ملعون" غالباً "مطعون" تھا

صفحہ ۳۹ پر دوسرے کالم میں درج حافظ کے اس مصرع

"کجا دانند حالِ ماسبکسارانِ ساحل ہا"

کو تبدیل کر کے ؎ "کجا دانند حالِ ماسبک رانِ ساحل ہا" بنا دیا گیا ہے ۔

صفحہ ۳۹ پر ہی پہلے کالم کا آخری شعر میر کے اس شعر کا مصرع اوّل ؎ ذلیل اس کی گلی میں ہیں تو ہیں آزردگی کیسی" اس مصرع میں دوسرا "ہیں" غالباً "ہے" ہونا چاہیے ۔

صفحہ ۴۱ ۔ کالم دوسرا سطر گیارھویں میں ہے ۔

"ان کا ذکر کرنا گزیر ہو جائے" ۔ اس فقرے میں یا تو ایک "گز" زیادہ لکھا گیا ہے یا ایک "نا" کم ۔ اسی صفحہ پر اٹھارہویں سطر میں "واقعات" کی بجائے "واقعاٹ" لکھ کر گویا شاہی تلفظ میں تبدیل کر دیا گیا ہے ۔

خیر ! عرض کرنے کا مطلب محض یہ ہے کہ آئندہ پروف پڑھنے کی جانب مزید توجہ مبذول فرمائی جائے ۔

دوسری گزارش ایک استفسار ہے جس طرح کہ تحریک میں بھی زیر نظر شمارہ کے صفحہ ۳۹ پر ہے ۔ حافظ کا یہ مصرع ۔

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی

ہندوستان میں شائع ہونے والے دیوانِ حافظ کے اکثر نسخوں میں اسی طرح درج ہے ۔ ان میں دیوانِ حافظ کا وہ مترجم نسخہ بھی شامل ہے ۔ جسے قاضی سجاد حسین صاحب نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے ۔ ــــ لیکن ایران سے شائع ہونے والے دیوانِ حافظ کے بعض نسخوں میں یہ مصرع بدلی ہوئی صورت میں ملتا ہے ۔ اس وقت میرے پیشِ نظر دیوانِ حافظ کا وہ مصوّر نسخہ ہے جسے عبداللہ باقری نے مرتب کیا ہے ۔ "مطبع شرکت آفست (سہامی خاص)" نے چھاپا اور اس کے ناشر "انتشارات امیر کبیر" کیا دیباچہ میں متن کے صحیح ترین ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے اور اس نسخہ میں زیرِ بحث مصرع اس صورت میں درج ہے ۔

؎ اگر دشنام فرمائی و گر نفرین دعا گویم

(جواب تلخ میزیبد لب لعل شکر خا را)

مشتاق علی شاھد (مالوی)

کمار پاشی کی "اردو دشمنی" کے سلسلے میں جو لے دے چل رہی ہے ، اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس "اردو دشمنی" سے تکلیف سردار جعفری کو ہوئی ہے جن کی "اردو دوستی" سے اردو دنیا خوب واقف ہے !

راج کمیتی (رھگواڑہ)

اگست کا تحریک ملا بشکریہ ۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ تحریک میں "مانگے کا اجالا" پھر سے شروع کر دیا گیا ہے ۔ منظومات میں سے جناب کرشن موہن ، گوپال متل صاحب ، ساحر ہوشیارپوری ، مخمور سعیدی ، رونق جہاں زیدی ، احمد وصی ، احتشام اختر ، عبداللہ کمال اور ظفر غوری کا کلام بہت پسند آیا ۔ مضامین میں گوپال متل صاحب اور ڈاکٹر صابرہ سعید کے مضامین بہت خوب ہیں

پریم کمار نظر (ہوشیارپور)

۱۸ ستمبر کو آل انڈیا ریڈیو دہلی کے پروگرام "اردو مجلس" میں تین طرحی غزلیں سنوائی گئیں ۔ شعرا تھے محسن زیدی ، شہاب جعفری اور شہریار پرواز ۔ مصرعہ طرح تھا : ہم تو چمن پرست ہیں ، پھول کہاں کے خار کیا ۔

اناؤنسر صاحب نے مصرعۂ طرح کو جگر مرادآبادی سے منسوب کیا لیکن دراصل یہ مصرعہ جگر کا نہیں فانی بدایونی کا ہے ۔ فانی کا مطلع ہے :

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد نہیں بہار کا ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

جگر صاحب کا ایک شعر ہے جو کم و بیش اسی مضمون کا حامل ہے ۔ اناؤنسر صاحب کو غالباً اسی لیے یہ تسامح ہوا ۔ وہ شعر یہ ہے :

[illegible]

جو ہم میں نہیں رہے

اردو زبان وادب نے پچھلے دنوں اپنے کچھ خاموش خدمت گزاروں کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ یہ تھے کنور یٰسین علی خاں صاحب شہاب برنی، جنابِ نقش ساہنی، جنابِ الیس الیس پرویز اور جنابِ محمد علی خاں عاجز۔

کنور یٰسین علی خاں شہاب، برنی یو۔پی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ولادت ۲۰ دسمبر ۱۸۹۸ء کو ریاست کھیلیا، ضلع بلند شہر میں ہوئی تھی۔ اس زمانے کے رئیس خاندانوں کے رواج کے مطابق گھر پر رہ کر پہلے اردو و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر انھیں دہرہ دون بھیجا گیا جہاں انھوں نے ایک انگریز معلم سے انگریزی پڑھی۔ پھر اپنے پھوپھی زاد بھائی نواب مکرم علی خاں صاحب رئیس بہاسو کے ساتھ یورپ گئے اور وہاں کے کئی ملکوں کی سیاحت کی۔ اب کئی برس سے جے پور میں مقیم تھے۔ وہیں وفات پائی۔

کنور صاحب مرحوم کا شمار اردو کے صاحبِ طرز نثر نگاروں میں ہونا چاہیے۔ انھوں نے نثر کی ہر صنف، مثلاً افسانہ، ناول ڈراما، میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنے دور کے ادبی مبصرین سے داد و تحسین حاصل کی ہے لیکن ڈراما نگاری میں انھیں خصوصیت حاصل تھی۔ وہ آغا حشر کاشمیری کے قریبی دوستوں میں تھے اور کئی سال ان کے ساتھ رہے بھی۔ اس زمانے کی تھیٹریکل کمپنیوں کے لیے انھوں نے بہت سے ڈرامے لکھے جو اسٹیج پر بھی مقبول ہوئے اور جب یہ شائع ہوئے تو ادبی حلقوں میں بھی انھیں پسند کیا گیا۔ ان کا پہلا ڈراما جو ماہ نامہ نیرنگِ خیال لاہور میں ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا "برزور رستم" تھا۔ انھیں دنوں یہ ڈراما اتر پردیش کے نصاب برائے میٹرک میں شامل ہو گیا تھا اور تقسیم سے پہلے تک یہ اس نصاب میں داخل رہا۔ ان کے دوسرے ڈرامے جنھیں خصوصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ تھے: امتحان، وعدہ، اشرف المخلوقات، حلقۂ زہرہ و مشتری، اہرمن و یزداں، فاروقِ اعظم اور کچھ دوسرے ڈرامے جو متعدد ادبی رسالوں میں شائع ہوئے اور وقتاً فوقتاً اسٹیج بھی کیے گئے۔

ماہنامہ "نیرنگِ خیال" کے صفحات پر شہاب صاحب مرحوم اور محترمہ حجاب امتیاز علی کے درمیان ایک سلسلۂ مضامین بھی عرصۂ دراز تک جاری رہا۔ اس وقت تک حجاب صاحبہ سید امتیاز علی تاج کے عقد میں نہیں آئی تھیں اور ان کا قلمی نام حجاب اسمٰعیل تھا۔ وہ "سیاح عورت کا خط اپنے پردیسی محبوب کے نام" لکھا کرتی تھیں اور شہاب صاحب جواباً "سیاح عورت کے نام اس کے پردیسی محبوب کا خط" لکھا کرتے تھے۔ یہ سلسلۂ مضامین قارئین میں اس قدر مقبول تھا کہ کسی مہینے ناغہ ہو جاتا تو ایڈیٹر کی میز شکایتی خطوط سے بھر جاتی۔

مرحوم نے ۱۹۲۵ء میں جے پور سے ایک ادبی ماہنامہ بھی "شباب" کے نام سے جاری کیا تھا جو کئی سال جاری رہا۔ اس رسالے میں اس زمانے کے کئی مشہور ادیب اور شاعر مثلاً مولانا محمد علی جوہر، مولانا سیماب اکبرآبادی، پطرس بخاری، مولانا اطہر ہاپوڑی، مرزا مائل دہلوی، مولانا انوار الرحمٰن بسمل، کرنل ولی احمد خاں، میکش اکبرآبادی، آغا حشر کاشمیری، سہا مجددی وغیرہ باقاعدہ سے لکھا کرتے تھے ــــــ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان وہ دہلی کے بعض اخبارات کے مدیر یا نگراں بھی رہے جن میں ہفت روزہ "جماعت" ہفت روزہ "جمہور" اور روزنامہ "الہلال" کے نام شامل ہیں۔

مرحوم کو شعر گوئی سے بھی شغف تھا۔ کم کہتے تھے لیکن اچھا کہتے تھے۔ اور صرف بے تکلف محفلوں ہی میں سناتے تھے۔ کبھی کبھی ان کا کلام رسالوں میں بھی نظر آجاتا تھا۔ بیان کی آراستگی اور سجاوٹ جو ان کی نثر کا خاصہ تھی شاعری میں بھی اپنی جھلک دکھا

اور ان کے کلام کو انفرادیت بخشتی تھی۔

مرحوم کی آخری تحریر ڈراما فاروقِ اعظم تھا جو ان کے انتقال سے ایک سال پہلے ہفت روزہ "بدلا ہوا زمانہ" جے پور میں شایع ہوا۔

انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۷۰ سال تھی۔ پس ماندگان میں دو لڑکے ہیں۔ نفاست علی خاں اور فصاحت علی خاں۔ اوّل الذکر خود بھی ایک با صلاحیت ادیب اور شاعر ہیں اور ادبی حلقوں میں راہی بلند شہری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ راجستھان کی ممتاز ادبی شخصیتوں میں ان کا شمار ہے اور ان دنوں وزیر اعلیٰ راجستھان جناب ہری دیو جوشی کے پریس اٹیچی کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

جناب رگھوناتھ نقش ساہنی کا نام قارئین تحریک کے لیے نیا نہیں۔ ان کا کلام تحریک میں شایع ہوتا رہا ہے۔ شاعروں میں بھی ان کا کلام پسند کیا جاتا تھا اور یو۔پی کے اکثر مشاعروں میں وہ شریک ہوتے تھے۔ خود بھی گاہ بہ گاہ ادبی نشستوں کا اہتمام کرتے تھے جن میں شعر و شاعری بھی ہوتی اور پھر اس پر اظہارِ خیال بھی۔ اردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہربنس لال ساہنی اور امر ساہنی دونوں ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اور ان کی ادبی صلاحیتوں کو سنوارنے میں بھی نقش صاحب کا حصہ رہا ہے۔ قیام میرٹھ میں تھا وہیں انتقال ہوا۔ نقش صاحب غزلوں کے علاوہ قطعات بھی کہتے تھے۔ کلام پُر اثر تھا اور زبان و بیان کے لحاظ سے بے عیب۔ ضرورت ہے کہ ان کے منتشر کلام کو یکجا کر کے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا جائے۔

جناب ایس ایس پرویز اردو کے اچھے افسانہ نگاروں میں تھے۔ کاروباری مصروفیتوں کی وجہ سے کئی برس سے انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن ان کے پرانے افسانوں میں سے آج بھی بہت سے افسانے توجہ طلب ہیں۔ کچھ مدت تک ان کے زیر ادارت اردو کا ایک ادبی ماہنامہ بھی "شعاعیں" کے نام سے نکلتا رہا تھا۔ ان دنوں گے ویز پبلسٹی کے نام سے وہ اشتہارات کی ایک ایجنسی چلا رہے تھے جو کاروباری اعتبار سے بہت کامیاب تھی۔ اشتہار دینے کے معاملے میں اردو اخبارات و رسائل کو ترجیح دینے کی کوشش کرتے تھے جو ایک طرح سے اردو کے ساتھ ان کے پرانے جذباتی لگاؤ کا اظہار تھا۔ انتقال نئی دلی کے جی۔ بی پنت ہاسپٹل میں ہوا۔ عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔

صاحبزادہ محمد علی خاں صاحب عاجز راجستھان کے کہنہ مشق شاعروں میں تھے۔ ۹۰ سال کی عمر پائی۔ علمِ عروض پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ تقسیم سے پہلے ریاست ٹونک میں ایک کل ہند طرحی مشاعرہ ہوا۔ مصرعہ طرح غالب کا یہ مصرعہ تھا: آگہ مری جان کو قرار نہیں ہے۔ وزن ذرا ٹیڑھا تھا۔ بہت سے مقامی اور بیرونی شاعروں نے ٹھوکریں کھائیں۔ اس پر مصرعۂ طرح کے مجوز مولانا ظہیر ہاپوڑی بہت خوش ہوئے لیکن عاجز صاحب ان سے الجھ پڑے اور ان کے بہت سے اعتراضات کو غلط ٹھہرایا ـــــ صنائع بدائع اور رعایت لفظی کے بڑے دلدادہ تھے۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتے اور لفظی تلازموں کے باغ لگا دیتے۔ دوسروں کے شعروں کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھتے۔ راقم الحروف نے ایک بار ان کے سامنے کوئی شعر پڑھا جس کا مفہوم کچھ یہ تھا کہ کسی سے جدا ہو کر مجھے ایک گھڑی چین نہیں۔ مرحوم نے داد دیتے ہوئے فرمایا: گھڑی کے ساتھ چین کا لفظ کیا خوب باندھا ہے۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

بقیہ: ماتھے کا اجالا

یعنی "اب" کو "اب" اور "اس" کو "ایس" لکھا جاتا تھا؟ اس سہل نگاری کی کوئی انتہا ہے؟ اس سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قواعد سے موصوف کس حد تک تعلق خاطر رکھتے ہیں۔

۲۔ گھاس کو بھی پہلے "گھانس" بولتے اور لکھتے تھے (حوالہ ایضاً) جس تعمیم کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ پہلے "گھانس" مستعمل تھا وہ کسی طرح قابل قبول نہیں۔

۳۔ بعض جگہ ان کے قلم سے کچھ ایسے لفظ بھی نکل گئے ہیں جو کے مرادف ہمارے ہاں ملتے ہیں، مثلاً برس... "بیڑ" (ایضاً ص ۲۰)۔ بڑی عنایت ہوگی اگر مالک رام صاحب یہ بتا دیں کہ اردو میں "بیڑ" کا مرادف کیا ہے؟

(سلمان احمد) ـــــ اردو تحقیق اور مالک رام

مانگے کا اُجالا

لغت اور مالک رام

ترقیِ اردو بورڈ (دہلی) نے اردو کا ایک مفصل لغت مرتب کرانے کا منصوبہ بنایا ہے اور اس سلسلے میں کام کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔

اس لغت کے ایک مؤلف مالک رام کی بعض نگارشات کا اس اعتبار سے جائزہ لینا چاہتا ہوں کہ لغت نویسی جس علمِ زبان کا مطالبہ کرتی ہے اس کا کیا حال ہے۔ مالک رام صاحب کی تحریروں کو اگر ذرا نظر جما کر دیکھا جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ وہ زبان کے مزاج شناس نہیں اور زبان سے کما حقہٗ واقف بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ہر طرح کی غلطیاں کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ ایسی غلطیاں اور اس کثرت کے ساتھ کہ تعجب ہوتا ہے۔ وہ معمولی معمولی الفاظ کے صحیح استعمال سے باخبر نہیں معلوم ہوتے اور معمولی قواعد سے بھی آشنا نظر نہیں آتے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی تحریروں میں محاورات، تذکیر و تانیث، استعمالِ الفاظ وغیرہ کی نہایت درجہ معمولی غلطیاں بہت بڑی تعداد میں بکھری ہوئی ہوں تو کیا اس شخص کی لغت نویسی کو محلِ استناد میں لایا جا سکتا ہے؟ یہ معمولی سوال نہیں، ضمنی طور پر اس سے اس کا بھی اندازہ کیا جا سکے گا کہ لغت نگاری جیسے اہم کام کو ترقیِ اردو بورڈ کے اربابِ حل و عقد کس نظر سے دیکھتے ہیں اور انتخابِ افراد میں کس قدر محتاط ہیں؛ اور یہ بھی کہ اگر شہرت کو تنقید کی کسوٹی پر نہ کسا جائے تو اس سے کس قدر غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جھوٹی شہرت کی وجہ سے اکثر صورتوں میں نہایت درجہ مہتم بالشان کاموں کو مطلقاً نااہل شخص کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

● "اس کتاب کے پڑھنے اور ترجمہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کروے کریلے پر گویا نیم چڑھ گئی" (نذرِ عابد، ص ۸۹)

اردو کے اہلِ زبان اور زبان دانوں کو اب معلوم ہو جانا چاہیے کہ صحیح محاورہ کیا ہے اور اس کے لیے ان کو مالک رام صاحب کا مشکور ہونا چاہیے۔ اس اطلاع کے لیے بھی ان کا شکریہ ادا کیا جانا چاہیے کہ دراصل بیل نیم کی ہوتی ہے جو کریلے کے درخت پر چڑھا کرتی ہے۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!

● "جب ایرانیوں کی مدد سے ہمایوں نے دوبارہ اس ملک پر اپنا تسلط جما لیا" (مقدمۂ غبارِ خاطر، ص ۷)۔

"تسلط جما لینا" پر کچھ زیادہ حیرت کا اظہار نہ کیجیے کیونکہ ابھی اس سلسلۃ الذہب کی کئی کڑیاں باقی ہیں۔ فی الحال "غلبہ مسلط ہونا" ملاحظہ فرما لیجیے۔

● "جب انگلستان کا سیاسی غلبہ اس ملک پر مسلط ہو گیا" (ایضاً ص ۱۹)۔

ایجادِ بندہ ہے سہی، مگر ہیں تو نئی باتیں!

● "مزید برآں، اردو کے غلط الفاظ اور غلط مخارج جو مکہ میں عرب بولتے ہیں، اُن کی زبان پر بھی رائج تھے" (مقدمۂ غبارِ خاطر ص ۱۷)۔

"مخارج بولنا" اور "مخارج کا زبان پر رائج ہونا" اردو زبان میں اضافے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس لغت کے مرتب یہ صاحب ہوں گے، اس لغت میں ایسے جواہر پاروں کو لازماً جگہ ملے گی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس لغت کا کیا حال ہوگا۔

● "یہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے کانووکیشن (سالانہ جلسے) میں ایم اے کی سند تک وصول کرنے کو نہیں جا سکے" (تذکرۂ ماہ و سال؟ ص ۴۳)۔

"کو" کا استعمال اردو والوں سے داد طلب ہے۔ "کانووکیشن" کا ترجمہ "سالانہ جلسہ" مزید برآں۔

● "جو روپیہ قرض لے کر آئے تھے وہ سارا خرچ ہو چکا تھا

اور لیسر اوقات کے لیے کوئی انتظام سامنے نہیں تھا۔" (نذرِ عابد ص ۵۷)

• "انتظام سامنے نہیں تھا" اردو روزمرہ کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ اسی قبیل کی ایک اور مثال بھی ملاحظہ فرمائیے۔

• "انھوں نے مسلم ہوسٹل میگزین کے نام سے اردو میں ایک رسالہ جاری کیا۔ ۔ ۔ ۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ جو قلم انھوں نے مسلم ہوسٹل میگزین کے الفاظ لکھنے کو ہاتھ میں لیا ہے" (ایضاً ص ۴۳)

• "ایک سید نور اللہ تھے جو بعد کے زمانے میں صوبہ بمبئی میں محکمہ تعلیم کے ڈپٹی ڈائرکٹر رہے اور پھر وہاں سے فارغ ہوئے اور پنشن پانے کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (ایضاً ص ۴۷)۔

• "ریٹائر ہونے" کے لیے "فارغ ہونا" لکھنا، اردو کے روزمرہ سے کم آشنائی کا اعلان کرنا ہے۔

• "سعدی کا اصلی شعر ہے" (ایضاً ص ۵۹)۔ "اصل" کی جگہ "اصلی" لکھنا، روزمرہ کی جان پر ستم توڑنا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ لکھنے والا، زبان کا مزاج شناس نہیں۔

• "بلکہ اس میں اصلی تخلیق کی شان پیدا ہو گئی ہے" (ایضاً ص ۹۶) "اصلی شعر" کے ساتھ اس "اصلی تخلیق" کو بھی ملاحظہ فرمائیے !!

• "اور موجودہ رام پور کے ارد گرد کے علاقے پر قبضہ کر کے یہاں اپنا عمل دخل جاری کر دیا" (نذرِ عرشی، ص ۶۱)

• "عمل دخل جاری کر دینا" نیا محاورہ ہے جس سے اردو زبان ناواقف ہے۔

• "تسلط جما لینا" اور "غلبہ، مسلط ہونا" کی قبیل کا اضافہ ہے دیکھیے، اردو کے نئے لغت کے لیے، اردو کا نیا محقق "اختراعاتِ فائقہ" کے کیسے انبار لگا رہا ہے۔

• "اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے اپنی اس والدہ کی خدمت میں کوتاہی کی" (ایضاً ص ۲۱)۔

اردو کا مزاج شناس "اس والدہ" کبھی نہیں لکھے گا، کیوں کہ اس کو معلوم ہو گا کہ "ماں" اور "والدہ" کے الفاظ کن لفظوں کے ساتھ تناسب کے دائرے میں آتے ہیں۔

• "فلسفے کے ادق سے ادق مسائل کو چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے" (ایضاً ص ۱۶۰)۔

• "چٹکیوں میں حل کر دینا" بھی ایجادِ بندہ ہے، اردو زبان اس محاورے سے ناآشنا ہے۔

• "یہاں انھوں نے بڑی جاگیریں اور زمینداریاں پیدا کر لیں۔ پہلے ان کے ہاتھ میں تلوار تھی تو اب ہل تھا۔" (مقدمۂ غبارِ خاطر ص ۶)

• "زمینداریاں پیدا کر لینا" نہ تو روزمرہ کے دائرے میں آتا ہے، نہ خوش مذاقی سے میل کھاتا ہے، معمولی لکھنے والا بھی اس قدر بھدا اندازِ بیان اختیار نہیں کر سکتا؛ مگر ان سب سے بڑھ کر ہے یہ اندازِ نگارش کہ پہلے ہاتھ میں تلوار تھی تو اب ہل تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش ذوقی واقعی خدا کی دین ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ زمیندار اور جاگیردار کے ہاتھ میں ہل ہوا کرتا ہے !! یہاں بردہ مثل یاد آتی ہے جس میں ایک جاٹ نے کھاٹ کے قافیے میں تیلی کے سر پر کولھو رکھ دیا تھا اور جواز یہ بتایا تھا کہ تک نہیں ملی تو نہ سہی، بوجھ تو بڑھ گیا۔

• "اور پھر یہ سب کچھ ایسی سہلِ ممتنع زبان میں بیان ہوا ہے کہ اس کا جواب نہیں" (ایضاً ص ۱۳)۔

اب تک تو یہ سنا تھا کہ سہلِ ممتنع نظم کی صنعت میں آتا ہے، اب پہلی بار ایک صاحب گویا یہ تلقین فرماتے ہیں کہ یہ نثر کے لیے بھی مستعمل ہے۔ اسے اعجوبہ نگاری کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ "سہلِ ممتنع" کے ساتھ "زبان" کا اضافہ کیا گیا ہے اور یہ "سہلِ ممتنع زبان" اردو کے لیے نئی اصطلاح ہے مژدہ باد !!

• "چائے کی پتی، اس کی کاشت کی تاریخ، اس کے دوسرے لوازمات" (ایضاً ص ۴۴)۔

• "لوازمات" جمع الجمع ہے، اس کی جگہ بہ آسانی "لوازم" لکھا جا سکتا تھا۔ اسے غلط نہ کہیے، مگر فصیح و غیر فصیح بھی ایک چیز ہے اور معروف لکھنے والوں سے اس کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس پہلو کو ضرور پیشِ نظر رکھیں گے۔

• "ان دونوں اشاعتوں کے ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی تھے" (ایضاً ص ۱۴)۔

اس جملے میں "تھے" کا استعمال اہلِ نظر سے داد طلب ہے۔ ایسے ہی جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کس بات کو کس طرح نہیں کہنا چاہیے۔

• "بقیہ دو جلدیں بھی غالباً اگلے سال ایک میں شائع ہو جائیں گی" (ایضاً ص ۲۱)۔

• "ایک میں" کی بلاغت اور فصاحت بھی قابلِ توجہ ہے۔

• "گھر پر بھی سلیپر یا چپل میں رہتے" (ایضاً ص ۱۲۶)۔

• "چپل میں رہنا" کو اردو کے روزمرہ سے علاقہ نہیں۔ کیا اسے بھی اُس نئے لُغت میں جگہ ملے گی؟

• "لیکن اس پر رائے زنی کرنے کا میرا کوئی حق نہیں" (ایضاً ص ۱۰۵)۔

پورا جملہ کاواک اندازِ بیان کا مجموعہ ہے۔ زبان کا مزاج داں یہاں پر "مجھے حق نہیں پہنچتا" یا اسی انداز کا کوئی اور جملہ لکھتا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس نامانوس اندازِ بیان میں یہ "بالیجر نیاپن" پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

• "اس کے علاوہ بھی صلائے عام تھی" (ایضاً ص ۷۶)۔

• "علاوہ بھی" کی بلاغت داد سے بے نیاز ہے۔

• "میں ان ایام میں اپنے کام کے سلسلے میں شملے میں مقیم تھا..... نواب صاحب مرحوم نے بھی مجھے دعوت دی کہ جب پہاڑ سے اتریں تو یہاں آئیے اور کتاب خانہ دیکھ جائیے۔" (ایضاً ص ۷۶)۔

• "اتریں" اور "آئیے" کا اجتماع، عجیب الخلقت سہی مگر ہے نیا، اور اس کی داد دینے کے لیے ایسے ہی ایک اور "محقق" اور "لغت نویس" کو تلاش کرنا ہوگا۔

• "کبھی وہ پیشانی پر بل نہیں لائے"۔ (ایضاً ص ۱۰۶)۔

• "پیشانی پر بل لانا" اس محاورے سے اردو کے لغات خالی ہیں، اور اہلِ زبان ناآشنا ہیں۔

• "منصوبے کے مطابق سب شہروں میں جلسے ہو رہے تھے۔ قراردادیں ہو رہی تھیں۔ پوسٹر چھپ رہے تھے" (ایضاً ص ۱۲۵)۔

• "قراردادیں ہونا" سے بھی اردو زبان واقف نہیں۔ یہاں روزمرّہ ہی تباہ نہیں ہوا، معنویت پر بھی حرف آگیا ہے۔

فنِ لغت نویسی اور علمِ زبان کو مژدہ ہو کہ ایک صاحب اردو میں ایسے گراں قدر اضافے فرما رہے ہیں۔

• "حال آنکہ انھیں شائع ہوئے ڈیڑھ صدی سے زیادہ کا زمانہ گزر چکا ہے" (مقدمۂ گلِ رعنا، ص ۷)۔

• "زیادہ کا زمانہ" کم فصاحتی کی چغلی کھا رہا ہے۔

• "پھر بھی چند کتابیں اِدھر اُدھر پڑی رہ گئی تھیں، انھیں میں سے یہ دو میں آپ کے لیے تحفہ لیتا آیا ہوں" (ایضاً ص ۱۲)۔

• "تحفہ لیتا آیا ہوں" بھی اپنی عجیب الخلقی کے باعث خصوصی داد کا مستحق ہے۔

• "رفتہ رفتہ غالب کے مولوی سراج الدین احمد سے تعلقات میں گہرائی پیدا ہوگئی" (ایضاً ص ۹)۔

اِس تنقید کے سامنے اچھی اچھی تنقیدیں شرما جائیں گی۔

• "یہ اشعار کسی ردیف وار مرتب دیوان سے اقتباس کیے گئے ہیں" (ایضاً ص ۲۲)۔

• "یوں تو غالب ساری عمر اپنے کلام میں سے خود ہی ترک و حذف کے اصول پر کاربند رہے" (ایضاً ص ۳۷)۔

کیا "اشعار..... اقتباس کیے گئے" اور "کلام میں سے..... کاربند رہے" پر کسی تبصرے کی بھی ضرورت ہے؟

• "شعر گوئی کے آغاز میں وہ بیدل اور شوکت بخاری اور اسیر کی دورِ افکار خیالی شاعری اور تشبیہات و استعارات سے گرانبار طرزِ سخن سے گویا چکا چوند ہو گئے" (ایضاً ص ۴۰)۔

• "وہ چکا چوند ہو گئے" زبان کے لیے محض اجنبی ہے اور روزمرّہ کے لیے نامانوس۔

محاورے اور روزمرّہ کا عالم آپ نے دیکھا؟ ان مثالوں کی حیثیت محض "مشتی نمونہ از خروارے" کی ہے۔ زبان سے اس قدر کم آشنا شخص کو لغت نویسی کے منصب پر فائز کر دیا جائے، یہ اعجوبہ اسی زمانے میں سامنے آسکتا تھا۔ غلام ربانی تاباں کا شعر یاد آگیا:

دورِ کم عیاری ہے، کچھ پتا نہیں چلتا
کون میرا قاتل ہے، کون چارہ گر میرا

مثالیں اچھی خاصی تعداد میں آچکی ہیں، اس لیے روزمرّہ اور محاورے کی حد تک مزید تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں۔

اب صرف دو تین مثالیں اس کی پیش کی جائیں گی کہ مفرد الفاظ کے محلِ استعمال، تذکیر و تانیث اور قواعدِ زبان اور تاریخ الفاظ کے اعتبار سے موصوف کی رسائی کہاں تک ہے۔ اس سے اتفاق کیا جائے گا کہ ایک لغت نویس کو ان اہم ترین مسائل سے بخوبی واقف ہونا چاہیے۔ اور اگر ایسا نہیں تو اس کو لغت نویسی سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہو سکتا:

۱: "اسلام اور اس کے مختلف علوم و فنون کا مطالعہ انھوں نے کم عمری ہی میں کر لیا تھا۔ آدمی تھے ذہین اور طباع اور محنتی، بعد کو انھوں نے اپنے وسیع ذاتی مطالعے اور غور و فکر سے ان علوم کی تکمیل کر لی، جس سے انھیں پورا رسوخ حاصل ہو گیا۔" (وہ صورتیں الٰہی، ص ۲۲۴)۔

معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی پہلی نظر میں سمجھ جائے گا کہ لفظ "رسوخ" یہاں بے محل ہے۔ "رسوخ حاصل ہو گیا" سے یہ مفہوم مراد لینا کہ علوم و فنون میں بصیرت حاصل ہو گئی، اس کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ لکھنے والا اس لفظ کے محلِ استعمال سے کم آشنا ہے۔

۲. غالب کے ایک فارسی قطعے کے تین شعر نقل کیے ہیں اور ان اشعار کے سلسلے میں لکھا ہے: "آخری تین شعروں کا مفاد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقدمے کے حسبِ منشا فیصلہ ہونے سے مایوس ہو چکے تھے۔" (مقدمۂ گلِ رعنا ۲۶)۔

اس "رسوخ" کی طرح یہ "مفاد" بھی بے محل ہے۔

۳: "ہفتے عشرے کے بعد پچیس تیس احباب کو مجھ سے ملانے کے لیے چائے کی دعوت دی۔ دو تین گھنٹے خوب گٹ پٹ رہی" (وہ صورتیں الٰہی، ص ۱۲۶)۔

میں تو کچھ نہ کہتا مگر اس کو کیا کروں کہ صاحب نور اللغات کا یہ اندراج بار بار جھنجھوڑتا ہے: "گٹ پٹ، مونث، باہمی تکرار (کنایتاً) رنجش آمیز گفتگو، بیجا بحث و تکرار جو باہم دو شخصوں میں ہو (فقرہ) زید سے مفت میں گٹ پٹ ہو گئی۔" (نور اللغات طبع اول جلد چہارم ص ۲۸۷)۔

جو صاحب "گٹ پٹ"، "مفاد" اور "رسوخ" جیسے معمولی الفاظ کے معانی و محلِ استعمال سے ایسے ناآشنا ہوں، کیا وہ لغت نگاری کے اہل ہیں؟ یوں آنکھوں پر دلیولد اٹھانے کا کچھ علاج نہیں۔

یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہی تین لفظ کم آشنائی کے ترجمان ہیں، جی نہیں، ان کی حیثیت تو محض "نمونۂ کلام" کی سی ہے۔ اتمامِ بحث کے لیے میں صرف ایک اور لفظ کی تباہی کی خبر دیتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ اس کے بعد بات بالکل صاف ہو جائے گی: "واقع" اور "واقعہ" یہ دو لفظ اپنے محل پر اردو میں مستعمل ہیں۔ مثلاً "بیان واقع" اور "واقعہ یہ ہے کہ ....." مگر آپ کو حیرت ہوگی یہ پڑھ کر کہ ترقی اردو بورڈ کے فاضل لغت نویس "واقعہ" کے محل پر عموماً "واقع" لاتے ہیں۔ مثلاً: "جب یہ خط مجھے ملا تو واقع یہ ہے کہ مجھے بہت تعجب ہوا" (وہ صورتیں الٰہی، ص ۱۲۳)۔

"یہ واقع ہے کہ ان سے پہلے اردو میں صحیح علمی تحقیق ....." (ایضاً ص ۱۰۷)۔ "تاہم واقع یہ ہے کہ اس کے بعد اطمینان کا ایک دن بھی ....." (ایضاً ص ۱۲۰)۔

اس کی بہت سی مثالیں ان کے یہاں سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ تذکیر و تانیث کی کچھ عجیبیوں کی بھی دو مثالیں ملاحظہ فرما لیجیے اور اس پر سر دھنیے کہ ہمارا لغت نویس معمولی معمولی الفاظ کی تذکیر و تانیث کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے:

۱: "اس میں ایک شہر اور ملک کی تہذیب و تمدن جس خوبی سے شگفتہ زبان میں بیان ہوئی ہے" (مقدمۂ گلِ رعنا، ص ۲۷)۔

"تمدن" کو آپ نے آج تک مذکر پڑھا ہوگا، لکھا بھی اسی طرح ہوگا مگر اب یہ سمجھ لیجیے کہ ترقی اردو بورڈ کے ایک فاضل لغت نویس کے نزدیک یہ مونث ہے۔

۲: "انھیں اکبری دور کا نظم و نسق اور اس کی معاشرت بھی اپنی پوری تابناکی کے باوجود، تقویمِ پارینہ سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا تھا" (ایضاً۔ ص ۸)۔

یہاں "معاشرت" غریب پر وہی حادثہ گزرا کہ اس کی بھی جنس بدل گئی یعنی تانیث نے تذکیر کا روپ دھار لیا۔

۱: "ابتدا میں اعراب بالحروف کا رواج عام تھا، الفاظ میں پیش کی جگہ واو، زبر کی جگہ الف اور زیر کی جگہ یاے لکھتے تھے" (مقدمۂ غبارِ خاطر، ص ۱۸)۔

(بقیہ صفحہ ۳۷ پر)

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

دہلی

شمارہ : ۱۰ جلد : ۲۳

جنوری ۱۹۷۶ء

مضامین :

افسانے :

منظومات :

تبصرے :

ادارہ تحریر :

گوپال متل

مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : دس روپے، فی کاپی : ایک روپیہ
غیر ممالک سے
سالانہ : تیس شلنگ ، فی کاپی : تین شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ
۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج ، نئی دہلی ۲

قیمت : ۱/-

پرنٹر پبلشر اور پروپرائٹر .. .. گوپال متل
مطبع .. .. نعمانی پریس دہلی
مقام اشاعت .. .. .. ۹۔ انصاری مارکیٹ
دریا گنج، نئی دہلی ۲

۲۵ روپے کی کتابیں
صرف ۱۱ روپے میں

ایک ہنگامہ خیز رعایتی اعلان

سامنے کے صفحہ پر کچھ عمدہ کتابوں کی فہرست دی جارہی ہے۔ ان میں سے آپ ۲۵ روپے کی کتابیں صرف ۱۱ روپے میں حاصل کرسکتے ہیں۔

آپ کو صرف اتنا کرنا ہے کہ ۱۱ روپے کا منی آرڈر ہمارے نام بھجوا کر ڈاکخانے سے ملنے والی رسید کے ساتھ ۲۵ روپے کی اپنی پسند کی کتابوں کے نام لفافے میں رکھ کر ہمیں بھجوادیں۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

آپ کا خط ملنے پر آپ کی طلب کردہ کتابیں رجسٹرڈ پیکٹ سے ارسالِ خدمت کی جائیں گی ——— ڈاک خرچ آپ سے نہیں لیا جائیگا، ہم خود ادا کریں گے۔

یہ رعایت ۳۱ مارچ ۱۹۷۶ء تک کے لیے ہے، بشرطیکہ اسٹاک اس سے پہلے ختم نہ ہو جائے۔

آپ اپنا آرڈر آج ہی بھجوا کر اس نادر پیش کش سے فائدہ اٹھائیں۔

کتابیں جو آپ طلب کر سکتے ہیں یہ ہیں :

۱۔ شہپر (شاعری، سید حرمت الاکرام) ۱۰/-
۲۔ تیشۂ نظر (تنقید، ابوالفیض سحر) ۸/-
۳۔ ادیب اور کمیار (ادب اور سیاست، جارج پلوکزی) ۱/-
۴۔ سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ موریس کرانسٹن ۱/-
۵۔ سیہ بر سفید (شاعری، مخمور سعیدی) ۶/-
۶۔ خواب تماشا (شاعری، کمار پاشی) ۴/-
۷۔ سوویٹ وسط ایشیا کی مسلمان قومیں (تاریخ) ۲/-
۸۔ لینن (سوانح حیات، رابرٹ کنکولسٹ) ۲/-
۹۔ گیان مارگ کی نظمیں (شاعری، کرشن موہن) ۱۰/-
۱۰۔ خرابہ (شاعری، من موہن تلخ) ۱۰/-
۱۱۔ کینسر وارڈ (ناول، الیگزنڈر سولنسٹین) ۱۸/-
۱۲۔ میں گواہی دیتا ہوں (آپ بیتی، اناتولی مارچینکو) ۴/-
۱۳۔ نامہ بہ نام (منظوم خطوط، رضا نقوی واہی) ۶/-
۱۴۔ قوموں کے قاتل (تاریخی مطالعہ، رابرٹ کنکوئسٹ) ۳/-
۱۵۔ نئے عہد نامے کی سوغات (افسانے، فیاض رفعت) ۱۰/-
۱۶۔ انسانی حقوق کیا ہیں؟ موریس کرانسٹن۔ ۲/-
۱۷۔ شہر خوشبو (شاعری، نور تقی نور) ۵/-
۱۸۔ ٹریڈ یونین کے بنیادی اصول، وکٹر فیدر ۱/-
۱۹۔ ٹریڈ یونین۔ جائز اور ناجائز استعمال۔ آرتھر باٹملی -/۵۰
۲۰۔ دیپک راگ (غزلیں اور رباعیات، مظفر حنفی) ۶/-
۲۱۔ صحرا کی پیاس (شاعری، شباب للت) ۶/-
۲۲۔ راہ گذر (غزلیں، دل ایوبی) ۴/۵۰
۲۳۔ جمہوری انقلاب (سیاسی مطالعہ، برائن ماگی) ۱/-
۲۴۔ جمہوری سوشلزم (سیاسی مطالعہ، نکانلز ریڈس) ۱/-
۲۵۔ بیاض (شاعری، بدیع الزماں خاور) ۴/-
۲۶۔ راکھ (شاعری، احتشام اختر) ۶/-
۲۷۔ اعراف (شاعری، عبدالرحیم نشتر) ۲/۵۰
۲۸۔ دو انقلاب (سیاسی مطالعہ) ۱/-
۲۹۔ ببول کے پیڑ (کسان کی آپ بیتی) -/۵۰
۳۰۔ خوشحالی کی تلاش (اقتصادی موازنہ) -/۵۰
۳۱۔ تکون کا کرب (شاعری، آزاد گلاٹی) ۵/-
۳۲۔ شہر خیال (شاعری، جلیس نجیب آبادی) ۴/۵۰
۳۳۔ احساس (شاعری، اوم پرکاش لاغر) ۵/-
۳۴۔ گلاگ مجمع الجزائر (آپ بیتی، الیگزنڈر سولنسٹین) ۷/-

سب قیمتیں اصلی ہیں، کسی کتاب کی قیمت بڑھائی نہیں گئی ہے۔ گیارہ روپے منی آرڈر سے پیشگی بھجوائیں، کتابیں وی۔ پی۔ سے نہیں بھیجی جائیں گی۔ آپ ۲۵-۲۵ روپے کے ایک سے زیادہ سیٹ بھی طلب کر سکتے ہیں، فی سیٹ ۱۱ روپے بڑھاتے جائیں۔

منیجر نیشنل اکاڈمی ۹، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

گوپال متل

ویٹ نام میں چینی روسی رقابت

۹ دسمبر کو وارسا میں پولینڈ کی حکمراں پارٹی پولش یونائیٹڈ ورکرز پارٹی کو خطاب کرتے ہوئے بریژنیف نے کہا: "دنیا کی موجودہ صورت حال کی جملہ پیچیدگیوں اور تضادات کے باوجود کئی برس سے نمایاں پہلو کشمکش اور کشیدگی میں کمی، مختلف سماجی نظاموں والی ریاستوں کا پرامن بقائے باہمی کے اصول کو تسلیم کرنا اور اس قسم کے بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینا رہا ہے جو مفاد باہمی پر مبنی ہو۔"

عجیب بات یہ ہے کہ بریژنیف کی پارٹی پرامن بقائے باہم اور مفید بین الاقوامی تعاون کے اصولوں کو ایک ایسے ملک کے ساتھ برتنے میں ناکام ہے جس کا سماجی نظام روس کے نظام سے مختلف نہیں اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں سے بھی متقاضی ہے کہ وہ چین کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کریں۔ سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کے اہم ترین نظریاتی جریدے "کومونسٹ" نے اپنے اگست ۱۹۷۵ء کے شمارے میں بڑی شد و مد سے کہا ہے کہ سوشلسٹ ممالک روسی چینی جھگڑے میں غیر جانب داری اختیار نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا مطلب کسی نہ کسی حد تک چین سے ہمدردی ہے۔ ایک پیراگراف میں "کومونسٹ" نے یہ بات خاص زور دے کر کہی کہ اس سے بھی بدتر ماوزے تنگ کی پالیسیوں کی طرف مفاہمانہ رویہ ہے جو کوئی بھی شکل اختیار کرے چینی لیڈرشپ کے سوشلسٹ دشمن مقاصد کو تقویت دیتا ہے۔

جہاں تک چینیوں کا تعلق ہے وہ تو مغربیوں سے بھی کہہ رہے ہیں کہ روسی جو کچھ کہتے ہیں اس پر بلا سوچے سمجھے اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء کی شام کو چینی وزیر اعظم چاؤ این لائی کی طرف سے مغربی جرمنی کے چانسلر شمیڈ کا خیر مقدم کرتے ہوئے نائب وزیر اعظم ٹینگ نے کہا: "دوسرے ممالک پر بالادستی قائم کرنے والے رائے عامہ کو دھوکا د کے لئے امن کے فرشتوں کا روپ اختیار کر لیتے ہیں لیکن کہ ایک چینی کہاوت میں کہا گیا ہے 'کسی شخص کے لفظوں کو ضرور لینا چاہیے لیکن اس کے قول کی صداقت کی کسوٹی افعال ہیں۔"

ایسے حالات کی ستم ظریفی سمجھنا چاہیے کہ چینی روسی رقا کا اہم ترین خطہ وہ ملک ہے جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا کہ وہ دونوں کمیونسٹ طاقتوں کے درمیان پل بنے گا۔ ویٹ کو ازسرنو متحد کرنے کے علاوہ مرحوم صدر ہوچی منہ کی ایک یہ بھی تھی کہ ویٹ نام ورکرز پارٹی بین الاقوامی کمیونسٹ میں یکجہتی پیدا کرنے کا اہم فریضہ انجام دے گی لیکن ہوا یہ کمیونسٹ فتح کے نتیجے میں خود ویٹ نام میں روسی چینی رقابت اور بڑھ گئی ہے۔

چین ازسرنو متحدہ ویٹ نام میں روسی مداخلت کا اس مخالف ہے کہ وہ کہیں روس کے زیر اثر ریاستوں میں گھر کر رہ جائے اور روسی یہ سمجھتے ہیں کہ ایک مضبوط اور متحدہ ویٹ چین کی جنوبی سرحد پر روس کے ایک مفید اور طاقت ور اتحا کا فرض انجام دے سکتا ہے۔ اس وقت تک شمالی ویٹ نام قیادت ان دونوں ملکوں کے جھگڑے میں ملوث ہونے سے گر کرتی رہی ہے اور اس بنا پر ابھی تک اس کی آزادی برقرار ہے۔ لیکن امریکہ کے اخراج کے بعد جنوب مشرقی ایشیا میں ا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لئے روس اور چین کی رقابت میں ج شدت سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے پیش نظر اس پالیسی پر چلے ر ویٹ نام کے لئے مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

ستمبر اور اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شمالی ویٹ نامی پارٹی کے لی لی ڈوآن نے ماسکو اور پیکنگ کا دورہ کیا اور روس اور چین دو

ساتھ مدد کے نئے معاہدے کیے۔ دورے کا مقصد اس بات پر زور دینا تھا کہ شمالی ویٹ نام دونوں بڑی کمیونسٹ طاقتوں کے ساتھ متوازن تعلقات رکھنا چاہتا ہے۔ ۷ اکتوبر کو بوڈاپسٹ میں اپنی تقریر میں اس نے کہا کہ ویٹ نامی عوام اور وہاں کی پارٹی ہو چی منھ کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گی کہ بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک میں یک جہتی پیدا کی جائے۔ ویٹ نام کی پارٹی دوسری کمیونسٹ پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام کرے گی۔

جنگ کے خاتمے کے بعد یہ دعویٰ روسیوں نے بھی کیا ہے اور چینیوں نے بھی کہ جنوب مشرقی ایشیا میں فریق ثانی کو اپنے منصوبوں میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے اور یہ بھی کہ فریق ثانی نئے ویٹ نامی نظام کی تخریب میں مصروف ہے۔ نیو چائنا نیوز ایجنسی نے اپنے ۲۳ مئی ۱۹۷۵ء کے نشریے میں کہا کہ ویٹ نام کے عوام کی عظیم فتوحات پر روسیوں کو جو تشویش اور برہمی ہوئی ہے وہ چھپائے نہیں چھپتی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کریں اور ہمدردی کے ایک دو لفظ کہہ دیں۔ دوسری طرف ماسکو ریڈیو نے ۳ مئی ۱۹۷۵ء کو کہا کہ سیگاؤن میں صدر تھیو کا زوال چینیوں کے لئے غیر متوقع صدمہ تھا اور ۲۴ مئی کو اسی ریڈیو نے اپنے نشریے میں کہا کہ پیکنگ جس مسرت کا مظاہرہ کر رہا ہے وہ بناوٹی ہے۔ چین کے اس الزام کے جواب میں کہ روس ویٹ نام میں بالا دستی حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے، روسیوں کا کہنا ہے کہ چین ایک متحد طاقت ور سوشلسٹ ویٹنام کے قیام سے خوف زدہ ہے۔ کمیونسٹ کامیابی میں وہ شمالی ویٹ نام کے کردار کو گھٹا کر پیش کرتا ہے۔ ویٹ نام کے عوام کی وحدت میں رخنے ڈال رہا ہے اور "سوشلسٹ ویٹ نام، لاؤس اور کمبوڈیا کے قومی مفادات کے خلاف کھلے بندوں تخریبی کارروائیاں کر رہا ہے"

(ماسکو ریڈیو ۱۳ ستمبر ۱۹۷۵ء)

ویٹ نام میں چینی روسی کشمکش پرانی ہے اور کمیونسٹ فتح سے دس سال سے بھی پہلے شروع ہو چکی تھی۔ ۱۹۶۵ء کے بعد سے جب چین نے روس کی اس تجویز کو مسترد کیا کہ ویٹ نام کی مدد کے لئے متحدہ اقدام کرنا چاہیے، چین اور روس ایک دوسرے کے خلاف اتہام تراشی میں مصروف ہیں۔ چینی جو ویٹ مدد کو شکر میں لپٹا زہر قرار دے رہے ہیں اور یہ الزام لگا رہے ہیں کہ روس نے جو سامان دیا وہ ناکافی بھی تھا اور اس کی کوالٹی بھی اچھی نہیں تھی۔ اُدھر روسی یہ الزام لگا رہے ہیں کہ چینی سامان کی سپلائی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور کبھی کبھی اسے ہڑپ بھی کر جاتے ہیں۔

کئی معاملے ایسے بھی ہیں جن میں شمالی ویٹ نام اور روس ایک دوسرے سے متفق نہیں۔ مثال کے طور پر ہنوئی نے جنوب مشرقی ایشیا کے مشترکہ تحفظ کی اسکیم کی حمایت نہیں کی جسے روس بہت شہرت دے رہا ہے اور جسے بریزنیف نے ۱۹۶۹ء میں پیش کیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ شمالی ویٹ نام کی نظر میں اس اسکیم کا ہدفِ خصوصی چین ہے اور اس اسکیم کی حمایت چینیوں کو ویٹ نام سے برہم کر دے گی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں اپنے غیر کمیونسٹ پڑوسیوں کے تئیں شمالی ویٹ نام نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ بھی روسی پالیسی کے منافی ہے۔ ●●

غزل کرشن موہن

ذوقِ ریاضت بھی، شوقِ مستانہ بھی
دنیا ہے میدانِ عمل، مے خانہ بھی

کڑوا سچ بھی، میٹھا جھوٹ بھی ہے ایسیں
میرا عشق حقیقت بھی، افسانہ بھی

اس کو پیار کرے جو اسکا دشمن ہے
کیسا ہے یہ میرا دلِ دیوانہ بھی

میں ہی فقط بیتاب نہیں ہوں اس کیلئے
میرے لیے ترسا ہے درِجانانہ بھی

یارب کیسی ہے تیری دنیا جس میں
دیوانہ بھی روئے اور فرزانہ بھی

●●

جس مرد کے بدن پہ بہت بال ہو گئے
ہم اس کے اختلاط سے پامال ہو گئے

ایمائے اہلِ ناز پہ سب کچھ لٹا دیا
کتنے ہی لوگ عشق میں کنگال ہو گئے

اک خشک سا پہاڑ ہے، بے کیف اور اُجاڑ
ہم فرصتِ طویل سے بے حال ہو گئے

دل غرقِ فکر ہے، کبھی یکسو نہ ہو سکا
ارمان میری جان کے جنجال ہو گئے

اک سوچ اب رفیق ہے شامِ شباب کی
کتنے ہی شوق نذرِ مہ و سال ہو گئے

●●

باقی

تین صدائیں

(اپنے بھانجے، اپنی چچی اور اپنی والدہ کی دائمی رخصت پر)

ہر صدا
ایک پہچان ہے
ذات ہے
ایک آواز
بیتی ہوئی ساعتوں
کا کرم
ایک آواز
اِمکاں کی
سوغات ہے
ایک آواز ..... پہلی ثنا
صبح کی
ایک آواز ..... پہلی دُعا
شام کی
ایک آواز ..... راحت سرا
رات ہے
ہر صدا
ایک پہچان ہے
ذات ہے
ایک آواز
معصوم خواہش کا
پھیلا ہوا
دائرہ ہے

ایک آواز
اک دوسرے سے
تعلق کا
اقرار خوں
ایک آواز
تنہا، اکیلی
خفی، خود مخاطب، دُروں
ہر صدا میں کوئی
بات ہے
ہر صدا
ایک پہچان ہے
ذات ہے
اک صدا
زندگی یافتہ
بوڑھی ڈیوڑھی کے پاس
آتی جاتی بھیانک
رُتوں سے
خبردار کرتی ہوئی
صدا پشت پر
پیش آمد
نشیبوں، فرازوں
عذابوں، ثوابوں

سے بیدار کرتی ہوئی
اک صدا
اک مسلسل صدا
پیار کرتی ہوئی
دھوپ میں
سایہ سایہ
جھلستی فضاؤں میں
برسات برسات ہے
ہر صدا
ایک پہچان ہے
ذات ہے

ایک اک کر کے
تینوں صدائیں
کہاں کھو گئیں
اے زمیں — سبز پوش
اے فلک — نیل گوں
ایک آواز
باقی ہے
تنہا، اکیلی
خفی، خود مخاطب، دُروں

دلی کے لیے ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام، کامیاب آغاز

بے زمین لوگوں کے لیے آراضی | ہریجنوں اور کسانوں کو مکان بنانے کے لیے ۲۵۰۰ رہائشی پلاٹ اور کھیتی باڑی کے لیے ۴۰۰ زرعی زمینیں تقسیم کی گئی ہیں۔

پنچایتوں کے ذریعے بے زمینوں کو ۱۳۹۴ رہائشی پلاٹوں اور ۹۴۷۱ زرعی زمینوں کی مزید تقسیم کا کام جاری ہے ● ہاؤسنگ کوآپریٹیوں کے توسط سے غریب اور کم آمدنی والے لوگوں کو ۷۰ ہزار رہائشی پلاٹ دیے جائیں گے ● مکان بنانے کے لیے ہریجنوں کو ۱۵ لاکھ روپے کی مالی امداد کی فراہمی

طلبا و طالبات کے لیے سہولتیں | تمام غریب طلبا و طالبات کے لیے بک بینکوں سے درسی کتابوں کی فراہمی۔ تمام اسکولوں اور کالجوں میں سستے داموں پر کاپیاں، کاغذ اور اسٹیشنری کی فراہمی ● تمام ہوسٹلوں میں سستے داموں پر ضروری اشیاء کی فراہمی۔

روزگار | دلی یونیورسٹی کے لیے گریجویٹوں کو ۲۰۰ منی بسوں کی فراہمی ● اپرنٹس شپ ایکٹ کے تحت تربیت یافتہ ڈپلومہ ہولڈر انجینیروں کو روزگار کی فراہمی مالکان کے لیے لازمی۔

● ۲ ہزار لوگوں کو جلد از جلد روزگار فراہم کرنے کے لیے نریلا صنعتی کمپلیکس کی تعمیر کے کام میں تیزی۔

کم سے کم اُجرتوں میں اضافہ | صنعت، زراعت، دکانوں اور تجارتی فرموں میں لگے ۵ لاکھ ملازمین و محنت کشوں کی کم سے کم اُجرتوں میں اضافہ۔

تقسیم اشیا کی مثالی اسکیم | سستے اناج کی دکانوں، کوآپریٹیو اسٹوروں، موبائل گاڑیوں کے ذریعے نصف شہری حلقوں بلکہ دور دراز گاؤں اور جھگی جھونپڑی کالونیوں میں ضروری اشیاء مٹی کا تیل اور موٹا کپڑا فراہم کیے جا رہے ہیں ● فروخت ہونے والی تمام اشیاء پر قیمت کا ٹیگ لگانا لازمی قرار دے دیا گیا ہے ● منافع خوروں، ذخیرہ اندوزوں اور اسمگلروں کے خلاف سخت قانونی کارروائی کی جا رہی ہے۔

دلی انتظامیہ کے دفاتر میں مستعدی اور بہتر کارکردگی | راجدھانی میں امن و امان اور نظم و نسق کی صورت حال میں کافی سدھار ہوا ہے ● آج دلی انتظامیہ کے تمام دفاتر اور اداروں میں ہر طرف مستعدی و بہتر کارکردگی اور لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی کے برتاؤ کا خوشگوار ماحول پیدا ہو گیا ہے اور بدعنوان عناصر کو ہٹایا جا رہا ہے۔ لوگوں نے اس نئے دور کے آغاز کا خیر مقدم کیا ہے۔

آئیے! ہم سب ایک ہو کر پورے نظم و ضبط، لگن اور پختہ ارادوں کے ساتھ اس پروگرام کو پوری طرح کامیاب بنائیں۔

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ دلی۔

شوکت حیات

تین لاشیں

سیلاب اس شہر کو چاروں طرف سے گھیر چکا ہے۔
پانی لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا ہے اور نظریں اوپر ہوتی جا رہی ہیں۔
پانی اگر اسی طرح بڑھتا رہا تو پہلے سیڑھیاں، پھر چھت، پھر پہلی منزل، پھر دوسری منزل .... اور اسی طرح سارا شہر سیلاب میں ڈبکیاں لگاتا ہوا کاغذ کے کسی کونے میں لڑھک جائے گا۔ بکھ انگلیاں نشاندہی کرتی ہوئی کلاسوں میں پڑھائیں گی،

"یہ وقت کے نیم مردہ کندھوں پر سانس لیتا ہوا وہ شہر ہے جہاں کے آدمی زندگی کی دوڑ میں اپنے اپنے آدمی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے اور خود کو انمول شے میں تبدیل کر کے ہاتھوں کو آسمانی چھت تک لمبا کر چکے تھے اور ان کے پاؤں زمین پر نہیں تھے اور یوں وہ تمام زمینی بلاؤں سے نجات حاصل کر چکے تھے۔ لیکن سیلاب کے ایک ریلے میں ان کے جسموں کا غبارہ جو ان کے اپنے ہی آدمی سے خالی تھا مٹی کی ناؤ بن گیا اور پھر وہ بکھ بکھر کر پانی میں ریزوں کی طرح بہہ گئے اور سیلاب ختم ہونے کے بعد اس بنجر زمین پر ایسی ہریالی چھائی کہ ان آدمیوں نے جنم لیا جنھوں نے اپنی دوڑ میں اپنے گمشدہ آدمی کو آگے رکھا اور خود پیچھے رہے۔"

پانی بڑھتا جا رہا ہے۔ آدمی، جانور، پیڑ پودے سب کے سب دھیرے دھیرے اپنی جڑوں سے اکھڑنے لگے ہیں اور سیلابی ریلوں کی گود میں بے یار و مددگار آسمان کی طرف تک رہے ہیں۔

سطح آب پر ایک چھپر بہا چلا جا رہا ہے۔ اس کے اوپر ایک کمزور آدمی اپنے زرد ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بے بسی کے عالم میں "بچاؤ بچاؤ" چیخ رہا ہے۔ ٹھیک اس کی بغل سے ایک تنومند چمکتی ہوئی بھینس بہہ رہی ہے۔ سیلابی تموج کے دور اطراف میں شہر بلندی پر ہے۔ جہاں کھڑے ہوئے لوگ یہ سب یا تو محض تماشہ کی طرح دیکھ رہے ہیں یا سہمے سہمے اپنے اپنے علاقوں کی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔

کچھ تنومند لوگ ہمدردی میں کود پڑے ہیں۔ تیزی سے تیرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ اسی طرف، جہاں ایک آدمی چھپر پر اور بغل میں کچھ دوری پر ایک تنومند بھینس بہے چلے جا رہے ہیں۔ لوگ تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سب لوگ چھپر سے گذرتے ہوئے اس آدمی سے آگے بڑھ گئے ہیں اور چاروں طرف سے بھینس کو گھیر چکے ہیں۔ سب کے چہروں پہ کامیابی اور حصول کی مسرتیں ہیں۔ آہستہ آہستہ سب لوگ بھینس کو چھان کر کنارے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آدمی پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ اور متوحش انداز میں "بچاؤ .... بچاؤ ....." چیختا ہوا مایوس آنکھوں میں موت کو سمیٹے بہا چلا جا رہا ہے ....
"بچاؤ ..... بچاؤ ....." کی چیخ دور ہو گئی ہے۔

پانی پھیلتا جا رہا ہے۔ آدمی، جانور، پیڑ پودے سب کے سب دھیرے دھیرے اپنی اپنی جڑوں سے اکھڑنے لگے ہیں اور سیلابی ریلوں کی گود میں بے یار و مددگار آسمان کی طرف تک رہے ہیں۔

سطح آب پر آبی پردوں کے ایک جھنڈ میں ایک آدمی کی لاش پھنسی ہوئی بہہ رہی ہے۔ پانی کے کنارے بہت سارے لوگ بیٹھے، کھڑے اور سوئے اپنے اپنے علاقوں کے حشر سے خوف زدہ ہیں۔ ایک طرف کچھ ڈوم بیٹھے ہوئے سطح آب کا بہت دور دور تک عقابی آنکھوں سے جائزہ لے رہے ہیں۔ پانی سے لاوارث لاشوں کو نکال کر اسے اسپتال کے اناٹومی ڈیپارٹمنٹ میں فروخت کر دینا ان کے فاضل اوقات کا پیشہ ہے۔ یہی ان کی زائد آمدنی کا ذریعہ ہے ایک دو لاشیں کسی حد تک صحیح و سلامت مل جائیں تو تھوڑی سی محنت سے رات بھر کی اچھی خاصی عیاشی کا انتظام ہو جاتا ہے۔

لاش پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ہے۔ وہ پانی میں کود پڑے ہیں۔

تیزی سے یہ لوگ لاش کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ لاش بالکل صحیح و سلامت ہے۔ ان کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی ہے۔ یہ لوگ مسلسل بڑھتے جا رہے ہیں۔ لاش کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اتنے سارے زندہ آدمیوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر لاش نے مدد کے لئے ہاتھ بڑھا دئے ہیں۔

"ارے زندہ ہے ....!!!"

ان کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ہے اور وہ بوجھل بوجھل انداز سے الٹے پاؤں واپس لوٹ پڑے ہیں۔ .... زندہ لاش کے ہاتھ ہل رہے ہیں .... ہلتے ہوئے ہاتھ دھیرے دھیرے دور ہو گئے ہیں .....

پانی پھیل چکا ہے۔ شہر کے وسطی علاقے میں کمر تک پہنچ چکا ہے۔ شہر کی سب سے خوبصورت دائرہ نما کالونی میں پانی مسلسل پھیلتا جا رہا ہے۔ سب لوگ اپنے قیمتی اثاثے کے ساتھ چھتوں پر چلے آئے ہیں۔ پانی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایک لاش کافی دیر سے کالونی کے علاقے میں سطح آب پر چکر کاٹتی ہوئی پھول اور سڑ رہی ہے۔ چکر کاٹتی ہوئی ایک مکان کے سامنے کسی چیز میں پھنس کر رک گئی ہے۔ لاش کا خالی پیٹ پھولتا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے مرنے سے پہلے مرحوم جینے کی اذیت ناک جد و جہد سے گذرا ہوگا۔ چہرے پر موت سے لڑنے والی شکنیں اتنی گہری ہیں کہ لاش کے پھولنے کے باوجود اب تک نمایاں ہیں۔ لاش کی آنکھیں پھٹی ہیں اور ان سے احتجاج کا مردہ لاوا ابل کر پانی میں ٹھنڈا ابال پیدا کر رہا ہے۔

چھتوں پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ اپنا بیش قیمت اثاثہ چھتوں پر منتقل کرنے کے بعد مطمئن تھے اور سیلاب کے مناظر خوف اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے پھولتی ہوئی اس لاش کو دیکھ کر انہیں ابکائی آنے لگی ہے۔ جس چھت کے پاس لاش آکر ٹک گئی تھی اس پر سے کچھ لوگ ہاتھوں میں لکڑی لئے ہوئے بیزار قدموں سے پانی میں اترے ہیں لکڑی کے ایک زوردار جھٹکے سے لاش پرے ہٹ جاتی ہے اطمینان سمیٹتے ہوئے وہ اپنی چھت پر واپس آ گئے ہیں۔

سطح آب پر تیرتی ہوئی لاش دوسرے مکان کے آ کر کسی چیز کے سہارے ٹک گئی ہے۔ اس چھت کے لوگ سیلابی منظر کے رومانی پہلو سے لطف اندوز ہو رہے تھے، وہ لاش کو دیکھ کر پہلے تو حواس باختہ ہو گئے اور پھر ایک ابکا کے اندر سے باہر آنے کے لئے کروٹیں بدلنے لگی ہے۔ یہ لو اسی طرح لکڑی لے کر پانی میں اترتے ہیں اور لاش کو آ کر واپس چھت پر چلے جاتے ہیں۔

لاش بہتی بہتی تیسری چھت کے پاس آکر رک گئی۔ چھت کے لوگ بھی سڑتی ہوئی لاش کی ناقابل برداشت تاب نہ لاتے ہوئے اپنی ناکوں پر رومال رکھ لیتے ہیں اور ہاتھ سے منہ اور ناک بند کئے ہوئے پانی میں اتر کر لاش سے آگے دھکیل دیتے ہیں۔

سطح آب پر بہتے بہتے لاش چوتھی چھت کے قریب آ اور یہاں سے اگلی چھت کی طرف دھکیل دی جاتی ہے پانچویں چھت سے چھٹی چھت کی طرف پھینک دی جا .... اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے ......

اور اسی طرح یہ لاش مستقل پوری کالونی کا چکر کا ہے۔ جس چھت کے پاس بھی پہنچتی ہے۔ اس چھت کے لوگ دھکیل دیتے ہیں۔ لاش کئی گھنٹوں سے سیلابی سطح پر اسی و اور چاند کی کرنوں میں چکر کاٹتے کاٹتے سڑنے اور پھولنے لاش کا خالی پیٹ بڑے غبارے کی طرح پھولتا جا رہا۔ ایک بے حد سیاہ کوا اڑتا ہوا آتا ہے اور لاش کی اچٹا بھر پور دونوں آنکھیں نکال لیتا ہے۔

خالی پیٹ پھولتا جا رہا ہے .... کچھ ہی دیر اسی طرح چکر کاٹتے ہوئے کسی بھی چھت کے پاس لا پیٹ اچانک پھٹ جائے گا اور خالی پیٹ کی زہر ساری کالونی میں پھیل جائے گی۔ ▲

اردو کے رسالے اور کتابیں خرید کر پڑھیے

محمد مشتاق شارق میرٹھی

شاگردِ غالب ــــ فصیح الدین رنج میرٹھی

فصیح الدین نام، رنج تخلص، والد کا نام محمد قمر الدین۔ آبائی وطن سکندر آباد (ضلع بلند شہر)، معلوم نہیں ان کے اجداد میں سے کس نے میرٹھ کی سکونت اختیار کی؟ ہاں کلیات کے قطعات تاریخیہ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ میرٹھ میں رنج کے ماموں کی رہائش تھی اور رنج محلہ بنی اسرائیل میں انہیں کے یہاں رہتے تھے۔

کلیات رنج کے اختتام پر ظہور د فرقانی کی تقریظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رنج کی وفات ۱۳ر مارچ ۱۸۸۵ء کو بعمر ۴۹ سال ہوئی۔ لہٰذا ان کا سن ولادت ۱۸۳۶ء ہوا۔ رنج کے صاحبزادے حکیم محمد فخر الدین فخر میرٹھی نے تاریخ وفات کہی ؎

ازلب فخر کا بہ گفت   آہ رنج درگذشت

۱۸۸۵ء

اس لحاظ سے رنج میرٹھی آزاد، حالی اور داغ کے معاصرین میں سے تھے۔

رنج نے علم درسی اپنے عم بزرگوار مولوی نصیر الدین سے حاصل کیا۔ طب میں ان کے استاد حکیم سعادت علی تھے۔ شاعری میں ان کا شمار غالب کے شاگردوں میں کیا جاتا ہے۔ مگر وہ کب غالب کے شاگرد ہوئے، غالب کے ان سے کیسے مراسم تھے اور ان کا رشتۂ شاگردی کتنے دن قائم رہا، اس کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ شاگردی کے ثبوت میں کلیات رنج کے آخر میں دیے ہوئے ایک قطعہ تاریخ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں رنج نے اپنے آپ کو غالب کا شاگرد لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:

(قطعہ تاریخ دیوان ریختہ استاذی غالب سلمہ اللہ تعالیٰ)

اسد اللہ خاں غالب کا   ریختہ کا وہ نسخۂ دل خواہ
پُر صحت چھپا بطرز جدید   ہو نظارے سے جس کے تیز نگاہ
کیا سخن پاک ہے، کہ کرتی ہے   بحر اشعار شست وشوئے گناہ
مست کہتے ہیں یوں مزا چکھ کے   کیا شراب دو آتشہ ہے واہ

۱۲۷۷ھ

(یہ قطعہ غالب کے اس دیوان کے بارے میں ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی بار ۱۲۷۸ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ یہ تیسری اشاعت تھی۔ قبل از غدر یہ دیوان ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء میں دوبار شائع ہوا)

غالب کے ایک خط میں بھی ایک ایسا اشارہ کیا گیا ہے جس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ غالب کے شاگرد تھے۔ نواب کلب علی خاں (رام پور) کے جشن تخت نشینی کے موقع پر حالی کے ساتھ رنج نے بھی ایک تہنیتی قصیدہ لکھا تھا۔ یہ قصیدہ جب غالب کے پاس پہنچا تو انہوں نے اسے میر منشی سرکار رام پور کے پاس بھیج دیا۔ (دیکھئے مکاتیب غالب مرتبہ عرشی طبع چہارم)

رنج عمر بھر، میرٹھ میں اپنی ننھیال میں رہے۔ وہ میرٹھ کے مشہور طبیب تھے۔ ابتدا میں ان کی معاشی حالت اچھی نہ تھی لیکن جلد ہی ان کا شمار میرٹھ کے سربرآوردہ اشخاص میں ہونے لگا۔

رنج کی شہرت شاعر کی حیثیت سے اتنی نہ تھی جتنی بحیثیت تذکرہ نگار کے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں:

۱۔ تذکرۂ بہارستانِ ناز۔
۲۔ گلشنِ نعت۔
۳۔ کلیاتِ رنج۔

ذیل میں علیحدہ علیحدہ بہ تفصیل، ان کا تعارف کرایا جاتا ہے:

تذکرۂ بہارستانِ ناز

اس تذکرے کے سبب تالیف کے بارے میں رنج لکھتے ہیں:

"اس اضطرار و انتشار میں شوق تالیف و تصنیف دامن گیر حال ہوا۔ فکر اور بڑھی، تفکر کو دونا کمال

ہوا۔ تذکرہ شعراء کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ اس سے فی الجملہ دل لگی حاصل ہوئی مگر طرز جدید کا دل خواست گار ہوا "کل جدید لذیذ" پر دار و مدار ہوا۔ آٹھ پہر تذکروں پر نظر رہی۔ اس زمانے میں مخفیؔ کا کلام نظر سے گزرا۔

اسے دیکھ کر رنجؔ شاعرات کے کلام کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے ان کا کلام فراہم کرنا شروع کر دیا۔ پہلی بار یہ تذکرہ بعنوان "بہارستان ناز" ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا۔ یہ اردو میں شاعرات کا پہلا تذکرہ ہے۔ دوسرے تذکرے فارسی میں ہیں۔ (بہارستان ناز سے پہلے شاعرات کا صرف ایک تذکرہ مولوی عبدالحی صفا بدایونی کا "شمیم سخن" تھا جس کا سن اشاعت ۱۸۶۲ء ہے۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ء میں درگا پرشاد نادر کا تذکرہ "گلشن ناز" شائع ہوا) شاعرات کا تذکرہ بہ اعتبار حروف تہجی کیا گیا ہے۔ ابتدا میں شاعرات کے حالات زندگی دیے گئے ہیں مگر اختصار کے ساتھ۔ انتخاب کلام اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے اشعار پر مشتمل ہے۔ رنجؔ کو زبان و بیان دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ جا بجا شوخی بیان اور رنگینی زبان کے جلوے نظر آتے ہیں۔ ایک خوبی ان کی تحریر کی یہ ہے کہ اس میں شروع سے اخیر تک ہمواری پائی جاتی ہے۔ ان کے اسلوب نگارش کا اندازہ مندرجہ ذیل فقروں سے لگائیے :

امیرؔ کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

"رشکِ حسن فردِ شانِ بازاری ہے
بے وفائی کی دوست اور دشمنِ وفاداری ہے"

خفیؔ (بادشاہ بیگم) کے بارے میں ان کا اندازِ تحریر دیکھیے :

"معاش کی دنیا میں اور عقوبات عقبیٰ میں بے اندیشہ ہے۔"

رنجؔ نے ناقدانہ طبیعت پائی تھی۔ وہ ہر جگہ اپنے تاثرات کا بے باکانہ اظہار کرتے ہیں اور کسی قسم کی مروت سے کام نہیں لیتے۔

اسیرؔ کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

"ایک قطع کے سوا باقی کلام اس کا بکائن کا پھول ہے۔"

امیرؔ کے لئے کیا کہتے ہیں ملاحظہ فرمائیں :

"یہ شعر جو ذیل میں درج ہے اگرچہ اس کے نام سے مشہور ہے الّا اس کی طبیعت سے کوسوں دور ہے۔"

اگرچہ تذکرہ دلچسپ ہے مگر بعض مقامات تاریخی شواہد سے عاری ہیں مثلاً آرامؔ (زوجۂ جہانگیر) کے بارے میں جتنی باتیں لکھی ہیں وہ محل نظر ہیں۔ مخفیؔ کے سلسلے میں، رنجؔ عام مغالطے سے نہ بچ سکے۔ یہ کلام زیب النساء مخفی کا نہیں بلکہ ایک ایرانی شاعر کا ہے جو بہ زمانۂ شاہجہاں وارد ہندوستان ہوا تھا۔

یاسمن کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

یاسمن تخلص، چنبیلی نام۔ یہ عورت منجملہ کنیزان انشاء اللہ خاں مرحوم ہے۔ نہایت طباع اور فہیم تھی۔ اپنا نکاح نہ کرتی تھی۔ ایک روز انشاء اللہ خاں نے بعد فہمائش تمام اس کا نکاح ایک شخص سے کر دیا۔ سنا ہے کہ بعد نکاح تین روز زندہ رہی۔ پھر مر گئی۔ یہ حال نہ کھلا کہ کیا باعث تھا۔ القصہ یہ اشعار اس کے تحریر ہوتے ہیں۔

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

(اس شعر کے ساتھ غالب کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا)

صبر جاتا رہا قرار کے ساتھ   پر مرے دل سے یار تو نہ گیا

یادؔ کا حال لکھتے ہیں :

یاد تخلص۔ یہ عورت دلی کی شہزادیوں میں تھی ۱۲۹۲ھ میں اس نے انتقال کیا۔ ہنگام نزع جو اس نے قطعہ لکھا تھا، وہی گوش زد ہوا۔ اور کچھ کلام اس کا ہاتھ نہ آیا۔

عبث فکرِ درماں ہے اے اقربا
کہ اب یاد تو یاں سے جانے لگی
سر انجام غسل و کفن کر رکھو
تن زار سے جاں نکلنے لگی

کلیات

کلیات کے تاریخی نام "مخزن الفصاحت" کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۱۳۰۷ھ میں مرتب ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی طباعت ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں ہوئی اور ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوا۔ یہ کلیات رنجؔ کی زندگی میں نہیں چھپ سکا۔ ان کی وفات کے بعد، ان کے صاحبزادے حکیم فخر الدین نے اسے چھپوایا جو اب نایاب ہے۔ البتہ اس کا

ایک نسخہ رنجؔ کے پڑپوتے محبی حکیم سیف الدین احمد میرٹھی کے پاس محفوظ ہے۔ میں نے وہیں اس کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے بعض اشعار پر ندرتؔ میرٹھی مرحوم کے انتخابی نشان لگے ہوئے ہیں اور انہوں نے طباعت کی اغلاط کو درست کیا ہے۔ یہ کلیات ۱۴۴ صفحات کو محیط ہے اور ہر صفحے پر اٹھارہ اشعار ہیں۔

لالہ سری رام نے اپنے مشہور تذکرہ خمخانۂ جاوید میں دو سطروں میں رنجؔ کے احوال اور ایک شعر انتخاب میں دیا ہے۔

اک بار اور میری عیادت کو آئیے
اچھی طرح سے میں ابھی اچھا نہیں ہوا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیات کا کوئی مطبوعہ نسخہ انہیں دستیاب نہ ہو سکا۔

کلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رنجؔ بہت صاف ستھرا شعر کہتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے اپنے استاد غالبؔ سے زیادہ اپنے معاصرین کا اثر قبول کیا۔ ان کے معاصرین میں حالیؔ، داغؔ، اور امیرؔ تھے۔ اگرچہ بعض اشعار میں مومنؔ اور غالبؔ کا طرز بھی نمایاں ہے مگر وہ داغؔ سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ یہ دور زبان کے چٹخارے کا تھا۔ لہٰذا رنجؔ بھی اس اثر کو قبول کرنے پر مجبور تھے۔

نمونۂ کلام

پہلے غالبؔ کے رنگ میں کہے ہوئے کچھ اشعار دیکھئے:

کس کو اٹھاؤں اور نہ کس کو اٹھاؤں میں
پردے ہزار ہا ہیں تمہارے حجاب میں
لاکھوں بناؤ ایک تغافل میں آپ کے
لاکھوں بگاڑ ایک مرے اضطراب میں
تمھیں نے حال سے بے حال کر دیا ہم کو
کبھی نہ حال ہمارا سنو تو کیوں کر ہو
دل سے جائے گا نہ اس جنبشِ ابرو کا خیال
کیا کہیں گوشت بھی ناخن سے جدا ہوتا ہے

ان اشعار کے بعد غالبؔ کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ انہوں نے استاد کا رنگ کس حد تک قبول کیا تھا۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو
دل سے جانا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اب طرز مومن کے نمونے دیکھئے:

عشق میں ہم نے کیا اپنوں کو غیر
تم نے کیوں کر غیر کو اپنا کیا
کیوں چھوا دامن کہ وہ چھپنے لگا
تو نے اے دست تمنا کیا کیا
مرے گھر سے عدو کے گھر گئے ہو، میں نہ مانوں گا
تمہارے نقش پا میں آج شوخی پائی جاتی ہے

خود رنجؔ کا رنگ سخن کیا تھا، اس کے لئے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

آج تشریف کیوں نہ لائے آپ
کیوں کرم میرے حال پر نہ ہوا
دیکھتے ہیں اب تو شرمائی ہوئی آنکھوں سے وہ
جا ہے، کیا میرے لو دیکھو اثر پیدا ہوا
ہاں قافلے والو کوئی درماندہ نہیں ہم
پہلے ہی پہنچ جائیں گے آوازِ درا سے
منتوں سے کبھی نہیں ہوتا ہے راضی کیا کروں
ہے وہ شرم پاک دامانی کا سمجھایا ہوا
بوسہ دینے میں نہیں عذر ہے اللہ اللہ
جان ہم دیتے ہیں تم دل تو ہمارا دیکھو
مجھ سے کہتے ہو کہ جا، جاتا ہوں
پھر اکیلے بھی تو گھبرائیے گا
کیا شان ہے کہ چھیڑتے ہیں بے حجاب وہ
بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے کس ادا سے ہم
تم اور نازِ گراں بارِ محبت
اٹھاؤ دیکھ کر، بارِ گراں کو

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

مصوّر سبزواری

زمیں پہ عضوِ جسم ایک اک گراتا جا رہا ہے
یہ کیسا حادثہ نزدیک آتا جا رہا ہے

اکیلا ہی رہے گا اب خدا ان بستیوں میں
فرشتہ شہپروں کو پھڑپھڑاتا جا رہا ہے

چلا جاؤں گا میں تو پھول کھلنے ہی سے پہلے
مری خاطر تو کیوں پودے لگاتا جا رہا ہے

ہوا تھا جنگلوں میں قتل میرا صدیوں پہلے
مجھے گیتوں میں اک بنجارہ گاتا جا رہا ہے

یہیں ٹھہرے گا کربِ انگیز رشتوں کا مسیحا
دلوں میں گھاؤ اک گہرا بناتا جا رہا ہے

مصوّر شہ رگِ امید پہ پنجوں کو گاڑے
گلا وہ روشنیوں کا دباتا جا رہا ہے

●●

غلام مرتضیٰ راہی

دیکھے کوئی ایک رات کتنا
ہیں خواب سے مجھے ثبات کتنا

وہ خاک اڑی کہ جانتا ہوں
آئینۂ شش جہات کتنا

کیا کیا میں سمجھ رہا ہوں خود کو
لیکن یہ شعورِ ذات کتنا

میں وہم، یہی مری حقیقت
جھٹلائے گی، کائنات کتنا

ہر موڑ سے دیکھنے میں آیا
روشن ہے رخِ حیات کتنا

●●

غ

قمر اقبال

اک موجِ نور تھی جو مرے گھر تک آ گئی
کھڑکی کھلی تو چاندنی بستر تک آ گئی

رگ رگ میں تشنگی کی وہی لہر ہے رواں
پانی کی سطح یوں تو مرے سر تک آ گئی

یادوں کے ہیں چراغ بھی زخموں کے داغ بھی
پھر مجھ کو لے کے شام سمندر تک آ گئی

وہ ہاتھ سو چکے ہیں چٹانیں تراش کر
تھی جو لہو میں آگ وہ پتھر تک آ گئی

پہلے تو چہرہ چہرہ بھٹکتی رہی مگر
سب کی نظر پھر ایک ہی منظر تک آ گئی

کچھ لوگ کر رہے تھے قمرؔ ذکرِ زندگی
آگے بڑھی تو بات مقدر تک آ گئی

●●

عروجؔ زیدی

تیرے دیوانے کا جس جانب گزر ہو جائے گا
ذرّہ ذرّہ خود پرست و خود نگر ہو جائیگا

شوقِ نظّارہ طلب جب معتبر ہو جائے گا
حسنِ خود بیں زیبِ آغوشِ نظر ہو جائیگا

تو نگاہِ التفاتِ دوست کا محرم نہیں
یہ جدھر ہو جائیگی، عالم اُدھر ہو جائیگا

ظلمتیں عزم و عمل کی راہ میں حائل نہیں
ہر نشانِ پا چراغِ رہ گزر ہو جائیگا

میرے افسانے لکھیں گے لوگ میرے بعد بھی
کون کہتا ہے یہ قصّہ مختصر ہو جائیگا

کیا سمجھ کر ہے نفس کی اس ہوابندی پہ ناز
کل یقینِ زندگی نامعتبر ہو جائیگا

وہ تصوّر جس کی وسعت ماورائے کائنات
کس طرح زندانیِ دیوار و در ہو جائیگا

قہقہوں سے کھیلنے والوں کو کب معلوم تھا
غم ہماری زندگی کا ہم سفر ہو جائیگا

کیا خبر تھی محفلِ نقدِ سخن میں اے عروجؔ
آدمی بیگانۂ عیب و ہنر ہو جائے گا

●●

کرشن مُراری

وہ اک امید جس کے سہارے تھی زندگی
وہ روشنی بھی آج اندھیروں میں کھو گئی

بہکا ہوا شعور بدلتا ہے کروٹیں
سوتی ہے رات جاگتے ہیں حادثے کئی

پھر نکہتوں کی موج رواں ہے چمن چمن
ان گیسوؤں سے کھیل کے بادِ صبا چلی

شاید تعلقات کا اک سلسلہ چلے
نظروں کی ہو رہی ہے جو نظروں سے دوستی

مستی ترے ملن کی بیاں ہو تو کس طرح
چھایا رہا حیات پہ اک کیفِ سرمدی

رعنائیِ شباب کا عالم تھا چار سو
کلیوں پہ تیرے حسن کی بکھری تھی چاندنی

کچھ حادثوں کی شوخ سی یادیں لیے ہوئے
سائے لرز گئے در و دیوار پر کئی

●●

نو بہار صابر

دور ہی دور سے خوشیوں نے تو ٹالا ہے مجھے
غم نے اخلاص کے آغوش میں پالا ہے مجھے

غیر تو ہو نہیں سکتا کوئی اپنا ہوگا
مار کر جس نے گھنی چھاؤں میں ڈالا ہے مجھے

کس وسیلے سے ہو دنیا سے تعارف میرا
کون یاں میرے سوا جاننے والا ہے مجھے؟

ڈوب جاؤں تو کریگا یہ بہت واویلا
جس نے خود حلقۂ گرداب میں ڈالا ہے مجھے

دور تک سایۂ تسکیں کا کہیں نام نہیں
کس ڈگر پر مرے احساس نے ڈالا ہے مجھے

یہی اک روز پٹک دیگی زمیں پر صابرؔ
جس ہوا نے سرِ افلاک اچھالا ہے مجھے

●●

مخمور سعیدی

دسمبر کی نظم

دسمبر کی جادو جگاتی ہوئی شام رنگیں
شفق کے زر افشاں دو شالے میں لپٹی —
قدم کتنی آہستگی سے اٹھائے
گلابی بدن اس کا کچھ گنگنائے
وہ نغمہ سنائے
گنہ گار لمحوں کی آنکھوں میں جس کی صدا پہ
کوئی بے زباں آرزو کسمسائے
خود اپنی چتا میں سلگتی ہوئی روح کو جیسے کوئی
مہکتی ہوئی اجنبی وادیوں کے سہانے سفر پہ بلائے
سیہ پربتوں سے اترتے دھندلکوں کے پیچھے
بہیں جیسے کوئی ندی، لذتوں کی سنہری ندی جگمگائے
جو جلتی ہوئی خواہشوں کے گھنیرے گھنے جنگلوں کی طرف
دیکھ کر مسکرائے
لہو رنگ شعلوں کو بڑھ کر جو اپنے گلے سے لگائے

دسمبر کی جادو جگاتی ہوئی شام رنگیں
شفق کے زر افشاں دو شالے میں لپٹی —
قدم کتنی آہستگی سے اٹھائے
مگر سمٹی سمٹی گزرتی ہی جائے
گنہ گار لمحوں کے کب ہاتھ آئے

●●

صلاح الدین پرویز

اے فلرٹیشن وتھ اے پوئم

چاند تاروں کی کٹوریاں پانی سے بھر گئی ہیں لیکن ہوا آسمان سے زمین پر مسلسل ریت کی صورت گر رہی ہے۔ تمہارا نام پرنیتا ہے اور تمہارے جھولے میں اب کوئی بھی سانس ٹیڑھی نہیں ہے۔ میرے سینے کے بال ایک دوسرے سے لپٹ کر زمین کے نیچے دھنسے جا رہے ہیں۔ تمہاری کوکھ میں انار کے پودے نے جنم لیا ہو یا تمہارے جھکے ہوئے کاندھوں پر انگور کی بیل چڑھ رہی ہو مجھے تمہارا نام یاد رہے گا۔ تم اپنے ہاتھوں میں کدال لیکر مجھے کس طرح گھماؤ گی۔ تمہارے آگے پیچھے تو پھل ہی پھل ہیں — اور درمیان میں بلّی بچہ مار سکتی ہے پرنیتا، مکان کے پردوں سے نکل کر اٹیشن کی پٹڑیوں پر اتر جاؤ۔ بھاگو، بھاگو، بھاگتی ہی رہو، تمہارے آگے پیچھے پھل ہی پھل ہیں —— اور میں اب اپنے پائپ سے تمباکو کے بجائے پانی پیتے پیتے خود ہی ایک نل بن گیا ہوں — خدا حافظ — فقط

تمہارا صلاح الدین پرویز ——————

■■

تنہا تماپوری

آخری نیند سے پہلے

کس نے سوچا تھا جنگل سجائے وہاں ؟
کس کے شیشے میں لرزا تھا پتھر کا دل ؟
کس نے انجمن کے چہرے مقابل کئے ؟
کون چیخا تھا سینے میں پل کے لئے ؟
کون تھا مجھ میں ؟
محرومیاں رکھ گیا ؟
میں کہاں تک دھندلکے بجھاتا رہوں ! ؟؟

وہ چہکتے ہوئے دن کہاں کھو گئے ؟؟؟
شب کی شاخوں سے پتے جدا ہو گئے !!
واسطے کٹ گئے، بس تھکن رہ گئی !!

حوصلوں کے سلگتے ہوئے دشت میں
آخری نیند سونے سے پہلے ــ کوئی
خواب کا کوئی چھتنار ڈھونڈے ذرا

سو کے اٹھوں تو ٹھنڈک کا احساس ہو

■■

اختر بستوی

آمدِ سالِ نو

نئے سال کی آمد آمد پہ یارو
مرا دل بھی ہوتا ہے مسرور و شاداں
مجھے اس تصوّر سے ملتی ہے راحت
کہ اور اک برس بڑھ گئی عمرِ دوراں
مگر میرے احساس کی خلوتوں میں
اُداسی کے بھی رینگ آتے ہیں سائے
میں یہ سوچتا ہوں کہ اس بار شاید
نیا سال آئے تو مجھ کو نہ پائے

■■

خالد سعید

سمندر قائم ہے

جب بوڑھا مچھیروں کی بستی کی آخری جھونپڑی کے پاس پہنچا تو پورنماشی کا زرد چاند بجھنے کو تھا۔ جہاں سمندر آسمان ایک تھے، وہاں سمندر سے سپیدی نکل کر آسمان پر چڑھ رہی تھی۔ بوڑھے کی آمد سے آخری جھونپڑی کے پاس کھڑے سیاہ سایوں کی بدبداہٹ رک گئی۔ وہ سب اسے شناخت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ بوڑھے نے کچھ پوچھنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ زرد اجالے میں کھنچی کھنچی کراہ لہرائی اور بوڑھا پوچھنے سے رک گیا اس نے کانوں سے جھونپڑی کے اندر کا منظر دیکھا پھر پوچھا "کیا ہوا؟"

"عورت بچہ جن رہی ہے" تب بوڑھے نے یوں سر ہلایا جیسے کانوں سے دیکھے ہوئے منظر کی تصدیق ہو گئی ہو۔ کچھ دور ساحل پر گڑی ہوئی کھونٹیوں نے سیماب آسا لہروں کے ساتھ اچھلتی کودتی، چاندنی میں بھیگی ہوئی کشتیوں کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا "کیا کوئی ڈاکٹر اندر ہے؟" —— جگہ جگہ سے مسکی ہوئی کراہیں ابھریں —— تخلیقی عمل کا صوتیاتی اظہار۔ اچانک مجمع میں ہلچل مچی۔ ایک عورت بڑھیا کو لیے، راستہ بناتی جھونپڑی کے دروازے تک پہنچی۔ یکبارگی جھونپڑی کا دروازہ کھلا۔ مسکی ہوئی چیخوں اور زرد مستطیلی روشنی کا لمحاتی اظہار۔ سمندر نغمہ ریز تھا۔

بوڑھا نوکیلی سرے والی لاٹھی ٹیکتا چل پڑا۔ اس کے تعاقب میں سیاہ سایوں کی گفتگو تھی۔

"کون ہے؟"

"بوڑھا ہے روز سویرے سیپیاں چننے آتا ہے۔ ان سے کھلونے بنا...... کراہیں۔

چاند سمندر چھونے کو تھا۔ سمندر کی کھاری ہوائیں بدن چھپانے لگیں۔ بوڑھا جھونپڑی کے عقب میں جا کھڑا ہوا تھا۔ سمندر کی لہریں چاندنی کے ہاتھ لہرا لہرا کر اسے بلا رہی تھیں۔ وہ ان کے بلاوے پر چل پڑا۔ عورت کی کراہیں بوڑھے کے کاندھے پر ہاتھ رکھے چل پڑیں۔ تھوڑی دیر بعد تھک کر گر پڑیں، اس کے قدموں کے نشان سے چمٹ کر رہ گئیں۔ سمندر نغمہ ریز تھا۔

سمندر کی لہریں رزمیہ گیت گاتی چٹانوں پر حملہ کر رہی تھیں۔ ہر حملہ کے ساتھ پانی کی کوٹنگ سے ساحل آئینہ بن جاتا۔ آئینہ میں زرد چاند جھلملاتا۔ ہر لہر کے ساتھ بنتے معدوم ہوتے ساحلی آئینے کی سطح پر سیاہ کیکڑے رینگ رہے تھے۔ بوڑھے کے قدموں کی آہٹ سے کیکڑے لہروں میں غائب ہو گئے۔ لہریں دوڑتی ہوئی آئیں، اس کے قدموں کو بوسہ دیا، لوٹ گئیں۔ اور لوٹتے سمے اپنے ساتھ اس کے پیروں کے نیچے سے ریت کھینچ لے گئیں۔ ریت کے سرکنے سے تلوؤں میں گدگدی ہوئی اور جونہی اس کے تلوؤں کی گرفت ریت پر ڈھیلی پڑتی وہ جھٹکے سے لاٹھی کا نوکیلا سرا ریت میں دھنسا دیتا کہ ساحل سے اس کا رشتہ قائم رہے۔ کوئی کوئی لہر اپنے ساتھ سیپ گھونگوں کے خول لے آتی۔ سمندر نغمہ ریز تھا۔

جہاں تک لہریں پہنچتی تھیں، وہاں انھوں نے ساحل پر بنے ہر نشان کو مٹا دیا تھا۔ اور جہاں کمزور تھیں وہاں انھوں نے بوڑھے کے قدموں کے نشانوں کو کھاری پانی سے لبالب بھر دیا۔ اور بوڑھے کے چند قدم جو ان کی دسترس سے دور تھے۔ لہروں کی بے بضاعتی پر ملگجے اجالے میں استہزائیہ انداز سے مسکرا رہے تھے۔ افق سے لہریں دوڑتیں آئیں بوڑھے کو ٹخنے ٹخنے ریت میں دھنسا گئیں۔ لہروں سے بوڑھے کی پرانی پنڈلیاں بھیگ گئیں اور دھوتی بدن رنگ بن گئی۔ جب لہر لوٹی تو کچھ قدم آگے ایک بڑی سیپی کتاب کی صورت کھلی پڑی تھی۔ بوڑھے نے لاٹھی کھینچنا چاہی۔ وہ ٹخنے ٹخنے ریت میں مضبوطی سے دھنسی تھی۔ وہ لاٹھی گاڑی

چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ بوڑھا جھکا جیسے اٹھانے اس کی نظریں بستی کی طرف تھیں جہاں اب بھی لوگوں کا مجمع قائم تھا۔ اِکے دُکے مرد اپنی اپنی کشتیاں کھول رہے تھے۔ بوڑھے کو اسجان پاکر ایک بھاری لہر تیزی سے دوڑتی ہوئی آئی، پوری قوت سے اچھل کر بوڑھے پر حملہ آور ہوئی۔ بوڑھا لڑکھڑا کر ساحل پر اوندھے منہ گرا صف بصف آتی لہریں بوڑھے کو روندتی آگے بڑھ گئیں۔ واپس ہوتی ہوئی لہروں نے بوڑھے کا چہرہ ریت ریت کر دیا۔ اس کی ٹانگیں پکڑ کر کھینچنے لگیں۔ بوڑھے کی ہتھیلی سے نکل کر سیپیاں ریت کی لہروں میں کھو گئی تھیں۔ بوڑھے نے ہڑبڑا کر لاٹھی کو تھامنا چاہا لیکن وہ اس کی دسترس سے دور تھی۔ بوڑھے نے اپنے پنجے ساحل کے سینے میں گاڑ دیئے۔ فاتح لہریں غصہ میں اس کی ٹانگیں پکڑ کر رگیدنے لگیں۔ ساحل کے سینے پر خراشیں بنتی گئیں اور ریت میں جذب پانی ان خراشوں میں اُبھر آیا۔ بوڑھے نے چلانے کے لئے منہ کھولا تو چھوٹی چھوٹی لہریں اس کی رانوں، کمر سے گذر کر اس کے ناک منہ میں داخل ہو گئیں۔ بوڑھے کو اچھو لگا، ساحل اس کے پنجوں کی گرفت سے نکل گیا۔ بوڑھے کو مغلوب دیکھ کر وحشی لہریں نئے ولولے کے ساتھ پھر اس پر کود پڑیں۔ اور اپنے حملے کے زور میں دور تک ساحل پر دوڑتی چلی گئیں۔ ان لہروں کے زور سے ساحل پر گری لاٹھی نے بھی اپنی گرفت کھو دی اور واپس ہوتی ہوئی لہروں کے ساتھ بہہ گئی۔ فاتح لہریں بوڑھے کی قمیص کا کالر تھام کر اسے اپنے ساتھ کھینچتی لے گئیں۔ سیاہ ناتواں پیر لہروں کے باہر فضا میں لہرا رہے تھے ـــــ ساحل سے معذ، لہروں میں الٹتے پلٹتے ہوئے بوڑھے نے جب سر اُٹھایا تو اس کے ناک، منہ سے بھل بھل پانی نکل پڑا۔ سمندر کی لہریں بوڑھے کو اپنے حلقہ میں گھیرے اچھل کود رہی تھیں۔ وحشی لہروں نے بوڑھے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بھی اپنی صف میں شامل کر لیا۔ ساری لہریں صف آرا ہو کر غصہ سے دوڑتی ہوئی پوری قوت سے چٹانوں سے ٹکرائیں۔ فضا میں چھینٹے اچھلے، چٹانیں بھیگ گئیں۔ بوڑھے کی میلی دھوتی چٹانوں سے شکست کھائی ہوئی لہروں کی سطح پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ لہروں کی دوسری صف کی چوٹی پر بوڑھے کی لاٹھی بھی شامل تھی۔ لاٹھی لہروں کے ساتھ فضا میں اچھلی۔ اس کا ایک سرا چٹان سے ٹکرایا، اور لاٹھی فضا میں تیرتی ہوئی چٹانوں کے عقب میں دور ساحل پر جا پڑی۔

بستی کی آخری جھونپڑی سے بڑھیا کو گھیرے ہوئے عورتیں نکلیں اور لوگ مطمئن انداز سے اپنی اپنی جھونپڑی کی طرف بڑھ گئے۔ سمندر نغمہ ریز تھا۔ ●●

....

بقیہ : ازالہ

تھے ـــ لیکن میں متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا تھا۔ کیوں کہ میرے لئے یہ کامیابی کا آخری جھٹکا تھا۔ اس ایک جسم کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا اور ہر فرد، فرد فرد ہو کر خود کی محافظت پر معمور ہو چکا تھا۔ لوگ سبز، زرد اور نیلے کا فرق جان چکے تھے۔ خود فراموشی اور خود پرستی کا کڑوا کسیلا اور میٹھا مگر اندھا ذائقہ ان پر روشن ہو چکا تھا۔ آئینے کا تصور پا کر ان کے شعور و احساس خود آگہی کے نور سے اجلا چکے تھے۔ خود کے ساتھ بسر کرنے کا سلیقہ انہیں پوری طرح آ گیا تھا۔ جب بھی رہائی پا کر تنہا تنہا ہر سمت بکھر گئے تھے ـــ تب میں نے اپنے بکھرے پن کو خود میں سمیٹا تھا اور جب واپسی کا ارادہ کر کے بھٹکی کی سرحد پار کرنے کے لئے بے چین ہوا تھا۔ تب سب لوگوں نے میری راہ روک لی تھی ـــــ دامن پکڑا تھا اور کہہ اٹھے تھے ـــ "پیغمبر ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔" ●●

جبار جمیل

پرانا شہر، نئے لوگ

بمبئی وی ٹی سے براڈ گیج لائن پر اگر آپ مدراس کے لئے نکلیں تو ٹھیک بارہ گھنٹے بعد اردو کے پہلے نثر نگار حضرت خواجہ بندہ نواز کی ابدی آرام گاہ، ابراہیم جلیس کی ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے اولیں مرکز اور سلیمان خطیب اور حمید الماس کے وطن گلبرگہ پہنچ جائیں گے۔ وہی گلبرگہ جو راہی قریشی کا وطن ثانی بھی ہے اور میرا جنم استھان بھی۔ قدیم کتابوں میں اس کا نام "کل برگی" نظر آتا ہے جو ایک کنڑی لفظ ہے کنڑی میں 'کل' پتھر کو کہتے ہیں اور 'برگی' ڈھیر کو یعنی پتھروں کا ڈھیر! ہوسکتا ہے بہت پہلے یہاں جابجا پتھروں کے ڈھیر رہے ہوں اور اسی مناسبت سے آس پاس کے لوگ اسے 'کل برگی' کے نام سے پکارنے لگے ہوں۔ جب یہ مسلم حکمرانوں کی دسترس میں آیا تو پتھروں کے بے جان ڈھیر سے نازک نازک پھولوں کی اور پتیوں کا مجموعہ "گلبرگہ" بن گیا۔ مگر اس کے دیہاتوں میں آج بھی اسے "کل برگی" پکارا جاتا ہے۔ اس لئے کہ قدیم رنگ بہت ٹھہرے ہوتے ہیں۔

گنبدوں کے اس شہر کی تاریخ بڑے نشیب و فراز رکھتی ہے!

جب ہندو راجاؤں کا دور ختم ہوا تو بہمنی خاندان نے عنان حکومت سنبھالی جس کا بانی حسن گنگو بہمنی اس وقت دلی میں محمد تغلق کا ایک نائب تھا۔ تغلق نے حسن کو دکن میں ہونے والی بغاوتوں کو کچلنے کے لئے گلبرگہ بھیجا تھا۔ گلبرگہ میں گورنری کے فرائض ایک خدا ترس بزرگ، اسماعیل مخ انجام دے رہے تھے۔ اسماعیل مخ نے حسن کا استقبال کیا اور خوشی خوشی ساری ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے حوالے کر دیا اور حسن نے جو ایران کے بہمن خاندان کا ایک فرد تھا۔ یہاں بہمنی خاندان کی بنیاد ڈال دی۔ گلبرگہ سے الند شریف کے لئے نکلیے تو راستے میں آپ کو حسن کا ویران مقبرہ نظر آئے گا۔ بہمنی خاندان کا سلسلہ جب چلا تو فیروز شاہ بہمنی کے دور میں حضرت خواجہ بندہ نواز گلبرگہ تشریف لے آئے۔ فیروز شاہ نے ایک روز اپنے بیٹے کو بندہ نواز کی خدمت میں بھیجا اور بیٹے نے باپ کی خواہش پر حضرت سے گذارش کی کہ سلطنت کا یہ سلسلہ اسی طرح باپ کے بعد بیٹے کو منتقل ہو۔ حضرت کا جواب بڑا پر اسرار تھا۔

"اس کا انتظام تو ہو چکا ہے!"

اور وہ انتظام یوں ہوا کہ بادشاہت بیٹے کے بدلے بھائی، احمد شاہ ولی کی طرف موڑ دی گئی۔ احمد شاہ نے پایۂ تخت بیدر کو بنایا۔

محمد شاہ سوم کا دور دراصل اس کے وزیر گاوان کا دور تھا۔ انتظامی امور کا ہر دریچہ، ہر دروازہ گاوان ہی کی رائے سے نصب کیا جاتا رہا۔ اس کی بنائی ہوئی گاوان یونی ورسٹی کے کھنڈر آج بھی آپ کو بیدر میں ملیں گے۔ مگر محمد شاہ سوم سے ایک بھیانک غلطی ہو گئی۔ غلط خبروں کی بنیاد پر محمد شاہ نے گاوان کو قتل کرا دیا۔ اور پھر بہمنی سلطنت پانچ ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ بیدر، برار، گولکنڈہ، احمد نگر اور بیجاپور! بیجاپور کے حاکم عادل شاہ سے وہاں عادل شاہی دور کا آغاز ہوا اور گلبرگہ اسی عادل شاہی جھنڈے تلے آگیا۔

سات گنبدوں کے جس مجموعہ کو آج ہم "ہفت گنبد" کے نام سے پکارتے ہیں، وہ بہمنی چراغوں ہی کی آخری آرام گاہ ہے۔ مگر یہ سات گنبد کیسے ہیں!!! یہیں سے اگر آپ مشرق کی طرف نظر کریں تو تھوڑی ہی دوری پر ایک سفید گنبد نظر آئے گا لیکن ان سات گنبدوں اور اس ایک گنبد کے بیچ زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہاں وقت گذاری کے لئے بے روزگار نوجوان تاش اور نادلیں لے کر ــــ اور ــــ گداگر دن بھر کی بھیک سے حاصل شدہ 'انکم' لے کر آتے ہیں۔ لیکن وہاں، وہاں روزانہ کئی سو، ہر ہفتہ

ہی ہزار اور ہر سال عرس کے موقعہ پر کئی لاکھ نفوس بلاقیدِ مذہب و ملت جمع ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ہوتی ہے عقیدت، انکساری، عاجزی اور منت و سماجت! ان سیاہ سات گنبدوں کے مکینوں نے جسموں پر حکومت کی تھی، اور اس اجلی گنبد کے شہنشاہ نے دلوں پر، پہلی حکومت مٹ گئی مگر دلوں کو جیتنے والی حکومت آج بھی جاری ہے۔

اس کل کے 'کل برگی' اور آج کے 'گلبرگہ' کی ادبی تاریخ بھی کافی لمبی ہے۔ زمانۂ قدیم کا ہر دور، ہر موڑ انگنت ناموں سے جگمگاتا رہا ہے۔ میں اس سفر کی روداد کو ماضی قریب کے دو ایک ناموں سے شروع کرتا ہوں:

گلبرگہ کا ماضی قریب ابراہیم جلیس اور شور عابدی کا زمانہ تھا۔ ابراہیم جلیس کی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی۔ یہاں کے اکثر مقامات کے نام آپ کو جلیس کی کتابوں میں نظر آئیں گے۔ 'غفوریہ ہوٹل' کا ذکر تو ایک کتاب میں آپ نے پڑھا ہی ہے جو آج بھی ہے اور اسی نام سے ہے۔ وطن نہ ہوتے ہوئے بھی گلبرگہ کو ہم جلیس کا وطن کہہ سکتے ہیں۔ یہاں آج بھی آپ کو ان کے سسرالی لوگ ملیں گے اور ساتھی بھی۔ ہمارے ایک بزرگ دوست ہیں، ساحل صاحب! ان سے ملئے تو گھنٹوں ابراہیم جلیس کے شب و روز کی حکایات سناتے چلے جائیں گے۔ ادھر چند دنوں سے یہ خبر گرم ہے کہ دونوں ملکوں میں تعلقات کی استواری کے بعد ابراہیم جلیس چند روز کے لئے پاکستان سے گلبرگہ آنے والے ہیں۔

شور عابدی مجاز ٹائپ کے شاعر تھے۔ یعنی طبیعت رومان پرور تھی مگر انگور کی بیٹی سے بھی لگاؤ تھا۔ ابھی کچھ دن ہوئے مقامی اردو اکادمی والوں نے ان کی موت کے کافی عرصہ بعد انکی شاعری کا ایک چھوٹا سا انتخاب "خم کا کل" شائع کیا ہے۔

سلیمان خطیب شور عابدی کے ساتھیوں میں سے ہیں خطیب صاحب مدراس سے کشمیر تک کے مشاعروں کے کامیاب شاعر ہیں۔ دور دراز مقامات سے خطیب صاحب کو مشاعروں کے اتنے آفر آتے ہیں کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ مگر ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری مقامی دکھنی زبان میں ہونے کی وجہ سے ابھی تک سنجیدہ نقادوں کی نظر میں نہیں آئی۔ حالانکہ طنز اور مزاح کے عناصر ان کے یہاں انہیں حدود میں ملتے ہیں جتنے شاد عارفی کے یہاں!

حمید الماس کو شمس الرحمٰن فاروقی نے 'خاموشی کا شاعر' کہا ہے۔ وہ ان معنی میں بھی خاموشی کے شاعر ہیں کہ ہندوستان میں وہ کافی تاخیر سے پہچانے گئے۔ ان کی بیشتر تخلیقات پاکستانی جرائد میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ایک عرصہ تک خود گلبرگہ والوں کو اس کا علم نہیں تھا کہ جذبات کی دھیمی دھیمی آنچ والا یہ البیلا شاعر ان کا ہم وطن ہے۔ انسانی فطرت میں اگر شرمیلا پن زیادہ ہو تو آدمی شور شرابے اور جھمیلوں سے خود کو بچاتا رہتا ہے۔ اور پھر کچھ دنوں بعد ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ اس خاموشی پربت کے سینے میں تو آتش فشانی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ ابھی ابھی ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "پہچان کا درد" شائع ہوا ہے۔ مجموعہ میں شامل نظموں اور غزلوں سے شاعر کے درد کی پہچان تو ہو جاتی ہے مگر خود شاعر کی پہچان ذرا کھٹائی میں پڑ جاتی ہے اور اس کا ذمہ دار شاعر خود ہے۔ راکٹ رفتار سے نظمیں یا غزلیں کہنا کچھ برا نہیں مگر مجموعہ کی اشاعت کے وقت شاعر اگر غالب کا سا طرز انتخاب نہ اپنائیے تو پھر اچھی چیزوں کے ساتھ ہلکی پھلکی اور سطحی چیزیں بھی مجموعہ میں شامل ہو کر شاعر کے مقام کو مضروب کر دیتی ہیں۔ راہی قریشی غزل کے شاعر ہیں "صحرا کا سفر" کی رسم اجرا کے موقعہ پر راہی صاحب کے ڈکشن کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ایک لفظ "آئینہ" کا خصوصیت سے ذکر کیا تھا۔ آئینہ راہی صاحب کی ہر غزل میں اور غزل کے ہر دوسرے شعر میں نظر آتا ہے۔ یوں میں راہی قریشی کو "آئینہ" کا شاعر کہتا ہوں مگر اس آئینہ میں جس شخص کا پیکر ابھرتا ہے وہ دکھوں کی ایک کتاب ہے۔ زندگی کے ایسے دکھ جو نارسائی کی دین ہوتے ہیں۔ ان دکھوں میں کھو کر قاری اپنے دکھوں کو پا جاتا ہے اور یہی راہی قریشی کی غزل کا کمال ہے۔ اگر راہی صاحب سے ملئے تو ان کے اور ان کی غزل کے درمیان میلوں کا فاصلہ نظر آتا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ سگریٹ کا دھواں اڑاتا، مشاعروں میں ہنستا ہنساتا اور موپیڈ پر بڑی بے فکری سے دوڑتا ہوا یہ کالج لکچرار ایک شکستہ دل کا مالک ہے! "صحرا کا سفر" کے پیش لفظ میں محمود سعیدی نے راہی صاحب

کے تعلق سے بڑے قیمتی الفاظ کہے ہیں۔

• راہی قریشی نے غزل کی روایت سے یکسر بے نیازی دکھائے بغیر اس سے اپنے عہد کے تخلیقی ذہن کی ترجمانی کا کام لیا ہے ....

خمار قریشی کی غزل کا لہجہ راہی قریشی سے قطعی مختلف ہے۔ خمار خالص نئی غزل کے شاعر ہیں۔ خمار نے نظمیں بھی کہی ہیں مگر اس میدان میں وہ بہت کم کامیاب ہوئے ہیں۔ حامد اکمل البتہ غزل اور نظم دونوں کا دھنی ہے۔ افسانہ پر بھی اس کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ 'دعا' اکمل کی ایک نظم ہے جس میں اس نے اپنے حالات کو بڑے پر اثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ در اصل یہ نظم اس کی منظوم آٹو بیوگرافی ہے۔

حامد اکمل کا افسانہ جدید اور علامتی ہونے کے باوجود اس قدر گنجلک نہیں ہوتا جتنا کہ حمید سہروردی یا اکرام باگ کا افسانہ ہوتا ہے۔ لطیف کی بابت بھی میں کم و بیش یہی کہوں گا۔ ان تینوں کی طرف سے چاہے کوئی افسانہ آئے یا نظم، قاری کا ذہن بوجھل پن کے غبار سے اٹ سا جاتا ہے۔ شروع میں البتہ اکرام کی تحریر میں ایک نئے فلسفہ کی چنگاریاں سی دکھائی دیتی تھی مگر بعد میں ان کا طرز جوگندر پال اور اختر یوسف کے سے بوجھل طرز کی طرف مڑ گیا۔ بشیر باگ تو اب بالکل خاموش ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کی کہانی "آکٹوپس" ایک کامیاب علامتی کہانی ہے۔ حکیم شاکر کی شروعات کافی پر امید ڈھنگ سے ہوئی تھیں۔ ایک قلیل عرصہ میں انہوں نے چند کہانیاں، چند نظمیں اور چند ایک غزلیں کہیں، وہ بھرپور معنویت رکھتی ہیں۔ اخبار "سلامتی" نکال کر وہ اب صرف اڈیٹر بن کر رہ گئے ہیں۔ بشیر باگ اور حکیم شاکر اگر دوبارہ لکھنا شروع کریں تو کتنا اچھا ہو۔

خالد سعید ابھی ابھی آئے ہیں مگر ان کی نظم اور کہانی، دونوں جی دار ہیں، خدا کرے یہ صاحب بوجھل پن کے آسان راستہ پر آئندہ بھی نہ چلیں۔

نصیر احمد نصیر، وقار علیم اور اسماعیل غازی بھی بالکل نئے لوگ ہیں اور بالترتیب غزل، کہانی اور غزل سے وابستہ ہیں۔ بدر مہدی کی مختصر غزلیں اپنے ساتھیوں کی بہ نسبت زیادہ وزن دار ہوتی ہیں۔

طیب انصاری اور شرف الدین سرخی کے مضامین دو قطعی متضاد دماغوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ طیب صاحب کے پاس انتہا پسندی ہے جبکہ سرخی صاحب کے یہاں ٹھہراؤ اور اپنی بات کو معتدل ڈھنگ سے کہنے کا سلیقہ ہے۔ طیب انصاری ایک طرف شمس الرحمٰن فاروقی کے نثری سرمائے کو کنڈم کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کی شاعری کی ستائش کر بیٹھتے ہیں (گنج سوختہ کا تیسرا آدمی) حالانکہ شمس الرحمٰن فاروقی کی نثر نے اردو تنقید کو نئی زبان دی ہے۔ طیب صاحب غالب شکن بھی ہیں۔ ان کی غالب شکنی بعض وقت یگانہ سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ اور انہیں اس بات سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ بندہ نواز پہلے نثر نگار ہیں!!!

سید مجیب الرحمٰن اور وہاب عندلیب کبھی کبھار ایک آدھ مضمون لکھتے ہیں۔ وہاب صاحب کی خاکہ نگاری خاصہ کی چیز ہوتی ہے۔ حامد اکمل اور امیر احمد خسرو کے خاکے بڑی دلکشی لئے ہوئے ہوتے ہیں۔

مجیب صاحب ماہر نفسیات ہیں، ادب اور نفسیات کے باہمی تعلق پر وہ گھنٹوں بول سکتے ہیں اور کئی صفحات لکھ سکتے ہیں۔ مگر لکھتے بہت کم ہیں۔ البتہ کبھی کبھی انہیں سننے کا موقعہ ضرور مل جاتا ہے۔

ان نئے لوگوں کے علاوہ کچھ چہرے ایسے بھی ہیں جن کی پیشانیوں پر مجھے فکر اور سوچ کی لویں نظر آتی ہیں مگر جو ابھی تک خاموش ہیں۔ جلیل تنویر بھی ایک ایسا ہی چہرہ ہے۔ ملنسار الماسی ہے ...... جمیل احمد عالی ہے ...... اور ...... اور ......

۵۵.

ندرت نواز

ترے نگر میں بھٹکنے کا کچھ صلا تو ملے
نصیب ہو کوئی آہٹ کوئی صدا تو ملے

وہ نقلی خون کے دھبّے سمیٹ لایا ہے
یہ سوچ کر کہ کوئی مشغلہ نیا تو ملے

ترے قریب پہنچنے کے راستے تو بہت
ترے قریب پہنچ کر ترا پتا تو ملے

نہیں ہے کچھ تو یہ تنہائیاں ہی اپنائیں
کسی طرح بھی سہی کوئی دوسرا تو ملے

یہ ساری ٹھوکریں ندرت نواز کو منظور
جو اس کو اس سے ملا دے وہ راستا تو ملے

●●

منظور ہاشمی

خواب ہریالی زمینوں کے دکھا کر لے گیا
زرد پتوں کو ہر اک جھونکا اڑا کر لے گیا

موم کے پتلے تھے ہم اور گرم ہاتھوں میں رہے
جس نے جو چاہا ہمیں ویسا بنا کر لے گیا

راستے کی چیز تھا میں جس کی نظریں پڑ گئیں
وہ مسافر اپنی مٹھی میں دبا کر لے گیا

جس کے پانی کو دعا دیتی رہی پیاسی زمیں
ایک دن فصلیں وہی دریا بہا کر لے گیا

تھک چکا تھا میں مگر وہ ذوقِ منزل کا بھلا
راستے بھر اپنے ہاتھوں پہ اٹھا کر لے گیا

ہاں مری آنکھوں نے دیکھی ہیں سنہری جنّتیں
وہ ملا تو آسمانوں پر اڑا کر لے گیا

●●

حسن عزیز

یہ جلتی دھوپ کہ آب و سحاب میرے تھے
کھلے کہاں تھے ابھی جتنے باب میرے تھے

نواحِ دشت بدن میں بھی دھند چھائی ہوئی
پسِ حجاب بھی کتنے حجاب میرے تھے

یہ بھول جاؤں کہ تھا مجھ سے کوئی رشتۂ آب
یقین کر لوں کہ دشت و سراب میرے تھے

یہ وہم ہے کہ ملیں گی جوان تعبیریں
سوادِ شب میں تھکے ہارے خواب میرے تھے

جلائے اس نے چراغِ سوالِ وہم کئی
اور ان کی ضو کو بڑھاتے جواب میرے تھے

لرز کے ٹوٹ گئی یورشِ ہوا سے حسنؔ
وہ سبز شاخ کہ جس کے گلاب میرے تھے

●●

ابوالمجاہد زاہد

شعلۂ برقِ تبسم سے جلا دی جائے
نگہِ عشق ہے گستاخ، سزا دی جائے

اسی ویرانے میں شاید کوئی چہرہ ابھرے
دشتِ دل ہی میں اسے آؤ! صدا دی جائے

ذہنِ انسان میں ہیں روپوش اندھیرے سارے
عہدِ حاضر کے اجالے کو دعا دی جائے

ادھر آ! اے مرے کردار پہ ہنسنے والے
تیرے ماتھے کی سیاہی تو مٹا دی جائے

کچھ تو مل جائے دہکتے ہوئے سورج سے پناہ
دشت میں ریت کی دیوار اٹھا دی جائے

کیا ستم ہے کہ تمنائے رہائی جو کروں
اور بھی قید کی میعاد بڑھا دی جائے

دل ہی جب جسم میں زندہ نہ رہا اے زاہد
پھر یہ دیوارِ عناصر بھی گرا دی جائے

●●

مہدی پرتاپ گڈھی

زمانہ جان رہا ہے میں اپنے گھر میں ہوں
مگر یہ جھوٹ نہیں ہے کہ میں سفر میں ہوں

نہ جانے ختم کہاں ہوگا خواب کا یہ سفر
میں گھوم پھر کے ابھی تیری رہگذر میں ہوں

شبِ سیاہ کا پندار ٹوٹ جائے گا
میں روشنی کی طرح سے ہر اک نظر میں ہوں

کیا کرے نظر انداز شوکتِ امروز
یہ کم نہیں کہ میں ہر چشمِ معتبر میں ہوں

جہاں خلوص ہے مہدی نہ قدرِ حسنِ وفا
میں دشتِ زیست کی اس تیرہ رہگذر میں ہوں

●● ▬

سید حبیب

فرحتِ زیست ہے حاصل اسی مستانے کو
بڑھ کے لے لیتا ہے جو ہاتھ سے پیمانے کو

تیری آنکھوں میں جوانی کا خمار اے ساقی
اور مدہوش بنا دیتا ہے مستانے کو

ہم نے ہی کاکلِ گیتی کو سنوارا اکثر
ہم نے ہی روشنی بخشی ہے سیہ خانے کو

دھو لیا اشکوں سے ہر داغِ تمنا میں نے
کر لیا صاف مئے ناب سے پیمانے کو

اے حبیب اشکوں سے بجھتی ہے کہیں دل کی لگی
روک لو اب تو چھلکتے ہوئے پیمانے کو

●●

حمید سہروردی

ایک پُر اسرار نظم

شب کے آخری پہر
نیلگوں آسماں میں
سفیدی مائل کوئی شے
اِدھر سے اُدھر ہچکولے لیتے ہوئے
گمراہ ہوئی
ایک ستارہ بکھرتا رہا
جیسے ایک انجان دھماکے سے
پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر
کائنات کے شکم میں بکھرتا ہے
شب کے سبھی خواب
زرد دن کے چہرے پر کالک ملے
سنت ، سادھو کی صورت بنائے ہوئے
ریزہ ریزہ پہاڑ کی بے شناخت زمیں پر
آہیں بھرتے رہے
شب کے گھنگھور لمحوں میں
آسماں میں
نیست کا ایک تماشہ ہوا

■■

جی۔ اے۔ غضنفر

ذرا سوچو

حقیقت ہے بلندی پر
اسے تم نے ہی پہنچایا
تمہیں نے اس بلندی سے
اسے نیچے گرایا ہے
مگر اپنی ہنسی کو روک کر
خود بھی ذرا سوچو
مزا اس نے بلندی کا بھی حاصل کر لیا
لیکن
تم اونچے اٹھ نہ پائے تھے
کہ نیچے گر گئے کتنے ....؟؟؟

■■

پرویز رحمانی

ازالہ

تب سب لوگوں نے میری راہ روک لی تھی — دامن پکڑا تھا اور کہہ اٹھے تھے —

"پیغمبر! ہم تمہیں جانے نہ دیں گے — ہمیں تمہاری مدد درکار ہے۔ تمہارے شفیق دعاؤں کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ تمام مصیبتوں کا ازالہ تمہیں سے ممکن ہے۔ اور میں سوچ کے کہرا کہرا دودھیالے ماحول میں دائرائی کشمکشوں سے الجھتا چلا گیا تھا — "کیا میں واقعی ایسا ہوں" کا احساس شدتوں کا جذباتی پیکر بننے کے لئے بے چین سا ہو گیا تھا۔ اور اسی کے تحت جب میں اپنے نقطے سے دائرے کی قسمت بنا تھا تو شرمندگی کے ساتھ ساتھ مجھے حیرانی بھی ہوئی تھی۔ پہلی بار وسعت کا احساس میرے اندر ابھرا تھا۔ دو ایک کروٹ کے بعد جب میں نے ایک طویل جمائی لی تھی تو گویا ایک صدی کا المیہ وقت کی طربناک ٹہنیوں پر خوشہ خوشہ مسکرا رہا تھا حلقہ محدودیت کی کالی کوٹھری سے رینگتا ہوا وسعت کے روشن دان میں پھیلنے لگا تھا۔

جب سارے ایک ہی جسم کے مالک تھے — تب میں نے خود کو بکھیرتے ہوئے انہیں صرف ایک ہی جگہ کی کلبلاہٹ سے رہائی دلانے کا عزم کیا تھا — اور — جس وقت میں نے انہیں اپنے پرچم تلے جمع کیا تھا تو حیرت کی آنکھیں میرے آئینے میں پھسل پھسل کر گرنے پڑنے لگی تھیں۔ اس وقت چیخوں کے احتجاج کو بھانپ کر میں اپنی آدھی قوت سے چیخ اٹھا تھا —

"نہیں، نہیں!! مجھے مایوس نہ کرو — مجھے تمہاری سوندھی سوندھی مہکوں سے آشنائی چاہئے۔ تمہاری قسم! میں تمہارے بیچ ایک خاص لذت سے ہمکناری چاہتا ہوں۔"

میری یہ عاجزی دروغ مصلحت آمیز کے مترادف تھی۔ لہٰذا یہ سراسر جھوٹ سچ سے تعبیر کر لیا گیا تھا۔ سب نے ستائش کے ان بولوں کو اپنے اپنے لئے مخصوص کر لینا غنیمت جانا تھا سچائی کا صحیفہ جھوٹ کے احسان تلے دب کر مسکرا رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ سارے دھیرے دھیرے چھٹنے لگے ہیں۔ لوگ بکھرتے تو جھوٹ کی قسم دے کر انہیں سمٹنے پر اور جب سمٹتے تو کنوئیں کے مینڈک کا واسطہ دیکر بکھرتے رہنے کی تلقین کرنا میرا پہلا اور آخری فرض تھا۔

جس وقت میرے سرد بولوں کی برفیلی آنچ سے بلندیاں پگھل پگھل کر پستیوں میں اترنے لگی تھیں۔ تو وہ سارے جو ایک جسم کے مختلف عضو تھے، مشتعل ہو ہو کر میرے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ کھسیانے خیطان جو ان کے اندر ابل رہے تھے اور اپنی کمینگی کی شکست پر قہر بن کر مجھ پر ٹوٹ پڑنے کے درپے تھے — میری اس آدھی چیخ سے (جو آج کے لئے محفوظ تھی) یک لخت مرعوب ہو کر باہر نکل آئے تھے اور جب ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہوتے ان میں سے ہر ایک صرف ایک مردود کا روپ دھار کر فرار کی سمت ڈھونڈنے لگا تھا — تب سب کا احساس جاگا تھا اور وہ خفگی و نفرت کے تاثرات سے بے نیاز ہو کر اپنے اندر کے خلا میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے تھے۔ اس وقت میں نے انہیں مسکرا کر دیکھا تھا — ایک دھماکا ہوا تھا، اور شوریدہ فصیلیں اوندھے منہ گر پڑی تھیں۔ خوف و ہراس کی چھتیں دھواں دھواں ہو کر اڑ گئی تھیں۔ لوگ محفوظ

باقی صفحہ ۲۱ پر

فان ڈرو
یوسف جمال

جوہی کے پودے

بوڑھے نے جواب دیا — "پودہ غاروں کی زندگی کی طرف بڑھنے لگتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ سب پتے جھڑ جاتے ہیں۔ ضروری ہے کہ یا تو اس پام کی مٹی تبدیل کردی جائے، اس میں کھاد ملائی جائے یا کسی نئے پام میں اسے لگا دیا جائے۔"

بوئی لان نے معصومیت سے سوال کیا۔ "ڈھیر سارے پودوں میں سے ایک اپنی زندگی کھو دے تو کیا فرق پڑتا ہے اسے زیادہ قیمت نہیں تو معمولی قیمت پر بیچا جا سکتا ہے۔"

بوڑھے کے چہرے پر غصے کی سرخی دوڑ گئی۔ "اپنی آسودگی کے لئے پھولوں کی کاشت ہر قیمت سے بالاتر ہے، دولت مند پیسوں سے پھول تو خرید سکتے ہیں لیکن وہ کلیوں کی نزاکت و لطافت سے حظ اٹھانا نہیں جانتے۔"

اور اس بوڑھے سے زیادہ کون ہے جو اتنی دلچسپی سے پھولوں کا دھیان اور کافی محنت سے ان کی نشو و نمائی کے لئے کوشاں رہتا ہے؟ بوئی لان نے بتایا تھا کہ اسے گلاب کے پودے بہت پیارے لگتے ہیں۔ دادا جان کا حکم ہے کہ میں پھولوں کے شگوفوں کو اس پانی سے دھوؤں جس میں اپنا چہرہ دھوتی ہوں۔

اور یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہ آسکی تھی، لیکن ایک دن کوئی شخص جوہی کے دو پودے خریدنے آیا اور اس کے عوض روپیوں کی کئی تھیلیاں دینے کی پیش کش کی، مگر بوڑھا انہیں اپنے سے جدا کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔

یہ بات بھی میرے لئے ایک عجوبہ کی حیثیت رکھتی تھی کہ۔ اگرچہ وہ یونہی جوہی کے پودے مانگ لیتا تو شاید وہ بلامعاوضہ ہی دے دیتا۔ سودے بازی کے نام سے وہ تلملا اٹھا تھا۔

یہ واقعہ پیش آتے ہی میری آنکھیں کھل گئیں، مجھے جوہی کے پودوں سے محبت ہوگئی۔ میں اور بوئی لان مل کر ان کی دیکھ بھال کرتے۔ ایک دن میں نے کہا۔ "بوڑھے دادا انہیں بید چاہتے ہیں۔ کیوں نہ ہم انہیں مذہبی تیوہار پر پھول کا تحفہ دیں؟ صرف ایک مہینہ اور۔"

اور میں جذبات سے مغلوب ہو کر ان معصوم شبنم زدہ ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا، میرے دل کی کائنات میں ہلچل مچ جاتی۔ میں جلد سے جلد جوہی کے پودوں کو پھولوں سے لدا ہوا دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا۔

مذہبی تیوہار کی آمد میں کچھ ہی دن رہ گئے تھے۔ تمام گھروں میں اس کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

اور پھر اچانک موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ مسلسل پانچ دنوں کی بارش سے جنگل اور میدان سیراب ہو گئے۔ دو دنوں کی غیر حاضری کے بعد جب میں نے باغ میں قدم رکھا تو سوچ رہا تھا۔ نئے شگوفے مسکرا کر پھول بن گئے ہوں گے اور انواع و اقسام کی تتلیاں رس چوسنے کے لئے ان پر منڈلاتی ہوں گی۔

لیکن دروازے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک کر رہ گیا۔ بوئی لان ایک کھمبے کے سہارے سہمی کھڑی تھی۔ میں نے اس سے زیادہ زرد چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

"لان! معاملہ کیا ہے؟"

وہ لڑکھڑا گئی، پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے سیب کی ایک ڈال کو پکڑ کر کہنے لگی — "دادا نے جوہی کے دونوں پودے فروخت کر ڈالے۔"

"ناممکن"! میں تقریباً چیخ اٹھا۔ "میں یقین نہیں کر سکتا۔ اگر انھیں بیچنا ہی ہوتا تو وہ انہیں اسی دن دے ڈالتے جب کہ ڈھیر سارے روپے بھی مل رہے تھے۔"

بوئی لان نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "تمھیں یقین نہیں آتا ہے تو جا کر دیکھ لو۔" مجھے واقعی یقین نہیں آ رہا تھا اور جب میں نے بے یقینی کا چہرہ لئے باغ کی اس طرف دیکھا جہاں جوہی کے گملے رکھے

ہوئے تھے۔ بوڑھا ایک شخص سے باتوں میں کھویا ہوا تھا۔

" اب مجھے ان کی خریداری میں کوئی دلچسپی نہیں رہی، آپ نے مجھے یاد کیا اس لئے چلا آیا "

بوڑھے نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ " بولو اب ان کی کیا قیمت لگاتے ہو؟ "

" خود ہی بتائیں کہ کیا دینا ہوگا۔ پرانی قیمت پر تیار نہیں ہوں۔"

" پانچ روپے کم کر سکتا ہوں "

بوڑھے کا چہرہ پیلا پڑ گیا ۔" اچھا لے جاؤ " اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے تیس روپے میں گھاٹے کا سودا طے کر لیا۔ جب وہ شخص جوہی کے پودے لے کر رخصت ہو گیا تو بوڑھا برسوں کا بیمار بنا کمزور و ناتواں مریض کی طرح چارپائی پر گر پڑا۔

لان سے نہ رہا گیا ۔" دادا یہ آپ نے کیا کیا؟"

بوڑھے کی آنکھوں میں اچانک چمک آگئی اور اس کی آنکھیں ادھر مرکوز ہو گئیں جہاں جوہی کے پودے رکھے ہوئے تھے۔

" ساری جھونپڑیاں جل کر راکھ ہو گئی ہیں اور ایک بچے کا باپ بھسم ہو گیا، ایک بیوی کا سہاگ اجڑ گیا۔ پھولوں سے لگاؤ رکھنے کے کیا معنی؟ پڑوس میں قیامت ٹوٹ رہی ہے اور ہم پودوں میں مگن ہیں۔ ناممکن!"

وہ اٹھا۔ ایک ہاتھ میں چھڑی پکڑی اور دوسرے میں چمکتے ہوئے نئے نوٹ۔ یہ سردیوں کی صبح تھی۔ میں بھی دادا کے پیچھے ہو لیا۔ وہ ایک جلی ہوئی جھونپڑی کے قریب رک گیا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ دونوں پودے کس لئے فروخت کئے گئے۔ تین روز قبل یہاں آگ لگی تھی۔ دو شخص جل کر مر گئے اور چار پانچ خاندان بے گھر ہو گئے۔

راستے میں بوڑھے نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا ـــــ " بیچاری بوئی لان! اسے رونے کا حق ہے۔ پھولوں کا مذہب پڑوسیوں سے محبت، اخلاق اور انسانیت کا درس دیتا ہے۔ انسان سے پیار کئے بنا پھولوں سے محبت کرنا قدروں کا زوال ہے۔، انسانیت کی موت ہے "

بوڑھے نے کانٹے دار جھاڑیاں راستے سے ہٹا کر چلتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی ـــــ " آگ کے جان لیوا حادثے کے بعد میں سکون سے سو نہ سکا۔ بیوہ اور یتیم آسمان تک رہے تھے۔ میرے پاس پھول تھے میں نے دل پر پتھر رکھ کر بیچ ڈالے "

دس سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ بوڑھا دور بھی دنیا سے رشتہ توڑ چکا تھا اور بوئی لان بھی۔ خوشبوؤں سے بسی ہوئی وہ ٹہنی عین بہار میں ٹوٹ گئی تھی۔

اب میں پرانے جانے پہچانے مقاموں پر جاتا ہوں تو بیتے دنوں کے لوگ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ پھولوں کا باغ بھی ویران کھنڈر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ لیکن اس تبدیلی سے پہلے میرے دل پر ایک ایسا نشان ابھرا تھا جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔

اور یہی نہ مٹنے والا امر نشان مجھے یقین دلا رہا ہے کہ رات بھر بیٹھ کر ماضی کے باغ میں اگے ہوئے جوہی کے پودے پر کہانی لکھوں...... ـــــــــــ (ویٹ نامی کہانی) ●●

بقیہ: شاگردِ غالب

وہ جور بے سبب سے، رنج دیکھا، کیسے نادم ہیں
نگہ پلکوں تلک آتی ہوئی شرمائی جاتی ہے

عطر بستر پہ ملوں، پھول چنوں تکیے پر
شبِ وعدہ ہے خدا جانے وہ کب آ نکلے

قاصد گیا، ہر طرح سے تسکیں ہوئی، لیکن
اب دل کو یہ دھڑکا ہے کہ کیسی خبر آئے

حیف رنج طبیب سے اپنا
چارۂ سوزشِ جگر نہ ہوا

(بعض اشعار میں رنج نے طبیب تخلص بھی اختیار کیا ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر شعراء کے دو دو تخلص تھے۔ مثلاً سید احمد حسین فرقانی و شاکی، بیاں و یزدانی، ظہور و عرفانی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی)

نساخ نے سخن شعراء میں یہ تین شعر نقل کیے ہیں:

نامہ ... مجھ سے وہ غیر کو لکھوائیں
یہ بھی لکھا مرے مقدر کا

اک بار اور میری عیادت کو آئیے
کسی طرح سے میں ابھی اچھا نہیں ہوا

میں خوب جانتا ہوں لگاوٹ کو آپ کی
آنکھیں تو مل رہی ہیں مگر دل ملا نہیں ●●

تبصرے

فارسی کی دلکش داستانیں صفحات : ۲۹۰۔
قیمت : ۱۸ روپے۔
ناشر: انجمن فارسی، دہلی۔ نیشنل اکاڈمی، دہلی سے بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

ایران کی ادیب ڈاکٹر زہرا خانلری نے "داستانہای دل انگیز ادبیاتِ فارسی" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جس میں ایسے سولہ قصوں کو ضروری تفصیلات کے ساتھ لکھا ہے جن سے متعلق تلمیحات فارسی ادب میں بہ کثرت ملتی ہیں۔ ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے:

"جن لوگوں کو فارسی ادب، خصوصاً فارسی شاعری سے سروکار رہا ہے، انہیں فارسی ادب کے مطالعے کے دوران، بارہا ایسی تلمیحوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کا تعلق تاریخی یا افسانوی داستانوں سے ہوتا ہے۔ ایران کے رہنے والے پچھلے ہزار سال میں ان داستانوں اور افسانوں سے اس قدر آشنا ہو چکے ہیں کہ اگر کسی داستان کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کیا جائے تو ان کے ذہن میں فوراً اس داستان کے تمام کردار اور واقعات ابھر آتے ہیں۔

لیکن ہمارے موجودہ نوجوانوں کو اس بات کا موقع کم ملتا ہے کہ ان داستانوں کا ان کی اصلی شکل میں مطالعہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی شعر و ادب میں ان داستانوں سے متعلق جو تلمیحات آتی ہیں، ہمارے نوجوان ان سے کما حقہٗ لطف اندوز نہیں ہو پاتے، اور اب اس بات کا خطرہ ہو چلا ہے کہ اگر کچھ عرصہ اور بے خبری کا یہی عالم رہا تو ایران کی جدید نسل کا رشتہ ادبیاتِ فارسی کے قدیم سرمائے سے منقطع ہو جائے گا۔

اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان داستانوں کو اختصار کے ساتھ سیدھی سادی زبان میں پیش کر دیا جائے تو نوجوانوں کو مطالعہ کرنے کے لئے اچھا مواد مل جائے گا، اور پرانے لوگوں کے لئے "گاہے گاہے باز خواں" کا کام کرے گا۔" (ترجمہ)

فارسی زبان و ادب کے اثر سے ایسی اکثر تلمیحات اردو ادب میں بھی بہ کثرت مستعمل ہیں، اور اب یہاں کا احوال بھی ایران جیسا ہے کہ ان کی تفصیلات سے کم لوگ واقف ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ اب اردو کو ایسی تالیفات کی زیادہ ضرورت ہے۔

ڈاکٹر نور الحسن انصاری نے فارسی کی اس دلچسپ کتاب کا "فارسی کی دلکش داستانیں" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اصل فارسی کتاب میں نہایت سادہ و صاف زبان میں ایسے قصوں کی ضروری تفصیلات کو قلمبند کیا گیا ہے، اور اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ تفصیلات کے باب میں نہ تو غیر ضروری باتیں شامل ہوں اور نہ اختصار کا یہ عالم ہو کہ ذہن کو تشنگی کا احساس ہو۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ "قصہ پن" پوری طرح محفوظ رہا ہے اور اس سے دلچسپی کے وہ عناصر تابناک رہے ہیں جن کے بغیر داستانیں، دلکشی سے محروم ہو سکتی ہیں (فارسی کی کتاب بھی پیش نظر ہے) یہ تو خوبی تھی ڈاکٹر زہرا خانلری کے کمالِ قصہ نگاری کی۔ اردو کی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ سارے محاسن ترجمے میں بھی اسی طرح برقرار رہے ہیں۔ یہ کتاب داستانی عناصر کی نسبت سے طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ عام قارئین کے لئے بھی دلچسپی کی چیز ہے۔ بہ قول ڈاکٹر پرویز ناتل: "یہ سبھی داستانیں

دلکش، انوکھی اور لطائف وظرائف پر مشتمل ہیں کہ اگر اس کتاب مقصد صرف دل و دماغ کو بہلانا ہو، تو بھی اس سے بہتر مواد ا مشکل ہے۔"

توقع ہے کہ اردو ادب کے طلبہ کے لئے یہ کتاب ان دیت کا وسامان فراہم کردے گی اور عام پڑھنے والے بھی ان قصوں یبی کے ساتھ پڑھیں گے۔ دل چسپی کے ساتھ ساتھ معلومات بھی اضافہ ہوگا۔ کتاب آفسٹ میں چھپی ہے۔ ہر قصے کے دع میں ایک تصویر بھی شامل کی گئی ہے۔ یہ تصویریں اصل ں میں موجود ہیں اور ان سے ایرانی مصوّری کے ایک انداز یہ جھلکیاں بھی سامنے آجاتی ہیں۔

—— رشید حسن خاں

لٹ وھٹ مین کی ۳۱ نظمیں

ترجمہ: عبدالرؤف۔ قیمت: پانچ روپے۔
ناشر: کلچرل اکیڈمی، رینا ہاؤس، جگجیون روڈ، گیا۔

آج جب کہ اردو شاعری اپنے باطن میں گھر کرتی ہوئی یت اور قنوطیت کے ہاتھوں اپنے جوہر سے ہاتھ دھوتی رہی ہے ہمیں عبدالرؤف صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ وں نے والٹ وھٹ مین کی حیات افروز نظموں کا ترجمہ و میں کرکے ہمارے پژمردہ ہوتے ہوئے احساس کو زندگی لہر سے ہم آغوش کرانے کی سعی سلیم کی ہے۔ شاعر کا کام اپنے اشرے کی روحانی لطافتوں کو زہریلی ظلمتوں کے حوالے نا نہیں۔ اسے یقیناً اس لازوال اور نایاب نغمے کی تلاش میں سرگرداں رہنا ہے جو تاریکیوں میں چلتے غلاموں کے نلوں کی بیڑیوں کی جھنکار سے پیدا ہوتا ہے، روشنی کی کرن کی کھوج میں خود کو مٹا دیتا ہے جو لامحدود اندھیروں دم دار ستارے کی طرح وقتاً فوقتاً ضوبار ہوتی رہتی ہے۔ ں کہ ناقابل برداشت کو قابل برداشت، دل پذیر بنانے لئے اس نغمے اور کرن کی ضرورت مسلم ہے۔

والٹ وھٹ مین کی نظموں میں زندگی کی جو تابندگی اور توانائی ہے وہ اسے بلاشبہ تمام نوعِ انسانی کا شاعر بناتی ہے۔ عبدالرؤف صاحب نے اس کی نظموں کی روح کو اردو زبان کا جامہ پہنایا ہے اور خود کو ترجمے کے نہایت مشکل کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کا اہل ثابت کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ نظموں کا یہ شاندار ترجمہ والٹ وھٹ مین کو روح کا کولمبس ثابت کرتا ہے جو ایک نئی دنیا کیطرف چلا جا رہا ہے۔ 'ایک فحبہ سے خطاب' میں والٹ وھٹ مین نے جس جرأت کا اظہار کیا ہے مترجم نے اس کی اسپرٹ کو قائم رکھا ہے ——

والٹ وھٹ مین ہوں میں
حرّیت کوش امنگوں سے بھرا
عین فطرت کی طرح
اپنے بکھرے ہوئے اجزا کو اکٹھا کرلو
ہوش سے کام لو، جمعیتِ خاطر رکھو
مجھ سے بے پروا ملو۔

'ایک سوانح حیات پڑھنے کے بعد' میں اپنی ذات سے عدم واقفیت کا المیہ اپنی شدّت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے ——

لیکن کوئی لکھے گا بھی کیا جب بذاتِ خود
بس چند اشارے، بکھری ہوئی کچھ علامتیں
اپنی افادیت کے لئے وضع کرتا ہوں

'ماں اور بچہ' نظم کا احاطہ کرنے والی معصومیت، سادگی اور پرکاری کو جوں کا توں بنائے رکھنا آسان کام نہیں تھا۔

ایک بچہ لپٹ کے سوتا ہے
اپنی ماں کے سینے سے
دونوں محوِ راحت ہیں
نیند کی رِدا اوڑھے
دیر تک بہ غور ان کا
جائزہ میں لیتا ہوں

پیش لفظ میں وہاب اشرفی نے بجا کہا ہے کہ عبدالرؤف ہمیں شاعر سے دور نہیں کرتے بلکہ اس کے احساسات و افکار کی کامیاب شاعرانہ ترسیل کا مشکل کام سرانجام دیتے ہیں۔

والٹ وھٹ مین کے مجموعۂ کلام — LEAVES OF GRASS کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے کا اقتباس دے کر عبدالرؤف نے ایک مزید خوشگوار فریضہ سرانجام دیا ہے۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ والٹ وھٹ مین شاعر کی ذات اور منصب کے بارے میں کیا سوچتا ہے — عظیم شاعر جعلساز نہیں ہوتا.... اس کے ذہن سے ایک عرفانی صدا کوندتی ہے اور کہتی ہے۔ صفائے باطن اور صاف دلی کتنی خوبصورت چیز ہے — شاعر کی محبت پرعزم ہوتی ہے۔ اس میں تشکیک کو دخل نہیں ہوتا۔ عصبیت، تاریکی موت، خوف — کوئی چیز شاعر کو بے ثمرا نہیں کر سکتی — شاعر ہر اس چیز کو ٹھکرا دیتا ہے جو اس کی روح کی تذلیل کرتی ہو۔ فن کا اصل جوہر، اظہار کی شان اور تجمّل اور علم و ادب کی چمک دمک کی دھوپ "سادگی" ہے۔ سادگی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ کوئی بھی شے قطعیت کی کمی کا بدل نہیں ہو سکتی... نقال بزدل ہوتا ہے۔ بزدل کی موت یقینی ہے۔ پر تکلف، پر تصنع اور مودّب لوگوں کی بھیڑ چھٹ جائے گی اور ان سے کوئی چیز یادگار نہیں رہے گی۔ میں مترجم کو اس کاوش پر مبارکباد دیتا ہوں اور اردو داں اصحاب سے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی استدعا کرتا ہوں۔

— کنور سین۔

بیزار آدم کے بیٹے

مصنف: رشید امجد۔ قیمت: پندرہ روپے۔
ناشر: دستاویز پبلشرز راولپنڈی۔

اس بے شباہت دور میں اپنی پہچان کرانے کے لئے جو روپ دھارن کرنا ضروری ہے اس کی ترغیب پر رشید امجد نے افسانے کو نئے اسلوب اور ہیئت کی ردا اوڑھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے انداز فکر اور انداز بیان میں جو موافقت پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اسے ایک حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ علامتی رنگ میں لکھے تجریدیت کی فضا میں ڈوبے یہ افسانے [illegible] ترسیل کے لئے ترستے نظر نہیں آتے۔ پوری طرح قاری کے [illegible] دماغ پر حاوی ہو کر اسے اپنے مرکزی خیال سے واقف متعارف کراتے ہیں۔ 'بیزار آدم کے بیٹے' میں رشید امجد خاصی حد اور کاریگری سے اپنی بات قاری تک پہنچاتا ہے۔ ہر انسان فراڈ ہے۔ وہ دوسروں کے جسم اور ضمیر کا سہارا لیکر زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا اپنا کچھ نہیں ہے۔ اپنے کھوکھلے پن کو دوسروں کے سامنے عیاں ہونے سے بچانے کیلئے وہ بے رشتہ بے تعلقی سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ افسانے کے کردار ا۔ب۔ د۔س سب اپنے اندر کی بوسیدگی اور تعفّن کے مارے ہوئے ہیں۔ ان کے لیئے زندگی ایک بار گناہ ہے۔ ان کی بے چہرگی ادھاری ہوئی شخصیت ان کی ٹریجڈی کا باعث ہے۔ افسانے کا پیرایہ پر اسرار مگر بامعنی ہے۔ فقروں اور مکالموں میں چستی اور تازگی ہے۔

لیکن یہ خوبی رشید امجد کے تمام افسانوں میں نہیں پائی جاتی۔ 'رکھی ہوئی پہچان' میں پرندہ حریت کی علامت ہے۔ افسانے میں خوف، تردّد، عقیدہ، جذبۂ شہادت اور انقلاب کی ترنگیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں مگر انجام کار کچھ بھی ہاتھ نہیں لگتا یہی صورت 'جلاوطن' میں ہے۔ وہاں اشاریت کی دھندلاہٹ افسانوی کشش اور زندگی کی تندی اور تیزی کو قاری کے ذہن پر چھانے سے روکتی ہے۔ بات ٹوٹتی رہتی ہے۔ کہانی معمولی اور بے رس ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسلوب ہی افسانہ نگار کے مدمقابل کھڑا ہو کر اسے شکست دینے کے در پے ہو جاتا ہے۔ تجریدی ادب میں یہ مقام سب سے خطرناک اور نازک ہوتا ہے۔ یہاں اگر اشاراتی اور علامتی اسلوب خاص رچاؤ اور غنائیت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس کے بغیر فنی تخلیق سپاٹ اور بے کیف ہو جاتی ہے۔ ابہام کی چادر سے پھوٹنے والا اجالا بھی پیدا ہوتا ہے جب فنکار کو اظہار فکر و احساس پورے طور پر میسر آجاتی ہے جس کی روشنی میں وہ اسلوب اور مواد کو مکمل طور پر ہم آہنگ کر کے ایک نئی روش کی بنیاد ڈالتا ہے۔ رشید امجد ابھی اس منزل سے کچھ دور ہیں پھر بھی ان کی کاوش اپنا مقام رکھتی ہے اور اس میں وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ نکھار کے بڑھنے کی امید انگڑائی لے رہی ہے۔

چونکہ رشید امجد ہیئت کی تجربہ گاہ میں کود پڑے ہیں لہٰذا وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موضوعاتی اعتبار سے پرانا اور یکساں

ہوتے ہوئے بھی ادب اسلوب کے سہارے نئی جہتوں پر گامزن ہو کر نئی منزلوں کو عبور کرتا ہے۔

— کنور سین۔

ٹوٹی ہوئی پتیاں

مصنف: اسلام پرویز۔
قیمت: آٹھ روپے۔
ناشر: ادارۂ فروغ اردو سیتامڑھی۔

ادیس احمد دوراں اسلام پرویز کو جدیدیت سے منحرف اور اکتایا ہوا شاعر کہتے ہیں جبکہ کرامت علی کرامت اسے جدید تر نسل کا ذہین شاعر قرار دیتے ہیں۔ اسلام پرویز ہے کہ ایک نقطے پر کھڑا اپنے بائیں دائیں پھیلی راہوں کو دیکھتا ہوا تذبذب میں گھرا نظر آتا ہے اور دونوں صاحبان کو اپنے متعلق دو ٹوک فیصلہ سنانے سے روکتا ہے۔ 'ٹوٹی ہوئی پتیوں' کی غزلوں اور نظموں کو پڑھ کر قاری بھی شاعر کے حسی اور ذہنی رجحان کا پتہ لگانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ کہیں شاعر خاصہ ترقی پسند نظر آتا ہے جیسے:

اس طرح ساری عمر میں مفلس بنا رہا
جا جا کے ہسپتال لہو بیچتا رہا
وہ گہر جبر کی علامت ہے
جو چمکتا ہے تاج پر تنہا
چند فرعون جو لعنت وقت ہیں
سخت چٹان ہیں آدمی کے لئے

تو کہیں جدیدیت کا دامن پکڑے دکھائی دیتا ہے:

منہدم ہونے کو ہے اب یہ مکاں
کھوکھلی دیوار کا سایا نہ کر
وہ شہر شہر بھٹکتا رہا ہے برسوں سے
جو اپنے آپ میں تنہا رہا ہے برسوں سے
اب نہ شیشے کا بدن لے کر کبھی جانا وہاں
پاگلوں کا شہر ٹھہرا کوئی پتھر پھینک دے
کٹ رہا ہے مرا سفر تنہا
میں ہوں تنہا، ہے رہ گذر تنہا

جو بھی ہو اسلام پرویز کے اشعار شعریت سے خالی نہیں۔ ان میں کسک، ٹیس اور چبھن کے ساتھ ساتھ وارفتگی اور بے تکلفی کا عکس ملتا ہے۔ اسلام پرویز کی روح کچھ کہنے کے لئے مضطرب نظر آتی ہے۔ اگر وہ اتنا ہی کم عمر ہے جتنا کہ کتاب کے گرد پوش پر چھپی فوٹو سے نظر آتا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں کہ وہ اپنی راہ چننے کے لئے بے قرار اور منتظر ہے۔ ترقی پسندی کی رو میں بہہ گئے۔ فنی لحاظ سے کمزور اشعار سے قطع نظر اس کی غزلوں میں ایسے شعر ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر ہم محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

روز ملتا ہے پھر بھی جانے کیوں
مجھ کو وہ اجنبی سا لگتا ہے
ہر فرد کے ہونٹوں پہ ہے پانی کی حکایت
ہر شخص سمندر کی طرف دیکھ رہا ہے
نہ جانے کس لئے اک شخص مجھ کو
حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے
لہو میں ڈوبے پرندوں کے خوں لگے بازو
فضا میں دور تلک رنگ بھر گئے ہر سو

نظموں کی جانب شاعر نے پوری توجہ نہیں کی لہٰذا وہ ہلکی پھلکی کمزور اور مرکزیت سے خالی ہیں۔ تاہم بقول علیم اللہ حالی اسلام پرویز بہت سے امکانات کے نقیب جنہیں جانتے اور سمجھنے میں وہ یقیناً خون پانی ایک کر رہے ہوں گے۔

— کنور سین

●●


قوم ترقی کی راہ پر
زیادہ سے زیادہ
لوگوں کے لئے مزید خوراک
اس سال اناج کی پیداوار ۱۱ کروڑ 40 لاکھ ٹن تک
پہنچ جانے کا امکان ہے جو کہ ایک ریکارڈ
پیداوار ہوگی۔
بھارت میں عوام میں ضروری چیزوں کی
تقسیم کے سسٹم میں بہت سُدھار ہوا ہے
اور اسے اب دُنیا میں بہترین سسٹم مانا جاتا ہے۔
مضبوط ارادہ اور کڑی محنت ہمارے ساتھی ہیں

بزمِ احباب

عظیم صدیقی (نئی دہلی)

بزمِ احباب کے لئے مندرجہ ذیل مراسلہ حاضر ہے شامل فرماکر ممنون فرمائیں۔ میں اپنے آخری مراسلہ کے بعد (مئی ۷۵ء) اس انتظار میں رہا کہ ڈاکٹر گیان چند کچھ ایسے شعرا کے بارے میں روشنی ڈالیں گے جنہوں نے جناب کرشن موہن کی غزل (ہر ایک جانب ہے جلوہ گر سلسلہ انا کا۔ مگر یہ کیا سہ سکے گا اک جھونکا بھی فنا کا۔ تحریک ستمبر ۷۳ء) کی بحر میں شعر کہے ہوں اور ساتھ ہی اس بحر اور وزن کو بھی تحریر فرمائیں گے جو کہ اس سب بحث کا موضوع ہے۔ بحث اتنی لمبی ہو گئی کہ تسلسل ٹوٹنے لگا جس سے اس کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب سے عرض ہے کہ اس سلسلہ میں اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہو تو وہ مجھ کو اور اربابِ تحریک کو مطلع ہونے کا موقع دیں۔

جناب کرشن موہن کی مندرجہ بالا غزل بحرِ منسرح میں ایک نئے وزن کا اضافہ ہے جس کے لئے وہ جائز طور پر مبارک بادی کے حقدار ہیں کیونکہ ابھی تک کاتی حضرات کی نظر سے کوئی ایسا شعر نہیں گزرا جو اس بحر میں اس وزن پر کہا گیا ہو۔

غزل کا وزن ہے:

مفاعلن   فاعِلاتْ   مستفعلن   فعولن

(مجنون)   (مطوی)   (سالم)   (مجنون مکشوف)

اس سلسلے میں کئی حضرات سے جن میں ڈاکٹر سحبان العصر۔ ڈاکٹر زار علامی۔ رمز آفاقی۔ آمر سورتی۔ ہمدم وغیرہ شامل ہیں، مشورہ کر لیا گیا ہے اور سب ہی میری اس تجویز سے متفق ہیں کہ حضرت کرشن موہن کے اشعار آپ اپنی مثال ہیں۔

حافظ اور جامی کے اشعار:

(حافظ۔ کرم نخوانی درم برانی ۔ دلِ حزیں را بجائے جانی

جامی۔ زہے جمالِ تو قبلۂ جاں ۔ حریم کوئے تو کعبۂ دل

فآں سجدنا الیک نسجد ۔ وآں سعینا الیک نسعیٰ)

کو مفتی سعد اللہ مرادآبادی نے فعول فعلن (بحرِ متقارب) میں ناپ کر اپنی عروض دانی کا بھانڈا پھوڑ لیا ہے۔ یہ وزن بحرِ تقارب میں سما ہی نہیں سکتا۔

حافظ اور جامی کے مندرجہ بالا اشعار چھ بحور میں بہ آسانی ناپے جاسکتے ہیں لیکن غور و فکر لازم ہے۔

چھ بحور مع اوزان عرض ہیں:

۱۔ بحرِ رجز مسدس ۔ مفاعلن   فاعلن   فعولن
(مجنون ۔ مرفوع ۔ مخلع)

۲۔ بحرِ بسیط مسدس۔ مفاعلن   فاعلن   فعولن
(مجنون ۔ سالم ۔ مخلع)

۳۔ بحرِ سریع۔ مفاعلن   فاعلن   فعولن
(مخبون ۔ مرفوع ۔ مجنون مکشوف)

۴۔ بحرِ منسرح مسدس۔ مفاعلن   فاعلات   فعلن
(مجنون ۔ مطوی ۔ اخذ)

۵۔ بحرِ مجتث مسدس۔ مفاعلن   فاعلات   فعلن
(مجنون ۔ مکفوف ۔ مجنون مسکن محذوف)

۶۔ بحرِ مقتضب مسدس۔ فعولُ   متفعلن   فعولن
(مرفوع و مجنون ۔ سالم ۔ مخلع)

مختار شمیم (اندور)

تحریک کے شمارہ اکتوبر ۷۵ء میں فرید احمد برکاتی صاحب کا مضمون نظر سے گزرا۔ انہوں نے اس مضمون میں ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی تالیفات "انتخاب قصائد اردو" اور "اردو میں قصیدہ نگاری" کو بڑی حد تک مناسب طریقے پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ "اردو میں قصیدہ نگاری" اور "انتخاب

قصائد اردو" کے بعض مقامات کو قابلِ گرفت سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فرید احمد برکاتی صاحب کے بعض اعتراضات سے اختلاف کی گنجائش کم ہے لیکن وہ مزید غور و خوض اور احتیاط سے کام لیتے تو غلط فہمیاں بھی راہ نہ پاتیں۔

معلوم نہیں مضمون نگار کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات رہی ہے یا نہیں کہ اردو کی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ چند ناگزیر مجبوریاں بھی رہی ہیں۔ عام طور سے اردو کی کتابوں کا معاملہ یہ ہے کہ مسودہ کی تیاری سے لے کر طباعت تک بھول چوک کے کئی مرحلے آتے ہیں۔ کبھی مصنف ہی سے کوئی لفظ درج ہونے سے رہ جاتا ہے اور کبھی کاتب یا پریس کی مہربانی سے لفظ تو لفظ، جملوں کی ساخت اور ہیئت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس خیال کے پیش نظر لازمی طور پر ہماری ہمدردی مؤلف کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ یوں کسی بھی سنجیدہ ادیب یا محتاط قلمکار سے فروگزاشتوں اور لغزشوں کا سرزد ہونا ناممکن نہیں ہے۔ بہرحال سحرؔ کی تالیفات میں وہ مقامات کہ جن کی نشاندہی کی گئی ہے مضمون نگار کے اور سحر صاحب کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فرید برکاتی صاحب نے اعتراضات کی رو میں غیر محتاط رویہ سے کام لیا ہے۔ انہوں نے انتخاب قصائد اردو کی فرہنگ کے بعض مقامات کو ناقص اور قابلِ گرفت تو بتا دیا ہے لیکن اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ فرہنگ میں اشعار کو مدنظر رکھ کر ہی معنی لکھے گئے ہیں۔

فرید برکاتی صاحب کو شکایت ہے کہ سحرؔ صاحب نے مصنف "ہفت قلزم" کی رائے کو اپنے یہاں بجنسہٖ نقل کر لیا ہے۔ تعجب ہے کہ بحث و تمحیص کے بعد وہ خود بھی کوئی مناسب حل پیش نہیں کر سکے ہیں۔ جہاں تک "ہفت قلزم" کے اقتباس کے اندراج کا سوال ہے، اس سے انہوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ سحرؔ صاحب اس سے پوری طرح متفق ہیں۔ سحرؔ صاحب نے "ہفت قلزم" کے اقتباس کو متن میں شامل نہ کرتے ہوئے حاشیے میں درج کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ ابھی اس سلسلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

فرید برکاتی صاحب کی اس رائے سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ "العلم حجابُ اکبر" ہونا چاہیے لیکن دیوانِ ذوقؔ کے تمام نسخوں میں "العلم حجاب الاکبر" ہی چھپا ہے۔ قصائد ذوقؔ مرتبہ سرشاہ سلیمان کے متن (صفحہ ۲۱) اور فرہنگ (صفحہ ۹۶) میں بھی یہی صورت ہے۔ اور "انتخاب قصائد ذوقؔ" مرتبہ تنویر احمد علوی کے متن اور فرہنگ میں بھی اسی طرح درج ہے۔ سحرؔ صاحب اصل متن میں بھلا تصحیح کیوں کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ ذوقؔ کے قصیدے میں متواتر "العلم حجاب الاکبر" ہی کیوں چھپتا چلا آ رہا ہے؟

"قوسین میں نمبروں سے ......" خردہ گیری اور خواہ مخواہ اپنی قابلیت جتانے کی مثال ہے۔ "دیے ہوئے" تو پھر غنیمت ہے لوگ تو "دیے گئے" بھی لکھتے ہیں!

نہیب: نعرہ اور ڈراؤنی آواز کے معنی غیاث اللغات کے ساتھ دوسری لغات میں بھی ملتے ہیں۔ اور کم از کم سوداؔ کے شعر میں صاف طور پر اسی کا موقع معلوم ہوتا ہے۔ خوف و دہشت کے معنی بھی لغات میں موجود ہیں۔

مایتحلل: سحرؔ صاحب نے لغوی معنی بالکل درست لکھے ہیں۔ رشید حسن خاں نے انتخاب سوداؔ کی فرہنگ میں "وہ غذا جو ہضم ہو چکی ہو" لکھے ہیں۔ لیکن مضمون نگار نے "بدل مایتحلل" کی صحیح نشاندہی کی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ڈاکٹر سحرؔ صاحب سے اندراج میں بھول ہوئی ہو لیکن مرادی مفہوم تک تو وہ بھی پہنچ گئے ہیں۔

عشر عشیر: معنی لکھتے وقت سہو ممکن ہے۔ کتابت کی غلطی بھی تو ہو سکتی ہے۔ سواں حصہ کو دسواں حصہ لکھ دیا گیا ہو۔

مور د سنگ: فرید احمد برکاتی صاحب معترض ہیں کہ سحرؔ صاحب نے "مورد سنگ" کے معنی "پتھر لگنا" لکھے ہیں۔ اور اس پر چوٹ کرتے ہیں "اس کا تلفظ تو اکثر غلط سنا تھا معنی غلط سمجھنے کی یہ نادر مثال ہے ......" سوداؔ کا مصرعہ ہے ؎

مورد سنگ ہو شیشہ تو غضب ہے کر دے

بامحاورہ زبان میں اس کی تشریح یوں کی جائے گی کہ اگر شیشے پر پتھر لگے یا لگ جائے ...... یوں کوئی نہیں کہے گا کہ اگر شیشہ پتھر لگنے کی جگہ بن جائے۔!

جبین جبیں: معشوق کی پیشانی کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ سوداؔ کے شعر میں اسی کا ذکر ہے ؎

ادائے جبین پیشانی و لطفِ زلفِ طولانی

(مگر فرید صاحب کو اصل لفظ میں ترمیم کا حق نہیں پہنچتا۔ انہوں نے چین پیشانی کو چین جبیں لکھا ہے)

فلک سیر، سیار، سیر: فرید صاحب لغوی معنی کو صحیح مانتے ہیں پھر وہ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ فرہنگ آصفیہ میں سیار کے معنی بہت سیر کرنے والا بھی درج ہیں اور شعر میں سیر کرنے والا ہی مراد ہے۔ صرف چلنے والا کے معنی وہاں موزوں نہیں ہو سکتے۔ فرہنگ آصفیہ میں سیر کے معنی ہیں (۱) گل گشت، سیل، تفریح، پھرنا، گشت، سیاحت، دورہ (۲) ہواخوری، چہل قدمی (۳) تماشا، کیفیت (۴) مزہ، تماشا، لطف (۵) میلا، ٹھیلا، نمائش (۶) لطف، مزہ (۷) ہنسی، مزاق، ٹھٹھا (۸) مطالعۂ کتب بینی (۹) نظارہ، دید بازی، بہار، جوبن۔

عقل کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اردو میں سیر کے معنی چلنے، پھرنے، گشت کرنے یا دورہ کرنے کے نہیں ہیں۔

سبز فام: ڈاکٹر سحر صاحب نے مرادی مفہوم ہری ہی لکھا ہے اور آگے وجہ بھی ظاہر کر دی ہے۔ آدمی کا رنگ ہرا تو ہوتا نہیں لیکن معترض کے لئے ضروری تھا کہ پہلے سبز رنگ کا لکھ دیا جاتا۔

خلق: فرہنگ آصفیہ اور دیگر لغات میں مروت کے معنی بھی درج ہیں۔ شعر میں بھی یہی معنی ہیں۔ سیر کے معنی کے لئے تو فرید صاحب نے فرہنگ آصفیہ دیکھنے کی سفارش کی ہے مگر اپنے اطمینانِ قلب کے لئے اس لفظ کے معنی فرہنگ آصفیہ میں دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بلکہ صاف یہ لکھتے ہیں کہ "صرف لفظ خلق کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں"۔

حسود: اعتراض درست ہے۔ شعر میں چونکہ حسود (بہت حسد کرنے والا) کا موقع ہے اس لئے یہاں یہ کہنا بے کار ہے کہ حسود حاسد کی جمع بھی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ سحر صاحب کو معنی لکھنے میں یہ خیال نہ رہا ہو کہ یہاں حسود یعنی حاسد کی جمع کے طور پر لینا مناسب نہیں ہے۔

آخر میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر صاحب نے حل لغات کا کام اپنے ان عزیزان کے سپرد کر دیا ہو گا جن کا شکریہ مقدمہ میں ادا کیا گیا ہے۔۔۔ گویا "عزیزان" کا شکریہ ادا کرنا فرید احمد صاحب پر گراں گزرا۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی یہ عالی ظرفی ہے کہ دیانت داری اور شاگردوں کی حوصلہ افزائی کے خیال سے وہ ان کے معمولی تعاون کا بھی اعتراف کرتے ہیں ورنہ یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ تو دوسروں سے بہت زیادہ مدد لینے کے بعد بھی اس کا ذکر نہیں کرتے۔

●●

شارق میرٹھی (ہمیر پور)

آج کی ڈاک سے تحریک کا "بسمل سعیدی" نمبر ملا۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ انتہائی خوبصورت، نہایت جامع اور تاریخی اہمیت کا حامل نمبر۔ میں اس قیمتی نمبر کے لئے آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ اپنی محرومی پر افسوس ہے کہ آج تک اس پیکرِ محبت کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت کیوں نہ حاصل کر سکا۔ قطع نظر اور خوبیوں کے، مجھے جو وصف ان کی شاعری میں محبوب ہے وہ پختگی کلام ہے۔ ان کے اکثر مصرعے ڈھلے ڈھلائے اور بے ساختہ ہیں جو زبان زد عام ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں مثلاً:

اب چاندنی دھوپ ہو چلی ہے

یا ٹھوکروں میں ہے سر زمانے کا

انتخاب کلام جامع ہے اور اس میں ایسے بیسیوں اشعار ہیں جو ہر طرح پسندیدہ قرار دئے جا سکتے ہیں:

جن کو دعوے تھے رہنمائی کے کھو گئے خود وہ رہگزاروں میں

کون ہے جو نہیں زمانے میں کس سے شکوہ کریں زمانے کا

جو جہاں ہے وہیں تجھ سے ہے قریب ہے کمال انجمن آرائی کا

راحت آشیاں ہے اس پہ حرام جس کو ہے ذوق لذت پرواز

بت خانے میں بن رہی ہے دنیا مسجد میں قیامت آ رہی ہے

اس زمانے میں جب کلاسیکی شاعری کی قدر و قیمت کو گرایا جا رہا ہے، بسمل صاحب کی شاعری ایسی ہے جیسے اندھیرے میں روشنی کا مینار۔ میری طرف سے ان کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کر دیجئے۔ اس کامیاب نمبر کے لئے دوبارہ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

●●

جو ہم میں نہیں رہے

پچھلے کچھ دنوں میں اردو والوں کو ایسے کئی صدموں سے دوچار ہونا پڑا جن کے اندوہناک اثرات عرصے تک محسوس کیے جائیں گے۔ لکھنؤ میں مشہور محقق اور ناقد پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کا انتقال ہوگیا۔ رضوی صاحب مرحوم کی تحقیقی نظر اور تنقیدی بصیرت مسلمات کا درجہ رکھتی تھی۔ ان کی پہلی اہم کتاب "ہماری شاعری" تھی، جس میں انھوں نے شعر و ادب کے ان معیاروں کی مدلل وکالت کی جو ہمارے اساتذہ کے وضع کردہ تھے اور جنھیں حالی اور بعض دوسرے ناقدین نے مغربی تنقید کے سرسری حوالوں کے ذریعہ مسترد کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کتاب اس ذہنی مرعوبیت کے خلاف پہلی موثر صدائے احتجاج تھی جو سیاسی شکست کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں ہمارا مقدر بن گئی تھی اس لیے علمی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے جو ہمیشہ قائم رہے گی۔

لکھنؤ کی قدیم تہذیب و معاشرت اور وہاں کی علمی، ادبی تاریخ کے گم شدہ گوشوں کی تلاش سے رضوی صاحب کو خاص دلچسپی تھی۔ لکھنؤ کے شاہی اور عوامی اسٹیج کے تعارف میں انھوں نے دو ضخیم کتابیں لکھیں جو بعد میں 'اردو ڈراما اور اسٹیج' کے نام سے یکجا شائع ہوئیں۔ اپنے موضوع پر یہ جامع ترین کتاب ہے اور اس کا مطالعہ اردو ڈرامے کے ابتدائی خد و خال سے قاری کو پوری طرح آشنا کر دیتا ہے۔ ڈراموں کے متن بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں اور اُس زمانے میں ا[illegible]، جو ترتیب ہوا کرتی تھی اس سے بھی متعارف کرایا گیا ہے۔ کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی رضوی صاحب کی تحقیقی جستجو اور دقیقہ یابی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی کتاب پر ساہتیہ اکادمی نے انھیں اپنا ادبی ایوارڈ پیش کیا تھا۔

'روحِ انیس' اور 'بزم نامۂ انیس' بھی رضوی صاحب مرحوم کی مشہور کتابیں ہیں۔ یہ دونوں کتابیں میر انیس کے مراثی کے انتخابات پر مشتمل ہیں لیکن ثانی الذکر میں رضوی صاحب نے یہ جدت پیدا کی ہے کہ انیس کے مختلف مراثی کے ان حصوں کو جن میں جنگ اور اس کے متعلقات کا بیان ہے، مراثی سے نکال کر اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ان میں تسلسل کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ 'تذکرۂ نادر' بھی رضوی صاحب کی اختراع پسندی کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے۔

اور بھی کئی اہم کتابیں رضوی صاحب سے یادگار ہیں جو ہمیشہ ان کی یاد کو تازہ رکھیں گی۔ انھوں نے 'ادبستان' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا تھا جس کا انتظام اب ان کے فرزندوں کے ہاتھ میں ہے۔ یقین ہے کہ یہ ادارہ معیاری کتابوں کی اشاعت کی اس روایت کو زندہ رکھے گا جس کی داغ بیل رضوی صاحب نے ڈالی تھی۔ ان کے فرزند ڈاکٹر نیر مسعود اس علمی روایت کے بھی امین ہیں جو رضوی صاحب مرحوم سے انھیں ورثے میں ملی ہے۔

ہفت روزہ "چٹان" کے مدیر اور مشہور صحافی آغا شورش کاشمیری کا لاہور میں انتقال ہوا۔ وہ بڑی متنوع شخصیت کے مالک تھے، اور ان کی دلچسپیوں کا دائرہ صحافت سے لے کر شاعری، خطابت اور سیاست تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کی متنوع شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ جن شخصیتوں سے انھیں عقیدت رہی اور جنھیں انھوں نے اپنا ذہنی رہنما بنایا ان میں کئی ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہوں یا محمد علی جناح، ڈاکٹر اقبال ہوں یا حسین احمد مدنی، عطاء اللہ شاہ بخاری ہوں یا ظفر علی خاں انھیں ان سب سے یکساں عقیدت تھی اور ان سبھی کی عظمت منوانے میں انھوں نے اپنا زور قلم صرف کیا۔ وہ صحافی سے زیادہ خود کو ایک سیاسی لیڈر کی شکل میں دیکھنا پسند کرتے تھے اور صحافت کو اپنے سیاسی افکار کی تبلیغ و اشاعت

ہ ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ سیاست میں ان کا انداز ہ تھا کہ خود اقتدار سے الگ رہ کر برسرِ اقتدار جماعتوں یا افراد ں کوتاہیوں پر انھیں متنبہ کیا جائے اور انھیں یہ احساس رایا جائے کہ وہ اپنے عوام کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اس کا جہاں یک نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ان تمام حکومتوں کے معتوب رہے جو ان ی زندگی میں ان کے ملک میں بنتی اور ٹوٹتی رہیں وہاں دوسری رف ان عوامی حلقوں میں انھیں بڑی ہردل عزیزی حاصل ہوئی تھی۔ ان کی تحریر و تقریر میں اپنے جذبات کی ترجمانی نظر آتی تھی۔ ان کے انتقال پر ان کے ہم عصر مشہور پاکستانی شاعر اور صحافی رئیس امروہوی نے جو نظم کہی ہے وہ ذیل میں درج کی جارہی ہے۔ یہ نظم ان اوصاف کی جامع ہے جن سے شورش رحوم کی شخصیت عبارت تھی اور اس تاثر کی بھی حامل ہے جو ن کی موت سے بے شمار دلوں پر طاری ہوا ہوگا:

آزادیِ شعور و عمل تھا ترا پیام
بیداریِ خیال و نظر تھی تری صفت
تاریخ کی نظر میں تری عظمتِ مقام
اہلِ وفا کے دل میں تری قدر و منزلت
آمادۂ جہاد رہا تو بہ عزمِ فتح
تقدیرِ ظلم و جور سے تا سعی و مقدرت
اے یوسفِ مصائبِ زندانِ آگہی
کنعانِ ذوق و شوق میں یعقوب منزلت
اے مقتلِ وفا کے شہیدوں کی یادگار
تو نے نہ کی سپاہِ ستم سے مصالحت
شورش! ترا پیام پیامِ صد انقلاب
شورش! ترا کلام کلامِ ہمہ جہت
اے عظمتِ صحافت و انشا کے ترجمان
انشا ترا کمال، صحافت تری صفت
جانِ رئیس لاکھ ہو حائل حجابِ مرگ
می ہیمنت عیان و دعا می قسمت

ہ کے انتقال پر پاکستان کے صدر اور وزیر اعظم کے تعزیتی امات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اختلافات کے باوجود حکومتی حلقوں میں بھی شورش مرحوم کی آواز کا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔

بھوپال میں کہنہ مشق شاعر محوی صدیقی انتقال کر گئے۔ وہ اردو شاعری کی کلاسیکل روایات کے آخری علمبرداروں میں تھے۔ انھوں نے بہت سے نوواردانِ بساطِ شاعری کی حوصلہ افزائی اور ذہنی تربیت کی اور خود بھی شاعری کی مختلف اصناف میں طبیعت کے جوہر دکھائے۔ خدمتِ شعر و ادب کی جو لگن اور ناسازگار حالات میں بھی اپنی وضع پر قائم رہنے کا جو انداز ان بزرگوں میں ملتا تھا وہ ان کے بعد اب کہاں نظر آئے گا۔

حیدرآباد میں ڈاکٹر میر ولی الدین کا انتقال ہوگیا۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ فلسفہ کے سابق صدر اور ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ اسلامی تعلیمات کی فلسفیانہ تاویل و توجیہہ میں انھوں نے کئی اہم کتابیں لکھیں جو علمی حلقوں میں بہت پسند کی گئیں۔ مخالفین بھی ان کے علمی تبحر اور اصابتِ رائے کا لوہا مانتے تھے۔ فلسفی ہونے کے ساتھ وہ راہِ طریقت کے سالک بھی تھے مگر ایسے سالک جو احکامِ شریعت کی بجاآوری کو شرطِ اول قدم مانتے ہیں۔ ان کی زندگی اسلامی شعائر کا نمونہ تھی اور اپنے قلم سے بھی انھوں نے ہمیشہ خدمتِ دین ہی کا کام لیا۔ انھوں نے لمبی عمر پائی اور اب ان کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اسے پُر کرنے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔

مولانا محمد میاں دلی کی اہم دینی اور علمی شخصیتوں میں تھے۔ وہ دیوبند کے سادات رضوی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تعلیم بھی دارالعلوم دیوبند ہی میں ہوئی تھی۔ دلی آکر انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لیا اور اس راہ میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم سے انھیں بڑی قربت تھی اور سیاست میں وہ انہی کی وجہ سے داخل ہوئے تھے۔ کچھ مدت تک جمعیتہ علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ بھی رہے لیکن مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات کے بعد اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اپنا زیادہ وقت درس و تدریس اور تالیف و تصنیف کے مشاغل میں گزارنے

لگے تھے۔ کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں بچوں اور بچیوں کا وہ تعلیمی نصاب بھی شامل ہے جو جمعیتہ العلما کے تعلیمی منصوبے کے تحت انھوں نے مرتب کیا تھا۔ وفات سے پہلے بہت کمزور اور ضعیف ہو گئے تھے لیکن ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

دلی کالج (اب ڈاکٹر ذاکر حسین کالج) کے سابق پرنسپل مرزا محمود بیگ کا بھی پچھلے دنوں، عید کے دوسرے روز، اپنے آبائی مکان، واقع محلہ رودگران، دلی میں انتقال ہوگیا۔ ایک اچھے معلم اور منتظم کی حیثیت سے ان کی بڑی شہرت تھی۔ وہ دلی کی پرانی تہذیب کے دلدادہ اور خود ان تہذیبی روایات کا نمونہ تھے۔ زندہ دلی ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ پچھلے تین چار سال سے دل کے عارضے میں مبتلا تھے اور بہت کمزور ہو گئے تھے لیکن ان کی شگفتہ روئی میں آخری دم تک فرق نہ آیا۔ سسک سسک کر مرنے کے تصور سے وہ بیزار تھے اور اب دوستوں سے اکثر اپنی اس آرزو کا اظہار کرنے لگے تھے کہ خدا انھیں اچانک ہی اٹھالے۔ خدا نے ان کی یہ آرزو پوری کی اور وہ ہنستے بولتے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

منشی شیش چندر سکسینہ طالب دہلوی بھی دلی کی ایک پرانی وضعدار شخصیت تھے۔ وہ اس گنگا جمنی تہذیب کے پروردہ تھے جس کے آثار اس سرزمین پر دھیرے دھیرے ختم ہوتے جارہے ہیں۔ طالب صاحب اس حادثے کے ماتمیوں میں تھے۔ ان کے انتقال سے کچھ پہلے ان کی ایک کتاب "یہ تھی دلی" منظر عام پر آئی تھی جس میں انھوں نے دلی کی قدیم تہذیبی زندگی کی جھلکیاں اور ان شخصیتوں کے قلمی خاکے پیش کیے ہیں جو اس تہذیبی فضا کی جان تھیں۔ یہ کتاب طالب صاحب کی رواداری، بے تعصبی اور روشن خیالی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

طالب نثر و نظم دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ منشی مہاراج بہادر برق دہلوی کے شاگرد تھے اور ان کے اور آغا شاعر کے وسیلے سے ان کا سلسلۂ تلمذ مرزا داغ دہلوی تک پہنچتا تھا۔ ان کے کلام کا ایک ضخیم مجموعہ "سبزۂ بیگانہ" کے نام سے چند برس پہلے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں شامل کلام پڑھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اردو محاورے پر کیسی دسترس رکھتے تھے۔ طالب صاحب کچھ مدت تک حکومت ہند کے اردو رسالے "آجکل" کے شعبۂ ادارت میں بھی شامل رہے تھے

ہم ان لوگوں کے اپنے درمیان سے اٹھ جانے پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں:

ستارے ڈوبتے جاتے ہیں شمعیں بجھتی جاتی ہیں
مرتب خود بخود انجامِ محفل ہوتا جاتا ہے

●●

Regd. No. D. (D) 118 Phone [illegible] January 1976

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No [illegible]

TAHREEK



नेशनल एकाडमी ६, आसफ़ अली रोड, दरियागंज, दिल्ली ६ की गौरवपूर्ण भेंट

नोबल पुरस्कार विजेता अलेक्जेंडर सोल्झेनित्सीन की नवीनतम रचना

गुलाग द्वीपसमूह

"इस पुस्तक में कोई भी काल्पनिक व्यक्ति नहीं है। कोई भी काल्पनिक घटना नहीं है। व्यक्तियों और स्थानों का नाम ठीक उसी प्रकार दिया गया है। यदि कहीं कुछ नामों का उल्लेख नहीं है, तो इस का केवल यही कारण है कि मानव स्मृति इन नामों को संजोकर रखने में असफल रही।"

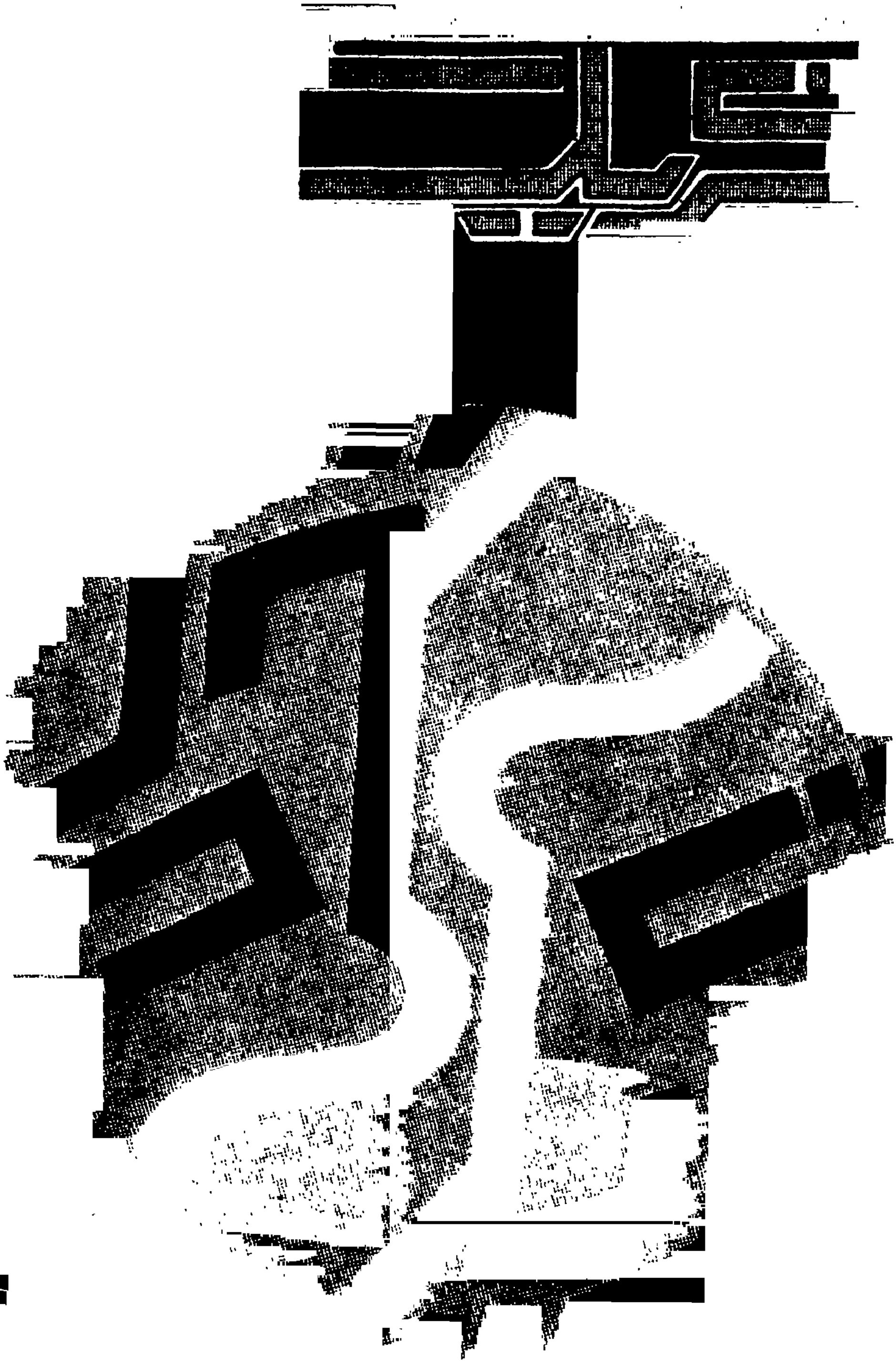
लेखक ने इस पुस्तक के बारे में उक्त विचार व्यक्त किये हैं। यह पुस्तक इतिहास का एक प्रामाणिक ग्रन्थ होते हुए भी उपन्यास से अधिक रोचक है। संभवत: यह कहावत इस पुस्तक पर पूरी तरह लागू होती है कि सच्चाई किस्से कहानियों की काल्पनिक बातों से भी कभी-कभी अधिक आश्चर्यजनक होती है।

- गुलाग द्वीपसमूह मनुष्य की अपार [illegible] को [illegible] करने वाली कहानी है।
- गुलाग द्वीपसमूह एक ऐसी पुस्तक है, जिससे इतिहास के अनेक अनछिपे प्रश्नों के बारे में जानकारी मिलती है, विशेषकर दूसरे महायुद्ध की मित्र-राष्ट्रों की राजनीति के बारे में।
- गुलाग द्वीपसमूह, सम्भवत:, वर्तमान युग की महानतम रचना है और सत्य की प्रखरता ने इसे यह महानता प्रदान की है।

[illegible] • आकर्षक [illegible] रंगों में •

मूल्य केवल बीस रुपये •

विद्यार्थी संस्करण [illegible]



براہ کرم ہمارے پتے میں معمولی ترمیم نوٹ فرمالیں اور خطوں کو جلدی پہنچانے کے لیے پن کوڈ نمبر ضرور لکھیں۔

ماہنامہ تحریک، ۹ء، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی، پن کوڈ ۱۱۰۰۰۲

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک نئی دہلی

شمارہ: ۱۱ جلد: ۸

فروری ۱۹۷۶ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متل مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

مضامین:

افسانے:

منظومات:

سالانہ قیمت: دس روپے فی کاپی: ایک روپیہ

غیر ممالک سے

سالانہ: تیس شلنگ فی کاپی: تین شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:

۹ء، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

قیمت -/۱

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس - دہلی

مقام اشاعت: ۹ء، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کرشن موہن

تتلیاں

یہ پشیمانی میں حُسنِ شبنمیں
تیرے شانوں پر ڈھلکتی شال، رنگیں، ریشمیں

- - - - -

ہر طرف ہیں جلوہ گر
تتلیاں ــــ کیفِ نظر
یہ فضائے شوخ کے ذی جاں گُہر
اڑنے والے پھول ہیں، یہ تتلیاں
نامہ بر، احساس کی
نرم، بوقلموں علامت زندگی کی آس کی
ہے کشش آمیز ان کا بانکپن
رات دن ہوتا رہے
نکہتوں کی سیج پر ان کا مِلن

سرد سنّاٹا اور لُو

سرد عورت، بے حس و بے آرزو
اور اس کے روبرو
تند مردانہ ہوس
گرم خوں اور کام رس
گرم خُو اور کام جُو

- - - - -

چھیڑتی ہے سرد سنّاٹے کو لُو

عظیم اختر

خلا

بارش میں جب سارا آنگن
گھٹنوں گھٹنوں پانی سے بھر جاتا تھا
ہم کاغذ کی ناؤ بنا کر
اس میں بہایا کرتے تھے
ماہ وسال کی بوندوں سے ٹکرا کر
آج وہ ناؤ ٹوٹ گئی ہے
ڈوب گئی ہے
اور جل تھل کرتا وہ آنگن
سوکھ گیا یا ——!
بھولے بسرے قہقہے
انجانی گھڑیوں میں آکر
مدھم سا سنگیت سنا کر —— کھو جاتے ہیں
حسرت کی تصویر بنا میں
جانے کیسی یادوں کا اک بوجھ اٹھائے
چپ چاپ خالی آنگن کو
تکتا رہتا ہوں ——

فریب

اپنے ماحول سے گھبرایا ہوا میں
دل کو بہلانے کے لیے
تیرے پاس چلا آیا تھا
میں نے پایا تھا کہ
چند ساعت کے لیے
تیری محبت، تیری قربت میں
درد بھول سکوں
قہقہے لگ سکیں
سگریٹیں جلتی رہیں
کافیاں چلتی رہیں
تیرے قریب آکے مگر
یہ احساس ہوا
درد کے ریگستان میں
تو بھی میری ہی طرح
کھوج رہا ہے
قہقہوں کے سراب !!

احمد رئیس (کراچی)

خواب دیکھے ہے بہت خواب سے ڈرنے والا
زندہ رہنے کی تگ و دو میں ہے مرنے والا

خاک کے ڈھیر پہ بیٹھا ہے مجاور بن کر
آسمانوں سے شفق بن کے اترنے والا

کیا قیامت کی خبر دے کے گیا ہے لوگو
میرے آنگن سے دبے پاؤں گزرنے والا

کون آیا تھا مجھے در سے رخصت کرنے
بہار آنکھوں میں لئے قرب سے ڈرنے والا

یہی دھرتی تو مری فکر کا محور ہے رئیس
اس کا ہر روپ ہے نغموں میں سنورنے والا

▲▲

ظفر غوری

خدا کا ہاتھ اس شہر کی تباہی میں
ہمارا نام تھا لکھا گیا گواہی میں

وہ سر کٹا کے بھی دشمن سے محوِ جنگ رہا
بھرا تھا جوشِ عجب اس جری سپاہی میں

وہ معرکہ تھا کہ سائے بھی قتل ہو کے گرے
یہ معجزہ ہے کہ اس قہر سے بچا ہی میں

درازدستِ صبا اب اُڑا کے لے جائے
بکھر رہا ہوں میں اس خولِ خود پناہی میں

کتابِ دہر کا ہر ہر ورق صدا دے گا
گھلا ہے دن کا لہو رات کی سیاہی میں

اک ایک حرف کو ٹانکا صلیبِ معنی پر
ہوا کہانی کا انجام ابتدا ہی میں

سزا ملی ہے ظفر جرمِ بے گناہی کی
کٹی حیات بھی اس فن کی دادخواہی میں

▲▲

عبدالرحیم نشتر

میں جسے چھو سکوں ایسا پیکر مجھے بھی دکھائی تو دے
سطح پر جو اُتر جائے آواز ایسی سنائی تو دے

جن کے پیچھے میں چلتا ہوں محض سائے نہ ہوں دیکھنا
یہ مرے سامنے کیسا آسیب ہے کچھ سجھائی تو دے

آسماں وہ بہت دور دھرتی پہ جھکنے لگا ہے اُدھر
اک ذرا کچھ مجھے بھی رسائی مری نارسائی تو دے

سرکٹے تیروں پہ جیسے ہی پانو پڑا چیخ اٹھے سب کے سب
مجھ پہ کیا بوجھ ہے درد میرا کسی کو دکھائی تو دے

دربدر چاہتوں کی تمنا ہوس تو نہیں ہے کہیں
یہ مجھے کیا ہوا عشقِ ناکام اس کی صفائی تو دے

▲▲

قطمیرؔ اور ہوا

(شہریار کے نام)

جیسے ہی وہ میرے کمرے میں داخل ہوا مجھے ایسا لگا جیسے ایک سایہ بھی اس کے ساتھ ہی کمرہ میں داخل ہوا ہے۔ ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالتے ہی میں نے نیچے نظر دوڑائی، فرش سپاٹ تھا۔ میں نے کنکھیوں سے میز کے نیچے دیکھا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں نے [illegible] کیا آپ لوگوں نے شہر کے [illegible] قبروں کا کوئی سروے کرایا ہے۔

مجھے ایک نامعلوم سی خنکی کا احساس ہوا۔

جب میں اس سے باتیں کرنے لگا تو مجھے اچانک لگا جیسے کوئی سایہ نیچے سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ سیاہ کتے کا پورا ہیولیٰ تیز چمکیلی روشن آنکھیں اور پتلی کمر، اب میں اسے واہمہ سمجھنے پر تیار نہ تھا۔ اس لئے باقاعدہ اچک کر اس کے پیروں کی طرف دیکھنے لگا۔ کتا —— لیکن کتا نہیں تھا۔

اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور کچھ کبیدگی سے بولا:

میں دراصل بہت مضطرب ہوں۔ کیا آپ اور کسی طرف متوجہ ہیں۔

جی نہیں۔

میں —— میرا مطلب ہے —— میں مریض ہوں۔ میں بیس سال بعد اچانک اب کچھ سوچنے لگا ہوں۔ کچھ آدمیوں کا یا قیلی بیٹھک مسئلہ ہے۔ میں کچھ قوتوں کے ذریعہ ڈائرکٹ کیا جاتا ہوں۔ جو مجھے بہت پراگندہ کر دیتی ہیں۔ مجھے تین سال تک لوگوں نے نشے کی حالت میں رکھا ہے اور پھر دوسروں کے حوالے کر دیا ہے میں ان سب سے بہت خوف زدہ ہوں میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں لیکن میں اچانک بے بسی سے ان کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہوں اور میرے بجائے وہ سوچنے لگتی ہیں۔ نہ جانے کن جہانوں کی باتیں یادداشتیں جیسے وہ سب میرے پچھلے جنموں سے تعلق رکھتی ہوں۔ کیا میں صورتاً بہت بُرا آدمی نظر آتا ہوں ——؟

میں پوری طرح اسی کی طرف متوجہ تھا کہ مجھے پھر ایسا لگا جیسے کرسی کے پاس کوئی شے آہستہ سے متحرک ہوئی ہے۔

لیکن میں اچانک ہی بُرا آدمی بن جاتا ہوں۔ ذہن کے کسی گوشہ میں برائی کا خیال باقی رہتا ہے، میں اپنے آپ کو اس سے باز نہیں رکھ پاتا ہوں بس میری سب سے بڑی اذیت یہی ہے۔

نہ جانے کون سی منفی قوتیں ہیں جو آہستہ آہستہ ہلکے دودھیا بادل کی طرح مجھ پر قبضہ جماتی چلی جاتی ہیں پھر آہستہ آہستہ وہ دودھیا بادل پھٹنے لگتے ہیں جگہ جگہ سے زخم کی طرح رِستے ہوئے سے پھر مجھے اندر اور باہر ہلکی ہلکی پھریری سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہا ہو یا صرف سانسوں کا دباؤ ہو پھر وہ سرگوشیاں بڑھنے لگتی ہیں اور میں اپنے ہر حصّہ سے آوازیں، سرگوشیاں، باتیں، تقریریں، سسکیاں اور چیخیں محسوس کرنے لگتا ہوں۔ ان میں نہ چاہتے ہوئے بھی گھر جاتا ہوں۔ ان سے بھاگنا چاہتا ہوں لیکن بے بس ہو جاتا ہوں اور مجبوراً کسی گوشے میں جا کر چھپ جاتا ہوں۔ عجیب سی تکلیف وہ سرسراہٹ سارے جسم میں محسوس ہوتی رہتی ہے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میں گرد و پیش دیکھتا رہتا ہوں پھر گھبرا کر باہر نکل آتا ہوں۔

اچانک ہی مجھے ایک بالکل ہی نرالی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ میں اسے الفاظ میں شاید واضح کر ہی نہیں سکتا کچھ عجیب سی اجنبیت۔ جیسے میں انھیں پہچانتا بھی ہوں اور وہ اجنبی بھی ہوں۔ مثلاً یہ کہ یہ چبوترہ اچانک یہاں کیسے آ گیا۔ یہ گلی اکھڑی ہوئی کیوں ہے

---

۱ اصحابِ کہف کے کتے کا نام۔

یہ ، یہ مکان ــــ یہ اس طرح تو نہ تھا۔

گوشہ سے نکلتا تو الجھ الجھ کر شہر کا چکر لگانے لگتا۔ کبھی لگتا کہ جیسے سارا شہر ویسے کا ویسا ہی تو ہے۔ یہ بڑا تالاب، یہ کملا پارک یہ کوتوالی، یہ ابراہیم پورہ۔ لیکن اچانک ہی مجھے لگتا کہ یہ کوئی عجیب سا نرالا اور اجنبی شہر ہے جہاں میں پہلی بار اپنا پہلا قدم رکھ رہا ہوں۔ یہ ــــ یہ کیا ہے؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ اسی لمحہ مجھے ایسا لگتا جیسے ابھی تک میرے ساتھ کوئی تھا۔ سمی ــــ لیکن اچانک ہی بغیر بتائے ہوئے سمی اچانک میری بغل سے غائب ہو گئی ہو۔ اور میں اسے دیوانہ وار کہیں آس پاس گھبرا گھبرا کر تلاش کرنے لگتا ہوں۔ ارے ــــ ارے، ابھی تو یہیں تھی بالکل میرے پاس۔ جب آنکھ اٹھاتا تو ایک لمحہ کے لئے اتنی شدید اجنبیت کا احساس ہوتا کہ میں گھبرا کر لوگوں کے چہرے دیکھنے لگتا لیکن وہ سب کے سب اجنبی لگتے۔ میں کہاں ہوں، اب تک کہاں تھا؟ یہ درمیانی لمحہ میں نے کہاں گزارا۔ لیکن اس لمحہ کو میں تلاش نہ کر پاتا اور پھر نہ جانے کیسے میرے قدم ایک بالکل ہی اجنبی سے راستے کی طرف اٹھتے رہتے۔ چہرے، دوکانیں، موڑ، آوازیں لیکن ہر شئے کی شناخت کھو چکی ہوتی تھی ــــ ایک عجیب سی اجنبیت لیکن اندر ہی اندر کہیں یہ احساس بھی پوشیدہ رہتا کہ یہ سب کچھ جانا پہچانا ہے۔ جب پہلی نظر اٹھ کر کسی پر پڑتی تو پہلا لمحہ ہوتا ــــ اجنبی، نامعلوم۔ لیکن میں اپنے کو پھر اسی گوشہ میں پاتا۔ یہ کیا ہے۔ میں اچانک یہاں کیسے آ گیا۔ یہاں کون رہتا ہے۔ یہ کمرہ، کتابیں، ریک، اسٹوو، ہیٹر، میز، تخت، تصویر، تھرماس، ٹیپ ریکارڈ، لحاف، تکیے، کلنڈر، ہولڈال، ٹرنک، سوٹ کیس۔ دواؤں کی شیشیاں، ایچی، بریف کیس، یہ سب کس کے ہیں۔ یہاں کون رہتا ہے۔ ابھی میرے ساتھ کون تھا۔ میں کون ہوں ــــ پھر اچانک ہی لگتا جیسے کوئی پرانا منظر ابھی ابھی اچانک ہاتھ سے پھسل کر کہیں گر پڑا ہے۔ میں گھبرا گھبرا کر راستے تلاش کرنے لگتا ہوں۔ سمی۔ سمی۔ سمی۔ اندھے کی طرح ــــ ٹٹولتا ہوں تو سگریٹ کے ٹکڑے، ماچس، کاغذات ہاتھ میں آجاتے ہیں لیکن سارے لمس اجنبی سے لگتے ہیں۔ میں بہت ڈسٹرب ہو جاتا ہوں، بہت پریشان ــــ کسی سے کچھ پوچھنے کی بھی ہمت نہیں پڑتی ہے۔ آوازیں سارے جسم سے اٹھتی ہیں اور میں گھبرا گھبرا کر سارا کمرہ روند ڈالتا ہوں۔ ارے ساتھ کا سارا وقت گزر گیا۔ ابھی تو میں اس سے کچھ کہہ ہی نہ سکا تھا۔ اپنے بارے میں کچھ بتا ہی نہ سکا تھا۔ ابھی تو اس کے سامنے صرف غلط رخ ہی آیا تھا۔ نہ جانے اب وہ کہاں ہے؟

در اصل اس سے میری انانیت مجروح ہوتی ہے ــــ کہ گویا ــــ کہ گویا ــــ اب کچھ ہی دیر بعد میں خود کچھ نہ رہ جاؤں گا۔ اب میں خود کچھ نہیں رہ گیا ہوں۔ بس ایک شدید اور نامانوس اجنبیت رہ گئی ہے۔ میں خود اپنے آپ کو مضحکہ خیز لگتا ہوں۔ کبھی لگتا ہے جیسے میری ناک سکڑ گئی ہو۔ کبھی میرا چہرہ لمبوترہ ہو جاتا ہے اور کبھی میرا اوپر کا دھڑ سمٹ جاتا ہے اور نچلا دھڑ بڑھنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ نہیں سب کچھ تو ویسا ہی ہے۔

میں جن لوگوں میں رہتا ہوں پہلے ان لوگوں سے خوف زدہ تھا کہ کب وہ اپنا دھاگہ کھینچ لیں۔ اب وہ سب کے سب مجھ سے شدید خوف زدہ ہیں۔ اب وہ مجھ سے یہ نہیں کہہ پاتے ہیں کہ میں وہاں سے کہیں چلا جاؤں پہلے وہ مجھ سے امیدیں رکھتے تھے اب مجھ سے ڈرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ سب اچانک بزدل ہو گئے ہوں۔

پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا لیکن اب جیسے ہی رات آتی ہے میرے سارے جسم میں ایک عجیب سی اینٹھن ہونے لگتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے میرے سینے پر کوئی گرم گرم بھاپ چھوڑ رہا ہو اسے آہستہ آہستہ سہلا رہا ہو۔ پھر مجھے اپنے زانوؤں پر عجیب سی پھریری سی محسوس ہوتی ہے اور میں طرح طرح کے دھندلے اور نیم واضح تصورات میں کھو جاتا ہوں۔

بہت دور دریا کے کنارے کچھ لوگ غسل کر رہے ہیں، وہیں رات کو ایک ٹنڈ منڈ کھجور کے درخت پر ایک عورت الٹی لٹکی ہوئی ہے اور اس کی چھاتیاں نیچے زمین سے کوئلہ اٹھا اٹھا کر کھجور پر کچھ نقش بنا رہی ہیں۔ نیچے کچھ دور پر ایک سادھو بیٹھا ہے کہ اچانک اس کا عضو تناسل بڑھنے لگتا ہے پھر ایک ہاتھ پر ایک دوسری عورت آجاتی ہے۔ عورت نہیں مرد۔ نہیں کچھ بھی نہیں، صرف بادل ہیں، ان میں سے ایک سیاہ ــــ بہت سیاہ رنگ کا چیتا ــــ نہیں کتا ــــ یا بلی ــــ یا صرف سایہ ــــ باہر

نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ تلوار نہیں بانسری ہے۔ یا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اچانک ان سب سے گھبرا کر دعائیں گنگنانے لگتا ہوں۔ عجیب سی نامانوس زبان کی دعائیں۔ اچانک محسوس ہوتا ہے کہ یہ دعا نہیں ہے، کوئی رومانی نغمہ ہے اور میں اپنی سبکی پر جھنجھلانے لگتا ہوں۔ بس، اتنا ہی شعور مجھے باقی رہتا ہے پھر نہ جانے کیسے میں کمرے سے نکل کر ایک دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں وہاں ایک تازہ کھدی ہوئی قبر ملتی ہے اور میں ــــــ.....

میرے اصل گھر کے بالکل سامنے ایک پیپل کا درخت تھا اس کے نیچے بہت سے چھوٹے چھوٹے پتھر رکھے تھے ایک پتھر کچھ زمین قند کی شکل کا تھا جس پر کچھ آس پاس کی عورتیں صبح کو آکر سرخ رنگ کا ٹیکا لگا جاتی تھیں۔ دھیرے دھیرے میں ان کی آنکھوں کا حجاب دیکھنے لگا تھا۔ جیسے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس زمین قند پر ٹیکا لگا رہی ہوں یا پھر بہت زیادہ خواہش مند ہوں۔ یعنی یہ کہ دن رات اس پر ٹیکا لگاتی رہیں۔ جوان لڑکیاں ٹیکا لگانے میں زیادہ جھجکتی تھیں۔ بوڑھیاں اس طرح جھک کر ٹیکا لگاتیں جیسے اب یہ ان کے لئے کوئی خاص بات نہ رہ گئی ہو یا وہی ــــــ اپنی کھٹاس ختم کر بیٹھا ہو۔ میں سوچتا اچانک ایک رات طوفان میں یہ درخت گر جائے تو کتنا اچھا ہو۔ بالکل وہی سوچ اب بھی جاری ہے۔ جاگتے میں تو سب کچھ مجھے بہت اچھا اور اہم دکھائی دیتا ہے ــــــ

یو۔ این۔ او، فلسطین، ویٹ نام، انگولا اور بنگلہ دیش۔ عمارات، ڈیم، راکٹ، اپولو اور سوئیز۔ لیکن اچانک ہی میں دعا مانگتا محسوس ہوتا ہوں کہ یہ شہر، یہ سارے مناظر۔ یہ گوشہ سارا سب کچھ تباہ ہو جائے تو ــــــ کتنا مزہ آئے۔ میں اکثر اپنی اس سوچ سے بہت عاجز ہو جاتا ہوں۔

رات ہوتے ہی میں اچانک گھر سے نکل پڑتا اور چپ چاپ کئی سیڑھیاں اتر کر ایک تہہ خانے میں داخل ہو جاتا۔ تہہ خانے میں داخلے سے پہلے میرے ہاتھوں میں کہیں سے ایک جلتی ہوئی شمع سی آ جاتی۔ نیچے چند نفوس خاموشی سے بیٹھے اپنے سامنے کی دیواروں پر ہلکی ہلکی لرزش دیکھا کرتے۔ کونوں میں مکڑی کے جالوں کے درمیان سفید سفید چمکتے خاص طور سے بہت نمایاں رہتے۔ ایک طرف کچھ ٹوٹی ہوئی کرسیاں، میزیں، لوہے کی زنگ کا پنجرا اور زمین کھودنے کے کچھ اوزار اور اس کے ساتھ تصویروں کا ایزل جس پر پنسل اسکیچ سے ایک دھندلی سی تصویر نظر آ جاتی۔ کبھی کبھی شک ہوتا کہ یہ تصویر میری ہی ہے۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ تھوڑی دیر تک مجھے گھور گھور کر دیکھتے اور پھر احتجاج میں اپنے پیر تھپتھپانے لگتے۔ میں جب ایک خالی کرسی پر بیٹھ جاتا تو میرے سامنے ایک لاش دکھائی دیتی۔ گھبرا کر جب میں دوسروں کو دیکھتا تو ان کے سامنے بھی ویسی ہی سبز پوش لاشیں دکھائی دیتیں۔ پھر وہ سب دھیرے دھیرے لاشیں ہاتھوں پر اٹھائے زینوں سے ہو کر باہر آ جاتے اور خاموشی سے ایک طرف چلنے لگتے۔ ان کے ساتھ اچانک ہی بالکل خاموشی سے کچھ مشعل بردار بھی آ جاتے۔ سناٹا گہرا ہوتا جاتا اور لاش برداروں کے چہروں پر آہستہ آہستہ تشنجی احتجاج ابھرنے لگتا ــــــ

سناٹا اتنا گہرا ہوتا کہ ان کے قدموں کی چاپ بھی نہ سنائی دیتی۔ لیکن راستہ میں اگر کوئی درخت کا پتہ بھی ٹوٹتا تو چٹ کی آواز ہم سب سن لیتے تھے۔ مجھے شروع سے آخر تک یہ احساس رہتا کہ میں جبراً ان لوگوں میں پھنسا ہوں اور یہ لاش بھی جبراً مجھ پر لاد دی گئی ہے۔ تبھی اچانک مجھے بہت شدید بھوک سی محسوس ہوتی لیکن واپسی میں مجھے لگتا جیسے برگد کے بہت سے پتے میرے پیچھے ٹوٹتے چلے آ رہے ہوں۔ چٹ چٹ مڑ کر دیکھتا تو ایسا لگتا جیسے ایک سیاہ سے کتے کی پرچھائیں میری طرف چلی آ رہی ہو۔ کتا ــ یا چیتا ــ یا کچھ نہیں۔

پیپل کے عین داہنی طرف بالکل بغل میں ایک مرگھٹ اور مٹی کے خاکستری کتبا تھی۔ کتبا کے باہر ایک بالکل سیاہ رنگ کا نیم غنودہ کتا بیٹھا رہتا تھا ــ سارا دن ــــ رات میں اچانک چاروں طرف چٹ چٹ کی آوازیں ابھرنے لگتی تھیں۔ میرے گھر کے بزرگ دھیمے سے کہتے۔ شاید وہ باہر نکلا ہے ــــ ہاں شاید ــــ صبح مجھے کتا پھر اسی جگہ دکھائی دیتا۔ میں اکثر اپنی چھت کی جھنجریوں سے اسے دیکھا کرتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے لگتا جیسے کتا وہاں سے غائب ہو گیا ہو۔ بالکل غائب۔ پھر مجھے چھت پر بالکل اپنے پاس چٹ چٹ کی آواز سنائی دینے لگتی۔ میں گھبرا کر پلٹ کر

دیکھتا ــــ تو مجھے کچھ نظر نہ آتا ــــ سامنے دیکھتا تو کتا پھر اسی جگہ لیٹا دکھائی دیتا۔

ایک صبح نہ صرف میں نے بلکہ تمام بزرگوں نے بھی دیکھا کتا اپنی جگہ سے سچ مچ غائب تھا اور کٹیا کے گرد بہت سے لوگ بانس اور لکڑی کے ٹکڑے لئے بہت اہم چہرہ بنائے گفتگو کر رہے تھے کبھی کبھی کسی کی آواز بلند ہوتی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

اسی کے کچھ دن بعد سے لوگ اچانک ہی مجھ سے خوف زدہ رہنے لگے تھے۔ تین سال تک مجھے متواتر لنٹے میں رکھا اور دس سال تک میں بیمار رہا۔

اب مجھے صرف اپنے دوہرے پن سے نفرت ہے یا اکتاہٹ ہے۔ یہ بھی مجھے ابھی محسوس ہوا ہے کہ دراصل میری سوچ میری ہے ہی نہیں بلکہ میں تو DIRECT کیا جا رہا ہوں۔ اور مجبور ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرا کمرہ جو انہوں نے خوف زدہ ہو کر میرے لئے مخصوص کر دیا ہے ایک قبر سے مشابہ ہے اور میں اکثر اسی میں لیٹا ہوا پایا گیا ہوں۔ باہر انھیں ایک سیاہ رنگ کا کتا سا بھی دکھائی دیتا ہے ــــ یا چیتا ــــ یا ــــ نہیں کچھ بھی نہیں ــــ

ہمیں چلتے چلتے بہت دیر ہو چکی تھی۔ مزاج میں کچھ سودا سا آتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے سیدھے کھڑے درخت اچانک زمین کی طرف جھک کر دھیرے دھیرے بڑھتے جا رہے ہیں، کبھی سمٹ کر جھاڑی سی بن جاتے ہیں۔ ساگون کا بے ڈھنگا پن مجھے کبھی بھی پسند نہ تھا۔ نہ ہی جنگلی بیر کے درختوں سے مجھے خوشی ہوتی لیکن اچانک ہی جب ان جھاڑیوں پر کچھ دوسری لپٹی ہوئی بیلیں دیکھتا تو بس ایک لمحہ کے لئے وہ اکتاہٹ ختم سی ہوتی۔

ابھی تک تو صرف پتھریلی زمین یا پہاڑیاں ہی تھیں لیکن اب اچانک بھوری سی ریتیلی زمین شروع ہونے لگی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا ــــ آخر وہ خاص قبرستان ابھی کتنی دور ہے۔ وہ کچھ جھجکا اور سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ یہ سارا راستہ ہی ایک کھائی نما راستہ تھا دونوں طرف جنگلی بیروں کی جھاڑیاں اور ان سے لپٹی ہوئی سیاہی مائل یا سبز کچھ بیلیں ــــ دراصل ہم ٹارچ لانا بھول گئے ہیں۔ ورنہ میں راستہ نہ بھولتا۔ وہ اصل راستہ اتنا چوڑا ابھی نہیں تھا۔ ایک پتلی سی اوبڑ کھابڑ لکیر ہی اس طرف گئی ہے۔ ہمیں اسی پر چلنا تھا۔ آؤ واپس چلیں۔

وہ مڑا تو مجھے محسوس ہوا جیسے ایک سیاہ سا ہیولی بھی اس کے ساتھ ہی مڑا ہو۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا ــــ نہیں اس کے پیچھے کچھ نہیں تھا۔ میں تو سارے راستے ہی وہم سے مڑ مڑ کر دیکھتا آیا ہوں ــــ کیا ملا ــــ کچھ ہے ہی نہیں تو ملتا کیا۔ کچھ نہیں ہوگا۔

اب ہم ایک بہت پتلے اور تاریک راستے سے جھاڑیاں اور بیلیں ہٹا ہٹا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ریتیلی زمین میں پیر پھنس جاتے ہو تو جوتے کرکرانے لگے تھے۔

کئی اچانک اور اندھے موڑوں کے بعد ہم قدرے واضح جگہ پہونچے تو سامنے ہی ایک شکستہ لوہے کا جالی دار دروازہ نظر آیا۔ باہر ہی سے میں نے دیکھا۔ سامنے ایک بہت اونچے درخت کے نیچے انگارے دہک رہے تھے اور اس کی عین بغل میں ایک پھوس کی کٹیا سی تھی۔

کوئی بات نہیں یہ مسجد ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو پھر ایسا لگا جیسے ایک سیاہ سا دھبہ اچک کر ادھر اندھیرے کی طرف گیا ہو۔

اندر داخل ہو کر ہم خاموشی سے ایک سمت بڑھنے لگے۔ احاطہ کی ساری زمین نم تھی۔ کچھ گڈھوں میں ذرا ذرا سا پانی بھی جمع تھا۔ اِدھر اُدھر گھاس تھی درمیانی راستہ پر ہم ذرا بچ بچ کر بڑھتے رہے کہ اچانک ہی بائیں طرف ایک ابھری ہوئی سی سفید چادر نظر آئی۔ اس کے پاس چند بیلے کے پھولوں کے ہار۔ ایک اوندھا ہوا مٹی کا کھڑا۔ اور کچھ خالی کوزے رکھے تھے۔

وہ میری طرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر اس قبر کی طرف بڑھا اسی وقت میں نے دیکھا کہ اس قبر کی بالکل بغل میں ایک اور کھدی ہوئی قبر تیار ہے۔ تہہ کیا ہوا سفید کپڑا، مٹی کا گھڑا بیلے کے ہار اور کچھ کوزے ایک طرف رکھے ہیں ــــ وہ قبر کے کنارے بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے قبر میں اتر گیا۔ مجھے لگا جیسے ایک سیاہ سا دھبہ ــــ اچک کر قبر سے دور ہٹ گیا ہو ــــ بس اب تم جاؤ۔ بہت بہت شکریہ ــــ خدا حافظ

پتھریلی زمین پر واپس آتے ہی مجھے لگا جیسے بالکل میرے پیچھے یا عین بائیں بغل کے پاس کچھ چٹ چٹ بول رہا ہے ــــ ●●

آئی۔ شٹینوسکی

باوردی خاتون

(۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کے 'پراودا' میں شائع شدہ یہ مضمون امید ہے قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا)

ای۔ آئی۔ نوسوواایک مدت سے اپنے پوتے پوتیوں سے ملنا چاہتی تھی۔ آخر وہ ان سے ملنے چل دی لیکن راستے میں ایک مصیبت اس کی منتظر تھی۔ وہ سورڈوسک سے روانہ تو ہوئی لیکن ویڈنا پہنچ نہیں پائی۔ وہ راستے میں بیمار ہوگئی اور رات کو اسے گاڑی سے اتار کر آپریشن کے لیے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

ان باتوں کا علم ہمیں ایوڈوکیا ایونیووا کے خط سے ہوا۔ مجموعی طور پر اس کا خیال یہ ہے کہ صورتِ حال اس سے بھی زیادہ خراب ہوسکتی تھی اگر وہاں بورس الیگزنڈروچ سرجن نہ ہوتا جس نے کسی تاخیر کے بغیر پیچیدہ آپریشن کا اہتمام کر دیا۔ اولیا اور کلاوا نامی نرسوں نے بھی اس کی کافی مدد کی۔ انھوں نے اسے بروقت دوائی دی اور ہر طرح کا اہتمام کیا لیکن ایک نرس آنٹی ٹینوشا نے کافی گڑبڑ کی۔ اسے دوسری بار اپنے بستر کے قریب بلانے کے لیے اس کی جیب میں پچاس کوپک ڈالنا ضروری تھے۔

نوسووا کا کہنا ہے کہ اس نے پچاس کوپک ضرور دیے لیکن ایک بوڑھی عورت جس کے پاس دینے کو کچھ نہیں تھا، اسے کافی مصیبت اٹھانا پڑی۔ وہ بار بار نرس کو پکارتی لیکن نرس نہ آتی۔

ایوڈوکیا ایونیووا کی تشویش کو سمجھنے میں ہمیں کوئی مشکل نہیں ہوئی کیونکہ آنٹی ٹینوشا ایک بے ضرر خاتون ہرگز نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ مریضوں کی بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر کھلم کھلا ان سے پیسے ہتھیاتی ہے۔

"اگر تمھیں گرم پانی کی بوتل جلد چاہیے تو پچاس کوپک میری جیب میں ڈال دو۔ اگر تم ایسا نہ کرنا چاہو تو انتظار کرتے رہو۔"

یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ سوویٹ قوانین کے مطابق رشوت لینا اور رشوت دینا دونوں ہی جرم ہیں لیکن معاملے پر غور کرتے وقت احتیاط سے کام لینا ضروری ہے۔ اس صورت میں نکتہ چینی کی زیادہ گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ہم ایک ایسے بےکس مریض کو جس کا آپریشن ہوا ہو نرس کو رشوت دینے پر موردِ الزام کیسے ٹھہرا سکتے ہیں اگر اس کے بغیر نہ تو اسے وقت پر پانی ملے نہ اس کا تکیہ ٹھیک سے رکھا جائے۔ لیکن اس کے کچھ ساتھی مریضوں کو بری الذمہ ہرگز نہیں قرار دیا جا سکتا ایونیووا لکھتی ہے کہ ایک مریضہ نرس کو کوئی تازہ جریدہ یا کھانے پینے کی کوئی چیز لانے کے لیے باہر بھیج دیتی ہے۔ آنٹی ٹینوشا یہ چھوٹے موٹے کام اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں کرتی اور اس کا معاوضہ وصول کرتی اس دوران میں بوڑھی عورت جس کے پاس کوئی پیسہ نہیں تھا اور جسے نرس کی فوری توجہ کی ضرورت تھی، بے توجہی کا شکار بے بسی کے عالم میں پڑی رہتی۔

اس طرح رشوت کے خلاف جہاد کے دوران ہم ان لوگوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو پیسے دے کر ڈیوٹی دینے والے عملے کا اخلاق بگاڑتے ہیں، ان سے ایسی خدمات لیتے ہیں جو ان کے فرائض میں نہیں۔ آج نوسووا کی شکایت ہمیں اس لیے یاد آئی کہ ایک شکایت ریون پیٹروچ رسیچنکو کی طرف سے بھی موصول ہوئی ہے جو کراسنویارسک کے دور افتادہ علاقے سے اپنی بیٹی اور اپنے داماد کے ساتھ راجدھانی پہنچا ہے۔ دس دن پہلے وہ یاروسلاول سے باہر نکلا، سوکول جانے کے لیے جہاں اس کی پرانی معلومات کے مطابق اس کی پہلی بیوی کا بھتیجا پولٹسکی کے علاقے میں رہتا تھا۔ وہ ٹیکسی والے سے سودے بازی کرنے لگا، بالکل

اسی طرح جس طرح تین چوتھائی صدی پہلے اس کا دادا کیا کرتا ہوگا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ اگر ڈرائیور کو میٹر بند رکھنے کی اجازت دے دے تو اسے کم پیسے دینے پڑیں گے۔ پیٹر دوچ نے اسے پتہ دکھاتے ہوئے پوچھا اس گلی میں مکان نمبر ۲۲ تک پہنچانے کا تم کیا لو گے؟

ٹیکسی ڈرائیور نے پیٹر دوچ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور دل ہی دل میں فاصلے کا اندازہ لگا کر کہا "بہت اچھا۔ میں تمھیں کم کرائے میں ہی لے جاؤں گا۔ تین روبل فی کس"

جب ٹیکسی مکان پر جا کر رکی تو میٹر صرف دو روبل دکھا رہا تھا۔

"تم مجھ سے نو روبل کیوں مانگ رہے ہو؟" پیٹر دوچ نے پوچھا "ہم میٹر کے حساب سے نہیں آئے۔ یہ تو ہم میں طے پا چکا ہے۔ میٹر پوری طرح کام نہیں کر رہا" ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا۔

مسافروں کو مکان نمبر ۲۲ میں اپنا رشتہ دار نہیں ملا اور وہ ہوٹل واپس چلے آئے۔ پیٹر دوچ نے اپنے پاسپورٹ میں جو اندرون ملک کے سفر کے لیے ہوتا رہا ہے، پانچ روبل کا نوٹ رکھ دیا اور اسے کسی دقت کے بغیر ایک ایسا کمرہ مل گیا جس میں تین شخص ٹھہر سکتے تھے۔ صبح کو اس نے اپنے پڑوسیوں سے بات چیت کی تو پتہ چلا کہ ان سب کو ادائگی کے بغیر ہی ہوٹل میں ٹھہرا لیا گیا ہے۔

"تو پھر مجھ سے کیوں رقم لی گئی" پیٹر دوچ نے برہمی سے کہا۔ اور جب فرڈ اس کے کمرے میں گرم پانی کے پائپ کا کنکشن ملانے آیا اور اس کے لیے اسے تین روبل دینے پڑے تو وہ اور بھی برہم ہوا۔

اس کے پڑوسیوں نے پوچھا "آخر تم نے پیسے دیے کیوں؟"

"میں نے اسے کہا تھا کہ وہ گرمی میں اضافہ کر دے۔ باہر بارش ہو رہی تھی"

"اور پانی کو پوری طرح گرم کرنے کے لیے اس نے پیسے طلب کیے؟"

"اس نے براہ راست تو پیسے نہیں مانگے لیکن وہ بہت ہی سستی سے کام کر رہا تھا اور بیکار وقت گزار رہا تھا"

"تو گزارنے دیتے۔ تم کس کی شکایت کر رہے ہو؟ خود اپنی؟ تم اندھا دھند رشوت دے رہے ہو اور جن لوگوں سے تمھارا سابقہ ہے انھیں کوئی شرم تو ہے نہیں، فوراً لے لیتے ہیں"

اب میں ایک اور خط پیش کرتا ہوں جو وورونیژ میں رہنے والی بوڑھی عورت آئی۔ اے۔ سوولوبووا نے لکھا ہے۔ حال ہی میں کسی کام کے لیے شاری ادسکول گئی تھی جب واپسی کا وقت آیا اور اسٹیشن پہنچی تو گاڑی وقت سے کچھ پہلے ہی آگئی اور ایک ہجوم فوراً اندر داخل ہو گیا۔ ٹکٹ گھر ابھی بند تھا اور عمداً تاکہ مسافر اس خوف کہ کہیں گاڑی چھوٹ نہ جائے ٹکٹ لیے بنا ہی اپنی سیٹوں پر بیٹھ جائیں کیشیر اس وقت پہنچا جب انجن اسٹارٹ ہونے ہی والا تھا۔ ہمارے ایک اور قاری ایل۔ آئی۔ کوزان کو بھی جس نے ٹسل ٹیوبوسے ا کا سفر کیا تھا ایسا ہی تجربہ ہوا۔ شروع شروع ہر چیز ضابطے کے مطابق ہوئی۔ مسافروں نے ٹکٹ گھروں سے ٹکٹ لیے اور اپنی سیٹوں پر جا بیٹھ گئے لیکن سفر کے وسط ہی میں ڈرائیور نے مسافروں سے کہا کہ وہ اپنے ٹکٹ واپس کر دیں۔ ایک موٹی سی باوردی خاتون اپنی سیٹ سے اٹھی اور اتنی چستی سے جس کا اس کا جسم اجازت نہیں دیتا تھا مسافروں کے ٹکٹ اکٹھے کرنے لگی۔

"تم یہ کیوں کر رہی ہو؟" کسی نے پوچھا۔

"ڈرائیور خود یہ نہیں کر سکتا وہ انجن چلا رہا ہے"

لوگوں نے اپنے اپنے ٹکٹ اس خاتون کو دے دیے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کے تعاون سے پبلک کا روپیہ لوٹا جا رہا تھا لیکن وہ خاموش رہے۔

پڑھنے والوں کے خطوط کی روشنی میں ایڈیٹر نے کئی اداروں اور تنظیموں کو خطوط لکھے اور اسے جواب بھی ملے۔ کراسنوڈار علاقائی کمیٹی کے نئے چیرمین آئی۔ این۔ بیورانگ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ "گذشتہ چھ ماہ میں ایسے چار ہزار نو سو پانچ ڈرائیوروں کے خلاف انضباطی کارروائی ہوئی اور انھیں سزائیں بھی دی گئیں جو مسافروں کو بلا ٹکٹ سفر کراتے تھے۔"

دھوکے بازوں کی اتنی تعداد صرف ایک خطے میں موجود ہے۔

جب میں اپنا مضمون لکھ چکا تو اخبار کے دفتر میں جلدی پہنچنے کے لیے ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا جس کا راستہ معین تھا۔ یہاں میرے لکھے ہوئے کی اور تصدیق ہو گئی۔ ایک باوردی خاتون ایک اسکول کی لڑکی کو سرزنش کر رہی تھی۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ سب سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی "تم نے اپنے پیسے صندوقچی میں کیوں ڈالے اور ٹکٹ کیوں پھاڑا۔ تمھارا فرض تھا کہ پیسے اور ٹکٹ ایک جگہ رکھ

۲۵ روپے کی کتابیں
صرف ۱۱ روپے میں
ایک ہنگامہ خیز رعایتی اعلان

ذیل میں کچھ عمدہ کتابوں کی فہرست دی جارہی ہے۔ ان میں سے آپ ۲۵ روپے کی کتابیں صرف ۱۱ روپے میں حاصل کرسکتے ہیں۔

آپ کو صرف اتنا کرنا ہے کہ ۱۱ روپے کا منی آرڈر ہمارے نام بھجوا کر ڈاکخانے سے ملنے والی رسید کے ساتھ ۲۵ روپے کی اپنی پسند کی کتابوں کے نام لفافے میں رکھ کر ہمیں بھجوادیں۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

آپ کا خط ملنے پر آپ کی طلب کردہ کتابیں رجسٹرڈ پیکٹ سے ارسالِ خدمت کردی جائیں گی ——— ڈاک خرچ آپ سے نہیں لیا جائے گا، ہم خود ادا کریں گے۔

یہ رعایت ۳۱ مارچ ۱۹۷۶ء تک کے لیے ہے، بشرطیکہ اسٹاک اس سے پہلے ختم نہ ہوجائے ——— آپ اپنا آرڈر آج ہی بھجوا کر اس نادر پیشکش سے فائدہ اٹھائیں؛

کتابیں جو آپ طلب کرسکتے ہیں، یہ ہیں؛

۱۔ آواز کا جسم، (شاعری، مخمور سعیدی) ... ۱۰
۲۔ جملوں کی بنیاد (یک بابی ڈرامے، کمار پاشی) ... ۷
۳۔ صریرِ خامہ، (شاعری، مظفر حنفی) ... ۶
۴۔ میرا وطن ہندوستان (حب الوطنی نظمیں) (بدیع الزماں خاور) ... ۴
۵۔ ۱۹۷۱ء کی منتخب شاعری (کمار پاشی، پریم گوپال متل) ... ۴
۶۔ شہپر (شاعری، سید حرمت الاکرام) ... ۸
۷۔ تیشۂ نظر (تنقید، ابوالفیض سحر) ... ۸
۸۔ ادیب اور کیسار (ادب اور سیاست، جارج پلوکرنی) ... ۱
۹۔ سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ، (موریس کرانسٹن) ... ۱
۱۰۔ سیہ بر سفید (شاعری، مخمور سعیدی) ... ۶
۱۱۔ خرابِ تماشا (شاعری، کمار پاشی) ... ۴
۱۲۔ سوویت وسط ایشیا کی مسلمان قومیں (تاریخ) ... ۳
۱۳۔ لینن (سوانح حیات، رابرٹ کنکوئسٹ) ... ۲-۶۰
۱۴۔ گیان مارگ کی نظمیں (شاعری، کرشن موہن) ... ۱۰-۵۰
۱۵۔ کینسر وارڈ (ناول، الیگزینڈر سولژنٹسین) ... ۱۸
۱۶۔ خرابہ (شاعری، من موہن تلخ) ... ۱۰
۱۷۔ میں گواہی دیتا ہوں (آپ بیتی، اناتولی مارچینکو) ... ۴
۱۸۔ نام بہ نام (منظوم خطوط، رضا نقوی واہی) ... ۴
۱۹۔ قوموں کے قاتل (تاریخی مطالعہ، رابرٹ کنکوئسٹ) ... ۳
۲۰۔ نئے عہد نامے کی سوغات (افسانے، فیاض رفعت) ... ۱۰
۲۱۔ انسانی حقوق کیا ہیں؟ (موریس کرانسٹن) ... ۴
۲۲۔ شہرِ خوشبو (شاعری، نور تقی نور) ... ۵
۲۳۔ ٹریڈ یونین کے بنیادی اصول۔ وکٹر فیدر ... ۱

۲۴ - ... جائز اور ناجائز استعمال - آرتھر بانملی　۵۰ - ۰
۲۵ - دیپک راگ (غزلیں اور رباعیاں، مظفر حنفی)　۰۰ - ۶
۲۶ - صحرا کی پیاس (شاعری، شباب للت)　۰۰ - ۶
۲۷ - راہگذر (غزلیں، دل اقبالی)　۵۰ - ۴
۲۸ جمہوری انقلاب (سیاسی مطالعہ، برائن ماگی)　۰۰ - ۱
۲۹ - جمہوری سوشلزم (سیاسی مطالعہ، کالمز بیڈس)　۰۰ - ۱
۳۰ بیاض (شاعری، بدیع الزماں خاور)　۰۰ - ۴
۳۱ راکھ (شاعری، احتشام اختر)　۰۰ - ۶
۳۲ - اعراف (شاعری، عبدالرحیم نشتر)　۵۰ - ۴
۳۳ - دو انقلاب (سیاسی مطالعہ)　۰۰ - ۱
۳۴ - جبول کے بیٹر (کسان کی آپ بیتی)　۵۰ - ۰
۳۵ - خوشحالی کی تلاش (اقتصادی موازنہ)　۵۰ - ۰
۳۶ - تکوین کا کرب (شاعری، آزاد گلاٹی)　۰۰ - ۵
۳۷ - شہر خیال (شاعری، جلیس نجیب آبادی)　۵۰ - ۴
۳۸ - احساسات (شاعری، اوم پرکاش لاغر)　۰۰ - ۵
۳۹ - گلاگ مجمع الجزائر (آپ بیتی، الیگزنڈر سولنسٹین)　- - ۷

سب قیمتیں اصلی ہیں، کسی کتاب کی قیمت بڑھائی نہیں گئی ہے ۱۱ روپے منی آرڈر سے پیشگی بھجوائیں، کتابیں وی۔پی۔ سے نہیں بھیجی جائیں گی۔ آپ ۲۵ — ۲۵ روپے کے ایک سے زیادہ سیٹ بھی طلب کر سکتے ہیں، فی سیٹ ۱۱ روپے بڑھاتے جائیں۔

منیجر نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

یہ اعلان بھی ضرور پڑھیے

کاغذ، کتابت، طباعت اور بائنڈنگ کے نرخوں میں مسلسل اضافے کے باوجود ہم نے اب تک 'تحریک' کی قیمت میں اضافہ نہیں کیا جبکہ دوسرے سبھی رسالوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں ——— ہم اب بھی قیمت بڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن ہمارے بہت سے پڑھنے والوں کا اصرار ہے کہ پرچے کی ضخامت میں اضافہ کیا جائے۔

بحالاتِ موجودہ ضخامت میں اضافہ قیمت میں اضافے کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا ہم نے اپنے پڑھنے والوں کی خواہش کے احترام میں فیصلہ کیا ہے کہ ——— اپریل ۷۶ء کے شمارے سے جو 'تحریک' کی ۲۴ ویں جلد کا پہلا شمارہ ہوگا اس کی ضخامت آٹھ صفحے بڑھادی جائے اور اس کی قیمت میں ۲۵ پیسے کا اضافہ کر دیا جائے۔ جیسا کہ آپ محسوس کریں گے ۸ صفحے کے عوض قیمت میں یہ اضافہ بہت ہی معمولی ہے۔

اپریل ۷۶ ۱۹ء کے شمارے سے تحریک ۴۰ کی بجائے ۴۸ صفحے پر شائع ہوگا، اس کی سالانہ قیمت پندرہ روپے ہوگی اور ایک شمارے کی قیمت سوا روپیہ'

لیکن جو حضرات ۳۱ مارچ ۷۶ ۱۹ء تک سالانہ خریدار بنیں گے، یا مزید ایک سال کے لیے اپنی خریداری کی تجدید کریں گے، چاہے ان کی مدتِ خریداری اپریل سے پہلے ختم نہ بھی ہو رہی ہو ان سے دس روپے ہی وصول کیے جائیں گے ——— اس رعایت سے خود بھی فائدہ اٹھائیے اور اپنے دوستوں کو بھی متوجہ کیجیے۔

آپ کے تعاون کا طالب
منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

اظہار آثر

شہر میں پتھر نہ تھے اور نجد کا صحرا نہ تھا
ہم نے دانستہ لباسِ عافیت پہنا نہ تھا

آج تک مرگِ تعلق کا ہمیں افسوس ہے
ہم نے اپنے آپ کو اس وقت پہچانا نہ تھا

حیرتیں بکھری ہوئی تھیں روشنی کے شہر میں
سینکڑوں سورج تھے لیکن ایک بھی سایہ نہ تھا

دوسروں کی زندگی جیتا رہا ہوں عمر بھر
آج بھی تنہا نہیں میں کل بھی میں تنہا نہ تھا

مجھ کو اپنا جان کر وہ دکھ پہ دکھ دیتا رہا
وہ خدا تھا ذات سے بندے کی لاپروا نہ تھا

اک طلسم نور افشاں تھا ترا سیمیں بدن
چاندنی کو جسم میں ڈھلتے کبھی دیکھا نہ تھا

اک ریاضی داں نے آخر کر دیا ثابت آثر
جس کو ہم نے کھو دیا اس کو کبھی پایا نہ تھا

▲▲

نازش انصاری

یوں تو بسنت آیا مہکنے لگی فضا
اندر کی آندھیوں سے مرا تن جھلس گیا

خشکی پہ جھاگ بن کے بہے گا بھی کتنی دور
دریا کنارے توڑ کے آخر کرے گا کیا

ہر لمحہ میری زندگی، ہر سانس میری موت
اک رشتۂ وفا ہوں مگر ٹوٹتا ہوا

دنیا چراغ خانۂ ویراں مرے لیے
میں جل نہ جاؤں آ کے ذرا خواب سے جگا

اور اس کے بعد میری حکایت تمام تھی
وہ اپنے راستے پہ بٹھا کر چلا گیا

آبی پرند درد کی دہلیز چھو گئے
منظر سبھی بکھر گئے ایسی چلی ہوا

▲▲

امیر قزلباش

سروں پر خوبصورت سائباں ہے
یہی شاید ہمارا امتحاں ہے

جلا کر چل دیا یہ کون مجھ کو
مرے چاروں طرف کیسا دھواں ہے

نہ جانے کیا ہوا ان بستیوں کو
ہر اک منظر نگاہوں پر گراں ہے

ٹھہر جا اے تھکے ہارے مسافر
مگر یہ سایۂ ابرِ رواں ہے

مرے گھر کی اکیلی سیڑھیوں پر
ابھی تک اُن کے قدموں کا نشاں ہے

مبارک ہو تمہیں شام چراغاں
مری قسمت چراغوں کا دھواں ہے

جہاں سب ہم سبو ہوں دوست اپنے
وہی اپنے لیے جائے اماں ہے

▲▲

مشتاق علی شاہد

دل کے زخموں کے لیے ایسی دوا لی جائے
ٹیس جب کم ہو ذرا اور بڑھا لی جائے

اُن سے بچ جائے وہی راہ نکالی جائے
مانگ کر یعنی محبت کی سزا لی جائے

بھولی بسری ہوئی یادوں سے اُلجھنا کیسا
ایسی باتوں پہ تو اب خاک ہی ڈالی جائے

اپنی تصویر کہ جو قصۂ پارینہ ہوئی
اُن کے البم سے وہ تصویر چرا لی جائے

کاسۂ دل میں بھرے ڈال دے سرمایۂ درد
کیوں ترے در سے تہی دست سوالی جائے

▲▲

جمیل کلیمی

جگاؤ تو مقدر سو رہا ہے
میں اندر ہوں وہ باہر سو رہا ہے

دبے پاؤں گزر جا چاند تو بھی
تھکا ہارا سمندر سو رہا ہے

زمانہ کھوج میں نکلا ہے جس کی
وہ چھپ کر میرے اندر سو رہا ہے

کوئی نامہ رقم کر لو سحر تک
کھلی چھت پر کبوتر سو رہا ہے

ہزاروں خواب ورقوں میں چھپا کر
مرے گھر میں کلنڈر سو رہا ہے

لہو جس نے پیا سورج کا دن بھر
چٹانوں میں وہ پتھر سو رہا ہے

▲▲

خالد رحیم

ہم کہ ہیں اپنے مکانوں میں ہوا کو ترسے
برہنہ جسم کوئی جیسے قبا کو ترسے

تنگ و تاریک علاقوں سے تھی منسوب حیات
سانس لینے کو بھی اک عمر ہوا کو ترسے

بھینچتے لمحوں سے اک پل کو نہ رشتہ ٹوٹا
اپنے ماحول میں خاموش فضا کو ترسے

ایک سیلاب تھا بڑھتے ہوئے ہنگاموں کا
شہر در شہر ہم اپنی ہی صدا کو ترسے

ہم بھی اس شہر نگاراں میں مسلسل خالد
اپنی ناکردہ گناہی کی سزا کو ترسے

حبیب کیفی

باؤجی

باؤجی کچھ دیر پہلے موہن پورہ ریلوے کراسنگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے، شاہد نے مجھے مطلع کیا تو میں بے چین ہوگیا۔ اس سے فوراً وداع لے کر میں سائیکل پر سوار ہوگیا۔ میری یہ جلد بازی اسے یقیناً عجیب لگی ہوگی۔ لیکن میں نے اس کا ردِ عمل نہیں جانا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔

سائیکل چلاتے ہوئے اندیشوں نے مجھے گھیر لیا۔ جودھپور دلی میل کے گزرنے میں ابھی وقت تھا۔ شاید وہ منتظر ہوں ــ یا ہوسکتا ہے کہ اس دوران ادھر سے کوئی مال گاڑی ہی گزری ہو.... لہو میں لت پت جسم پٹریوں کے بیچ پڑا ہوگا! جان کیسے چھوڑی ہوگی؟ شاید بھیڑ جمع ہوگئی ہوگی۔ میں کیسے اس منظر کو دیکھوں گا؟

نہیں، یہ نہیں ہوسکتا! سر کو ایک جھٹکا دے کر خود سے میں نے کہا اور تیز تیز پیڈل چلانے لگا۔ جی عجیب ہو اٹھا تھا۔

ہانپتا ہوا میں کراسنگ تک پہنچا۔ وہاں بھیڑ لگی دیکھ کر جان حلق کو آگئی۔ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ باؤجی نے خودکشی کرلی! سائیکل سے اترتے اترتے میں روہانسا ہوگیا۔

سائیکل ایک طرف رکھ کر میں بدحواس سا کراسنگ کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں کئی لوگ کھڑے تھے۔ جیبن پر تالا لگا تھا۔ میں بے تحاشہ کود کر اندر بھاگا تو پایا کہ وہاں کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے۔ پٹریاں دور تک سونی پڑی تھیں۔

تو پھر؟........ باؤجی؟ غور کرنے پر پایا کہ دور سگنل گرا ہوا ہے۔ میل کے گزرنے کا وقت تھا۔ یہ بھیڑ دراصل کراسنگ کی طرف جانے والی سڑک پر پڑی آہنی زنجیر کے کارن تھی۔ ٹریفک تھم سا گیا تھا۔ حالات میری ننگی آنکھوں کے سامنے تھے۔ لیکن دل کو تسلی نہیں ہوئی۔ خیال آیا، ہوسکتا ہے کہ باؤجی اسی کے منتظر ہوں۔ میل کا تیز رفتار انجن ادھر سے گزرے اور وہ اس کے آگے کود جائیں! یہیں کہیں پٹریوں کے پاس ہوں گے وہ۔

لیکن میرے خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے۔ دھڑدھڑاتا ہوا جودھپور۔ دلی میل ادھر سے گزر گیا۔ دونوں طرف کی آہنی زنجیریں کھول دی گئیں اور کوئی تماشہ نہیں ہوا۔ بھیڑ بکھر گئی۔ ٹریفک نارمل ہوگیا...... باؤجی وہاں نہیں تھے۔

تھکا تھکا لوٹا تو دیکھا کہ سائیکل ایک طرف پڑی ہے۔ سائیکل کو محفوظ دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اس جلد بازی میں اسے لاک کرنا ہی بھول گیا تھا۔ خیال آیا کہ کوئی اٹھائی گیرا اگر سائیکل لے کر رفوچکر ہوجاتا ــ تو؟ ڈانٹ پڑتی، ذلیل کیا جاتا اور پیدل گھسٹتے رہنے کی سزا ملتی۔

باؤجی اس وقت کہاں ہوں گے؟ انھوں نے شاید کوئی کنواں باؤڑی دیکھ لی ہو، ایک لمحہ کے لئے دل میں یہ خیال آیا تو سائیکل چلاتے ہوئے ایک بار پھر میری حالت غیر ہوگئی۔ اسی عالم میں میں نے سیدھے گھر کا رخ کیا۔

دور سے ہی باؤجی کو صحیح سلامت دیکھ کر میں نے راحت محسوس کی۔ مجھے نارمل ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ بلکہ اپنے پورے وجود میں میں خوشی کی، ایک ہلکی سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کرنے لگا۔

باؤجی باہر لان میں بیٹھے ہوئے بیڑی پی رہے تھے۔ میں ان کے قریب گیا تو آہٹ پاکر انھوں نے فوراً بیڑی دوب میں رگڑ دی، جیسے بڑوں کو دیکھ کر بالعموم اخلاقاً بیڑی سگریٹ بجھا دی جاتی ہے۔ وہ سہمے سے عینک درست کرکے میری طرف دیکھنے لگے۔ مجھے پہچان لینے پر ان کا سہما پن ختم ہوا۔

"راجیو تو ہے؟" گلا صاف کرکے وہ بولے "کہاں گیا تھا؟"

"یہیں تھا" میں بولا۔ جی میں آیا کہ خود انہیں سے پوچھوں، آپ کب لوٹے؟ اس کراسنگ کی طرف جانے کی کیا ضرورت پیش

آگئی تھی؟ لیکن میں نے ان سے کچھ نہ پوچھا۔

اس دوران بجھائی ہوئی بیڑی کو سلگا کر وہ پھر پینے لگے۔ ان کے اس اطمینان سے بیڑی پینے کا صاف مطلب یہ تھا کہ بھیّا اور بھابی کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہ اگر گھر میں ہوتے تو باؤجی یقیناً چین سے بیڑی پیتے ہوئے نہیں پائے جاتے بلکہ ان کا پورا وجود سہما ہوا ہوتا۔

مجھے پچھلی شب کا واقعہ یاد آگیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں اپنے بستر پر جاگ رہا تھا۔ اتنے میں زیرو پاور کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا، کھڑکی کے پاس لگی چارپائی سے باؤجی اٹھے اور دبے پاؤں دیوار کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں کھونٹی سے میرے کپڑے لٹک رہے تھے۔ سہمے ہوئے وہ میری جیبیں ٹٹولنے لگے۔ یقیناً انھوں نے مجھے محوِ خواب سمجھا تھا۔ اور میں انھیں صاف صاف دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی بڑی دولت کی آس میں ایسا نہیں کر رہے تھے۔ انھیں دراصل بیڑی کی طلب ہو رہی تھی اور میری جیب سے انھیں سگریٹ مل جانے کی امید تھی۔ وہ جانتے تھے کہ میں سگریٹ نوشی کرتا ہوں۔ لیکن انھیں مایوسی ہوئی۔ اسی عالم میں وہ اپنی چارپائی کی طرف لوٹنے لگے تو جی چاہا کہ انھیں روک کر اپنے سرہانے رکھی سگریٹ اور ماچس انھیں تھما دوں۔ وہ اس غیر متوقع عنایت پر ضرور خوش ہوں گے۔ مجھے سگریٹ نہ پینے کی ہدایت دے کر خود سگریٹ پھونکنے لگیں گے۔ دھواں اگلتے ہوئے وہ کھانسنے لگیں گے۔ کھانستے چلے جائیں گے۔ بے تحاشہ..... لیکن میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں اسی طرح لیٹا ہوا انھیں دیکھتا رہا۔

بیڑی جلدی ہی ختم ہو گئی۔ بیڑی ایک طرف پھینک کر انھوں نے میری طرف دیکھا اور بولے "تیری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟"

"جی، اچھی ہی چل رہی ہے۔" میں بولا۔

"آرٹس کی پڑھائی.....؟" وہ زیرِ لب بولے "کاش! تو بائلوجی پڑھتا"۔

آٹھویں جماعت پاس کر لینے پر باؤجی کی صلاح پر میں نے سائنس بائلوجی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میری اس میں دلچسپی بھی تھی۔ لیکن مجھے آرٹس میں دھکیل دیا گیا۔ انکار کی جرأت نہیں ہوئی۔

اور اب میں کالج میں تھا۔ سیکنڈ ایئر۔

"تو کچھ گیمس میں بھی حصہ لیتا ہے کہ نہیں؟" باؤجی نے پوچھا۔

"جی، ہاکی کی پریکٹس کرتا ہوں"۔

"اچھا کھیل ہے!..... اپنے زمانے میں خود مجھے بھی اس کا بہت شوق تھا۔ دھیان چند کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ وہ اس کھیل کے جادوگر تھے۔ اور دارا بھی تھے۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے....."

وہ اپنے زمانے کی کچھ دیگر باتیں بھی مجھے بتانے کے موڈ میں تھے لیکن بیماری نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ بیٹھے بیٹھے وہ اچانک بے چین ہو گئے اور بے طرح کھانسنے لگے۔ انھیں دمہ کا دورہ پڑ گیا تھا۔ سانس پھول گیا۔ کسی طرح انھیں سنبھال کر میں اندر لے گیا۔ چارپائی پر انھیں لٹا کر پانی کے ساتھ گولیاں دینے کے بعد میں ان کے سرہانے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد انھیں آرام ہوا تو میں راحت محسوس کرنے لگا۔ بعد میں میں ان کے پیر دابنے لگا۔

'نکی' نے اچانک کمرے میں آکر اچھلنا شروع کیا تو میں نے جان لیا کہ بھابی باہر سے لوٹ آئی ہیں اور تھوڑی ہی دیر بعد انھوں نے اُدھر جھانک کر اپنی موجودگی کا احساس بھی دلا دیا۔

"راجی، تم گھر میں ہو، یہ اچھا ہے!" انھوں نے مجھے مخاطب کیا "سنو، شومو کے ساتھ تم فوراً بازار چلے جاؤ۔ کچھ ضروری سامان لانا ہے۔ لسٹ میں نے اسے دے دی ہے۔ وقت کم ہے۔ جلدی لوٹنا۔ شام کو اپنے یہاں ایک پارٹی ہے۔ بہت سے لوگ آئیں گے....."

حکم دے کر وہ الٹے پاؤں لوٹ گئیں۔ میں نے باؤجی کی طرف دیکھا۔ بھابی کی بات انھوں نے بھی سنی تھی۔

"تم جاؤ..... تمھیں بازار جانا ہے" وہ بولے۔

"پر آپ کی طبیعت.....؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ آرام ہے۔ اور پھر یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ لیٹا رہوں گا تو اور آرام آجائے گا" انھوں نے کہا تو مجھے لگا کہ وہ صاف جھوٹ بول گئے ہیں۔ انھیں دراصل اپنے پاس میری اشد ضرورت تھی۔ لیکن بھابی کا حکم!

شومو کو جب ضروری سامان کی لسٹ دے دی گئی ہے تو

اب میری کیا ضرورت باقی رہ گئی ہے؟ وہ کوئی بچہ تو ہے نہیں۔ لیکن نہیں، گھر پر کام کر رہے سرکاری نوکر پر اتنا بھی بھروسہ نہیں!

بھابی کو کب باؤجی کی چنتا رہی ہے؟ بلکہ ان کے اس سلوک کی وجہ سے ہی باؤجی کی یہ حالت ہے۔.... میں یہ سب سوچ گیا۔

باؤجی نے ایک بار پھر مجھے بازار جانے کی یاد دلائی۔ اٹھتے اٹھتے دروازے کے پاس 'ٹنی' کو دیکھا۔ وہ کچھ ادھر ادھر سونگھ سانگھ لینے کے بعد اب آرام کر رہا تھا۔ اس کے گلے میں پڑے بیلٹ پر آج کچھ زیادہ ہی چمک تھی۔

پارٹی رات گئے دیر تک چلتی رہی تھی۔ کئی لوگ آئے تھے۔ پینے پلانے کا دور چلتا رہا تھا۔ وہاں مہمانوں کو سرو کرنے والوں میں میں بھی تھا۔ اپنی حالت پر غور کیا تو خود کو میں ایک بیرا ہی لگا تھا۔

میں اس وقت بھوکا تھا۔ میری فکر کسی کو نہیں تھی۔ باؤجی کی بات تو بالکل دیگر تھی۔ میرا دھیان بیرا ابران کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔ نظر بچا کر میں دو ایک دفعہ انھیں دیکھ بھی آیا تھا۔ کھانا انھوں نے کھا لیا تھا۔ انھیں دوائیں نے پلا دی تھی۔

بھوک جب ناقابل برداشت ہو گئی تو مہمانوں کو سرو کرتے وقت چپکے سے میں نے ڈش میں سے مٹن کا ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا اور چوروں کی طرح جلدی جلدی چبا کر اسے نگلنے کی کوشش کرنے لگا۔ جبڑا چلاتے ہوئے جانے کیسے میں بھابی کی نگاہ میں آ گیا۔ انھیں دیکھا تو میری حالت عجیب ہو گئی۔ انھوں نے حالانکہ مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا تھا لیکن مجھے لگا تھا کہ وہ کہہ رہی ہیں، راجی! یہ تم ہو؛ شرم آنی چاہیے! ذرا بھی تمیز نہیں ہے تم میں۔ تمھاری یہ حرکت مہمانوں میں سے کوئی اگر دیکھے گا تو کیا کہے گا؟

ہتی دق بھابی فوراً مہمانوں کی قطار کی سمت مڑ گئیں تو جی چاہا کہ چبایا ہوا مٹن فرش پر زور سے تھوک دوں۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میری آنتیں بڑی دیر سے گڑگڑا رہی تھیں اور یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دفعہ تو چلتے دور کے دوران پیگ لگا لینے کو بھی جی چاہا تھا!

شراب و کباب کی اس محفل میں مجھے باؤجی کا خیال آ گیا۔ ان کے خیالات کا دھیان آیا۔ شراب کو وہ ساری برائیوں کی جڑ مانتے تھے۔ شر یعنی جھگڑا فساد اور آب یعنی پانی۔ جس کا نام ہی لڑائی جھگڑے کا بانی ہو اس سے کسی کا بھلا کیونکر ہو سکتا ہے؟ اسی طرح وہ انڈے اور گوشت سے بھی پرہیز کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ان کے مطابق ان کے استعمال کرتے رہنے سے من شانت نہیں رہتا۔ وہ عورت ہی کیا، جس کی آنکھوں میں شرم نہ ہو؟ ...... اور ایک محفل یہ تھی — شراب بے دریغ لنڈھائی جا رہی تھی۔ سیخ کباب چاپ، بوٹی، بھنوا غرضیکہ طرح طرح کا گوشت اڑایا جا رہا تھا۔ اور پارٹی میں آئی ہوئی عورتیں مردوں کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر نہایت ہی اپنائیت کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں! خود باؤجی کی بہو بھی! .....

اسی پارٹی میں ایک عورت نے مجھے اپنے پاس بلایا تو میں سہم گیا۔ مجھ سے کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہو گئی؟...... سہما ہوا میں اس کے پاس گیا۔ ڈھلتی عمر کی وہ عورت خوب سجی سنوری اور گہرا میک اپ کیے ہوئے تھی۔

"جی، کچھ چاہیے آپ کو؟" ادب سے میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاؤ سویٹ اینڈ اسمارٹ یو آر!" خوشی سے وہ چہکی۔ یہ شراب بول رہی ہے، میں نے سوچا۔ اس نے مزید کہا "تم تو ہو بہو 'بوبی' کے ہیرو رشی کپور لگتے ہو!..... یہاں نوکر ہو؟"

میں کچھ بھی کہنے کی حالت میں نہیں تھا۔ عجیب تذبذب میں پڑ گیا۔ لیکن جلدی ہی مجھے اس سے نجات مل گئی۔

"میں کافی دیر سے نوٹ کر رہا ہوں مسز اہلو والیہ کہ آپ صرف پی رہی ہیں..... کھانے سے پرہیز ہے کیا؟" بھائی صاحب نے اس عورت کو مخاطب کیا تو وہ ایک زوردار قہقہہ لگا کر جھوم گئی۔ اس اثنا میں مجھے وہاں سے ٹل جانے کا موقع مل گیا۔

"کیسے ہو راجی؟" یہ ہستی مل تھے۔ انڈسٹریز ایسوسی ایشن کے منیجر۔ بھائی صاحب کے گہرے دوست۔ باؤجی کو بھی وہ جانتے تھے۔ ان کے مرحوم والد باؤجی کے دوست تھے۔ ان کے ہاتھ میں گلاس تھا اور چہرے پر مسرت چھائی ہوئی تھی۔

"جی، اچھا ہوں۔" میں بولا۔

"تم کہاں ہم شرابی کبابی لوگوں میں پھنس گئے؟" انھوں نے ہنس کر کہا۔

اتنے میں بھائی صاحب آ دھمکے۔ ہستی مل سے انھوں نے جی بھر کر ملنے کا امر لیا۔ کچھ پل میں بھی کھڑا رہ گیا۔ اس دوران انھوں نے باؤجی کے بارے میں پوچھ لیا۔

"ٹھیک ہیں" بھائی صاحب نے کہا "ابھی طبیعت کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ دراصل یہ بڑھاپا ہی اپنے آپ میں بہت بڑی بیماری ہوتی ہے! کل ہی انہیں ڈاکٹر بنرجی کو دکھایا ہے۔ دواری۔ اب آرام سے سو رہے ہیں۔۔۔۔"

زیادہ دیر تک میں وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ یہ مناسب بھی نہیں لگتا۔

باؤجی! انھیں تو خیراتی ہسپتال تک کی پوری دوا نصیب نہیں ہے۔ پچھلے کئی مہینوں سے بھگت رہے ہیں۔ اور بھائی صاحب نے انھیں شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر کو دکھا دیا! وہ اس صفائی کے ساتھ جھوٹ بول جاتے ہیں، اس کا علم مجھے اس وقت ہی ہوا تھا۔ یہ مہارت انھوں نے کہاں سے حاصل کی؟ شاید اپنی افسری کے دوران!۔۔۔۔۔

ایسی پارٹیاں بے مقصد نہیں ہوتیں۔ اس پارٹی کے اہتمام کا بھی ایک خاص مقصد تھا۔ یہ میں نے بعد میں جانا۔ وہاں موجود قریب قریب سب لوگ جب پوری طرح سرور میں آ گئے تو ایک رو دیلی شخصیت کے مالک نے بھائی صاحب کی موجودگی میں انڈسٹریز ایسوسی ایشن کے منیجر کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ہستی مل اس وقت احسان مند لگ رہے تھے۔ بھائی صاحب خوش تھے، گویا کہ پارٹی بے حد کامیاب رہی تھی۔ وہ رو دیلی شخصیت کا مالک احسان کرنے والوں کی طرح رہ رہ کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہا تھا۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس پارٹی کا سارا خرچ ہستی مل نے اٹھایا ہے۔

باؤجی نارمل اور خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ تندرست اور تازہ لگ رہے تھے، جیسے دمہ تو دور، انھیں کوئی معمولی سی بیماری بھی نہیں ہو۔ اسی عالم میں انھوں نے مجھے مخاطب کیا۔

"راجی، ایک صلاح دے گا بیٹا؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟۔۔۔۔ میں آپ کو صلاح کیسے دے سکتا ہوں؟ آپ پتا ہیں، ہمارے بھگوان!" احترام سے میں نے کہا۔

"ارے چھوڑ ان دقیانوسی باتوں کو! تو کیوں بھگوان کے چکر میں پڑتا ہے؟۔۔۔۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ببلی کو دیکھے ایک عرصہ ہو گیا۔ سوچتا ہوں کہ کچھ دن اس کے یہاں رہ آؤں۔ تیرا کیا خیال ہے؟"

میں تذبذب میں پڑ گیا۔ ان سے کیا کہتا؟ چپ رہ گیا۔ دو پل غور سے انھیں دیکھا ـــ بہن بیٹی کے گھر بہت کم جانا چاہیے۔ کھانا تو دور، وہاں کا پانی بھی نہیں پینا چاہیے۔ یہ ہمارے یہاں کی ریت ہے۔ ان خیالات کے حامی باؤجی نے جب مجھ سے اپنی بیٹی کے ہاں کچھ دن رہ آنے کی بات کہی تو مجھے سخت حیرانی ہوئی۔ پھر جب ذرا غور کیا تو وہ مجھے اپنی جگہ سو فیصدی صحیح لگے تھے۔ دیدی کو دیکھے واقعی کئی مہینے ہو گئے تھے۔ پچھلی دفعہ وہ جب آئی تھیں تو بھابی نے عادتاً ان سے بے رُخی برتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ دیدی کی معصوم بچی بنٹی تک کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا تھا۔ باؤجی نے یہ سب دیکھا تھا۔ میں نے بھی۔ مگر ہم کچھ بھی کرنے یا کہنے کی حالت میں نہیں تھے۔ دیدی نے تب دانشمندی سے کام لیا تھا۔ دو ہی دن بعد وہ لوٹ گئی تھیں۔ ان کی ناراضگی اسی سے ظاہر تھی کہ انھوں نے خیریت سے پہنچ جانے کی خبر تک نہیں بھجوائی تھی۔ بے رُخی اور سرد مہری نے انھیں باؤجی کی خیر خبر تک نہ لینے دی۔

"تو کیا سوچنے لگا؟" مجھے چپ دیکھ کر انھوں نے پوچھا۔

"جی، کچھ نہیں۔"

"لیکن اس کے یہاں جانے سے بھی کیا ہوگا؟ لوٹ کر آخر یہیں تو آنا پڑے گا!" انھوں نے کہا تو مجھے ایسا لگا کہ میں ایک بہت بڑی ذمہ داری سے نجات پا گیا ہوں۔ اس طرح اپنے سوال کا جواب خود انھوں نے ہی دے ڈالا تھا۔

باؤجی کو اس طرح بے آسرا اور دکھی دیکھ کر کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ یہ ہمارے پتا ہیں بھی کہ نہیں؟ ایسا گیا گزرا ان تو گلی محلے کے کسی بھکاری کے ساتھ بھی نہیں ہوتا۔ گھر کے پالتو مٹھی کا بھی بڑا خیال رکھا جاتا ہے اور ایک ہمارے یہ باؤجی ہیں!

مجھے یاد ہے کہ انھیں باؤجی نے ہمارے آرام اور چین کے لئے

کئی کئی دفعہ اپنے حقوق کو چھوڑ دیا تھا۔ ہماری خوشیوں پر اپنی خوشیاں نچھاور کر دی تھیں۔ ماتاجی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہیں کی۔ اس وقت تو باؤجی اپنے پاؤں پر کھڑے تھے اور قدرے جوان بھی تھے..... مجھے تو ماتاجی کی شکل تک یاد نہیں ہے۔ ان دنوں میں دو برس کا تھا۔

اور یہ بھائی صاحب جو آج اس بڑے سرکاری عہدہ پر ہیں تو انھیں باؤجی کی بدولت ہیں۔ ورنہ آج یہ بھی زیادہ سے زیادہ کسی دفتر میں چھوٹے موٹے کلرک ہوتے۔ پھر تو بھابی کے یہ رئیسی ٹھاٹ بھی ہرگز نہ ہوتے۔

آج اگر باؤجی کے پاس خوب دولت ہوتی، تو؟ ایسی صورت میں حالات یقیناً ان کے موافق ہوتے۔ پر صاف دل باؤجی نے ریٹائرمنٹ پر ملی پی۔ ایف اور انشورنس وغیرہ کی خاصی بڑی رقم بھی بھائی صاحب کو سونپ دی۔ بعد میں وہ منہ تکتے رہ گئے۔ اور تو اور ببلی دیدی کے بیاہ پر بھی وہ اپنے جی کے ارمان نہیں نکال پائے تھے۔

کئی ایک دفعہ میں نے باؤجی کا پکش لینے کی کوشش بھی کی۔ بھابی اور بھائی صاحب تک سے لوہا لینے کی بات ذہن میں آئی۔ لیکن حالات نے مجھے روک دیا۔

ایک دفعہ کی بات ـــ باؤجی کو حرارت تھی۔ وہ دمہ سے بہت پریشان تھے۔ میں ان کے پاس تھا۔ ایسے میں بھابی وہاں آ گئیں۔

"تو راجی یہاں کیا گپیں لڑا رہا ہے؟ باہر جاکر ذرا ــ ان بھکمنگوں کے بچوں کو یہاں سے دور بھگا دے۔ وہ خواہ مخواہ نکی کو چڑا چڑا کر پریشان کر رہے ہیں!"

"آپ دیکھ رہی ہیں کہ یہاں باؤجی کی طبیعت خراب ہے، اور آپ کو کتّے کی فکر لگی ہے..... شومو سے کہہ دیجئے!"

پل بھر وہ مجھے دیکھتی رہ گئیں۔ یقیناً انھیں مجھ سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ انھیں غصہ آ چلا تھا۔ پر انھوں نے اس وقت آگے مجھ سے کچھ نہ کہا۔

شام کو بھائی صاحب سے سامنا ہوا تو ان کی تیوریاں چڑھی ہوئی دیکھیں۔

"راجی!" انھوں نے مجھے براہ راست مخاطب کیا۔ "تمھیں بڑوں سے پیش آنے کی تمیز سیکھنی چاہیے۔ بڑی بھابی ماں کے برابر ہوتی ہے۔ خبردار آئندہ کبھی تم نے اس کے آگے زبان چلائی تو!....."

بڑی بھابی ماں کے برابر ہوتی ہے، مجھے تسلیم، لیکن پتا جو ہمارے حقیقی باپ ہیں، ان کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟.. ان سے میں نے پوچھنا چاہا، پر میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔

اس دن کے بعد پھر کبھی میں نے بھابی کو ٹوکنے کی ہمت نہیں کی۔

میں اس جہنم سے نجات کی صورت سوچنے لگا۔ باؤجی کو لے کر الگ رہنے کا خیال آیا۔ لیکن جب سوچا کہ کہاں رہوں گا۔ کھانے کپڑے کا بندوبست کیونکر ہوگا؟ تو ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی لگی۔

اس تاریکی سے نجات کی ایک ہی صورت ہے۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں۔ لیکن ابھی تو میں صرف طالب علم ہوں۔ تعلیم کے سلسلے میں بھابی نے ایک بار مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"لکھ پڑھ کر تو کیا بنے گا راجی؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

دو پل ان کی طرف دیکھتا ہوا میں ان کے اس اچانک سوال کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ صاف طور پر یہ طنز تھا۔ میں چپ رہ گیا۔ یہی بہتر تھا۔

ان کے جانے کے بعد میں اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے لگا۔ میں کیا بنوں گا؟ یہ لوگ مجھے کہاں تک پڑھائیں گے؟ آرٹس کی پڑھائی! بی۔ اے یا ایم۔ اے۔ پاس کر بھی لیا تو کہاں پوچھ ہوگی؟ یہاں تو ڈاکٹر اور انجینئر تک بے روزگار رہنے لگے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کہیں کلرکی مل جائے گی۔ بعد میں جب بھائی صاحب کا دھیان آیا تو کچھ تسلی ہوئی۔ سوچا کہ وہ بڑے افسر ہیں، کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔

فی الوقت میں باؤجی کے پائتانے بیٹھا ہوا ان کے پیر دبا رہا ہوں۔ انھیں اس وقت آرام ہے۔ ان کے سونے کے بعد ٹیبل لیمپ جلا کر میں سیاسیات اور معاشیات کے ضروری نوٹس تیار کروں گا۔

●●

نخشب مسعود

رفتار

اسے یوں لگ رہا ہے جیسے شہر سے دور ایک الاؤ روشن ہے جس کی آنچ دس فٹ کے فاصلے پر رکھی ہوئی چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر پگھلا رہی ہے۔ آگ اس قدر تیزی سے جل رہی ہے کہ اس کے پگھلتے ہوئے شعلوں کی آواز شہر کے دوسرے کونے تک صاف سُنائی دے رہی ہے۔ شہر کے خوش باش لوگ عیش و نشاط میں محو ہیں۔ چار آدمی اسے کاندھے پر سوار کیے۔ آگ کے جلتے ہوئے الاؤ کی طرف گھسیٹے لیے جا رہے ہیں وہ چیخ رہا ہے۔ چلّا رہا ہے۔ لیکن اس کی چیخیں جیسے سرد شعلے ہیں جن کی لپکیں ان کے کانوں پر حدت کی ہلکی سی رمق بھی پیدا نہیں کر رہی ہیں ——

وہ ان کی قید سے فرار ہونے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ لیکن اس کے ہاتھ پیر رسّی سے اس قدر کس کر باندھ دیے گئے ہیں کہ اس کی تمام تر قوت سلب ہو کر رہ گئی ہے بس ایک چیخ ہی ہے۔ جس پر اُسے اختیار ہے۔

دوسرے ہی لمحہ اسے اس تیز الاؤ میں جھونک دیا گیا ہے۔ تاکہ بھوکی آگ اپنی برسوں کی اشتہا مٹا سکے۔

سڑکوں پر کاریں تیزی سے رینگ رہی ہیں۔ بھیڑ اس قدر ہے کہ راستہ تنگ ہو گیا ہے۔ آگے بڑھنے کا سوال ہی نہیں! مگر وہ راستہ جلد عبور کر لینا چاہتا ہے کہ سورج کا سفر ختم ہونے کو ہے۔ اور اسے ابھی اتنے سارے کام انجام دینے ہیں مگر......

اب وہ بھیڑ سے جدا ہو کر ننگی سڑک پر پھیلنے لگا ہے۔ کاریں اسی تیزی کے ساتھ آ جا رہی ہیں۔ سرخ، پیلی، اور ہری روشنی کا رقص جاری ہے۔ لیکن رفتار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک چیخ بلند ہوئی۔ اور سڑک گرم خون سے مہک اٹھی ہے۔ وہ کار کی زد میں ہے۔

سیلاب ویسے ہی ہمک ہمک کر بہہ رہا ہے۔ ایک لہر بھی اس تک نہیں آ رہی ہے۔

وہ سائے نہایت سرعت کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ (جن کا کام ہی یہ تھا) اسے اسٹریچر پر لٹا کر پوسٹ مارٹم کے لیے لے جانے لگے ہیں۔ وہ اٹھ کر بھاگ جانا چاہتا ہے۔ لیکن اسٹریچر کی ڈوری اس کے وجود کے گرد اس قدر کس کر باندھ دی گئی ہے کہ وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اُٹھ نہیں سکتا اور چیخ رہا ہے۔

(اس کا سفر جاری تھا)

اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک انتہائی مصروف شہر میں زندگی گزار رہا ہے۔ جہاں کسی کو ایک پل کی فرصت نہیں؛ جنازے پر جنازے پڑے ہیں۔ لیکن انھیں کاندھا دینے والا کوئی نہیں، بس کچھ آدمی مقرر ہیں جو یہ کام اپنے اصولوں پر کیے جا رہے ہیں۔

مگر اس کا چہرہ انتہائی مسرت سے دمک اُٹھا ہے کہ ایک معمولی آدمی ہونے کے باوجود بھی سارا شہر اس کے ماتم میں شریک ہے۔ تمام کاروبار بند ہیں۔ اور شہر کی دیواروں پر سیاہ سائے رینگ رہے ہیں۔ سرکاری بینڈ باجوں کے ساتھ اس کے جنازے کا جلوس شہر کی سب سے بڑی شاہراہ سے اک شان کے ساتھ گزر رہا ہے۔ لوگ غم زدہ اور مایوس ہیں۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ جنازے کا رُخ قبرستان یا مرگھٹ بھومی کے بجائے اسی الاؤ کی طرف ہے۔ جہاں ہزاروں برس کی بھوکی آگ اپنے ہوس رنگ ہونٹوں پر سرخ زبان پھیر رہی ہے اور اس کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی ہیں......

(سفر جاری ہے)

وہ سوچ رہا ہے...... اب یہ سوچیں ہی اس کا سہارا ہیں۔

ساری بستی اپنے کاروبار میں منہمک ہے۔ کسی کو بھی فرصت نہیں ہے۔ اور وہ جو اپنی فیکٹریوں اور آفیسوں سے اپنی شفٹ ختم ہوتے ہی آچکے ہیں۔ اور ڈیوٹی یا اپنی تفریح کے لیے کلبوں اور سینما گھروں میں گھومنے جانے کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اس کے جنازے میں چار قدم چلیں۔

لیکن اب جبکہ اس کا آخری وقت ہے وہ چیخ رہا ہے۔ چلّا رہا ہے۔ مگر کوئی نہیں ہے ایسا جو اسے آخری منزل تک پہنچائے۔

بس ایک تیز الاؤ ہے اور اس کی خوف ناک آگ ہے۔ اور چار سائے ہیں جن کی آنکھوں پر چمک دار مادّے کی ٹکیہ ہے اور کانوں میں سیسہ بھرا ہوا ہے۔ ان کے کان چیخ و پکار پر بند رہتے ہیں مگر ایک خاص کھن کھرج پر ضرور چونک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(اسے دن رات ایسے ہی عجیب و غریب خیالات کاٹے کھا رہے ہیں)

اب وہ کٹ کر ایک پگڈنڈی پر گرا ہے۔ دور تک سبز فصلوں کی قطاریں ہیں۔ ہزارہا نگاہیں اسے گھور رہی ہیں۔ اور دوسرے ہی لمحہ وہ سب ایک ساتھ فرار ہو جاتی ہیں شاید وہ خوف زدہ تھیں کہ ناحق خون کے الزام میں پکڑی جائیں گی۔

(اب وہاں کوئی نہیں تھا)

اور اب جبکہ بڑے بڑے گدھ اس کی لاش نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ حال اور مستقبل سے بے نیاز چہروں کی قطاریں اس کے قریب دائرہ بنائے کھڑی ہیں۔ اور وہ انھیں وزدیدہ نگاہوں سے تک رہا ہے۔ ایک رحم و خلوص کی ہلکی سی رمق تک ان کی آنکھوں میں نہیں ہے۔ وہ سبھی مسکرا رہے ہیں۔ (ان کے نزدیک یہ ایک عجیب تماشا تھا۔ اور اس کے سوا ان کی تفریح کا اور کوئی سامان نہ تھا)

وہ ان گدھوں کی زد سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا رہا ہے مگر یہ اسے دھکیل کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اس جدوجہد میں اس کے قویٰ جواب دے گئے ہیں۔ اب وہ انھیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اسے گدھوں سے زیادہ ان لوگوں سے خوف آنے لگا ہے وہ محسوس کر رہا ہے جیسے ان کی مسکراہٹ گدھوں کے خونخوار ناخنوں سے زیادہ تیز اور قاتل ہے۔

اب وہاں صرف سوکھی ہڈیوں کا پنجر رہ گیا ہے گدھ پیڑ کی اونچی اونچی شاخوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں اور وہ اس پنجر کے گرد شائیں شائیں کرتا ہوا منڈلا رہا ہے۔

▲▲

شاہدہ محبوب

پتھروں کے شہر سے.....!!

یہ کس کی چاپ ہے مدھم
یہ کس کی ہے صدا پیہم
پکارا کس نے پھر مجھ کو
دیارِ آرزو کے بام و در سرگوشیاں کرنے لگے باہم

یہاں کا ہے عجب شیوہ
صدائیں آ کے خود ہی لوٹ جاتی ہیں
پشیمانی کے عالم میں
یہاں صرف ایک ہی موسم رہا ہے
خزاں کا، وحشتِ دل کا
یہاں تو ہر طرف مٹی کے تودے ہیں کھنڈر ہیں، ہو کا عالم ہے
نگاہیں تک پھسل جاتی ہیں ایسے چکنے پتھر ہیں
کسی کے نقشِ پا تک ٹک نہیں سکتے
یہ وہ بنجر زمیں ہے
جہاں
گل ہائے الفت کھل نہیں سکتے
یہ وہ صحرا نما بستی ہے جس جا
سدا احساس پر پہرہ ہی رہتا ہے
خموشی زہر ہے لیکن اسے پینا ہی پڑتا ہے
جو بھولے سے کبھی سچ بات کہتا ہے۔

یہ کس کی چاپ آتی ہے
یہاں دھیمے سروں میں کون گاتا ہے
کہو اس سے نہ یوں خود پر ستم ڈھائے
ابھی وہ پتھروں کے شہر سے باہر چلا جائے۔

شاہد عزیز

قید ہو گیا سورج

مجھ کو یاد ہے اکثر
میں یہاں پہ آیا ہوں
ایک کچا رستہ تھا
جس کی آخری حد پر
ایک گاؤں چھوٹا سا
مسکراتے چہروں کا
اک حسین جنگل تھا
ایک جھیل تھی جس پر
میں نہانے آتا تھا

آج دیکھتا ہوں میں
لمبی چوڑی سڑکیں ہیں
اجنبی صداؤں کا
ایک شہر ہے جس میں
بے شمار سائے ہیں
صرف بند کمرے ہیں
اور بند کمروں میں
قید ہے کہیں سورج

خلیل تنویر

نظم

ہماری کھیتیاں گھروں میں تھیں
اور ہم بھٹک رہے تھے
اجنبی صداؤں کے سراب میں
وہ کون سی طلب ہے جو ——
حصارِ جان سے نکل سکی
عدم کے بھید پا سکی
نظر زمین کے طلسم میں اسیر ہے
عجیب پیاس ہے!
کہاں کہاں لئے پھری

رونق زیدی

ایک نظم

ہوا کا یہ ٹھٹھرتا جھونکا
ہمالیہ کی ——
برفیلی چوٹیوں کو چومتا ہوا
برسات کی —— ہلکی بوچھاروں
اور —— مندر میں بجتی
گھنٹیوں کی ہلکی آوازوں کے ساتھ
●● میرے وجود میں سرایت کرتا
مسرت کی کلیاں کھلا جاتا ہے
اور تب ——
میری روح —— جسم سے نکل کر
ان برفیلی چوٹیوں کا طواف کرتی ہے

خوشتر مکرانوی

قطعات

وہ رنگ و بو گلابوں میں نہیں ہیں
وہ لالہ رو نقابوں میں نہیں ہیں
جنھیں بچپن کی آنکھوں نے پڑھا تھا
وہ قصے ان کتابوں میں نہیں ہیں

زمیں کی کروٹوں میں رات گزری
●● کہیں بجلیاں نازل ہوئی تھیں
گواہی دے رہا ہے دشت مشرق
کہ موسم نیند میں شامل ہوا تھیں

خالد سعید

درندہ پچھلی ساعت کا

ٹیلوں پہ رہے اکھاڑے، ہر طرف ہے شام دستک زن
ہوا میں تیز سموں کی کھڑکھڑاہٹ
اپنی تیغ میں پھر زنگ ہے
ہوا سے لڑتے لڑتے اپنی تلواریں شکستہ ہیں
بچے ہیں ہاتھ میں دستے
ہمارے دست و بازو بھی ہیں خوں آلود
زخمی ہنہناتے دوڑتے گھوڑوں پہ قابو پائیں
کہیں اپنی نیاموں سے لہو مٹی نہ پی جائے
(کہ اب تو بس یہی اپنا اثاثہ ہے)
وہ خوں آشام مرغولے ہماری سمت بڑھتے آرہے ہیں
نکالیں آنکھیں اپنی اور ہتھیلی پر سجائیں
درندہ پچھلی ساعت کا
ہنرمندی دکھانے پر ہے آمادہ ......

●●

محمد امین

نظم

میں کانٹوں کی فصل اگاؤں
تم موسم پر گیت لکھو
میں چتا میں آگ رکھوں
تم اشکوں کی برسات کرو
میں تو دکھ کی بات سناؤں
تم خوشیوں کے راگ الاپو

یہ نہیں کہتا
میں ہی بجا ہوں
لیکن پھر بھی
جیون کی یہ ٹوٹی نیا
جس کی دونوں پتواریں الگ الگ سمتوں میں رواں ہیں
آخر کب تک؟
ان الٹی سیدھی باتوں کے ساگر میں بھٹکے گی.....

حسنیٰ سرور

گمشدہ منزل کے مسافر

"تم ؟!" دو حیران آنکھوں اور دو سنجیدہ ہونٹوں نے پوچھا۔

"تم ؟!!" دو پشیمان آنکھوں اور دو پژمردہ ہونٹوں نے پوچھا ——

یہ آنکھیں اپنی سی لگیں ..... اپنائیت کا وہ رنگ جو کہیں اور دوسری نگاہوں میں کبھی نہ مِلا تھا، وہی رنگ ...... آج برسوں بعد ..... اِن آنکھوں میں نظر آ رہا تھا —— جو برسوں پہلے کھو گئی تھیں۔ دُھند اور مٹی کی دبیز چادروں کے پرے —— غفلت اور نادانی کے گہرے سائے میں !

ایک لمحہ، دو لمحے اور کئی لمحے بیت گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے بالکل مقابل کھڑے تھے، پاس پاس —— اور چہروں پر پہچان کی لکیریں تھیں ——

پھر دونوں میں سے کوئی بھی کچھ نہ بول سکا —— چونک کر، سنبھل کر اپنی اپنی سیٹ ڈھونڈنے لگے —— اتفاق سے دونوں کی سیٹیں برابر تھیں —— ایئر ہوسٹس نے اُنہیں اُن کی سیٹوں تک پہنچا دیا —— دونوں پھر ایک بار چونکے —— آنکھوں نے پھر ایکبار پوچھا —— "تم ؟!"

اور دونوں سمٹے سمٹے سے انجان بنے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے ——

وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھا ——

یہ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی —— برسوں بعد قسمت ہم دونوں کو کس قدر قریب لے آئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو چھو سکتے ہیں محسوس کر سکتے ہیں۔ ہمارے جسموں کے درمیان ایک دو انچ کا ہی فاصلہ ہے جو کسی پل مِٹ بھی سکتا ہے !

مَیں —— میں اُنہیں دیکھ سکتی ہوں چھو سکتی ہوں لیکن، دل کے اتھاہ سمندر میں ایک بھولا بِسرا طوفان سا اُبھرا۔

لیکن ہمارے دل ایک دوسرے سے بہت دُور ہیں —— ہمارے ذہن بھی ایک نہیں جانے اُن کے دل میں کیا ہے ؟! وہ کیا سوچ رہے ہیں —— ؟! ہم ایک دوسرے کے پاس رہ کر بھی کس قدر دُور ہیں —— کتنی بڑی خلیج دنوں کے درمیان بن چکی ہے۔ جو ان دس برسوں میں پاٹی نہ جا سکی۔ دس سال —— جیسے ایک عمر —— ایک یُگ ——

کاش —— یہ سفر عمر کے اُس دور میں نصیب ہوا ہوتا جبکہ میرا زخمی دل پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا ! جبکہ میں ہار کر —— پچھتا کر باہوں کی اُن پناہوں میں جانا چاہتی تھی، جو عورت کے لئے ایک مضبوط قلعے سے کم نہیں ——

کاش ! قسمت بہت پہلے ہمیں ایک دوسرے کے اتنا قریب ہونے کا موقع دیتی جس وقت کہ دلوں میں نفرت کی جڑیں اتنی گہرائی تک نہ اُتری ہوتیں ——

کاش ! —— کاش !!

مالا نے سر جھکا کر چپکے سے کنکھیوں سے اُسے دیکھا ! —— اُس نے آنکھوں پر نیلا چشمہ چڑھا لیا تھا۔ اور انجان بنا نہ جانے سامنے کیا دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے ایک آہ نکل گئی۔

اب ہوائی جہاز اڑان میں ہے —— فضا کی بیکراں بلندیوں کی جانب اڑا جا رہا ہے —— اس کے خیالات کا طائر بھی پرواز کر رہا ہے ——

صِرف مالا ہی نہیں آمر بھی اپنے خیالات کی دوریوں میں کسا جانے کیا کیا سوچ رہا ہے —— اس کے چہرے کی گمبھیرتا اور بھی گہری ہو چلی ہے۔ پیشانی پر ایک دو شکنیں —— لب بھینچے ہوئے ——

مالا ــــ ؟تم میرے سامنے کیوں آگئیں ؟! میرے پاس میرے ساتھ تمہاری سیٹ کیوں لگ گئی ہے ؟ کیا قدرت کوئی اور مذاق کرنا چاہتی ہے ؟ کیا وقت کوئی اور کھیل کھیلنا چاہتا ہے ؟! یہ تمہارے جسم سے اٹھتی ہوئی ایوڈی کولون کی دھیمی دھیمی مہک کن بھولی بسری وادیوں کی طرف لئے جارہی ہے مجھے ؟ تمہارے قرب کا طلسمی احساس کن خواب زاروں کی طرف اشارہ کر رہا ہے ؟ ــــــ نہیں مالا ــــ نہیں ــــــ بھگوان کے لئے مجھے اب کچھ نہ یاد دلاؤ ــــــ میں راکھ کا ایک ڈھیر ہوں ــــ اسے کریدنے کا تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا ــــ تم ــــ تم یہاں سے چلی جاؤ ــــ چلی جاؤ۔

ہوائی جہاز اڑ رہا ہے۔ ہلکے پھلکے دودھیا بادلوں کی نرم سطح سے گذرتا ہوا ایسا لگ رہا ہے جیسے تصورات ماضی کی دھیا دھند کی چادروں کو چاک کر کے ٹوٹے ہوئے خوابوں کو تلاش کر رہے ہوں۔

مالا کی نگاہیں نشست بدلتے ہوئے غیر ارادی طور پر آمر کی جانب اٹھ گئیں ــــ وہ بھی مڑا اور نیلگوں شیشے سے جھانکتی دو گہری چمکیلی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں آنکھیں پلکیں جھپکانا بھول گئیں ــــ لب کچھ کہنے کے لیے مچلے ــــ کانپے لیکن کھل نہ سکے۔ جیسے اندر سے کسی نے انہیں بند کر رکھا ہو ــــ جیسے دونوں ایکدوسرے کو جانتے ہوئے بھی پہچاننے سے انکار کر رہے ہوں۔

جہاز کی گڑگڑاہٹ کانوں میں گونج رہی تھی! اور گردوپیش کا احساس دلا رہی تھی۔ مالا نے جھجک کر پلکیں جھکا لیں اور آمر نے بھی گھبرا کر منہ پھیر لیا۔

وقت پل پل بہتا رہا! ــــــ

مالا کی آنکھیں پھر آمر کی جانب مڑیں، ...... اور جیسے اپنے معبد کا طواف کرنے لگیں ــــ وہی چوڑے چکلے شانے ...... وہی مضبوط گردن ــــ بالوں کا وہی انداز ــــ لیکن یہ کیا ؟ کنپٹیوں کے پاس اجلی کرنوں کا باریک سا جال ابھر آیا ہے ــــ تب تو بال بےحد سیاہ، گھنگھریالے اور گھنے تھے ...... لیکن اب بال کم بھی ہو گئے ہیں اس کے جی میں آئی کہ آہستہ سے آمر کے شانے پر ہاتھ رکھدے۔ اور اپنائیت کا وہ لمس محسوس کرلے جس کے لیے وہ برسوں سے تڑپتی رہی ہے۔

یہی تو ہے میرا مندر ــــــ یہی تو وہ دہلیز ہے جہاں ماتھا ٹیکنے کی حسرت لیے ساری عمر سسکتی رہی ہوں ــــ مالا کا لرزتا ہاتھ چپکے سے آگے بڑھا ــــ دل کی دھڑکن جہاز کی آواز کو چیر کر بھی سنائی دے رہی تھی ــــ ہاں مالا! ــــ یہی وہ لمحہ ہے جس کی تو متلاشی تھی ......

"نہیں ــــ !!" اس کے ہونٹوں سے نکل گیا ــــ آمر چونک کر پلٹا ــــ مالا سہم گئی تھی ــــ بت بن گئی تھی ــــ چہرہ پسینے میں شرابور ــــ آمر کے لب پھر بھی نہ کھلے ــــ اس کی آنکھوں میں اجنبیت کے گہرے رنگ تھے، نفرت کی دہکتی سی آگ تھی ــــ مالا نے چپکے سے کھڑکی کی جانب نگاہیں مرکوز کر دیں۔ آمر کی دھڑکنوں میں تلاطم تھا، ــــ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ انجان نظروں سے مالا کو دیکھنے لگا ــــ اس کا حسین چہرہ صرف آدھا ہی نگاہوں کی زد میں تھا ــــ وہی ناک ...... وہی ہونٹ ــــ وہی تراشیدہ سیاہ بال ــــ لیکن ــــ یہ کیا ؟ ــــ اب مالا کے بالوں میں یہاں وہاں چاندی جھلملا رہی ہے ــــ

اتنی جلدی ؟! نہیں نہیں ــــ مالا کی عمر ہی کیا ہے ؟ ــــ ابھی تو ہماری شادی ہوئی ہے ــــ ابھی تو ہمارے آنگن میں پھول بھی نہیں کھلے ــــ !!

مالا کا وہ عنابی رنگ کیا ہوا ــــ اس کے بھرے بھرے گالوں کو کس کی نظر لگ گئی ہے ! مالا ــــ مالا ــــ تم اتنے دنوں مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں ــــ تمہارے بغیر زندگی میں نے شعلوں پر بسر کی ہے۔ دل کے گھاؤ لئے شہر شہر بھٹکتا رہا ہوں ــــ تم نے مجھے جینے بھی نہ دیا تو مرنے بھی نہ دیا ــــ مگر یہ تم ــــ اتنی اداس اتنی تنہا سی کیوں لگ رہی ہو ــــ کیا تم بھی ــــ میرے لیے تڑپتی رہی ہو؟

جواب دو مالا ــــ !" مالا" ــــ آمر کے ہونٹوں نے مالا کا نام لے لیا ــــ

وہ بے اختیار چونک کر مڑی ــــ تم ــــ آپ نے کچھ

"ہیں — !؟"

دونوں کی آنکھیں ملیں — گھبراہٹ، شرمندگی پچھتاوا — کیا کچھ نہ تھا مالا کی آنکھوں میں — ؟ امر آنکھوں آنکھوں میں اُسے تولنے لگا — دل کی گہرائی میں اُتر کر اُسے جانچنے لگا۔

"آپ نے میرا نام لیا تھا؟!" ایک آس نے پوچھا۔

"جی نہیں — میں آپ کا نام نہیں جانتا!" نفرت نے بے رخی سے جواب دیا —

مالا زخمی ہرنی کی طرح تڑپ اٹھی۔ تکلّف کی ساری دیواریں ایک ہی جھٹکے میں گراتے ہوئے بولی — "تم یوں انجان نہیں بن سکتے امر! میں جانتی ہوں میرا گناہ ایسا نہ تھا کہ فراموش کیا جاتا۔ لیکن تمہیں بتا دوں کہ جس بھول نے مجھے تم سے سدا کے لئے جدا کر دیا تھا اس بھول کی سزائیں ان دس برسوں میں بھگت چکی ہوں — اتنا کہ اب ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر چکی ہوں......

تم...... تم اب اور سزا نہ دو امر — اب اور سزا نہ دو —"

مالا کا لہجہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا، اُس کا دل بھی زخمی تھا وہ یہ چوٹ برداشت نہ کر سکا۔

"مالا — پلیز! اب زخم کریدنے سے کیا حاصل سوائے جلن کے! یہ کہو تمہیں جانا کہاں ہے؟!"

وہ ایک طنزیہ ہنسی ہنس کر بولی: "ایسی تو کوئی جگہ نہیں امر جسے اپنا گھر کہہ سکوں، تقدیر کبھی کبھی یوں بھی ظالم بن جاتی ہے کہ تنکے کا آسرا بھی نہیں رہتی" — وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی جیسے اپنے اندر اٹھتے طوفان کو دبا رہی ہو — اس کے رخساروں پر خون کی تیز گردش نے ہلکی سی سرخی ابھار دی ہے۔ نچلا ہونٹ بار بار کاٹ رہی ہے — پیشانی پر ننھے ننھے موتی جھلک آئے ہیں۔ امر سے دیکھا نہ گیا۔ اُس نے چپکے سے پوچھ لیا۔ "میں نے سُنا تھا کہ تم جرمنی میں مقیم ہو گئی ہو۔ تو کیا وہاں تمہارا گھر نہیں ہے؟!"

مالا دھیمی سی ہنسی ہنس پڑی — "کہیں مقیم ہو جانے سے وہ اپنا گھر تو نہیں کہلاتا! — گھر تو وہ ہوتا ہے امر — جہاں مرد عورت مل کر ایک دوسرے کے سہارے جیتے ہیں — تنہائی جس کا مقدر ہو وہ ہجوم میں بھی اکیلا ہوتا ہے — بے سہارا — بے گھر"

امر کانپ اٹھا — ، مالا کی باتوں میں زہر گھلا ہوا تھا۔

"تو کیا — ؟!" وہ بات پوری نہ کر سکا — ادھورا سوال مالا کے لئے مکمل ہی تو تھا —

"ہاں امر! جس کی خاطر تم سے ناطہ توڑا تھا جس کے موہ نے ایک بیاہتا عورت کی زندگی میں زہر گھول کر اُسے محبت کی حسین دنیا کے رنگ دکھائے تھے وہ کوئی مستقل سہارا نہ تھا۔ جرمنی پہنچ کر ہم M.S کر رہے تھے کہ وہ کسی اور کی باہوں میں کھو گیا — اور رہ گیا ایک چہرہ — زخمی اور لہولہان۔ اسے ملا پچھتاوا — ادھ جلن" — وہ ایک دو پل کو رکی — نظریں نیچی کئے کئے ہی پھر بولنے لگی۔

"ایک بار جب پیروں تلے پھسلن آجاتی ہے امر تو انسان گرتا ہی چلا جاتا ہے سنبھل نہیں پاتا۔ چاہ کر بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کوئی اس گرنے کو سنبھالنا چاہے تو — اور بات ہے! تو ہاں! میں کہہ رہی تھی کہ تقدیر نے گن گن کر ایک ایک کر کے سارے بدلے لے لئے ہیں — ایک خطا کے جرم میں ان گنت سزائیں مل چکی ہیں مجھے — پردیس میں جب کوئی کسی کا اپنا نہ رہے...... تو وہ کتنا تنہا ہوتا ہے — کتنا بے آسرا! شاید تم یقین نہ کر سکو کہ غلط قدم اٹھانے کے فوراً بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا — اپنے کئے پر پشیمانی تھی — شرمندگی تھی — لیکن جو قدم اُٹھ چکا تھا وہ کیسے پلٹتا؟ زمانہ کیا کہتا امر!؟ —"

"تم اپنے گھر بھی آ سکتی تھیں مالا" — وہ چپکے سے بول اُٹھا —

"امر — !؟" ایک ناقابلِ یقین حیرانی اس کی آنکھوں میں سما گئی —

"تو — تو کیا — کیا تم مجھے قبول کر لیتے —" وہ آہستہ سے بولی۔

"شاید — اس لئے کہ گھر سے تم خود گئی تھیں میں نے نہیں نکالا تھا۔ اور جب کسی کو اپنے گناہ کا احساس ہو جاتا

ہنے تو اُسے خدا بھی معاف کر دیتا ہے "۔ امر نے رُک رُک کر ایک ایک لفظ تولتے ہوئے جواب دیا۔

مالا کے پژمردہ لبوں پر نڈھال سی مسکراہٹ آگئی۔ احساسِ گناہ اور شکست ہی نے تو مجھے تمہارے پاس آنے سے روکے رکھا۔ زندگی کو میں نے ایک عذاب کی طرح سہا ہے امر! حالانکہ میں ایک بلند مرتبہ ڈاکٹر ہوں۔ میری عزت، شہرت سبھی کچھ ہے —— لیکن ایک کمی ایک خلا کے سوا زندگی کچھ بھی نہیں —— مالا کی پلکوں پر دو آنسو آ ٹکے — جن کو اُس نے ہاتھ کی پشت سے پونچھ کر سر جھکا لیا ——

امر گم صم سا ٹوٹا بکھرا سا، اُسے تکتا رہا۔ کیا کہے؟ ایسا نہ کہے —— نفرت کی پرتیں ایک ایک کر کے اُترنے لگیں۔

"تم نے نہیں بتایا تم جا کہاں رہی ہو؟"

مالا نے آہستہ سے سر اٹھایا اور اس کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی —— "میری کوئی منزل نہیں ہے! —— لیکن ایک بار اُس دھرتی کی مٹی کو اپنی مانگ میں بھرنا چاہتی ہوں جہاں میرا سہاگ رہتا ہے"

امر سارے بدن سے کانپ اٹھا —— وہ ضبط کی چٹانوں سے پھسلتے پھسلتے بچا —— اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے مالا نے پوچھ لیا،

"میں نے سُنا تھا کہ —— کہ تم شادی کر رہے ہو"

امر مسکرانے لگا —— "شادی؟ او ہاں! کی تو تھی"

مالا کے چہرے پر کالی گھٹاؤں کا سایہ اُتر آیا ——

تب ہی امر بولا —— "شادی تو ایک بار کی تھی — تم سے!" پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا —— "بیاہ کے صرف تین مہینوں بعد جب تم M.D کے لیے بمبئی چلی گئیں اور وہاں پہنچ کر تم نے اُس بیوقوف سے منہ موڑ لیا جس سے تمہیں یہ گِلہ تھا کہ وہ تم سے والہانہ پیار نہیں کرتا —— اُسے محبت کرنا نہیں آتی —— وہ صرف ایک بے حس پتھر ہے —— صرف ایک محنتی ڈاکٹر ہے —— شوہر نہیں!! —— وہی بے حس پتھر —— تمہارا غم سینے سے لگائے زندگی بھر سلگتا رہا —— زمانے نے ہنسی اڑائی —— طنز کے پتھر پھینکے —— ماں نے دوسری شادی کی بار بار صلاح دی —— مگر —— مگر تمہارا پیار اُس سے بھلایا نہ گیا —— نہ میں تمہیں معاف کر سکا نہ ہی بھلا سکا!!"

"امر! خدا کے لئے کبھی اُس ناگن کو معاف نہ کرنا —— جس نے تمہیں جہنم کے غاروں میں دھکیل دیا ہے —— کبھی معاف نہ کرنا —— کبھی ——" وہ سسکنے لگی ——

اور تب امر نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر مالا کا ہاتھ تھام لیا

"مالا —— ہماری منزل قریب آ رہی ہے —— بنگلور میں ہمارا نرسنگ ہوم ہے "مالا نرسنگ ہوم" —— وہ کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہے"

"نہیں ——!!" وہ خوشی اور دُکھ کے گہرے ساگروں میں ڈوبنے اُبھرنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے موتی لُڑھکتے رہے اُس نے لرزتا کانپتا ہاتھ امر کے شانے پر رکھ دیا اور کھوئی ہوئی اپنائیت کا اِک گہرا احساس اس کی رگ رگ میں سرایت کرنے لگا۔

جہاز سانتا کروز کے ہوائی اڈے پر رُک چکا ہے امر مالا کا ہاتھ تھامے زینوں سے اُتر رہا ہے —— اُن کی منزل آ چکی ہے!!

▲▲

طاہر تلہری

یہ حادثہ بھی پھول کے اوپر گزر گیا
شبنم میں اپنی شکل کو دیکھا تو ڈر گیا

رازِ حیات و موت کا اظہار کر گیا
غنچہ چٹک کے پھول بنا اور بکھر گیا

بے پردہ وہ رہگذارِ نظر سے گزر گیا
یہ کون تھا جو مجھ کو گنہگار کر گیا

سایہ بھی اب نہیں ہے مرے اس کے درمیاں
بجھ کر چراغِ شام بڑا کام کر گیا

حیرت کی اک مثال ہوں دنیا کے واسطے
بگڑا میں اس طرح کہ زمانہ سنور گیا

تو لوحِ زیست پر تھا بس اک نقشِ ناتمام
میرا وجود ہی تری تکمیل کر گیا

کس کی مجال جو مجھے محبوس کر سکے
جھونکا ہوا کا ہوں ادھر آیا ادھر گیا

ہاتھوں سے بدنصیبی کی تحریر مٹ گئی
میں اس طرح گرا کہ مقدر سنور گیا

طاہر تعلقات میں آنے نہ دی کمی
وہ میرے گھر نہ آیا تو میں اس کے گھر گیا

▲▲

عشرت دھولپوری

کنوئیں میں سایۂ مہتاب ڈالتے کیوں ہو
شبِ الم کو مری تم اجالتے کیوں ہو

یہ روز روز کی تلقینِ صبر کیا معنی؟
جو پاسِ عہدِ وفا ہے تو ٹالتے کیوں ہو

جو جانتے ہو پلٹ کر ہمیں پہ برسیں گے
تو پتھر یہ تیری راہوں میں اچھالتے کیوں ہو

جو تم سے زلف بھی اپنی سنور نہیں سکتی
دلِ غریب کو الجھن میں ڈالتے کیوں ہو

نہ چھپ سکے گا غمِ دل کسی تبسم سے
ردائے گل مرے زخموں پہ ڈالتے کیوں ہو

▲▲

عین تابش

انجان صداؤں پہ کبھی کان نہ دھریے
اک بار تو اس غار کے سینے میں اتریے

بوسیدہ تعلق کا دھواں بن کے بکھریے
بے جان سی تصویروں سے اس درجہ نہ ڈریے

قبروں پہ اگ آئی ہے ہری گھاس کی کائی
ان دھندلی سی تصویروں میں اب رنگ بھی بھریے

ہنستے ہوئے لوگوں میں تو جی کھول کے ہنسیے
روتے ہوئے روتی ہوئی بستی سے گزریے

کچھ دوڑتے قدموں پہ عجب خوف تھا طاری
لوگوں نے پکارا تو بہت تھا کہ ٹھہریے

▲▲

اجیت کور
نعیمہ کوثر

گل بانو

خوش دل خاں گارڈ کی بیوی گل بانو کی بات اڑوس پڑوس کے بیسوں گاؤں میں ایک کہاوت کی طرح مشہور تھی۔ لمبے قد کی پٹھانی، چہرہ جیسے دودھ کا کٹورا۔ سنگ مرمر کا تراشیدہ بدن۔ حسین اتنی کہ پریاں دیکھ لیں تو بس شرم سے منہ چھپالیں۔

لیکن ہر ایک پری کو کوئی نہ کوئی دیو اپنے پتھروں کے قلعے میں چھپا کر رکھتا ہے۔ خوش دل خاں گارڈ نے بھی اپنی بیوی کو اسی طرح چھپا کر رکھا تھا۔ یہی پٹھان نہ جانے کیوں اپنی بیویاں کو چھپا کر رکھتے تھے جیسے وہ اپنی بیویوں کو بیاہ کر نہیں بھگا کر لائے ہوں۔ لیکن خوش دل خاں گارڈ کی بیوی کی پرچھائیں بھی کسی مرد نے نہیں دیکھی تھی۔

موسم بہار میں گاؤں کی عورتیں گروہ بنا کر ایک ساتھ ضرورت کی چیزیں خریدنے شہر جایا کرتی تھیں۔ گاؤں کی ہر عورت اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتی تھی۔ برقعہ میں جب وہ سنور کر نکلتیں تو لگتا بادلوں کی اوٹ سے چاند نکل آیا ہے۔ آگے آگے ڈھول ہوتا۔ پٹھان دور سے ہی ڈھول کی آواز سن کر راستہ چھوڑ دیتے۔ جب وہ گاؤں سے باہر نکل جائیں اور کسی کی نگاہ پڑنے کا خطرہ دور ہو جاتا تو ہر برقعے سے خوبصورت چاند نکل پڑتا اور پھر ان کے مہندی رچے چاندی کی پازیبوں والے خوبصورت پاؤں ڈھول کی تال کے ساتھ ناچ ناچ کر باورے ہو جاتے اور کتنے مہینوں منٹوں اور ملپوں کی رگ رگ کر دوڑ کر لگائی گئی ساری تیدحشموں کی طرح ان کی ایڑیوں سے نکل جاتی اور گداز کولہوں کی لچک میں بہہ جاتی۔

اور اس طرح گاؤں کی عورتیں جب ہوتی رہتیں تو ٹی کے اس طرف اور ٹولی کے اس طرف اور جب وہ خوش دل خاں گارڈ کے گاؤں گذشتہ سوات پہنچیں تو ایک ہوک سی ان کے کلیجے میں اٹھتی اور ایک عجیب سا درد گل بانو کے کلیجے میں سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا۔ گذشتہ سوات کی ساری عورتیں ان کے ساتھ ہو جاتیں، لیکن خوش دل خاں گارڈ نے اپنی بیوی کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت کبھی نہ دی۔

پھر ساری عورتیں ایک ساتھ خوش دل خاں گارڈ کے یہاں پہنچتیں۔ اس تجربے میں سید چھپا کے گھر ——— اور پھر وہ گل بانو کے آنگن میں ناچتیں، ڈھول بجاتیں اور پھر سیب، امرود، خوبانیاں، انگور، مصری بانٹی جاتی اور پھر ان کے دلنواز قہقہوں سے سارا آنگن گونج اٹھتا ———

گل بانو کے حسن کو دیکھ کر ان کے دلوں میں ایک کسک سی ہوتی۔ انہیں محسوس ہوتا دل میں گھرے ہوئے بادل بن برسے ہی چھٹ گئے۔ آنگن میں ڈھول کی خوش کن آواز بھی گونجتی لیکن اس آواز میں ایک کرب ہوتا ایک درد ہوتا۔ پٹھانیاں بھی ناچتیں لیکن ان کی ایڑیوں میں درد کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔

گل بانو کا درد ایک ستار کی طرح تھا جس کے دل میں اتھاہ غم تو ہوتے ہیں لیکن اس کے تار سے نکلی ہوئی دھن میں ایک دلفریب جادو ہوتا ہے ایک نغمگی ہوتی ہے لیکن ستار کے دل پر کیا گزرتی ہے یہ کب کسی نے جاننے کی کوشش کی ہے۔ اس کو صرف روح کی گہرائیوں سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

عورتیں اپنی راہ چل دیتیں اور ان کے جانے کے بعد گل بانو کو محسوس ہوتا جیسے ان دیواروں کے تپتے تنور میں اس کی زندگی بھسم ہو کر راکھ کا ڈھیر بن جائے گی۔

خوش دل خاں گارڈ کے ساتھی اس کو مشورہ دیتے کہ وہ بھی اپنی بیوی کو ان عورتوں کے ساتھ باہر جانے کی اجازت دے دیا کرے۔ جانوروں کی بھی رسی کبھی کبھی ڈھیلی کر دی جاتی ہے اور انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے اور گل بانو تو ایک انسان ہے ایک دن وہ

ان دیواروں کے بیچ گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔

لیکن خوش دل خاں گارڈ پر ان لوگوں کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ جب کبھی عورتوں کا غول خوش دل خاں گارڈ کے یہاں پہنچتا غصّے کی ایک زبردست لہر اُس کے چہرے پر چھا جاتی اور اس کا اثر اس کی ڈیوٹی پر رہتا۔ وہ اُن عورتوں کو بغیر سوچے سمجھے برا بھلا کہہ دیتا۔ اسٹیشن پر اپنے ماتحتوں سے خفا رہتا نوکروں کو جھڑک دیتا۔ بچوں کو دھکا دیتا۔ بیوی سے منہ پھلائے رہتا اور پھر گھر کے برتنوں کو توڑ پھوڑ کر اپنے دل کا غبار نکالتا پھر جیسے جیسے دن گذرتے رہتے غم و غصہ کی گھٹا چھٹ جاتی اور زندگی حسب معمول پہ آجاتی۔ لیکن گل بانو اپنی رنگ زار ستی میں خواب شیریں کی جستجو میں بھٹکتی رہتی۔ ان دیواروں کے تنہائی میں آوارہ پھرتی رہتی۔

خوش دل خاں گارڈ کے گھر چندن دودھ دینے والا آیا کرتا تھا برسوں سے اس کے یہ روز کا معمول تھا۔ لیکن اُس کی پیاسی آنکھیں گھر کے آنگن میں کچھ تلاش کرتی رہتیں۔ لیکن گل بانو اُسے کبھی دکھائی نہیں دی۔

اور ایک دن ....

چندن نے ابھی دودھ کی بالٹی لاکر رکھی ہی تھی کہ آنگن سے گل بانو گذری۔ چندن کو اُس نے نہیں دیکھا۔ لیکن چندن نے اُس کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ لی۔ اُسے محسوس ہوا گل بانو کسی سنگ تراش کا ایک حسین شاہکار، کسی کلاکار کی انمول تخلیق اور ایک شاعر کی حسین پرواز تخیل کا کمال ہے۔

چندن جہاں بیٹھتا جہاں جاتا اور جدھر سے گذرتا گل بانو کی باتیں ضرور کرتا اُس کا چہرہ ایسا تھا۔ چال ایسی تھی ...... کپڑے اس رنگ کے تھے .... زیور ...... اُس کے ہاتھ ...... چلتے چلتے اُس کے پاؤں ...... !

چندن کو محسوس ہوتا اس کی زندگی کے اندھیرے آکاش پر جیسے بجلی نے لپکا ایک روشنی کی برسات کر دی ہے۔ گل بانو نے چندن کی طرف دیکھا بھی نہ تھا لیکن چندن کو محسوس ہوتا ایک خوبصورت خوابوں کا پرندہ اُس کی بغل میں آ بیٹھا ہے اور اُس کے نرم نرم پنکھوں خوبصورت تخیل اور حسین آشائیں اپنی ننھی ننھی باریک پروں سے لمبی گردن نکال کر معصوم اور بے خطر آنکھوں سے اُس دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ اس آکاش کو اس دھرتی کو اپنی معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہے جو لاکھوں برس پرانی ہے لیکن آج بھی پیتے دودھ کی طرح میٹھی، ان ہی کے لیے بنی ہے۔ صرف ان ہی کے لیے ———

گل بانو کی صرف ایک جھلک ——— اور چندن شہزادہ بن گیا ——— گل بانو کی صرف ایک جھلک نے چندن کے دل کو اتنا وسیع اور پھیلا ہوا بنا دیا کہ زمین و آسمان دونوں اس میں سما جائیں اور خوش دل خاں گارڈ گل بانو کا ساتھ پاکر بھی پتھر بنا رہا اور گل بانو کے خوش دل خاں کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی اُس کے درمیان صدیوں کا فاصلہ تھا اور چندن جو گل بانو سے دور رہتے ہوئے بھی اُس سے بہت قریب تھا۔

ایک دن گل بانو کو اس کی ایک سہیلی نے بتایا کہ اُس کے یہاں دودھ دینے والا چندن ہر جگہ اس کی خوبصورتی کی تعریفیں کیا کرتا ہے۔

دوسرے دن گل بانو نے دروازے کی دراڑ سے چندن کو دیکھا۔ دودھ کی دھار چندن کی بالٹی سے نکل کر اُس کی بالٹی میں گر رہی تھی اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی تپتی ہوئی زندگی میں دودھ کی نہر پھوٹ پڑی ہے۔

گل بانو کے پاؤں گھر کے آنگن میں ناچنے کے لیے پاگل ہو اٹھے۔ ہونٹوں پر خوبصورت گیت مچلنے لگے اور آنکھوں میں خمار سا چھانے لگا۔ اُس کی زندگی کے آنگن میں چندن کی یاد کا ایک حسین گلاب لہلہانے لگا اور اُس کی پچھلی گذری ہوئی بے کیف زندگی بھی خوشبوؤں سے معطر ہوگئی ——— اُس کے حسن کے سیپ میں ایک بوند پڑی اور عشق کا سچا موتی بن گئی۔

اور جب اس بار گاؤں کی عورتیں ناچتی گاتی ڈھول کی تھاپ پر اُس کے گھر آئیں تو ڈھول بھی خوشی سے کھنک اٹھا اور گل بانو بھی پھول کی طرح کھل اٹھی۔ گاؤں کی عورتیں گل بانو کو خوش دیکھ کر بے حد مسرور ہوئیں اور گاؤں سے دور ندی پر نالے کے کنارے اپنی بھینسوں کو نہلاتا ہوا چندن بے حد

[illegible] تھا لیکن اگر کوئی رنجیدہ اور غمگین تھا تو وہ خوش دل خاں۔ [illegible] سے لوگوں کی باتیں ہواؤں کے دوش پر اڑتی ہوئی خوش دل خاں کے کانوں سے ٹکرائیں ——— اور اس کا خون کھول اٹھا غصے میں اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور جب وہ گھر پہنچا گل بانو کمرے سے کپڑے دھو [illegible] اور [illegible] لی تھا پر [illegible] [illegible] رہی تھی۔

خوش دل خاں نے وہیں [illegible] چھین کر اس کی پیٹھ پر [illegible] ——— [illegible]

[illegible] تجھے [illegible] نہیں [illegible]

وہ اس کی بانہہ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا آنگن میں لے آیا ———

"بتا کیا چندن والی بات سچی ہے ———"

گل بانو خاموش تھی ایک خاموش سمندر کی طرح ——— [illegible] اس حقیقت [illegible] جھوٹ [illegible] کہتی۔

[illegible] دل خاں غصے میں [illegible] ہوا آگے [illegible]

آیا "[illegible] تجھے تیرے بندن سے ملا [illegible]"

اس نے [illegible] گل بانو کو گلی میں پھینک دیا۔ گل بانو [illegible] ایک [illegible] دیوار سے ٹکرا کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

گل بانو کی آواز سن کر اڑوس پڑوس سے لوگ جمع ہوگئے اور [illegible] خوش دل خاں کو خیال آیا کہ اس کی بیوی تو [illegible] گلی میں پڑی ہے اور سب لوگ اسے دیکھ رہے ہیں ———

[illegible] وہ نیچے آیا اندر سے ایک موٹی سی چادر ڈھونڈ کر گلی کی طرف بڑھا اور جھٹ پٹ اس نے چادر گل بانو کے منہ پر [illegible] دی ———

▲▲

بزمِ احباب

میکش اکبر آبادی (آگرہ)

تحریک کا "بسمل سعیدی نمبر" موصول ہوا۔ یہ نمبر ہر حیثیت سے بہتر بلکہ بہترین ہے۔ کتابت، طباعت اور سائز وغیرہ محاسنِ صوری کے علاوہ آپ نے چوٹی کے قلمکاروں اور اربابِ علم کے اتنے اچھے مضامین جمع کر دیے ہیں کہ اس سے بہتر کا تصور مشکل ہے۔ بذاتِ خود یہ ایک مستقل تصنیف ہے جس کی پذیرائی دانشوروں کے حلقوں میں کی جائے گی اور سچ پوچھیے تو بسمل صاحب کے کلام کا مطالعہ بغیر اس نمبر کے نامکمل رہے گا۔ اس کارنامے پر آپ بسمل صاحب کے قدر دانوں کے علاوہ تمام اہلِ علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔

نثار احمد فاروقی (دلی)

تحریک کا "بسمل سعیدی نمبر" مل گیا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ اگر اس نمبر کی تعریف کروں تو اس کی بالواسطہ چھوٹ خود اپنی جانب پر بھی پڑے گی کیونکہ آپ نے آغاز ہی میں میرا مضمون رکھا ہے اور وہیں سے بسمل سعیدی نمبر کا تاثر بننا شروع ہو جاتا ہے۔ بسمل سعیدی کے پاس نہ طبل و علم ہے نہ ملک و مال نہ کوئی خطاب یا عہدہ وہ لے سکتے ہیں نہ دے سکتے ہیں۔ نہ اُن کا نام ایسا نکلا ہوا ہے کہ آپ ان کا نمبر نکال کر رقم بٹور لیں۔ غرض یہ کہ خود غرضی کی اس دنیا میں بسمل سعیدی کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے گا وہ خالصۃً لوجہ اللہ، محض بربنائے خلوص و محبت اور بطور اعترافِ خدمات ہی ہوگا۔ آپ کے لیے اور بہت سی بڑی شخصیات ہو سکتی تھیں جن کو جھنڈے پر چڑھا کر آپ پیدا و پنہاں فوائد حاصل کرتے لیکن بسمل سعیدی کو خراجِ تحسین پیش کر کے آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ کسی فن کار کی ادبی خدمات کا اعتراف بغیر کسی غرض یا لالچ کے بھی کر سکتے ہیں اور اعتراف بھی کیسا شائستہ اور بھرپور ہوا ہے۔ مجھے سارے نمبر میں ترتیب کا سلیقہ ملا مضامین کے بلند معیار اور سنجیدہ ہونے کا احساس ہوا اور اختصار کے باوجود جامعیت نظر آئی۔ سطحیت یا سستی شہرت والی کوئی ادا نہیں تھی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، میکش اکبر آبادی، رشید حسن خاں، مظفر حنفی، کرامت علی کرامت، عنوان چشتی، ساحر ہوشیارپوری، اسلم پرویز، ڈاکٹر نور الحسن انصاری، سید فضل المتین، مخمور سعیدی — اتنے نام کسی فہرست میں نظر آئیں تو پھر بھی وہ معتبر، مستند اور لائقِ رشک نہ ہوگی؟

مجھے کم و بیش ۲۴-۲۵ سال سے بسمل صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل ہے اور اسی دہلی میں شاید ۱۰-۱۲ برس روزانہ بلا ناغہ کئی کئی گھنٹے اُن کے ساتھ گزارے ہیں۔ ان کی شخصیت سے کتنا گہرا تعلق ہوگا اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بسمل سعیدی نمبر شائع کر کے آپ نے مجھے ذاتی طور پر ممنون کیا ہے اس لیے آپ کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہو جاتا ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے بقولِ غالب

"دکان بے رونق کے خریدار" ہو

پرکاش فکری (رانچی)

ادارہ تحریک مستحقِ صد تحسین و ستائش ہے کہ اس نے بسمل سعیدی نمبر نکال کر قدر دانی فن و فنکار کی ایک گراں قدر مثال پیش کی۔ اُردو ادب میں مردہ پرستی ایک شعار بن چکی تھی۔ مگر حالیہ چند برسوں سے لوگوں نے فنکار کی زندگی ہی میں اس کی خدمات کا اعتراف کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اس سلسلے میں متعدد رسالوں نے مختلف ادیبوں پر اپنے خصوصی نمبر نکال کر اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے مگر عموماً ان نمبروں میں مضامین کی اتنی زیادہ بھرمار ہوتی ہے کہ متعلقہ ادیب کے فن اور اس کی شخصیت

کی کوئی منضبط تصویر ابھر نہیں پاتی۔ اس کے برعکس تحریک کا یہ نمبر اپنے مقصد میں بجد کامیاب ہے۔ بسملؔ سعیدی صاحب کی شخصیت اور اُن کے فن پر لکھی ہوئی تمام تحریریں وحدت تاثر کی ایک عمدہ مثال ہیں۔

بدلتے ہوئے مزاج اور رجحانات کے دباؤ میں آکر کلاسیکی انداز فکر سے ہمارا رشتہ ٹوٹ رہا ہے۔ اور ہم اپنی وراثت سے بےنیاز ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بسمل سعیدی صاحب کلاسیکی شعرا کے سلسلے کی تقریباً آخری کڑی ہیں۔ اور ان کی بازیابی ضروری تھی۔

آدمی لاکھ مشینی ہو جائے اور مشینیں لاکھ ہم پر حاوی ہو جائیں لیکن آفتاب، ماہتاب، یہ کہکشاں، ستاروں کی یہ محفل تو اسی طرح جگمگاتی رہے گی۔ سوگوار شاموں کا طلسم اور پھوٹتی ہوئی سحر کے رنگ تو دلوں پر اسی طرح اثر انداز ہوتے رہیں گے، ہم اسی طرح لباس تبدیل کرتے رہیں گے۔ آدمی کے اندر چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش اسی طرح نمو پذیر ہوتی رہے گی۔ اور اس خواہش کے تحت وہ جذباتی حادثوں اور واردا توں کا شکار بھی ہوتا رہے گا۔ ایسے میں ان آوازوں اور صداؤں کی طرف لوٹنا ہی ہوگا۔ جو ایسے عالم میں اسے تسکین دے سکیں تھوڑا سا سکون دے سکیں۔

بسمل سعیدی کی شاعری ایسی ہی صداؤں اور آوازوں کا حصہ ہے جس کی ضرورت تمام تغیر و تبدل کے باوجود زمانہ محسوس کرتا رہے گا

آکے دنیا میں انقلاب کوئی
دل کی دنیا بدل نہیں سکتا

مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی (بمبئی)

تحریک کا "بسمل سعیدی نمبر" ملا۔ اور میں نے اسی وقت پڑھنا شروع کر دیا۔ نثر کا حصہ تو تقریباً پورے کا پورا پہلے دن ہی پڑھ ڈالا۔ جس کے مطالعہ سے ذاتی بے خبری کے بہت سے پردے اٹھ گئے۔

جناب بسملؔ سعیدی ایک قادر الکلام شاعر ہیں خصوصیت سے غزل خوب کہتے ہیں۔ "تحریک" جہاں اور رنگا رنگ شاعروں کا کلام شائع کرتا رہتا ہے وہاں دو "سعیدیوں" کا کلام بھی شایع ہوتا ہے جو بہ تخلص "بسمل و مخمور" دادِ سخنوری دیتے ہیں۔ یہ تو اس خاص نمبر سے کھلا کہ دونوں میں استاد و شاگرد کا رشتہ ہے۔

جناب نثار احمد فاروقی نے حضرت بسملؔ کے خاندانی حالات بیان کرکے تاریخ کے ایک خاص ورق کو دہرایا ہے جیسا کہ فاضل فاروقی نے بیان کیا یہ واقعات اور کتابوں میں بھی جلی حرفوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں۔ نواب سید صدیق حسن خان قنوجی بھوپالی مرحوم نے "ابقاء المنن" نام کی کتاب میں جو گویا موصوف کی آپ بیتی ہے مولانا سید محمد علیؒ کے قنوج میں آنے اور وعظ فرمانے کے ذکر میں ایک مصرع نقل کیا ہے جو سید موصوف نے اثناء بیان میں پڑھ کر جادو جگایا تھا مصرع یہ ہے ؎

ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

مجھے اس خاندان کے بزرگوں سے عقیدت رہی ہے بعض ٹونکی فضلا سے تعلقات نیازمندانہ کے علاوہ میری ابتدائی فارسی تعلیم بھی ایک ٹونکی بزرگ مولوی عبد الوالی غمگین کی مرہون احسان ہے۔

حضرت بسمل سعیدی کے کمالِ فن پر ملک کے مسلمہ علماء ادب نے بہت کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ کوئی کیا لکھے گا۔ ہاں مخمور سعیدی صاحب نے اپنے مضمون میں دو واقعے ایسے نقل کیے ہیں جنھیں پڑھ کر حضرت بسمل سعیدی کی جودتِ طبع اور مہارت فن کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ جناب مخمور راوی ہیں کہ ایک بار لال قلعہ میں جشن جمہوریت کی تقریب میں جناب فراقؔ گورکھپوری نے غزل پڑھی جس کا مقطع تھا ؎

فراقؔ گرم سخن ہے مذاق بند کرو
وہ دیکھو ہو گئے سنجیدہ سب در و دیوار

بسملؔ صاحب مائک کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے دوسرا مصرعہ اس طرح دہرایا :۔

وہ دیکھو ہو گئے سنجیدہ ثابت و سیار"

"در و دیوار" کی جگہ "ثابت و سیار" نے شعر کو زمین سے آسمان پر پہونچا دیا۔ گمان غالب ہے کہ حضرت فراقؔ نے اگر سنا ہوگا تو اصلاح کا دل ہی میں شکریہ ادا کر کے اسے بہ نظر استحسان دیکھا ہوگا۔

دوسرا واقعہ حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے متعلق ہے اس کے راوی بھی مخمور سعیدی ہی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ :۔

"ایک بے تکلف محفل میں جوش صاحب حسب عادت غزل اور غزل گو شاعروں کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ بسملؔ صاحب نے کہا جوش صاحب آپ کی طبیعت سوز و گداز سے خالی ہے غزل ان کا تقاضہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ غزل پسند نہیں کرتے۔ جوش صاحب نے کہا نہیں صاحب! ہماری

طبیعت میں تو بڑا سوز و گداز ہے اور ثبوت میں اپنی کسی نظم کا یہ شعر پڑھا ؎

میرے رونے کا جس میں قصہ ہے عمر کا بہترین حصہ ہے

بسمل صاحب نے جوش صاحب کی طرف دیکھا اور کہا: "خدا کی قسم بچپن پر اس سے اچھا شعر آج تک سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا۔"

ایس۔ اے۔ رحمٰن (نئی دلی)

"بسمل سعیدی نمبر کی اشاعت کے لیے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ بسمل سعیدی اُردو کی ان قدآور ادبی شخصیتوں میں ہیں جنھوں نے اُردو شاعری میں گراں قدر اضافے کیے ہیں اور جن کی ادبی خدمات کو اُردو ادب کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ مطالعے، مشاہدے اور پھر اپنے تجربات و نظریات کو صفحۂ قرطاس پر اس لہجہ اور اسلوب میں پیش کر دینا کہ اپنی کہانی روداد جہاں معلوم ہونے لگے یہی وہ خوبی ہے جو شاعر کو عظیم بناتی ہے۔ بسمل صاحب نے اگرچہ نظمیں بھی کہی ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں اور یہ بات سچ ہی ہے ؎

جس شخص کی بسمل سے ملاقات ہوئی ہے
وہ شخص محبت کے پیمبر سے ملا ہے

بسمل صاحب سراپا محبت ہیں۔ جانے پہچانے کی تو بات ہی الگ ہے، اجنبی بھی اگر بسمل صاحب سے ملتا ہے تو ان کی محبت اور شفقت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے بسمل صاحب سے ملاقات کا شرف بہت کم ملا ہے لیکن چند بار کی ملاقات بھی یادوں کا وہ انمول خزانہ ہے، جہاں بسمل صاحب کی شفقت بھری مزاج پرسی اور محبت بھرا لہجہ گونجتا رہتا ہے۔

تحریک نے "بسمل نمبر" شائع کر کے ایک بڑی ادبی ذمہ داری نباہی ہے اور 'مردہ پرستی' کے دور میں زندگی کو سرخرو کیا ہے۔ بسمل صاحب کی زندگی اور شاعری پر کام کرنے والوں کے لیے یہ نمبر ہمیشہ نشانِ راہ بنے گا۔

حرمت الاکرام (مرزا پور)

بسمل سعیدی نمبر کا کیا کہنا! آپ نے بسمل صاحب کی قدر شناسی کا حق بڑی خوش سلیقگی سے ادا کیا ہے جس کی مبارکباد لازمی ہے۔ اس نمبر میں بسمل صاحب کی شخصیت و شاعری سے متعلق خاصا مواد یکجا کر دیا گیا ہے جو بہر طور قابلِ قدر ہے۔ علاوہ ازیں کلام کا انتخاب بھی لائقِ تحسین ہے۔ بسمل سعیدی نمبر کی کامیابی اور مقبولیت کے پیشِ نظر اسے مناسب اضافہ کے بعد کتابی شکل دینے کی خبر مسرت انگیز ہے۔

محمود خاور (حیدر آباد)

"بسمل سعیدی نمبر" ملا۔ بیحد خوبصورت، بامعنی، دیدہ زیب اور بھرپور مضامین نظم و نثر سے آراستہ نمبر نکالا گیا ہے۔ اراکین ادارۂ تحریک قابلِ مبارکباد ہیں کہ مردہ پرستی کی روایت کو درگور کر دیا۔

یوسف جمال (راج گانگ پور)

ہمارا ملک تو مردہ پرست ملک ہے۔ آپ نے اس قول کا سر قلم کر کے "بسمل سعیدی نمبر" نکال کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ایسا باوقار اور بھاری بھرکم خاص نمبر دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ آپ نے بسمل سعیدی صاحب کے شایانِ شان نمبر نکال کر شعر و ادب سے اپنی بے لوث محبت کا بیّن ثبوت فراہم کیا ہے۔ گوناگوں خوبیوں سے مزیّن یہ خوبصورت نمبر نکالنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

بدیع الزماں خاور (داپولی)

بسمل سعیدی نمبر دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی۔ آپ نے اُردو غزل کے ایک بے مثال شاعر اور استادِ فن کو اس کی زندگی ہی میں خراجِ عقیدت پیش کر کے 'ایک اور روایت کو توڑ دیا ہے۔ نمبر ہر اعتبار سے قابلِ داد ہے۔ میری طرف سے اس کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

حبیب کیفی (جودھپور)

تحریک کا بسمل سعیدی نمبر توقعات سے زیادہ خوبصورت اور جاندار ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آپ کا ایک شاندار کارنامہ ہے۔ بسمل صاحب کی شخصیت اور فن پر مضامین پُرمغز اور دلچسپ ہیں۔ اُردو دشمنی کے دور میں ایسا کارنامہ انجام دینا واقعی جگر گردے کا کام ہے۔ آپ کے مخالف بھی آپ کا لوہا مانتے ہیں (حاسد النظر بد سے بچائے!) آپ اب اسے کتابی شکل میں شائع فرما رہے ہیں' اس سے

یقیناً اہلِ ادب اور محققوں کی رہنمائی ہوگی۔

سید غلام مرتضیٰ (بہار شریف)

"بسمل سعیدی نمبر" باصرہ نواز ہوا۔ ترتیب و تنظیم دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ آپ نے یہ خصوصی نمبر شائع کرکے اُردو ادب کی ایک گرانقدر خدمت انجام دی ہے اور یہ نمبر اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بسملؔ سعیدی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی شاعری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ انھوں نے زندگی کے پیچ و خم سے بھرے تجرباتِ حاصل کیے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری ہمیں میرؔ کی یاد دلاتی ہے۔ میرؔ کی طرح بسملؔ سعیدی کی شاعری بھی داخلی و خارجی جذبات و احساسات اور مشاہدات و تجربات کا مرقع ہے۔

اسلام پرویز (سیتامڑھی)

تحریک کا تازہ شمارہ "بسمل سعیدی نمبر" بدست ہوا۔ ہر لحاظ سے پسند آیا۔ میں ادارۂ تحریک کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خاص طور پر مخمورؔ صاحب کا مضمون "بلاجی" بہت پسند آیا اور بہت کچھ بسمل صاحب اور مضمون نگار کے متعلق جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اور بھی مضامین پسند آئے مثلاً کرامت علی کرامت، نثار احمد فاروقی اور ساحر ہوشیارپوری کے مضامین بڑے معلوماتی ہیں۔

غزلوں میں گوپال متلؔ، کمار پاشی، عقیل شاداب اور مخمور سعیدی کی غزلیں بہت اچھی لگیں۔ سچ جانیے غزلوں کو پڑھنے کے بعد گھنٹوں سوچتا رہا۔ کاش! میں بھی اتنی اچھی غزلیں کہہ پاتا

اگر سنائیں بھی یاد کرے گا کون اسے

چمن کا رنگ جو دورِ خزاں سے پہلے تھا　　(گوپال متلؔ)

تعیّناتِ زمان و مکاں سے پہلے تھا

مرا وجود، مرے جسم و جاں سے پہلے تھا　　(مخمور سعیدی)

مرے لیے ہی کہیں جگمگا رہا ہوگا

ترا مکاں جو رہِ بے نشاں سے پہلے تھا　　(کمار پاشی)

گھرا ہوا تھا میں نرغے میں دشمنوں کے مگر

کوئی خیال مجھے فکرِ جاں سے پہلے تھا　　(عقیل شاداب)

واقعی آپ نے یہ ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو سالہا سال تک یاد رہے گا۔

نثار اعظمی (لکھنؤ)

بسملؔ سعیدی نمبر ہر لحاظ سے خوب ہے۔ اچھے ناقدین اور فنکاروں کے مضامین نے اس کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اور یہ انشاء اللہ ایک تاریخی نمبر ثابت ہوگا۔ نثار احمد فاروقی کا مضمون پڑھ کر میں بسملؔ صاحب سے بے حد متاثر ہوں اور ان کی شخصیت اور فن کے مطالعہ کے لیے اپنے اندر ایک عجیب ذوق و شوق محسوس کر رہا ہوں۔

ندرت نواز (امروہہ)

تحریک کا بسمل سعیدی نمبر دیکھنے کو ملا۔ یوں تو میں ابھی اسے مکمل نہیں پڑھ سکا ہوں لیکن جتنا پڑھ سکا ہوں اس میں مخمور سعیدی کے مضمون نے مجھ پر بڑا گہرا تاثر چھوڑا ہے۔ کم فرصتی کے باوجود میں اس مضمون کو دوبارہ پڑھنے سے اپنے آپ کو نہیں روک سکا۔ مضمون میں جس تسلسل اور دلچسپ انداز کے ساتھ کچھ واقعات کو پیش کیا گیا ہے وہ دل کو چھوتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور بسمل صاحب کی مکمل شخصیت سامنے آجاتی ہے۔

جلال اختر (گلبرگہ)

جنوری کے تحریک میں گلبرگہ کے موجودہ ادبی ماحول پر جبّار جمیل کے مضمون کو میں گلبرگہ والوں کے لیے نئے سال کا تحفہ سمجھتا ہوں۔ آج تک کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی تھی کہ اس تاریخی شہر کے ادبی گوشوں پر روشنی ڈالے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر جبّار جمیل صاحب فرداً فرداً ہر نئے رائٹر پر ایک تفصیلی مضمون لکھیں۔

مضمون میں صرف انہی قلم کاروں کا ذکر ہے جن کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس سے ہٹ کر دیکھیں تو گلبرگہ میں اور کئی قلم کار ایسے نظر آئیں گے جو زندگی اور ادب کے نئے تقاضوں کی عکاسی کرتے ہیں، مگر جن کی تخلیقات نہیں شائع ہوئیں۔ آخر ان گم نام لوگوں کو کون پوچھے گا؟

بقیہ : انگولا میں غیر ملکی مداخلت

اتحاد کا امکان موجود تھا لیکن سوویٹ یونین نے صرف ایک دھڑے کی حمایت کر کے اُسے باقی دو دھڑوں کے خلاف اکسا کر خانہ جنگی شروع کرا دی۔

جہاں تک کیوبا کا معاملہ ہے، اسے انگولا میں مداخلت سے کوئی براہِ راست فائدہ پہنچے گا یہ بات کافی محل نظر ہے۔ لیکن اتنے زیادہ غیر کمیونسٹ ممالک کی دشمنی مول لینا اس کے قومی مفاد کے منافی ضرور ہے۔

بہر حال جہاں تک انگولا کے مسئلے کے امکانی حل کا سوال ہے ہر صاحبِ نظر کو مسز تُوری بی مکرجی کے اس مطالبے سے اتفاق ہو گا کہ اس ملک سے تمام غیر ملکی فوجوں کا اخراج ضروری ہے۔ اس مطالبے پر افریقی ممالک بھی متحد ہو سکتے ہیں اور اُن کی تنظیم بھی نفاق سے بچ سکتی ہے۔ غیر ملکی فوجوں کے اخراج کے بعد انگولا میں تینوں دھڑوں کی ملی جلی حکومت کا قیام آسان ہو جائے گا۔ اس طرح انگولا خانہ جنگی سے بھی بچ جائے گا اور وہاں ایک پائیدار قومی حکومت بھی قائم ہو سکے گی۔

بقیہ : باوردی خاتون

دیتیں جیسا دوسروں نے کیا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ ڈرائیور صبح سے کام پر ہے، بچارہ ہمارے لیے کتنی مشقت کرتا ہے۔"

باوردی خاتون ہم سب سے مطالبہ کر رہی تھی کہ ہم اس کی فراخدلی اور مہربانی کی تعریف کریں۔

"تم دیکھ رہے ہو، میں کیسی خاتون ہوں"

لیکن یہ باوردی خاتون تھی کیسی؟ صرف ایک رشوت خور کی شریک کار۔

OO

جو ہم میں نہیں رہے

۲۷ جنوری کی دوپہر کو ساحر ہوشیارپوری صاحب نے فون پر یہ رنجیدہ خبر سنائی کہ ان کے استاد اور اُردو کے مشہور اور محترم شاعر جناب جوش ملسیانی کا نکودر میں انتقال ہوگیا۔

جوش صاحب یکم فروری ۱۸۸۴ء کو پنجاب کے ایک دُور افتادہ مقام ملسیان، ضلع نکودر میں پیدا ہوئے۔ شعر گوئی کا ذوق انھیں اوائل عمر سے تھا اور انھوں نے اپنی عمر کا دو تہائی سے زیادہ حصہ اُردو شعر و ادب کی خدمت میں گذارا۔ اہلِ پنجاب میں اُردو شاعری کا ذوق پیدا کرنے اور اس ذوق کی ترویج و توسیع کرنے والوں میں ان کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ پنجاب کے بہت سے شاعر جن میں سے کچھ کو ہندوستان گیر شہرت ملی، ان کے حلقۂ تلامذہ میں رہے ہیں اور سر عبدالقادر اور مولانا صلاح الدین احمد جیسے اُردو زبان و ادب کے پارکھوں نے ان کی شاعرانہ فضیلت اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

جوش ملسیانی صاحب داغ دہلوی کے شاگرد اور انھیں کے رنگِ سخن کے علمبردار تھے۔ زبان کا چٹخارا اور بیان کی صفائی ان کے لیے شاعری کے یہ دو ایسے وصف تھے جنھیں انھوں نے خود بھی ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اپنے شاگردوں کو بھی ان کی پاسداری کی تلقین کرتے رہے۔ ان کے کلام کے چار مجموعے شائع ہوئے: بادۂ سرجوش، جنون و ہوش، فردوسِ گوش اور نغمۂ سروش جو صرف رباعیوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے کلامِ غالب کی شرح بھی لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔

۱۹۵۷ء میں جوش صاحب کے معتقدوں اور مداحوں کی طرف سے انھیں ابھینندن گرنتھ پیش کیا گیا اور اس کے چند برس بعد حکومتِ ہند نے انھیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا تھا۔

مشہور شاعر جناب عرش ملسیانی جوش صاحب کی زندہ یادگار ہیں، ان کے علاوہ تین صاحبزادیاں بھی بقیدِ حیات ہیں۔ عرش ملسیانی صاحب کا قیام دلّی میں ہے، انھوں نے بہت چاہا کہ جوش صاحب دلّی آکر ان کے ساتھ رہیں لیکن جوش صاحب نے ضعیف العمری، بیماری اور تنہائی کے باوجود اپنے آبائی قصبے کو خیرباد کہنا قبول نہ کیا اور وہیں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے۔

∞

انیس احمد عباسی اُردو کے بڑے پرانے صحافی تھے۔ انھوں نے ۱۳ نومبر کو اپنے وطن سے دُور کراچی کے ایک ہسپتال میں وفات پائی جہاں وہ اپنے ایک بیٹے سے ملنے گئے تھے ——— عباسی صاحب نے صحافتی زندگی کا آغاز "ہمدم" لکھنؤ سے کیا اور جالب دہلوی کے رفیقِ کار رہے۔ پھر انھوں نے خود ایک روزنامہ "حقیقت" کے نام سے جاری کیا جسے انھوں نے برسوں تک زندہ رکھا اور کبھی بددل نہ ہوئے۔ ان کی اولاد میں مشہور شاعرہ عفت بانو زیبا کاکوروی اور فرحت کاکوروی مرحوم کی بیوہ بھی شامل ہیں۔ ان کے اور عباسی صاحب کے دوسرے پسماندگان کے غم میں ہم شریک ہیں۔

∞

پوران کمار ہوش اُردو کے جواں سال شاعر تھے اور تھوڑی سی ہی مدت میں انھوں نے ادبی حلقوں میں اپنے لیے ایک جگہ بنالی تھی۔ ان کی شاعری کا سرچشمہ پنجاب کا مخصوص کلچر اور وہاں کی قصباتی زندگی تھی، جو زبان وہ لکھتے تھے اس پر بھی پنجاب اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے لوک گیتوں کا گہرا اثر تھا۔

ہوش کے ابھی مرنے کے دن نہ تھے۔ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے ان کی عمر چالیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ وہ بہادر گڑھ کی ایک فرم میں انجینئر تھے۔ دلّی میں ان کے بڑے بھائی شری کرشن کمار ملہوترہ رہتے ہیں جن سے ملنے اور دوسرے کاموں سے وہ اکثر دلّی آیا کرتے تھے۔ ۱۰ جنوری کی رات کو دلّی کی ایک ادبی محفل میں شرکت کے بعد اسکوٹر پر بہادر گڑھ واپس ہوئے لیکن گھر نہ پہنچ سکے۔ دوسری صبح ان کی لاش سڑک پر پائی گئی جو ناقابلِ شناخت تھی۔ ۲۲ جنوری کو ان کے بھائی شری ملہوترہ کے مکان واقع ویسٹ پٹیل نگر میں رسم کریا تھی جس میں لگ بھگ پانچ سو سوگوار موجود تھے۔ اس سے ہوش صاحب کی ہردلعزیزی کا پتہ چلتا ہے۔ اس المناک حادثے کا جتنا بھی غم کیا جائے کم ہے۔ ہم ان کے بھائیوں، ان کی بیوہ اور ان کے کم عمر بچوں سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

∞

۲۲ جنوری کو بسمل کپور تھلوی پٹیالے میں بعارضۂ قلب وفات پاگئے۔ وہ جوش ملسیانی کے شاگرد اور خود ایک کہنہ مشق اور خوشگو شاعر تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ستّر برس تھی۔

بسمل کپورتھلوی صاحب کے کلام کے دو مجموعے "ساز و نغمہ" اور "گلِ صحرائی" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ نام و نمود سے انھیں دلچسپی نہ تھی۔ تحریک سے انھیں بلا کا لگاؤ تھا اور وہ اس تحریک کے پرانے قدردانوں میں سے تھے۔ ان کی دائمی رخصت ہمارے لیے ایک ذاتی صدمہ بھی ہے۔

∞

Regd. No. D. (D) 118 PROHIB...

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No 648/57

TAHREEK







جوش ملسیانی

۱ر فروری ۱۸۸۴ء ——— ۲۷ر جنوری ۱۹۷۶ء



صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے مرکزی وزیر ڈاکٹر کرن سنگھ
جناب ساحر ہوشیارپوری کے مجموعۂ کلام "جلترنگ" کا اجرا کرتے ہوئے۔

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک نئی دلّی

شمارہ: ۱۲ جلد: ۲۳

مارچ ۱۹۷۶ء

ادارۂ تحریر

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: دس روپے فی کاپی: ایک روپیہ

بیرونی ممالک سے

سالانہ: تیس شلنگ فی کاپی: تین شلنگ

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتا:

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلی ۲-۱۱۰۰۰

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس، دہلی

مقامِ اشاعت: ۹- انصاری مارکیٹ، نئی دلی ۲-۱۱۰۰۰

گوپال متل

انگولا میں امن کے امکانات

بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ انگولا کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ ایم۔پی۔ایل۔اے۔ کی حکومت کو افریقی ریاستوں کی اکثریت نے تسلیم کر لیا اور جنوبی افریقہ کا رویہ بھی مزاحمانہ نہیں۔ مغربی حکومتیں بھی یا تو اسے تسلیم کر چکی ہیں، یا تسلیم کرنے والی ہیں۔ ہندستان کی حکومت بھی اسے تسلیم کر چکی ہے۔ اس کے بعد دو مسئلے باقی رہ جاتے ہیں: انگولا میں داخلی امن کا قیام اور وہاں سے غیر ملکی فوجوں کا اخراج۔

جیسا کہ ہم نے گذشتہ شمارے میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی جنرل سیکرٹری مسز پورابی مکرجی کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا ہندوستان کی حکمراں پارٹی کا موقف یہ ہے کہ انگولا سے تمام غیر ملکی فوجوں کا اخراج ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسا مطالبہ ہے جس کی تائید وہ سب لوگ کریں گے جو انگولا میں پائدار امن اور ایک حقیقی خود مختار حکومت کے قیام کے خواہاں ہیں۔

سوویٹ سرکار کے بعض بیانات سے گمان گزرتا ہے کہ وہ بھی اس موقف کی تائید میں ہے۔ مثال کے طور پر ۶ر جنوری ۱۹۷۶ء کو ریڈیو پیس اینڈ پروگریس نے افریقی ممالک کے لیے اپنے نشریے میں کہا: "انگولا کے مسئلے پر سوویٹ موقف واضح اور غیر مبہم ہے۔ انگولا کے عوام کو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ آزادی اور خود مختاری کے ماحول میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔" ۳ر جنوری ۱۹۷۶ء کو "پراودا" نے لکھا: "سوویٹ یونین مضبوطی سے اس کی تائید کرتی ہے کہ انگولا میں غیر ملکی مسلح مداخلت ختم ہونی چاہیے۔" اس تحریر کو پڑھ کر امریکی افسروں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سوویٹ یونین انگولا میں سوویٹ روس اور کیوبا کی فوجی مداخلت کا بھی خاتمہ چاہتا ہے۔ کچھ مغربی اخبار نویسوں کا انداز فکر بھی یہی ہے۔ مثلاً "لندن ٹائمز" نے اپنی ۷ر جنوری کی اشاعت میں لکھا: "اس قسم کے شواہد موجود ہیں کہ روسی شاید اپنا قدم پیچھے ہٹا لیں اور امریکی لڑائی بندی اور غیر ملکی فوجوں کی واپسی کی حمایت کر کے روسیوں کو ہر قسم کا موقع فراہم کر رہے ہیں کہ وہ بہ آسانی اپنا قدم پیچھے ہٹا سکیں۔"

سوویٹ موقف کے بارے میں اس قسم کی قیاس آرائیاں کافی امید افزا ہیں لیکن دقت یہ ہے کہ ..... "افریقہ اور دوسرے خطوں میں ماسکو نواز عناصر کی حمایت ماسکو کے نزدیک "قومی نجات کی تحریکوں اور ان کی جائز جد و جہد کی حمایت" ہے۔

جو لوگ انگولا میں سوویٹ یونین اور کیوبا کی مداخلت کو غیر ملکی مداخلت کا نام دیتے ہیں وہ ماسکو کے نزدیک سرد جنگ کے محاورے استعمال کرتے ہیں۔ سوویٹ یونین کے نزدیک غیر ممالک میں اس کی کارروائیاں جہاں جائز اور عزت مندانہ ہیں وہاں بورژوا حکومتوں کے اقدامات قابل نفریں ہیں۔

سوویٹ یونین کے پاکبازی اور نو آبادیت دشمنی کے دعاوی کے پیش نظر یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ کریمیا کے تاتاریوں کا ۳۲ سالہ لیڈر مصطفےٰ زیمیلیو سائبریا کے مشقت کیمپ میں سات مہینے سے بھوک ہڑتال پر ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے ہم قوموں کو جنھیں ۱۹۴۴ء میں ان کے وطن سے جبراً نکالا گیا تھا، از سر نو وہاں جانے کی اجازت دی جائے لیکن کریملن کا کہنا یہ ہے کہ کریمیا کے تاتاریوں کا کوئی مسئلہ ہی

نہیں یا کم سے کم یہ ایسا مسئلہ نہیں جس میں کوئی غیر ملکی دلچسپی لے سکے۔

جاپان کے ساتھ بھی سوویٹ یونین کے معاملات اس نہلے طے نہیں ہو رہے کہ سوویٹ یونین جاپان کے وہ چار شمالی جزیرے واپس کرنے کو تیار نہیں جن پر اس نے دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد قبضہ کیا تھا۔ خود جاپان کمیونسٹ پارٹی بھی ان جزیروں کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس پارٹی کا کہنا ہے کہ سوویٹ یونین یہ جزیرے جاپان کو واپس کر دے تو اس کا کچھ بگڑے گا نہیں اور اسے جاپانی رائے عامّہ کی بہت بڑی حد تک تائید حاصل ہو جائے گی۔ جاپان کی وزارتِ خارجہ کا یہ بھی بیان ہے کہ روسی ان جزیروں پر دفاعی اڈے بھی قائم کر رہے ہیں جن میں راڈار اسٹیشن، ہوائی اڈے اور گشتی کشتیوں کے اڈے شامل ہیں۔

انگولا میں امن ضرور قائم ہونا چاہیے اور اس کے امکانات بھی ہیں لیکن یہ امکانات حقیقی شکل اسی وقت اختیار کریں گے جب جملہ ممالک اس پر حریصانہ نظریں ڈالنا چھوڑ دیں گے اور اس کی خود مختاری کا احترام کرتے ہوئے وہاں ہر قسم کی مداخلت کاری بند کر دیں گے۔

▲▲

اطلاع نامہ بابت ماہنامہ تحریک، نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

ازروئے فارم نمبر ۴

مالک، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر : گوپال متل

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ۹ ۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

میں گوپال متل تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے علم کے مطابق درست ہیں

گوپال متل پرنٹر
بہ قلم خود

۲۷ فروری ۱۹۷۷ء

اسد ملتانی مرحوم

جوش ملسیانی

ایک مشاہدہ و مطالعہ

پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی کا کلام اخبارول اور رسالوں میں نظر سے گزرتا رہا لیکن طالب علمی کے زمانے میں ان کے کلام سے ان کا نام زیادہ دلچسپ معلوم ہوا اور غالباً اسی سبب سے ذہن میں ہمیشہ اٹکا رہا۔ کوئی پندرہ سولہ برس کی بات ہے کہ پہلی بار انہیں دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ شملہ میں پرنس آف ویلز سنیما میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ شیخ سر عبد القادر مرحوم صدارت پر تشریف فرما تھے۔ اچھے اچھے شاعر کلام سنا چکے تو پنڈت جی کے نام کا اعلان ہوا۔ متوسط جسم کے ایک بزرگ اسٹیج پر آئے۔ ڈاڑھی مونچھیں نیم سفید، لباس نہایت سیدھا سادہ۔ سفید پگڑی۔ سفید پاجامہ اور مٹیالے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کوٹ۔ چہرے پر باوقار متانت کے آثار۔ شملہ کے رنگین پس منظر میں یہ سادگی اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ شیخ صاحب نے اٹھ کر خاص طور پر ان کا تعارف کرایا۔ اور انھوں نے غزل پڑھی۔ دم سمجھتے ہیں۔ کم سمجھتے ہیں

کوئی دنیا کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

تو سماں بندھ گیا۔ غزل کا ایک ایک شعر بار بار پڑھوایا گیا۔ شیخ صاحب تھے کہ جھوم جھوم کر شعر دہرا رہے تھے۔ شاعر کی ظاہری صورت سے غزل کی ہم آہنگی اور پھر شعر پڑھنے کے تحت لفظ مگر پُر درد انداز نے مجموعی طور پر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ اس روز پہلی بار اُن کی شاعرانہ عظمت کا احساس ہوا اور طبیعت پہ اُن کی شاعری سے بھی بڑھ کر اُن کی شخصیت کا اثر۔

بعد ازاں جب ۱۹۳۴ء سے ہماری بزم اُردو شملہ کے مشاعرے شروع ہوئے تو انہیں ہر سال دعوت دینے کا معمول بنا لیا گیا اور اس طرح اُن سے ملاقات کا سلسلہ بھی پیدا ہو گیا۔ لیکن یہ ظاہر کرنے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں کہ ہر بار جب اُن سے ملاقات ہوتی یا وہ مشاعرے میں شرکت فرماتے تو ان کی شخصیت اور شاعری کے متعلق دل کے خوش گوار تاثرات میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ یہ ظاہر یہ معمولی بات ہو گی لیکن اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ وہ صاحبان لگا سکتے ہیں جنہیں دورِ حاضر کے اکثر مشہور شعراء سے وقتاً فوقتاً ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہو۔

۱۹۳۴ء کے مشاعرے کا وہ منظر بھی مجھے اب تک یاد ہے جب شملہ کے ڈیوڈیکو ہال میں سید سر رضا علی کی صدارت میں مجلس گرم تھی اور حضرت اصغر مراد آبادی مرحوم کے بعد پنڈت جی کی باری آئی تو انھوں نے ایک غزل سنائی جس کا مطلع تھا ؎

سوزِ غم میں دیدۂ تر کام آسکتا نہیں
یہ وہ آتش ہے جسے پانی بجھا سکتا نہیں

یوں تو اس غزل کے ہر شعر کی خوب پذیرائی ہوئی لیکن ذیل کے شعر نے تو قیامت برپا کر دی ؎

میری رسوائی کا حال اے دادرِ محشر نہ پوچھ
میں بھری محفل میں یہ قصہ سنا سکتا نہیں

جب یہ غزل ختم ہوئی تو مزید کلام کا مطالبہ ہوا اور انھوں نے ایک اور غزل پڑھی۔ جس کی زمین تھی دنیا ایک اور روئے زیبا ایک اور۔ اس غزل کا یہ اثر ہوا کہ اس کے

ختم ہونے پر حاضرین نے یک زبان ہوکر "ایک اور" "ایک اور" کا شور مچا دیا۔ نتیجہ یہ کہ انہیں تیسری غزل بھی سنانی پڑی۔

اس طرح بڑے بڑے مشاعروں اور مخصوص مجالس میں ان کا کلام سننے کا موقع ملا۔ ریڈیو پر بھی ان کی غزلیں سنیں اور رسالوں میں بھی ان کے اشعار دیکھے۔ لیکن ان کا کلام یک جا طور پہ پہلی دفعہ ۱۹۴۱ء میں "بادۂ سرجوش" کی صورت میں نظر کے سامنے آیا۔ یہ ان کے منتخب کلام کا ایک پاکیزہ مجموعہ ہے جس میں ان کے مختلف اصنافِ سخن کے نمونے دیے گئے ہیں۔ شروع میں اُن کے استاد بھائی حضرت نوح ناروی نے اُن کے مختلف حالاتِ زندگی سپردِ قلم فرمائے ہیں۔ پھر کچھ متفرق نظمیں ہیں اور اُن کے بعد چیدہ چیدہ غزلیں۔ انتخاب اس قدر شدت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اکثر غزلیں پوری نہیں رہ سکیں۔ اور ان کے چار چار، تین تین اور دو دو شعر چہار آتشہ، سہ آتشہ اور دو آتشہ کے عنوانوں سے دیے گئے ہیں اور آخر جہاں صرف ایک ایک شعر پر اکتفا کرنا پڑا ہے وہاں "جرعات" کی سرخی دے کر کام نکالا گیا ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں تھوڑا سا ظریفانہ کلام بھی شامل ہے۔

جناب جوش ملسیانی کی زندگی کچھ ایسی تفصیل طلب نہیں۔ ۵ ۱۸۸۲ء میں بہ مقام قصبہ ملسیاں (ضلع جالندھر) پیدا ہوئے۔ چودہ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ انگریزی تعلیم نہ پا سکے لیکن منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان پاس کر کے ہائی اسکولوں میں اوّل مدرس فارسی رہے۔ علاوہ ازیں "رہ نمائے تعلیم" جیسے بعض تعلیمی اور ادبی رسالوں کی ادارت میں بھی شرکت کی۔ شعر و شطرنج ان کے خاص مشاغل رہے۔ چناں چہ اس وقت جب کہ وہ باقی سب دھندوں سے فارغ ہو چکے ہیں۔ یہ دو مشغلے بدستور جاری ہیں۔

شاعری کا ذوق فطری تھا لیکن اس دور کے رواج کے مطابق استاد داغ مرحوم کی شاگردی بھی اختیار کی۔ بہرحال ان کی عام اور سادہ زندگی کی سب سے امتیازی خصوصیت یہی اُن کی شاعری ہے جس کا انہیں خود بھی احساس ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں ؎

انکار کیجئے نہ کمالاتِ جوش سے
کم گو سہی مگر وہ سخن در ضرور تھا

ان کے مجموعۂ کلام کو دیکھ کر ان کی شاعری کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ ان کے یہاں کوئی خاص نظامِ فکر یا پیغامِ حیات موجود نہیں۔ وہ نہ شاعرِ انقلاب ہیں نہ شاعرِ جمود۔ نہ شاعرِ تعمیر ہیں نہ شاعرِ تخریب۔ بس شاعر ہیں اور صرف شاعر۔ پہلو میں ایک حساس دل رکھتے ہیں اور منہ میں ایک شائستہ منجھی ہوئی زبان۔ جس بات سے متاثر ہوتے ہیں اُسے سیدھے سادھے الفاظ اور دل نشیں انداز سے شعر میں ڈھال دیتے ہیں انھوں نے اپنے لئے کوئی نیا اسلوبِ سخن نہیں نکالا، لیکن صحیح ذوقِ شعری کے ساتھ زبان کے گہرے مطالعے اور اصولِ فن کی پوری پابندی سے انھوں نے رسمی شاعری ہی کے اندر اپنے لیے ایک انفرادی رنگ پیدا کر لیا ہے۔ ان کے ہاں الفاظ کی ظاہری شان و شوکت، بیان کی مصنوعی رنگینی اور مضامین کی پیچیدگی مطلق نہیں پائی جاتی بلکہ خیال کی لطافت اور زبان کی سلاست ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اصولِ فن کی پابندی اور صحتِ زبان کا خیال یہاں تک رکھتے ہیں کہ مجموعۂ کلام کے شروع میں ۴۲ ایسی باتوں کی فہرست دے دی ہے جن سے انھوں نے احتیاط برتی ہے۔ یہ فہرست ایک نہایت جامع اور مفید ادبی ہدایت نامہ ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ فہرست محض اصطلاحی متروکات ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں زبان و ادب کی بہت سی عام غلطیوں کا ذکر بھی آگیا ہے۔

کہتے ہیں کہ بالعموم شاعر کا تخلص نفسیاتی طور پر اس کی طبیعت کا آئینہ ہوتا ہے۔ لیکن کم از کم جنابِ جوش ملسیانی کا تخلص اس کلیے پر پورا نہیں اترتا۔ یوں تو جوشِ طبع کے بغیر شعر کا عالمِ وجود میں آنا ہی ناممکن ہے اور اس حد تک جوش ہر شاعر کے کلام میں ثابت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن لفظ جوش عرفِ عام میں جن خصائص کا حامل ہے وہ نہ ان کی شخصیت میں پائے جاتے ہیں اور نہ اُن کی شاعری میں۔ اس کا انھیں

خود بھی احساس ہوا ہے۔ چناں چہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

کلامِ جوشؔ میں رنگ اس قدر ہے یاس و حسرت کا
اسے بھی ہم تو اک نیرنگیٔ عالم سمجھتے ہیں

البتہ ان کے مجموعۂ کلام کے نام "بادۂ سرجوش" نے اس تخلص کی موزونیت کا ایک اور پہلو پیدا کر دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے شاعری کے علاوہ شطرنج سے بھی انہیں خاص شغف ہے ناممکن تھا کہ اس شوق کا اثر شاعری پر نہ پڑتا۔ چناں چہ اس مضمون کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

سمجھتے خوب تھے ہم شاطرِ دوراں کی چالوں کو
مگر نقشہ پڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں

دوسری جگہ آنسو کی زبان سے فرماتے ہیں ؎

مجھ سے جاں باز کو غربت ہے بساطِ شطرنج
جو نہ پلٹے کبھی واپس وہ پیادا میں ہوں

چار پانچ برس کی بات ہے کہ میں ریواڑی سے دہلی آرہا تھا۔ گاڑی میں رائے بہادر لالہ کنور سین ایم اے کا ساتھ ہوگیا۔ باہمی تعارف ہوجانے پر دلچسپ ادبی صحبت قائم ہوگئی۔ کچھ انھوں نے سنایا اور کچھ میں نے۔ ایک مارواڑی سوداگر اور بی اینڈ سی۔ آئی کے ایک انجینئر بھی اس لطف میں شریک رہے۔ آخر میں ان انجینئر صاحب نے کہا کہ میں نہ شاعر ہوں نہ ادیب لیکن ادبیات سے کچھ تھوڑی سی دلچسپی ضرور رکھتا ہوں۔ مدت ہوئی رسالہ "مستانہ جوگی" میں ایک انوکھی نظم نظر سے گزری جس کے کچھ شعر یاد رہ گئے۔ اگر آپ صاحبان چاہیں تو میں بھی وہ سنادوں۔ ہم نے کہا ضرور سنائیے۔ انھوں نے غزل پڑھی جس کا ایک مصرع تھا ؎ نام ہے جس کا بشر اس میں ہے شر $\frac{2}{3}$
اور تین شعر تھے ؎

منحصر قوتِ بازو پہ ہے دولت مندی
دیکھ لو زور میں موجود ہے زر $\frac{2}{3}$

ملک الموت سے دنیا میں ہراساں نہیں کون
جس کو کہتے ہیں نڈر اس میں ہے ڈر $\frac{2}{3}$

ظالمو خوف کرو آہ کو سمجھو نہ حقیر
لفظ اللہ میں ہے اس کا اثر $\frac{2}{3}$

اس غزل کی ردیف کی ندرت نے خوب لطف دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب "بادۂ سرجوش" سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ریاضیاتی غزل بھی حضرت جوش ملسیانی کی شوخیٔ طبیعت کا نتیجہ ہے۔

تفنن برطرف۔ اب ذرا ان کے سنجیدہ کلام کی طرف آئیے۔ ان کی نظمیں پاکیزہ پختہ اور صاف ہیں۔ مثلاً خاص طور پر

(۱) خدا جانے ترا دیوانہ کس دنیا میں رہتا ہے
(۲) کیا اسی دن کے لیے فصلِ بہار آنے کو تھی
(۳) نقیبوں کی سُن لے صدا ساقیا
پلا ساقیا کچھ پلا ساقیا
(۴) غریبوں کی دُنیا میں راحت نہیں ہے

بہت اچھی اور کامیاب نظمیں ہیں۔ لیکن میرے نزدیک جوش کا اصلی جوہر غزل ہی کے آئینے میں نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے چند غزلیہ اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ؎

جور تو اے جوشؔ آخر جور ہے
لطف بھی اُن کا ستم ڈھاتا رہا

اب توجہ تو مرے حال پہ ہو جاتی ہے
شکر کرتا ہوں کہ اس بُت کو جفائیں آئیں

مدت ہوئی کہ بابِ اثر بند ہوگیا
میں نے دُعا سے ہاتھ اُٹھایا نہیں ہنوز

جو کہہ سکیں نہ ہم وہ کہا ہی نہیں ابھی
جو سن سکو نہ تم وہ سنایا نہیں ہنوز

سو حیاتِ ابدی موت پہ کرتی قرباں
قتل کے بعد ہی کہہ دو کہ گنہ گار نہ تھا

کر گئی موت مجھے اور بھی رسوائے جہاں
اس نے الزام یہ رکھا کہ وفادار نہ تھا

وہ لطف ہی نہیں اب وہ بات ہی نہیں اب
یا میں بدل گیا ہوں یا تو بدل گیا ہے

اے کاش اس کو تجھ کو باہم گلے ملا دیں
دو آدمی یہاں کے دو آدمی وہاں کے

وہ تو وہ اُن کا تصور بھی گریزاں ہی رہا
کون ٹھہرے مرے اُجڑے ہوئے کاشانے میں

نزع میں پیشِ نظر ہیں عمر بھر کے واقعات
ساری دنیا کا مرقع آخری منظر میں ہے

اک فقط میں ہی تو ناکام نہ آیا ظالم
خاک اڑاتی ترے کوچے سے صبا بھی آئی

اس شعر پر جیرت شملوی کا شعر یاد آ جاتا ہے ؎

ہیں اور بھی اس بزم میں محرومِ نوازش
اک تو ہی فقط اے دلِ ناکام نہیں ہے

مگر ظاہر ہے کہ جیرت کا شعر محض بیانیہ ہے لیکن جنابِ جوش کے شعر میں ثبوت بھی موجود ہے اور وہ بھی ایسا کہ شعر بالتصویر معلوم ہوتا ہے۔ چند اور ناوکارِ عالیہ ملاحظہ ہوں ؎

اب میں کیوں تقدیر کا قائل رہوں
جو کہا تم نے وہ ہو جاتا رہا

ایک عالم تو عطا کر اے کریم
یہ بھی کیا کچھ قید کچھ آزاد ہوں

خدا جانے صبا ہر روز کیا پیغام لاتی ہے
کہ پہروں کانپتے رہتے ہیں تنکے آشیانوں میں

کون جانے کون سمجھے چاک دامانی کا راز
تم میں اے اہلِ بصیرت کوئی دیوانہ بھی ہے

کہوں شرحِ جنوں کیوں کر خردمندوں کی محفل میں
یہ وہ نکتے ہیں جن کو اہلِ دانش کم سمجھتے ہیں
ہوئے جو خوگرِ غم عیش کا اُن پر اثر کیا ہو
خوشی کو وہ خوشی سمجھیں جو غم کو غم سمجھتے ہیں

ترے انداز پر عمرِ رواں کچھ شک گزرتا ہے
لیے جاتی ہے تو مجھ کو کدھر آہستہ آہستہ

کھائے جاتی ہے اسے ترکِ تمنا کی خطا
پہلے مشکل دل میں تھی اب دل مرا مشکل میں ہے

سرگرمِ سفر رکھتا ہے دردِ دلِ بے تاب
اُٹھے نہ اگر یہ تو قدم اٹھ نہیں سکتا

کامل کی جو پوچھو تو نہیں خضر بھی کامل
جینا اُسے آتا ہے تو مرنا نہیں آتا

گریۂ شرمِ گنہ سے اور رسوائی ہوئی
داغِ عصیاں میں نے دھو دھو کر نمایاں کر دیا

نکما ہو گیا میں اس قدر مصروفِ غم ہو کر
مرے اعمال کے کاتب بھی اب بے کار بیٹھے ہیں

ایک شعر میں اپنی ناکامی کی تصویر کھینچی ہے ؎

ناکامِ تمنا ہوں میں اس رشک کی مانند
مرتے ہوئے عاشق کی جو آنکھوں میں رکا ہو

لیکن ایک اور شعر میں اس کی حکمت کو بھی محسوس کرتے ہیں ؎

عیش میں ڈوبے ہوئے دل کا ٹھکانہ ہے کہاں
یہ بھی حکمت تھی کہ ناکام تمنا کر دیا

فارسی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

طے می شود ایں راہ بہ درخشیدنِ برقے
ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم

اس مضمون کو انھوں نے اُردو میں کس صفائی سے ادا کر دیا ہے ؎

ہے اگر راہِ طلب تاریک تو پروا نہیں
مشعلیں روشن کریں گی بجلیاں میرے لیے

معلوم ہوتا ہے کہ آپ تناسخ کے قائل نہیں ہیں۔ کم از کم اس شعر میں تو اس سے انکار کا ایک نہایت لطیف پہلو نکالا ہے ؎

اس کے چکر میں دوبارہ تو میں آنے کا نہیں
ڈھونڈتی پھرتی ہے کیوں گردشِ دوراں مجھ کو

مگر انکار اس گردشِ دوراں یعنی موجودہ زمان و مکان میں دوبارہ آنے سے ہے۔ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی کے امکان سے انکار نہیں۔ اس بارے میں تو ان کا عقیدہ بھی وہی معلوم ہوتا ہے جو حضرت علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں پایا جاتا ہے ؎

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

مثلاً فرماتے ہیں ؎

داستانِ عاشقی کچھ اور باقی ہے ابھی
خوابِ ہستی تو فقط افسانہ در افسانہ تھا

ایک اور جگہ لکھا ہے ؎

حشر کا اے حضرتِ واعظ یہی مفہوم ہے
زندگی کے بعد دیکھیں گے تماشا ایک اور

ہماری مروجہ شاعری میں شاعر کا رند ہونا کچھ لازم و ملزوم سا ہو گیا ہے۔ چناں چہ جناب جوشؔ ملسیانی نے بھی رندی و مستی کے بہت سے مضمون باندھے ہیں ؎

حشر میں تھا نامۂ اعمال سب کے ہاتھ میں
میرے ہاتھوں میں مرا ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا

رندی میں ذرا شوخی بھی ملاحظہ ہو ؎

محشر میں سن رہا ہوں صدا واہ واہ کی
یارب ملی یہ داد مجھے کس گناہ کی

مگر ایک جگہ اپنی رندی کا معیار کس قدر پاکیزہ پیش کیا ہے ؎

وہی رندی ہے جس کے ساتھ شانِ پارسائی ہو
وہ مے کیا دامنِ تقویٰ میں جو چھانی نہیں جاتی

لیکن اس شانِ پارسائی کا راز بھی اپنے ایک لاجواب شعر میں فاش کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

زاہد کے قصرِ زہد کی بنیاد ہے یہی
مسجد بہت قریب تھی مے خانہ دور تھا

اس شعر میں جو نفسیاتی حقیقت اور طنز کی لطافت مہک رہی ہے اس پر ان تمام بے ادب شعراء کا رندانہ کلام قربان کیا جا سکتا ہے جو مذہب و اخلاق کا مضحکہ اڑانے کو رندانہ شاعری سمجھتے ہیں۔

اب یہاں ان کی غزلوں میں سے دو خاص ٹکڑے ملاحظہ ہوں جن میں زورِ بیان اور خلوصِ جذبات کا بہترین نمونہ پایا جاتا ہے اور جن پر کلامِ اقبال کا دھوکا ہوتا ہے۔

فغاں میں برقِ سوزاں کا اثر پیدا کرا اے بلبل
نہ آہیں کوئی آہیں ہیں نہ نالے کوئی نالے ہیں
محبت میں گراں پا ہو نہ اتنا خوفِ رہزن سے
جو اس رستے میں لٹ جائیں بڑی تقدیر والے ہیں

یہی التجا ہے کہ اے خدا مجھے حشر سے تو معاف رکھ
وہ ترے حضور میں آ کے کیا جو کسی کو منہ نہ دکھا سکے
یہ ادا ہوئی کہ جفا ہوئی یہ کرم ہُوا کہ سزا ہوئی
اُسے شوق حد عطا کیا جو نگہ کی تاب نہ لا سکے

(منقول از آجکل ۱۹۴۴ء)

۲۵ روپے کی کتابیں

صرف ـــــ ۱۱ روپے میں

یاد رکھیے ۳۱ مارچ تک ھی آپ اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ھیں

ذیل میں کچھ عمدہ کتابوں کی فہرست دی جارہی ہے۔ ان میں سے آپ ۲۵ روپے کی کتابیں صرف ۱۱ روپے میں حاصل کرسکتے ہیں۔

آپ کو صرف اتنا کرنا ہے کہ ۱۱ روپے کا منی آرڈر ہمارے نام بھجوا کر ڈاکخانے سے ملنے والی رسید کے ساتھ ۲۵ روپے کی اپنی پسند کی کتابوں کے نام لفافے میں رکھ کر ہمیں بھجوا دیں۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

آپ کا خط ملنے پر آپ کی طلب کردہ کتابیں رجسٹرڈ پیکٹ سے ارسالِ خدمت کردی جائیں گی ـــــ ڈاک خرچ آپ سے نہیں لیا جائے گا، ہم خود ادا کریں گے۔

یہ رعایت ۳۱ مارچ ۱۹۷۶ء تک کے لیے ہے، اور یہ تاریخ اب قریب ہے ـــــ آپ اپنا آرڈر آج ہی بھجوا کر اس نادر پیشکش سے فائدہ اٹھائیں:

کتابیں جو آپ طلب کرسکتے ھیں، یہ ھیں، اب ان میں کچھ اور کتابیں بڑھادی گئی ھیں:

۱۔ آواز کا جسم (شاعری، مخمور سعیدی) ۱۰-۰۰
۲۔ جملوں کی بنیاد (یک بابی ڈرامے، کمار پاشی) ۷-۰۰
۳۔ صریرِ خامہ (شاعری، مظفر حنفی) ۶-۰۰
۴۔ میرا وطن ہندوستاں (شاعری، بدیع الزماں خاور) ۴-۰۰
۵۔ ۱۹۷۱ء کی منتخب شاعری (کمار پاشی / پریم گوپال متل) ۴-۰۰
۶۔ شہپر (شاعری، سید حرمت الاکرام) ۸-۰۰
۷۔ تیشۂ نظر (تنقید، ابوالفیض سحر) ۸-۰۰
۸۔ ادیب اور کمیسار (ادب اور سیاست، جارج پلو کرزی) ۱-۰۰
۹۔ سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ (موریس کرانسٹن) ۱-۰۰
۱۰۔ سیہ بر سفید (شاعری، مخمور سعیدی) ۶-۰۰
۱۱۔ یہ قربتیں یہ دوریاں (شاعری، خلش دہلوی) ۱۰-۰۰
۱۲۔ سوویٹ وسط ایشیا کی مسلمان قومیں (تاریخ) ۳-۰۰
۱۳۔ لینن (سوانح حیات، رابرٹ کنکوئسٹ) ۲-۰۰
۱۴۔ گیان مارگ کی نظمیں (شاعری، کرشن موہن) ۱۰-۰۰
۱۵۔ کینسر وارڈ (ناول، الیگزنڈر سولشنٹین) ۱۸-۰۰
۱۶۔ خرابہ (شاعری، من موہن تلخ) ۱۰-۰۰
۱۷۔ میں گواہی دیتا ہوں (آپ بیتی، اناتولی مارچینکو) ۴-۰۰
۱۸۔ نام بہ نام (منظوم خطوط، رہنما نقوی داہی) ۶-۰۰
۱۹۔ قوموں کے قاتل (تاریخی مطالعہ، رابرٹ کنکوئسٹ) ۳-۰۰
۲۰۔ نئے عہد نامے کی سوغات (افسانے، فیاض رفعت) ۱۰-۰۰
۲۱۔ انسانی حقوق کیا ہیں؟ (موریس کرانسٹن) ۳-۰۰
۲۲۔ شہر خوشبو (شاعری، نور تقی نور) ۵-۰۰
۲۳۔ ٹریڈ یونین کے بنیادی اصول (ڈاکٹر فیصد رم) ۱-۰۰
۲۴۔ ٹریڈ یونین ـ جائز اور ناجائز استعمال (آر کمر با جملی) ۰-۵۰

۲۵ - دیپک راگ (غزلیں اور رباعیاں، مظفر حنفی) ۶-
۲۶ - صحرا کی پیاس (شاعری، شباب للت) ۶-۰۰
۲۷ - راہگذر (غزلیں، دل ایوبی) ۴-۵۰
۲۸ - جمہوری انقلاب (سیاسی مطالعہ، برائن ماگی) ۱-۰۰
۲۹ - جمہوری سوشلزم (سیاسی مطالعہ، گائلز ریڈس) ۱-۰۰
۳۰ - بیاض (شاعری، بدیع الزماں خاور) ۴-۰۰
۳۱ - راکھ (شاعری، احتشام اختر) ۶-
۳۲ - اعراف (شاعری، عبدالرحیم نشتر) ۴-۵۰
۳۳ - وہ انقلاب (سیاسی مطالعہ) ۱-
۳۴ - ببول کے پیڑ (کسان کی آپ بیتی) ۰-۵۰
۳۵ - خوشحالی کی تلاش (اقتصادی موازنہ) ۰-۵۰
۳۶ - سکون کا کرب (شاعری، آزاد گلاٹی) ۵-۰۰
۳۷ - شہر خیال (شاعری، جلیس نجیب آبادی) ۴-۵۰
۳۸ - احساسات (شاعری، اوم پرکاش لاغر) ۵-۰۰
۳۹ - گلاگ مجمع الجزائر (آپ بیتی، الیگزنڈر سولنسٹین) ۷-۰۰
۴۰ - سورج کے تماشائی (شعری انتخاب) ۱۰-۰۰

سب قیمتیں اصلی ہیں، کسی کتاب کی قیمت بڑھائی نہیں گئی ہے ۱۱ روپے منی آرڈر سے پیشگی بھوائیں، کتابیں وی۔پی سے نہیں بھیجی جائیں گی۔ آپ ۲۵ — ۲۵ روپے کے ایک سے زیادہ سیٹ بھی طلب کرسکتے ہیں۔ فی سیٹ ۱۱ روپے بڑھاتے جائیں

منیجر نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

یہ اعلان بھی ضرور پڑھیے

کاغذ، کتابت، طباعت اور بائنڈنگ کے نرخوں میں مسلسل اضافے کے باوجود ہم نے اب تک "تحریک" کی قیمت میں اضافہ نہیں کیا جبکہ دوسرے سبھی رسالوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں ——— ہم اب بھی قیمت بڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن ہمارے بہت سے پڑھنے والوں کا اصرار ہے کہ پرچے کی ضخامت میں اضافہ کیا جائے۔

بحالاتِ موجودہ ضخامت میں اضافہ قیمت میں اضافے کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا ہم نے اپنے پڑھنے والوں کی خواہش کے احترام میں فیصلہ کیا ہے کہ ——— اپریل ۱۹۷۶ء کے شمارے سے جو تحریک کی ۲۴ ویں جلد کا پہلا شمارہ ہوگا اس کی ضخامت آٹھ صفحے بڑھادی جائے اور اس کی قیمت میں ۲۵ پیسے اضافہ کردیا جائے۔ جیسا کہ آپ محسوس کریں گے ۸ صفحے کے عوض قیمت میں یہ اضافہ بہت ہی معمولی ہے۔

اگلے شمارے سے تحریک ۴۰ کی بجائے ۴۸ صفحے پر شائع ہوگا، اس کی سالانہ قیمت پندرہ روپے ہوگی اور ایک شمارے کی قیمت سوا روپیہ

لیکن جو حضرات ۳۱ مارچ ۱۹۷۶ء تک سالانہ خریدار بنیں گے، یا مزید ایک سال کے لیے اپنی خریداری کی تجدید کریں گے، چاہے ان کی مدتِ خریداری اپریل سے پہلے ختم نہ بھی ہو رہی ہو، ان سے دس روپے ہی وصول کیے جائیں گے ——— اس رعایت سے خود بھی فائدہ اٹھایئے اور اپنے دوستوں کو بھی متوجہ کیجیے۔

آپ کے تعاون کا طالب

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

کرشن موہن

غزل

کیوں کر ہمارے زخم کا مرہم دکھائی دے
ہم اہلِ غم سے ہر کوئی برہم دکھائی دے

غم میں خوشی بھی، پیار بھی ماتم دکھائی دے
احساسِ یاسِ زیست کا محرم دکھائی دے

جانِ عزیز کھوئیں تو پائیں حیاتِ نو
موت آس اور یاس کا سنگم دکھائی دے

یہ کیسی کیفیت ہے کہ اندوہِ غم میں بھی
رنگِ امید، گرچہ ہے مدھم، دکھائی دے

اے دل تمام عمر ترستا رہا ہے تو
محرم کوئی ملے کوئی ہمدم دکھائی دے

پلکوں پہ اشک آئیں نظر اہلِ عشق کو
اہلِ خرد کو پھول پہ شبنم دکھائی دے

پہنچے ہوئے فقیر کے چہرے پہ روز و شب
سرمستی و سرور کا عالم دکھائی دے

جتنا بھی ہو زیادہ متاع و زر
چشمِ ہوس کو اتنا ہی کم کم دکھائی دے

اہلِ نشاط و رنگ کا اندازِ بود و باش
عہدِ شباب و شوق کا البم دکھائی دے

بے ساز و برگ ہر کوئی ہے رہ نوردِ مرگ
دُنیا مجھے تو محفلِ ماتم دکھائی دے

رکھے گا عاشقی کا بھرم کیا وہ عشق باز
ہر آستانِ ناز پہ جو خم دکھائی دے

حیران اپنی طرفہ مزاجی پہ کیوں نہ ہوں
غم بھی خوشی، خوشی بھی مجھے غم دکھائی دے

کیا وہ بھی راہرو ہے جو ہر ایک موڑ پر
جی ہار بیٹھے، خستہ و بے دم دکھائی دے

اُن ناقدوں کی تیرہ نگاہی کا کیا علاج
ہر سادہ شعر بھی جنھیں مبہم دکھائی دے

کیا اُس کو ہو گیا ہے کہ ہر کیفیت میں کرشن
موہن ہمیشہ سوزِ مجسم دکھائی دے

ندا فاضلی

راستوں میں پیچ و خم آنے لگے
ہوش آیا ، ٹھوکریں کھانے لگے
جیتنے نکلے تھے ساری کائنات
دوستوں سے لڑکے گھر جانے لگے
چند دن دونوں رہے تھے ساتھ ساتھ
وہ ہمیں ہم ان کو سمجھانے لگے
چلتے چلتے راستہ گم ہوگیا
ہر طرف جنگل نظر آنے لگے

▲▲

محبت کرو یا عداوت کرو
کہیں کوئی جینے کی صورت کرو
یہ بے لہر پانی سی کیا زندگی
کوئی تیر پھینکو شرارت کرو
چھلک جائے آنکھوں سے ایسا نہ ہو
ابھی اور غم کی حفاظت کرو
بہت تیز ہیں عقل کی آندھیاں
عقیدہ تراشو ، عبادت کرو

▲▲

دو غزلیں

بدیع الزماں خاور

نظم

سمندر پُر سکون ہے
ساکت و خاموش ہیں لہریں.......
بڑا اچھا سماں ہے
مانجھیو! ــــــ لنگر اٹھاؤ
بادباں کھولو۔
رواں کر دو اُفق کی سمت پھر، ٹھہرے سفینوں کو۔
سماں آخر سماں ہے، کون جانے کب بدل جائے؛
کہیں دیکھو نہ ہاتھوں سے یہ موقع بھی نکل جائے!!

▲▲

شاہین بدر

واپس چلو

کھڑکیوں کے سارے پردے کھینچ دو
بند کمرے میں سکوں ہے، چین ہے
تیرگی کا زہر ہی تریاق ہے اپنے لئے
چلچلاتی دھوپ کا تالاب باہر گرم ہے
مچھلیاں بے تاب ہیں، بے چین ہیں
اب زمیں میں سوندھی مٹی کی مہک باقی نہیں
ہر طرف ڈیزل کی بُو ہے اور چمنی کا دھواں
سچ کے کھیتوں میں بھی اب آ گئی ہیں فصلیں جھوٹ کی۔
زہر کا پیالہ ترستا ہے کسی سقراط کو
کھولتا ہے دھوپ کا تالاب باہر دوستو!
اس جہنم سے بچو
اپنے کمروں میں چلو
کھڑکیوں کے سارے پردے کھینچ دو
اب صحیفہ لے کے آئے گا نہ پیغمبر کوئی!!

▲▲

مشتاق علی شاہد

احساسِ جرم

وہ پہلا شخص
جس نے
سوچ کے ٹھہرے ہوئے پانی میں
پہلی کنکری پھینکی ـــــ
وہ پہلا فلسفی
جس نے
دریچے ذہن کے کھولے ـــــ
وہ شاعر
جس نے پہلے شعر کی تخلیق
کی ہوگی ـــــ
وہ سب کے سب اگر
اس دور میں
پھر سے جنم لے لیں
تو ان کو ارتکابِ جرم کا احساس
پھر سے مار ڈالے گا ـــــ!

▲▲

شاہ حسین نہری

ڈُبُول

عجب کشمکش، اپنے ہونے کا احساس دیتی ہوئی بے زبان زندگی، ـــــ زندگی بن کے پھیلی ہوئی ہی نہیں ہے کہ دوشیزۂ سال خوردہ ہیں، اس دن سے اب تک، کھلے آسمانوں کے نیچے جھلستی تڑپتی ہوئی، ہر گھڑی تار تار بدن کے جکڑتے ہوئے خول سے خود کو آزاد کرنے کی کوشش میں، بد ذات چہروں میں نقطہ بنی ایک سناٹے میں، خود گرفتہ، پڑی ہوں کہ کوئی تو آئے، پھر اک بار آئے کہ عرصے سے کوئی بھی آیا نہیں ہے۔

▲▲

تنہا تماپوری

زندانِ جسد

برف کی قاش کو اِک کرن چھو گئی!
جلتی سگریٹ پہ ایک آنسو گرا!
یوں مرے نام کے اولیں حرف پر
سو گیا ہے سیاہی کا دھبہ کوئی!!

یہ اگر زندگی ہے تو اتنا کرو،
موت کا لفظ بھی اس میں شامل کرو!

▲▲

ممتاز شکیب

اُنگلیوں کا خُون

میری انگلیوں میں آج پھر درد ہو رہا ہے —— نیند آنکھوں سے دُور ہے اور سر پہ ایک بوجھ ہے... —— یہ بوجھ میں نہ جانے کب سے اٹھائے پھر رہا ہوں کتنی ہی صدیاں اس کوشش میں گزر گئیں کہ میں اس بوجھ کو اپنے سر سے اُتار پھینکوں لیکن وقت ہے کہ اسی کشمکش میں گزر رہا ہے اور یہ بوجھ متواتر بڑھ رہا ہے۔ میں نے کارنس پہ کبھی ایک سانولی سی معصوم لڑکی کی تصویر سجائی تھی وہ لڑکی بہت دلکش تھی ایک دن کمرے میں ہوا کا تیز جھونکا آیا اور وہ تصویر کارنس سے گر گئی —— ..... شیشے کو ٹھیس لگی اور اس میں بال آگیا۔

اب وہ تصویر میرے کمرے میں نہیں ہے اور ایک شاندار بنگلے کے نفیس ڈرائنگ روم کی زینت بنی ہوئی ہے —— ..... جس آدمی نے اس تصویر کو میرے کمرے سے اڑایا ہے وہ اکثر میرے گھر آیا کرتا تھا اور اس تصویر کے ہونٹوں میں دبی ہوئی دلکش مسکراہٹ کو دیکھ کر کہا کرتا تھا:

"لگتا ہے یہ لڑکی اپنے ہونٹوں میں تبسم کا ایک انمول طلائی سکہ دبائے ہوئے ہے ——!" وہ لڑکی آج بھی —— میرے کمرے میں دبے پاؤں آتی ہے لیکن کارنس پر اپنی تصویر نہ پا کر اداس ہو جاتی ہے اور مجھے دیکھ کر —— نظریں جھکا لیتی ہے .... میں نے اکثر دیکھا ہے —— اس کے ہونٹوں کی مرمریں فصیلوں پہ جھلملاتے ہوئے مسکراہٹ کے وہ دیرینہ چراغ اب بجھ چکے ہیں اور جب میں اس کے بجھے ہوئے ہونٹوں کو غور سے دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے جیسے اس آدمی نے اس لڑکی کی مسکراہٹ کا وہ طلائی سکہ چھین لیا ہے جس کو وہ اپنے ہونٹوں میں دبائے رکھتی تھی ——

ویسے مجھے اب اس کی تصویر سے کوئی اُنس نہیں! جس دن سے وہ کارنس سے گری ہے اور شیشے میں بال آیا ہے اسی دن سے اس کی تصویر کے ساتھ اس کا تصور بھی دھندلا پڑ گیا ہے اس لیے مجھے اب تصویر کے چلے جانے کا کوئی غم نہیں ہے۔ ہاں —— کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا ہے۔ وہ تصویر اکثر میرے درد کا مداوا بن جایا کرتی تھی لیکن اب —— کوئی بھی شے میرے درد کا مداوا نہیں بنتی —— .... یہی انگلیوں کا درد ہے اور آنکھوں میں نہ سونے کی جلن —— ..... اب مجھے اپنے کمرے سے بھی کوئی لگاؤ نہیں ——

گھر کی چہار دیواری میں رہتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے چھت ہوا میں اڑ گئی ہے اور زمین چار سمتوں میں پھیل کر گھر سے باہر نکل گئی ہے سر پر اب کھلا ہوا آسمان ہے اور میں ستاروں سے بھی آگے دیکھ رہا ہوں!

جب سے میں نے —— گھر سے باہر —— دُور تک دیکھنا شروع کیا ہے —— ...... میری آنکھوں کی بینائی کچھ تیز ہو گئی ہے لیکن سر کا بوجھ کئی گنا زیادہ ہو گیا ہے نیند آنکھوں سے کوسوں دُور ہو گئی ہے اور انگلیوں کا درد پہلے سے زیادہ بڑھنے لگا ہے۔

درد انگلیوں میں ہو یا جسم کے کسی اور حصے میں ——

بڑھتا ہے تو پورے جسم کو اپنی گرفت میں لے کر . . . .
. . . . زندگی کے احساس کو اپنی
مٹھیوں میں بھینچ لیتا ہے اور یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی
ہو رہا ہے۔ میرا اپنا درد جب سوا ہو جاتا ہے تو میں سمجھ جاتا
ہوں میرے اندر اب کچھ تازہ خون جمع ہو گیا ہے ـــــ

آج! جب میرا یہ درد حد سے بڑھنے لگتا ہے تو
میں انگلیوں کو ہاتھ کی گرفت میں لے کر آہستہ آہستہ اپنی
مٹھیاں بھینچنے لگتا ہوں . . . . . . خون انگلیوں کے پوروں
میں سمٹ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ انگلیوں سے ٹپکنے لگتا ہے
اور دیکھتے دیکھتے کمرے کی دودھیا سی چکنی مٹی لال ہونے
لگتی ہے۔

قطرہ قطرہ تازہ لہو ـــــ سفید مرمریں سطح پر
ٹپکتا رہتا ہے . . . . .

جانے کب سے یہ خون کی بوندیں انگلیوں سے نچوڑی
جا رہی ہیں جو مرمریں سطح پر منجمد ہو کر سیاہ پڑ جاتی ہیں میری
اپنی تحریروں کی طرح سیاہ ـــــ

لوگ کہتے ہیں "یہ تحریریں سیاہ رنگ کی ہیں ـــ!"
اور میں پوچھتا ہوں "کیا خون کا رنگ کالا ہوتا ہے ـــ؟"
اور پھر ہوائیں میرے کانوں میں چیخنے لگتی ہیں "پہلے خون
کا رنگ سُرخ تھا اور اب سیاہ سے سفید ہو گیا ہے ـــ!"
"نہیں! خون کا رنگ سفید نہیں سُرخ ہوتا ہے ـــ!"
میں زور سے چیخ کر کہتا ہوں میں نے کل ہی ایک غیر ملکی خوشنما
سے میگزین میں جن مردہ بچوں، عورتوں اور مردوں کی تصویریں
دیکھی تھیں اُن کے توانا جسموں سے رِستے ہوئے خون سے دُور
تک زمین سُرخ دکھائی دے رہی تھی۔ ان تصویروں کو
دیکھ کر میرے ایک ہپّی نما نوجوان شناسا نے کہا تھا۔

"اتنی خوبصورت فوٹوگرافی میں نے کبھی نہیں دیکھی ـــ
اس میگزین میں ایسی تصویروں کی اشاعت پر اتنا معقول
معاوضہ ملتا ہے کہ اس سے کئی سال کے لیے حشیش اور ایل
ایس ڈی کا اسٹاک خریدا جا سکتا ہے" وہ نوجوان روانی
سے بول رہا تھا اور میں اس کا منہ تک رہا تھا۔ میں اس
کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ میری سوالیہ نظروں کو چرس
کے دھوئیں میں اڑاتے ہوئے قدرے مشتعل ہو کر کچھ اور
کہنے لگا تھا پھر اس کی آنکھوں میں اچانک نیند کا غبار سا
بھر گیا اور وہ اونگھنے لگا۔

"اگر میں بھی ـــ گانجے اور حشیش کا استعمال شروع کر
دوں تو شاید مجھے بھی جلد نیند آ جائے ـــ؟" میں نے اس کا اظہار اپنے
ایک صحافی نما شاعر دوست سے کیا تو اس نے رازدارانہ
طور سے کہا:

"بڑے کام کی شے ہے ـــ تھوڑا سا لے لیا کرو!"
صحافت میں آنے سے پہلے میرا یہ دوست ایک بیباک شاعر
ہوا کرتا تھا اور اکثر بری طرح انگلیوں کے درد میں مبتلا رہا
کرتا تھا لیکن اب اُسے درد کا احساس تک نہیں ہوتا اسے
نیند بھی جلد آنے لگی ہے یہاں تک کہ میں نے اُسے اب
دن میں بھی اونگھتے ہوئے دیکھا ہے حد یہ ہے کہ اب اس
کی تحریروں میں بھی اونگھنے والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔
میرا خیال ہے میرے دوست کو حشیش اور افیون کچھ زیادہ
ہی دے دیا گیا ہے۔

"تم بھی تھوڑی سی افیون لے لیا کرو ـــ!" ایک
دن اس نے مجھے مشورہ دیا تھا۔
"نہیں! میں افیون نہیں لوں گا ـــ!"
"سوچ لو ـــ اس سے نیند جلد آتی ہے ـــ!"
"میں سونا نہیں چاہتا ـــ!"
"دیکھ لو ـــ چین سے گزرے گی ـــ میں تمہیں
منشیات کا پرمٹ الاٹ کرا دوں گا ـــ!"
"مجھے یہ اعزاز نہیں چاہیے ـــ!"
"آخر کیوں ـــ!؟"
"میں اپنے خون کو منجمد نہیں کرنا چاہتا ـــ!"
"کیا تمہارے اندر ـــ ابھی تک خون ہے!؟"
"اسی لیے تو جل رہا ہوں ـــ ورنہ کبھی کا بجھ
جاتا ـــ" میری بات پر وہ زور سے قہقہہ لگاتا ہے
"میرا خیال ہے ـــ تمہارا خون سفید ہو چکا ہے"

(باقی صفحہ ۲۳۲ پر)

حسن رہبر

ایک پَل کا فاصلہ

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

جب کئی ڈبے میری نظروں کے سامنے سے گذر گئے اور کسی نے دروازہ نہیں کھولا تو یکایک میرا دماغ غصّہ سے کھولنے لگا۔ لوگ کتنے پست ذہن اور مفاد پرست ہیں۔ ذرا سے آرام کے لیے دوسروں کا کچھ خیال نہیں کرتے۔ یہ دنیا کس سمت جا رہی ہے؟ آدمیت کہاں کھو گئی ——؟ انسانیت کی رگوں میں موجیں مارتا ہوا خون سرد کیوں ہو گیا ہے؟ آدرشوں کے بھونڈے بھدّے اصول —— موٹی کتابوں کے ابھرتے شعلوں میں درندوں کی طرح ناچتی ہوئی قدیم روایتیں —— جن کی تبدیلیوں کا کوئی شمار نہیں —— لیکن وقت کا فیصلہ تو اہم ہوتا ہے۔ اسے کسی کی موت یا زندگی کا انتظار نہیں ہوتا ——!

فضاؤں میں پھیلا سوالوں کا یہ دھواں کیسا ہے ——؟ کڑوا کسیلا دھواں —— جو حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ میرے کس جرم کی سزا ہے ——؟ کہ لمحے دو لمحے کے فاصلے نے مجھے ان ہنگاموں کے بیچ لا کھڑا کیا۔ قیامت کا سا ہنگامہ —— جیسے حشر کا میدان ہو —— کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہ تھا —— سبھی جگہوں کی تلاش میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ ہیولوں کی طرح ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے —— جوش، جذبہ۔ مایوسی —— متفرق خیالات کی ساری لکیریں گرد و غبار میں دھندلی پڑ گئی تھیں —— کوئی آرام دہ ڈبے میں بیٹھا اطمینان سے سگار پی رہا تھا —— اور کوئی دوزخ کی آگ میں جل رہا تھا۔ جیسے جلنا ہی اس کا مقدر ہو —— مجھے خود پر بڑا غصّہ آیا۔ میں کاہل تھا۔ یا میرے ساتھ وقت کا مزاج بدل گیا تھا —— کہ میری ٹرین چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی۔

جب میں پلیٹ فارم میں داخل ہوا تو گاڑی کی رفتار میں قدرے تیزی آ چکی تھی —— میں بھی اسی سمت تیزی سے بھاگتا ہوا ایک دروازے کی طرف لپکا۔ لیکن کمپارٹمنٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی کسی نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا —— جیسے میں کوئی اچھوت تھا۔ جس سے وہ دور رہنا چاہتے ہوں یا ریت کا کوئی ذرّہ —— جو کانٹا بن کر آنکھوں میں چبھتا ہے —— مجھے اس کی یہ نازیبا حرکت بڑی بُری لگی —— مگر غصّہ پی کر رہ گیا۔ پھر دوسرا ڈبہ سامنے آیا —— وہ تو پہلے ہی سے بند تھا —— اور جب کئی ڈبے سامنے سے گذر گئے تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

میرا یہ سفر اپنا شوق پورا کرنے کے لیے نہیں تھا —— اس لیے کہ میری زندگی میں شوق کو کوئی اہمیت حاصل نہیں —— اپنی ذات کی تکمیل —— اور زندگی کو قائم رکھنے کے لیے میرا یہ سفر ضروری تھا —— میں اپنے شعور کا کرب برداشت نہ کر سکا —— اور جب ٹرین کا آخری ڈبہ میرے سامنے آیا تو میں نے لپک کر دروازہ کی آہنی سلاخوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ اور میں زندگی کے بوجھ کو ہاتھوں میں تھامے ریت پر کھڑا تھا —— تپتے ہوئے صحرا میں ننگے پاؤں —— جیسے تلووں میں کوئی بجلی کے شاک دے رہا ہو —— میں نے چلّا چلّا کر لوگوں سے دروازہ کھولنے

کو کہا۔ لیکن کون کس کی بات سنتا ہے۔ کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی ——— میری آواز میرے ہی وجود سے ٹکرا کر لوٹ آئی ——— بے نام اداسی میں گھلی ہوئی ——— ٹوٹی ہوئی ایک سایہ دیوار پر جھول رہا تھا ——— بالکل الگ ——— تنہا ——— مجھے کچھ سجھائی نہیں پڑتا ——— ساری کائنات میرے وجود میں سمٹ کر آگئی ہے میرا نہ کوئی ماضی ہے ——— اور نہ مستقبل ——— میں حال کا تنہا آدمی ہوں ——— میرے اطراف اندھا سمندر پھیلا ہے۔ بھیانک اور خوفناک ——— لیکن میرے لیے کسی کے منہ سے ہمدردی کے دو لفظ بھی نہ نکل سکے۔ ہر لمحہ خوف اور وحشت ——— جیسے گاڑی پل صراط سے گزر رہی ہو ——— ذرا بھی ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑی تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا ——— گاڑی اسٹیشن سے نکلی تو میں سگنل پول سے ٹکراتے ٹکراتے بچا ——— اگر ذرا بھی چوک ہوتی تو میرا سر پاش پاش ہو کر رہ جاتا ——— مگر آدمی کا خون کتنا سفید ہو چکا ہے کہ کوئی باہر کھڑا موت اور زندگی سے کھیل رہا ہے ——— اور اندر کسی کو باہر کی کوئی فکر نہیں ——— دنیا اس خود غرضی کی آگ میں جل جائے گی ——— جلنے دو اس آگ کو ——— تاکہ ساری کائنات جل کر راکھ ہو جائے ——— تو پھر آگ بھی سرد پڑ جائے گی۔

کائنات پر چھائی ہوئی یہ تیرگی کیسی ہے۔ آدمیت کافور تو نہیں ہو گئی ——— غصہ میں آکر میں نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا ——— تب جا کر لوگ جیسے اچانک کسی گہری نیند سے جاگے ——— دانتوں کے درمیان جب ریت آجاتی ہے۔ تب آدمی کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ——— آدمی کا اپنا شعور کچھنے لگتا ہے۔ بڑی ناگواری کے ساتھ کسی مسافر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ شاید وہ میرے مسلسل دروازہ پیٹنے کی آواز سن کر جاگا تھا۔ اس نے اپنے قریب ہی میرے لئے جگہ بنائی۔ اور میں بیٹھ گیا۔

اندر ماحول کسی قدر پر سکون تھا۔ لمحہ بھر تک میں نے اچٹتی سی نگاہ چاروں طرف ڈالی ——— وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ہر شے سبک اور ہلکی تھی ——— سامنے درمیانی سیٹ پر ایک بھدی سی نوجوان لڑکی ایک خوبصورت سے مرد کے ساتھ باتیں معروف تھی ——— لڑکی کے وجود میں کوئی کشش تو نہ تھی، لیکن کوئی بات ایسی تو ضرور ہوگی ——— جس کے کارن نوجوان کو اس کی طرف مائل ہونا پڑا ہوگا۔

اور پچھلی سیٹ پر موٹے اور بڑے بڑے توند والے کچھ بیٹھے تھے۔ وہ سب حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کوئی ملک کے موجودہ حالات سے بیزار تھا۔ کوئی چور بازاری اور بدعنوانی کے خلاف بول رہا تھا۔ اور کوئی غریبوں کے حق میں لکچر دے رہا تھا ——— لیکن سبھی اس بات پر متفق تھے کہ انسانیت کی خدمت ہی آدمی کی زندگی کا آدرش ہونا چاہیے۔

ایک برتھ پر کئی منچلے نوجوان بیٹھے تھے۔ جو کسی فلمی ہیروئن کی اداکاری پر تبصرہ کر رہے تھے۔ گویا ہر شخص اپنے آپ میں معروف تھا۔

میں بھی اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ لمحہ بھر میں ساری تکان دور ہو گئی ——— تھکن اور مایوسی کا کوئی احساس باقی نہ رہا۔ چہرے پر ناگواری کے جو اثرات ابھرے تھے ——— ڈبے کی پر سکون فضا میں تحلیل ہو گئے۔

سفر بھی ایک عجیب دھوکہ ہے۔ لمحے دو لمحے کا رشتہ کتنا گہرا بن جاتا ہے کہ صدیوں اس کی یادوں کا اثر دل سے نہیں جاتا ——— جلد ہی میں نے اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ——— پھر تو کمپارٹمنٹ کی فضا ہی یکسر بدل گئی میں اپنے ہم سفر کا اتنا اچھا اور گہرا ساتھی بن گیا ——— جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کے بے حد قریب رہے ہوں ——— اور آگے کے مقام پر اترنے سے پہلے مجھے کئی بار سوچنا ہوگا کہ کہیں ہمارا جدائی ایک دوسرے کو دل برداشتہ نہ کر دے ——— دل ایک آبگینہ ہے۔ جو ایک معمولی ٹھوکر سے بھی ٹوٹ جاتا ہے اور میں کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتا۔

گاڑی اپنے پیچھے بے شمار یادوں کو چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی ہے ——— اپنی منزل کی طرف ——— اجنبی پن کے احساس کو مٹانے کے لیے ——— اپنے سپاٹ سینے پر وقت کی بے شمار کہانیاں لیے ——— اپنے اپنی ذمہ داریوں

کتنا احساس ہے۔

میری منزل ابھی دور تھی ۔۔۔ کئی گھنٹوں کا سفر باقی تھا۔ اور مجھے محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ میں سفر میں ہوں ۔۔۔

اگلا اسٹیشن جہاں کچھ لمحے بعد گاڑی رکنے والی تھی۔ کوئی دیہاتی علاقہ تھا۔ اس جگہ گاڑی محض چند منٹوں کے لیے ہی رکتی تھی لیکن علاقے کے لوگ ایسے جاہل اور ضدی تھے ۔۔۔ کہ جب تک وہ اپنے لوگوں کو گاڑی میں سوار نہیں کر لیتے ۔۔۔ گاڑی آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ اسٹیشن کے قریب ہی گاؤں کا ہاٹ لگتا تھا ۔۔۔ دور دراز سے لوگ وہاں سودا سلف کرنے آتے تھے ۔۔۔ اور آج ہاٹ کا دن تھا ۔۔۔ اس لیے اسٹیشن پر بڑی بھیڑ تھی ۔۔۔

گاڑی کے پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہی جیسے پورا اسٹیشن حرکت میں آ گیا۔ عجب بے لبی اور بے کسی کی سی کیفیت تھی۔ لوگ ڈبوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

میں اپنے ہمسفر سے کسی اہم موضوع پر محو گفتگو تھا ۔۔۔ اس نئی آفت سے بچنے کے لیے میں نے اٹھ کر آہستہ سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ تاکہ بھیڑ اندر نہ آسکے۔ ایک لمحے کے لیے ۔۔۔ محض ایک لمحے کے لیے کسی نے میرے وجود کی گہرائیوں سے مجھے پکارا ۔۔۔ اور مجھے اس ایک پل کی یاد دلائی ۔۔۔ جب اندر کے لوگوں نے مجھ پر دروازہ بند کر دیا تھا ۔۔۔ مگر میں نے اپنے اندر کی آواز کو دبا دیا ۔۔۔

اور جب میں پلٹا تو میرے ہمسفر کی آنکھیں گہری اجنبیت کا درد لیے ہوئے جیسے میرے سینے میں اتر گئیں ۔۔۔ میں نے باتوں کا سلسلہ پھر سے قائم کرنا چاہا ۔۔۔ مگر وہ شخص پتھر بن چکا تھا ۔۔۔ اور جیسے میرے اندر کا کوئی بے رنگ، دھندلا شیشہ اس کی ضرب سے چکنا چور ہو گیا تھا۔

▲▲

ڈاکٹر عبد العلیم کی رحلت

۱۸ فروری کی سہ پہر کو نئی دلی کے ولنگڈن اسپتال میں ڈاکٹر عبد العلیم کا انتقال ہو گیا جہاں انھیں انتقال سے ایک روز قبل دل کا دورہ پڑنے کے بعد داخل کیا گیا تھا۔ انتقال کے وقت ڈاکٹر عبد العلیم کی عمر ۷۱ برس تھی اور انھیں خون کے دباؤ کا عارضہ لاحق تھا۔

ڈاکٹر عبد العلیم کا شمار ملک کے ممتاز ماہرین تعلیم میں کیا جاتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں برلن، مغربی جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دلی سے اپنی تعلیمی خدمات کا آغاز کیا تھا۔ یہاں سے وہ عربی زبان و ادب کے لیکچرر بن کر علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے۔ کچھ مدت بعد اسی حیثیت سے لکھنؤ یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو گیا لیکن ۱۹۵۰ء میں ریڈر بن کر وہ دوبارہ علی گڑھ یونیورسٹی میں آ گئے۔ ۱۹۶۸ء میں انھیں اس یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا، اس سے پہلے انھوں نے وہاں اسلامی علوم کے شعبے کے ڈائرکٹر، ڈین اور رجسٹرار کی حیثیت سے بھی کام کیا تھا۔ آج کل وہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے قائم کردہ ترقی اردو بورڈ کے چیئرمین تھے اور اردو کی ترقی و ترویج کی ایک بڑی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر تھی، جسے اپنی بیماری اور پیرانہ سالی کے باوجود وہ کامیابی سے نبھا رہے تھے۔

مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار لڑکیاں اور ایک فرزند ڈاکٹر عبد الحلیم ہیں جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لیکچرر ہیں۔ ہم ان کے غم میں شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا انھیں یہ صدمۂ عظیم برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرے۔

—— ادارہ

شفیق صدیقی

بیج

اس نے اس بیج کو بغور دیکھا ۔ کون سے پودے کا بیج ہوگا؟ اس نے اپنے ذہن سے سوال کیا ۔ لیکن اس بیج کے پودے کا نام اسکا ذہن نہ بتا سکا وہ بڑبڑایا ۔ خیر ہوگا کوئی بیج کو بونے کے بعد کوئی نہ کوئی پودا اُگ ہی آئے گا ۔ اس نے زمین کے ایک حصّے کو تھوڑا سا کھودا اور اس بیج کو بو دیا ۔

پھر وہ روز اس جگہ پانی ڈالتا رہا ۔ کئی دن گزر گئے ۔ لیکن کسی قسم کا بھی پودا نہیں پھوٹا وہ حیران ہوا ـــ اس نے چند دن اور انتظار کیا ـــ ایک مہینہ گزر گیا ـــ لیکن پودا زمین سے برآمد نہیں ہوا ـــ اس نے سوچا ـــ آخر کیا بات ہے ـــ دیکھنا چاہیے بیج کو تقویت پانے کے بعد اب تک پودا بن جانا چاہیے تھا ـــ اس نے زمین کو کھودا ـــ لیکن اسے کہیں بھی بیج نظر نہ آیا ـــ اس نے آس پاس کی ساری زمین کو چھان ڈالا ـــ لیکن بیج نہ ملا ـــ وہ بہت حیران ہوا ـــ آخر بیج کدھر گیا ـــ وہ کئی دنوں تک اس تشویش میں مبتلا رہا کہ بیج کہاں گیا ـــ چند دن بعد وہ اس واقعہ کو بالکل بھول گیا ـــ

ایک دن جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا ـــ اس کی نظر دیوار پر پڑی ـــ وہ چونک پڑا ـــ دیوار پر سرخ پھولوں کا گچھا سا لگا ہوا تھا ـــ اس نے آگے بڑھ کر دیوار پر لگے پھولوں کی جانب ہاتھ بڑھایا ـــ لیکن وہ بہت اوپر تھے ۔ ایک کرسی گھسیٹ کر وہ اس پر چڑھ گیا ـــ اب اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی ـــ کیونکہ وہ جن کو پھول سمجھ رہا تھا ، وہ تو ایک پودا تھا ـــ سرخ پودا ـــ ! جس کے پتے بھی سرخ تھے ـــ اور شاخیں بھی سرخ تھیں ـــ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں یہ اس بیج کا پودا تو نہیں ـــ تو پھر وہ بیج اس دیوار میں اتنی بلندی تک کیسے آ گیا ـــ اس کا ذہن خیالات کے پیچیدہ جال میں پھنستا چلا گیا ـــ

اس نے آہستگی سے اس پودے کو چھوا ـــ لیکن چھونے کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ کو تیزی سے کھینچ لیا ـــ پودا نہایت ہی ملائم تھا ـــ روئی کی مانند ـــ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے جس جگہ چھوا تھا ـــ وہاں کا رنگ اڑ گیا تھا ـــ اور اتنا حصّہ سفید ہو گیا تھا ـــ " یہ کونسا پودا ہے ؟؟ " ـــ اس نے پھر اپنے ذہن سے سوال کیا ـــ لیکن ذہن سے اب بھی کوئی جواب نہ بن پڑا ـــ

دفعتاً کچھ سوچ کر اس نے کدال اور پھاوڑا اٹھا لیا ـــ اور کمرے کی دیوار کے اس حصّے کو جس پر پودا لگا ہوا تھا ـــ توڑنے لگا ـــ وہ پودے کو جڑ سے نکالنا چاہتا تھا تاکہ اس کے بارے میں تحقیق کر سکے ـــ کچھ ہی دیر بعد اس پودے کی جڑ نظر آئی ۔ جڑ دیوار کے بہت اندر تک چلی گئی تھی ـــ اس کو اکھیڑ کر نکالنے میں بڑی دقت ہوئی ـــ لیکن اس نے اس کو نکال لیا ـــ جڑ کو پکڑنے کے ساتھ ہی ـــ وہ حصّہ جو سفید تھا ـــ پھر سرخ رنگ میں تبدیل ہوتا گیا ـــ

اس پودے کو اس نے بڑی احتیاط سے زمین کے ایک حصّے میں لگا دیا ـــ اور کمرے میں داخل ہوا ـــ کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ چونک پڑا ـــ کیونکہ دیوار اپنی پہلی حالت میں تھی ـــ وہ دوڑتا ہوا اس جگہ گیا ـــ جہاں اس نے وہ پودا لگایا تھا ـــ لیکن وہاں پر سوائے ایک بیج کے کچھ بھی نہیں تھا ـــ اور ـــ اور وہ بیج وہی تھا ـــ !! ●●

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیے

(مینیجر)

عروج زیدی

لوگ اس رُخ سے بھی فصلوں کو ہوا دیتے ہیں
شکرِ بیداد کو فریاد بتا دیتے ہیں

وہ توجہ کو تغافل کی ادا دیتے ہیں
منفرد رنگ میں انعامِ وفا دیتے ہیں

سوچتا ہوں میں کوئی رونقِ صحرا تو نہیں
کیوں بگولے مجھے رہ رہ کے صدا دیتے ہیں

کوچۂ دوست میں ہر گام پہ ہیں دیر و حرم
یہ تصور ہمیں نقشِ کفِ پا دیتے ہیں

اصلِ جوہر ہے یہاں وجہِ خرابیِ بشر
لوگ سقراط کو بھی زہر پلا دیتے ہیں

خوش رہیں جو مری نسبت سے ہیں سرگرمِ عمل
کم سے کم راہ میں کانٹے تو بچھا دیتے ہیں

شعر میں فن بھی ہے، ندرت بھی روایت بھی عروجؔ!
ہم اسے جدتِ اسلوبِ ادا دیتے ہیں

▲▲

ابوالمجاہد زاہدؔ

گیا، تو حسن نہ دیوار میں نہ در میں تھا
وہ ایک شخص، جو مہمان میرے گھر میں تھا

نجات دھوپ سے ملتی تو کس طرح ملتی
مرا سفر تو یہاں! دشتِ بے شجر میں تھا

غمِ زمانہ کی ناگن نے ڈس لیا سب کو
وہی بچا جو تری زلف کے اثر میں تھا

دیارِ غیر میں پہچانتا بھی کیا کوئی
کہ اجنبی تو میں خود اپنے ہی نگر میں تھا

نہ آئی گھر میں کبھی اک کرن بھی سورج کی
اگرچہ میرا مکاں وادیِ سحر میں تھا

کھلی جو آنکھ تو افسونِ خواب ٹوٹ گیا
ابھی ابھی کوئی چہرہ مری نظر میں تھا

نہ چین لینے دیا پھر بھی سنگباروں نے
نہ کچھ جنوں ہی نہ سودا ہی میرے سر میں تھا

ملا نہ گھر سے نکل کر بھی چین اے زاہدؔ
کھلی فضا میں وہی زہر تھا جو گھر میں تھا

▲▲

دلؔ ایوبی

فریبِ عشرتِ قلب و نظر سے کیا کم تھی
ہماری شامِ الم بھی سحر سے کیا کم تھی

خطا ہے عشق تو سب کچھ مری خطا تو نہیں
جو بات ادھر سے بڑھی تھی ادھر سے کیا کم تھی

مرے لیے بھی رفیقانِ راہ کی منزل
کسی چراغِ سرِ رہگزر سے کیا کم تھی

تجھے بھی ہے غمِ انجامِ آشیاں، صیاد
تری نگاہ بھی برق و شرر سے کیا کم تھی

نہ غفلتوں میں اگر مبتلا ہوئے ہوتے
وہ دروزہ زیست بھی عمرِ خضر سے کیا کم تھی

انھیں تلاش کیا تھا ہزار میں اے دلؔ
مری نظر بھی کسی دیدہ ور سے کیا کم تھی

▲▲

خورشید افسر بسوانی

میری نظروں سے وہ ہر چند کہ بچا بھی گیا
روشنی بن کے مرے جسم کو چھوتا بھی گیا

اس سے میرا کوئی خاص تعلق بھی نہیں
آج لیکن وہ مرے نام سے شرما بھی گیا

دشمنو، مجھکو خود اپنا ہی پتہ یاد نہ تھا
خیر تم سے تو میں اپنوں کا پتہ پا بھی گیا

کچھ تو بھٹکے تھے مرے راہ میں نقش بیں قدم
اور کچھ جان کے پتھر سے میں ٹکرا بھی گیا

وہ مرے پاؤں کے چھالوں کی بدولت ہی سہی
میں تو جس راہ سے گزرا اُسے چمکا بھی گیا

بزم رنداں میں ترستا ہی رہا میں افسرؔ
اک نیا شخص مرے نام کی چھلکا بھی گیا

کرشن مراری

نشاطِ بیخودی میں یہ کے منزلوں سے بے خبر
گزرنا تھا گذر گیا یہ زندگی کا قافلہ

سوالِ بے جواب سے جوابِ بے سوال تک
چھڑا رہا کسی سے اپنی گفتگو کا سلسلہ

نہ کام کوئی ہو سکا نہ بات کوئی بن سکی
نہ کچھ کہا تھا آپ نے نہ ہم نے کچھ کبھی سنا

فضائیں مسکرا اُٹھیں ہوائیں گنگنا اُٹھیں
برنگِ موجِ نور وہ حسیں جدھر جدھر گیا

تمھاری زلفِ عنبریں ہے دشمنِ سکونِ دل
یہ رُخ پہ جب بکھر گئی تو دل مچل مچل گیا

بڑے ہی دل نواز تھے جزیرے میرے خواب کے
کنول کی طرح کھل رہا تھا چہرہ اِک حسین سا

ساحلؔ احمد

راہ کا پتھر کبھی بولا نہیں
آج تک تم نے مجھے جانا نہیں

آرزوؤں کے سلگتے دشت میں
اک پرندہ بھی کہیں اُڑتا نہیں

کھو گیا ہوں حلقۂ احساس میں
آئینہ کو آج تک بھولا نہیں

ابر اُڑتے ہیں پہاڑوں کی طرف
اب کہیں بھی دھوپ کا سایہ نہیں

منجمد ہے برف شیشے میں ابھی
کیا کسی نے شعلہ دکھلایا نہیں

کس نے پایا ہے سراغِ زندگی
جو گیا وہ لوٹ کر آیا نہیں

آج کھیتی (انگلستان)

جیون تپتا ریت کا تھل
سونے کا دکھ کا، پیتل

دیکھ کے اندھی گپھا میں چل
خوف کا دیو نہ جائے نگل

تیرا بدن اور تاج محل
سندرتا کے دو ہمبل

دھوپ نے جھانکا کھڑکی سے
مچ گئی کمرے میں ہل چل

پاپ دھلیں گے دونوں سے
مدرا ہو یا گنگا جل

دیکھ، نہ بھاری پتھر پھینک
دِل ہے نازک شیش محل

راج ہمیں نے چھلکایا
اپنے لہو سے جامِ غزل

▲▲

شانؔ بھارتی

عوضِ یقیں کے متاعِ سراب کیا کرتا
میں صرف دیکھ کے محلوں کے خواب کیا کرتا

کہوں تو کیا کہ تجھے بھا گیا اندھیرا بھی
دیا جلا کے پسِ آفتاب کیا کرتا

فضا غبارِ جہالت سے ہو چکی بوجھل
بھلا، دماغ کوئی احتساب کیا کرتا

ہوا تھی سرد مگر جل رہا تھا سارا بدن
فضا عجب تھی مگر اجتناب کیا کرتا

زبان جس کی نہیں لکنتوں سے پاک ابھی
وہ گفتگو میں مجھے لاجواب کیا کرتا

▲▲

شاہؔ ظہیر

محصور رہگذر میں نہ تھی رہگذر کی آگ
اب گھر کی سمت بڑھنے لگی ہے نگر کی آگ

نزدیک تر ہے سیلِ ہوا، یہ تو سوچ
دل ہے شرارِ سنگ کہ سوکھے شجر کی آ

بے آب دشتِ جاں ہے کہاں اب اما
چہرے کی جوت بجھ گئی، لیکن یہ سر کی آ

اب روشنی سے تیز ہے رفتار پا قو
میرے لہو میں کس نے لگا دی سفر کی آگ

جلنا ہوا نصیب نہ خود اپنی آگ میں
تنہائی میں بھی ساتھ رہی در بدر کی آگ

▲

سید حبیب

نظم

ستارہ شام کا لیتا ہے ہنس کے انگڑائی
شریر چاند نے شب کی نقاب سرکائی

رگوں سے شب کی لہو پھوٹ کر نکلتا ہے
یہ غازہ آسماں چہرے پہ اپنے ملتا ہے

مگر اے دوست نہ گھبرا تو اس اندھیرے سے
کہیں اداس نہ ہونا تو اس اندھیرے سے

کبھی تو دامنِ شب تار تار دیکھے گا
سحر کا نور اسی تیرگی سے نکلے گا

جو بخت سویا ہوا ہے وہ جاگ جائے گا
تمام رات جو رویا وہ مسکرائے گا

▲▲

جی ۔ اے غضنفر

نظم

کئی سمت سے روشنی کی شعاعیں
مجھے آکے اپنا تماشا دکھانے لگیں
میں نے چاہا ہری نیلی پیلی گلابی
شعاعوں سے رنگین کرلوں
یہ ویران کمرہ مگر
روشنی کی لکیریں پکڑنے جو آگے بڑھا
ٹوٹ کر دائروں میں بکھرتا گیا
ہاتھ آئی نہ میرے کوئی بھی کرن
بڑھ گئیں اور کمرے کی ویرانیاں

▲▲

جبار جمیل

دم بہ دم

خام سوچوں کے مومی پروں کی مدد سے

میں کہاں تک اڑوں

حقائق کا سورج ،

دم بہ دم مجھ سے نزدیک تر ہو رہا ہے

▲▲

اگر کنبہ چھوٹا ہو تو والدین ہر بچے پر زیادہ توجہ دے سکتے ہیں اور اسے زندگی کی زیادہ سہولتیں مہیا کر سکتے ہیں۔ اس سے ملک کو بھی بحیثیت مجموعی اپنے وسائل کے بہتر استعمال کا موقع ملتا ہے۔

فیملی پلاننگ ہماری قومی ترقی کے پروگرام کا ایک لازمی جزو ہے اور ہم نے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے تمام ذرائع کو بروئے کار لانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔



اندرا گاندھی

تبصرے

اردو کیسے لکھیں

رشید حسن خاں صاحب پچھلے پندرہ سولہ برس سے املا کے موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں اور گزشتہ دنوں اپنے نتائج تحقیق کو وہ ایک ضخیم کتاب کی صورت میں "اردو املا" کے نام سے شائع بھی کرا چکے ہیں (ناشر: ترقی اردو بورڈ، تقسیم کار: نیشنل اکاڈمی) اس کتاب میں املا اور متعلقاتِ املا کے تمام مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے اور سابقہ شہادتوں اور حالیہ معلومات کی روشنی میں املا کے ضابطے طے کیے گئے ہیں یہ کتاب اردو کے طلبہ کے علاوہ اہلِ علم کے لیے بھی کشش کی حامل ہے۔ اب خاں صاحب نے بہ طور خاص طلبہ اور اساتذہ کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر، جو طلبہ کو صحیح املا سکھانے کے ذمے دار ہیں، زیادہ تفصیلات میں جائے بغیر، املا کے کچھ ضروری قواعد اختصار کے ساتھ زیر نظر کتابچے میں مرتب کر دیے ہیں۔

املا کے ضابطوں میں ڈھیلا پن اور اک گونہ انتشار دنیا کی تقریباً سبھی تحریری زبانوں میں موجود ہے لیکن اردو میں بے ضابطگی کا عمل دخل کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ یہاں ایک ہی لفظ کو لوگ کئی کئی طریقوں سے لکھتے رہے ہیں اور حرفوں کے استعمال میں بھی بے امتیازی کا رواج رہا ہے۔ مثلاً ایک زمانے میں یاے معروف و مجہول میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ ہاے ملفوظ و مخلوط میں بھی یہی عدم امتیاز روا رکھا جاتا تھا اور کبھی کبھی یہ بے امتیازی اب بھی دیکھنے میں آجاتی ہے، قلمی مسودوں میں بھی اور مطبوعہ تحریروں میں بھی۔ ایسا نہیں ہے کہ ان بے ضابطگیوں کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا ہو۔ حسن مارہروی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور دوسرے کئی اہلِ علم نے یہ کوششیں کیں کہ اردو لکھاوٹ کے کچھ قواعد منضبط ہو جائیں۔ مولوی عبدالحق کی کوششوں سے ایک اصلاحِ املا کمیٹی بھی قائم ہوئی تھی جس کی سفارشات انجمن کے رسالہ "اردو" میں ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھیں۔ لیکن ان سفارشات پر پوری طرح عمل نہ ہو سکا اور چونکہ کمیٹی نے بعض الفاظ کے املا میں تبدیلی کی تجویز بھی پیش کی تھی اس لیے کچھ اختلافات بھی سامنے آئے۔ خاں صاحب نے، جیسا کہ انھوں نے "اردو املا" کے دیباچے میں بھی کہا تھا اور زیرِ نظر کتابچے کے پیش لفظ میں بھی لکھا ہے، انھی سفارشات کو اپنے کام کی بنیاد بنایا ہے۔ ترقی اردو بورڈ کی قائم کردہ املا کمیٹی کے وہ خود بھی رکن ہیں، جس کی سفارشات "املا نامہ" کے نام سے چھپ چکی ہیں (مرتب، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، تقسیم کار: مکتبہ جامعہ)

اختصار کے باوجود رشید حسن خاں نے کوشش کی ہے کہ صحتِ املا کے تمام ضروری نکات کا بیان اس کتابچے میں آجائے۔ صحت املا کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ضمناً انھوں نے خط نسخ اور خط نستعلیق کی جداگانہ خصوصیات بھی واضح کی ہیں۔ انھوں نے حرفوں کے جوڑوں اور ان کی مختلف ترکیبی صورتوں کی وضاحت کی ہے۔ اعراب، علامات اور اوقاف کے استعمال کی صحیح صورتیں بتائی ہیں، لفظوں کو ان کے صحیح املا کے ساتھ لکھنے کے طریقوں کی نشاندہی کی ہے اور ان قاعدوں کی وضاحت کرتے ہوئے جنھیں سامنے رکھ کر انھوں نے کسی لفظ کے صحیح یا غلط املا کا فیصلہ کیا ہے، ہر بحث کے آخر میں ایسے بہت سے لفظ درست املا کے ساتھ

درج کیے ہیں جن کا غلط املا رواج پا گیا ہے۔

خاں صاحب کی وضاحتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحتِ املا کے تین معیار ان کے ذہن میں رہے ہیں: کسی لفظ کے اصل مادّے کو سامنے رکھ کر اس کے املا کا تعین کیا جائے، ایک لفظ جس طرح متواتر لکھا جاتا رہا ہے اور ذہنوں پر نقش ہو چکا ہے، اس کا وہی املا قابلِ ترجیح ہے، خواہ بعض صورتوں میں وہ اصل مادّے سے مطابقت نہ بھی رکھتا ہو یا یہ دیکھا جائے کہ کوئی لفظ زیادہ سہولت اور آسانی کے ساتھ کس طرح لکھنے پڑھنے میں آسکتا ہے۔ یہ تینوں اصول اپنی جگہ قابلِ لحاظ ہیں لیکن ان صورتوں کا بھی قطعی تعین ہونا چاہیے جب ان میں سے کوئی ایک اصول قابلِ ترجیح سمجھا جائے کیونکہ ان تینوں اصولوں میں کوئی ربط باہم نہیں ہے اور ترجیحی ضابطوں کے تعین کے بغیر یہ سوال الجھن پیدا کرتا رہے گا کہ کس لفظ پر کس اصول کا اطلاق ہونا ہے۔

خاں صاحب اس خیال کے مؤید ہیں کہ مرکب لفظوں کو ملا کر نہیں لکھنا چاہیے۔ ایسے مرکب لفظوں کے بارے میں بھی جو مفرد الفاظ کے طور پر استعمال ہونے لگے ہیں، ان کی یہی رائے ہے اور اصولاً یہ رائے درست ہے لیکن ایسے بہت سے الفاظ ہیں جن کے بارے میں اب یہ تصور باقی نہیں رہا کہ وہ مرکب ہیں۔ اگر انھیں اس اصول کی رو سے کہ ان کی مروج شکلوں سے اردو والے بہت زیادہ مانوس ہو چکے ہیں اسی طرح لکھا جاتا رہے تو کیا حرج ہے مثلاً کیونکہ، چنانچہ، بلکہ اور دوسرے بہت سے ایسے ہی الفاظ، لیکن رشید حسن خاں یہاں آسانی اور سہولت کے تقاضوں کو ترجیح دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ تک کہنا ہے کہ ایسے مفرد الفاظ جو آسانی کے ساتھ ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکتے ہوں علیحدہ لکھے جائیں مثلاً وہ چاہتے ہیں کہ 'دلدل' کو 'دل دل' لکھا جائے۔ بعض مصادر کو بھی انھوں نے اسی ذیل میں رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح بہت سے لفظوں کی شکلیں مسخ ہو جائیں گی اور کچھ نئی الجھنیں بھی پیدا ہوں گی۔ مثلاً ایک معروف مصدر ہے، مسکرانا۔ اسے دو ٹکڑوں میں بانٹ کر 'مس کرانا' لکھا جائے گا تو قاری کا ذہن اس مصدر کی طرف مشکل ہی سے منتقل ہوگا اور وہ 'مس' اور 'کرانا' کو دو الگ الگ لفظ سمجھ کر کچھ دوسرے معنی تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ انگریزی لفظوں کو بھی خاں صاحب کئی کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر کے لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ مدعا وہی ہے کہ انھیں لکھنے میں اور غیر انگریزی داں لوگوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے میں بھی آسانی رہے۔

ہائے مختفی اور ہمزہ کا اردو میں بہت بے جا استعمال ہوتا رہا ہے۔ ہائے مختفی ہندی میں موجود نہیں لیکن اردو والے بہت سے ہندی الاصل الفاظ کے آخر میں اسے الف کی جگہ استعمال کرتے رہے ہیں (پتہ، بھروسہ اور ایسے دوسرے تمام الفاظ جن کے آخر میں الف لکھنا چاہیے 'پتا'، 'بھروسا'۔ اسی طرح ہمزہ کہیں 'ی' کی جگہ استعمال ہوتا رہا ہے (دیجئے، لیجئے وغیرہ جن میں دو 'ی' لکھی جانی چاہئیں: 'دیجیے، لیجیے') کہیں کسرۂ اضافت کی جگہ جیسے زندگیٔ جاوید وغیرہ اور بہت سی صورتوں میں ایک فالتو حرف کے طور پر بھی جیسے رائے وغیرہ۔ خاں صاحب نے ایسے بہت سے الفاظ اور تراکیب کی نشاندہی کی ہے جہاں یہ حروف بے جا طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں۔ یہ پوری بحث توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے۔ یہ ایک قاعدۂ کلیہ ہے کہ ہمزہ کسرۂ اضافت کا بدل نہیں ہو سکتا، خاں صاحب کا بھی یہی کہنا ہے لیکن جی چاہتا ہے کہ جہاں بعض اور کلیوں میں انھوں نے کچھ استثنائی صورتوں کی نشاندہی کی ہے، ایک استثنیٰ یہاں بھی مان لیا جائے اور وہ الفاظ جو یائے مجہول پر ختم ہوتے ہیں، ترکیب اضافی کی صورت میں، ان لفظوں کی طرح جو ہائے مختفی پر ختم ہوتے ہیں، ان کے حرفِ آخر پر بھی کسرۂ اضافت کی جگہ ہمزہ کا استعمال ہی باقی رہنے دیا جائے مثلاً مے ناب کو مےِ ناب نہ لکھا جائے یہ کچھ زیادہ نامانوس صورت ہوگی۔

آزمائش، آرائش جیسے الفاظ میں خاں صاحب اصل کی رعایت سے ہمزہ کی جگہ 'ی' لکھنے کو کہتے ہیں۔

(آزمائش، آرائش) ہندی الاصل الفاظ کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اگر یؔ پر کسرہ ہو تو وہ ہمزہ سے بدل جائے گی مثلاً گھائل، پائل وغیرہ کہ یہ محمل کا قافیہ ہوں گے تو اسی طرح لکھے جائیں گے بصورتِ دیگر یؔ سے: گھایل، پایل۔ لیکن فارسی کے حاصل مصدروں کے قیاس پر بنے ہوئے اردو الفاظ مثلاً رہائش، زیبائش، گرمائش وغیرہ کو اس کے باوجود کہ یؔ پر زیر ہے وہ یؔ سے ہی لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں ضمیمۂ الفاظ کے زیرِ عنوان خاں صاحب نے الفاظ کی ایک طویل فہرست دی ہے جن کا املا ان کی مجوزہ اصلاحات کے مطابق ہے۔ بہت سے لفظوں کے معنی بھی اس میں درج کیے گئے ہیں اور مثالیہ جملوں سے بھی ان کے معنی کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ ضمیمۂ الفاظ طلبہ اور ان کے اساتذہ کے لیے خاص طور پر کارآمد ثابت ہوگا۔

رشید حسن خاں اردو املا یا رسم خط میں کسی تبدیلی کے مؤید نہیں۔ وہ اس تجویز کے بھی حق میں نہیں کہ ہم آواز حروف اردو سے خارج کر دیے جائیں اور ان کا قائم مقام کسی ایک ہی حرف کو قرار دے دیا جائے۔ وہ صرف ان غلطیوں کی اصلاح چاہتے ہیں جو مختلف چور دروازوں سے اردو لکھاوٹ میں راہ پا گئی ہیں، نیز انھوں نے اس پہلو پر زور دیا ہے کہ اردو اگر ایک باقاعدہ زبان ہے تو دوسرے ضابطوں کی طرح اس کے پاس املا کے بھی اپنے ضابطے ہونے چاہییں اور اسے غیر ضروری طور پر کسی دوسری زبان کے طریقِ املا کے اتباع کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایسا موقف ہے جس سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔

"اردو کیسے لکھیں" مکتبہ جامعہ، نئی دلی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، کتابت، طباعت معیاری ہے قیمت چار روپے ہے جو واجبی ہے۔

——— مخمور سعیدی

سفینۂ زرگل

فضا ابن فیضی اردو کے ان چند شاعروں میں ہیں جن کی شاعری کلاسیکل وزن و وقار کی حامل ہوتے ہوئے اس عصری حسیت کی بھی ترجمان ہے جو کسی شاعر کے کلام کو ندرت اور تازگی کے اوصاف سے بہرہ ور کرتی ہے یہ "سفینۂ زرگل" فضا ابن فیضی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان غزلوں میں وہی فنی رکھ رکھاؤ لفظی اور معنوی تلازمات کا وہی سلیقہ اور زبان و بیان کی وہی شائستگی نظر آتی ہے جس پر ہمارے اساتذہ زور دیا کرتے تھے لیکن فضا کی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے روایت سے یہ اکتساب فیض تقلیدی سطح پر نہیں، تخلیقی انداز میں کیا ہے اور روایت کے گوناگوں عناصر کو ردّ و قبول کی میزان میں رکھ کر صرف انہی عناصر سے اپنا رشتہ استوار کیا ہے جو ان کے انفرادی تجربے کے فنی اظہار کو حسن اور اعتبار بخشنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔

بعض لوگ فضا ابن فیضی کو ان کے دو ہمعصر شاعروں نازش پرتاپ گڑھی اور سید حرمت الاکرام کے ساتھ BRACKET کرتے رہے ہیں، اس شکایت کے ساتھ کہ ان تینوں شاعروں کی طرف سے ناقدوں نے بے توجہی برتی ہے اس شکایت سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں شاعروں میں اور فضا ابن فیضی میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ فضا کو نہ تو نازش کی نظموں کے خطیبانہ آہنگ سے قربت ہے نہ حرمت الاکرام کے وضاحتی اسلوب سے بلکہ ان کے لہجے میں ایک ایسا دھیما پن ہے جو خود کلامی کا سا انداز رکھتا ہے۔ لہجے کا یہ دھیما پن سنجیدہ تفکر اور ایک دور رس شعور کی غمازی کرتا ہے۔ شاعر زندگی کے بہت سے نشیب و فراز سے گزر چکا ہے، سنگین حالات کی سفاکیاں اور رنگین لمحات کی دل نوازیاں، دونوں اس نے دیکھی ہیں، دونوں کی فضا میں وہ جیا ہے اور ان مشاہدات کو، ان تجربات کو اس نے اپنی شخصیت میں جذب کر لیا ہے۔ اب اس کی شخصیت، اس کی ذات کا اظہار ہی اس کائنات

کا اظہار ہے جس میں اس نے ایک طویل صبر آزما ذہنی اور جذباتی زندگی بسر کی ہے اور جواب بھی اس کے گرد وپیش کی دنیا ہے۔

فضا ابن فیضی کی شاعرانہ شخصیت سالم نہیں یہ ایک ٹوٹتی بکھرتی ہوئی اکائی ہے جسے سمیٹنے کی کوشش میں شاعر کو بہت کچھ تج دینا پڑا ہے۔ فضا نے کسی ادبی تحریک کے ساتھ خود کو وابستہ نہ کیا، انھوں نے کسی ادبی فیشن کا ساتھ نہ دیا، لوگوں کو چونکا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کا حربہ بھی انھوں نے نہیں آزمایا اور وہ اس توڑ جوڑ سے بھی الگ رہے جس کا سہارا لے کر کچھ لوگ اپنی ادبی ساکھ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے ان کا فنی خلوص اور خود اعتمادی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ خود اعتمادی اس فکری ریاضت کی دین ہے جس میں وہ ربع صدی تک، جو ان کی شاعری کی عمر ہے، ڈوبے رہے ہیں:

سفینۂ زر گل ہے فضا سخن جس کا
خود اپنے سوختہ خوابوں کی گرد ہے وہ شخص

خواب اور شکستِ خواب کی متخالف کیفیات، بیرونی عوامل کی توجیہات کی اپنے دروں میں تلاش اور اپنی ذات کے وسیلے سے کائنات تک رسائی کی خواہش، دردمندانہ احساس اور ایک محزوں سی فکری سنجیدگی، فضا ابن فیضی کے کامیاب اشعار کی یہ وہ داخلی خصوصیات ہیں جو انھیں جدید شاعروں سے قریب لے آتی ہیں۔ ان کے اچھے اور نمائندہ اشعار کا ڈکشن بھی استعاراتی ہے، اور تصورات کی پیکر تراشی کا عمل بھی ان کے ہاں بار بار اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ان کے چند اشعار سے آپ بھی لطف اندوز ہوں:

اپنی ہی جھیل میں ہے کنول اجنبی کوئی میری طرف دیکھتا بھی نہیں
زندگی! یہ بھلا کونسا موڑ ہے، بھیگی بھیگی رُتیں، شعلہ شعلہ بدن
جانتا ہوں اسی کی ہوس میں یہاں لوگ تاریک شب کے مسافر بنے
گیسوؤں کے سمندر میں ہنستا ہوا چاندنی کا جزیرہ وہ گورا بدن

سورج ابھرا تو سیہ پڑ گئے چہرے کتنے
روشنی کا جو تصور تھا، سحر سے بھی گیا
تو بھی اب میرے لیے کچھ دنوں آوارہ بھٹک
جستجو میں تری میں اپنی خبر سے بھی گیا

جانبِ منزل چلا تھا، رہگزر میں کھو گیا
میں وہ دریا ہوں جو قطرے کے سفر میں کھو گیا
بے نوا لفظوں سے کوئی ان کا دکھ کیا پوچھتا
جس نے لب کھولے صداؤں کے بھنور میں کھو گیا

خود اپنا سرخ لہو چاٹتی پھریں صدیاں
بکھرتے ٹوٹتے لمحوں کا وار ایسا تھا
جو دھوپ دھوپ جلا صرف دوسروں کے لیے
مرا لہو شجرِ سایہ دار ایسا تھا

آنے والی صبح کو آؤ یہ ترکہ سونپ دیں
زندگی کا کرب بجھتی مشعلوں میں تھا بہت

چمک کے تیرگیِ جاں بڑھا گیا کچھ اور
مرے لبوں کا تبسم شرار جیسا تھا

وہ ریزہ ریزہ کہاں تک فضا ہمیں چنتا
بکھر گئے کہ اسی میں نجات اپنی تھی

فضا ابن فیضی کی شاعری کا ایک حصہ وہ ہے جو ا
مشاقی کی پیداوار ہے۔ ان اشعار میں بھی شاعری کے خا
محاسن تلاش کیے جا سکتے ہیں لیکن ایسے اکثر اشعار جذ
کی گرمی سے خالی ہیں۔ فضا طویل طویل غزلیں کہتے
اور غالباً ان کی کوشش یہ رہتی ہے کہ جو قافیے ذہن
ہیں اُن میں سے کسی کو چھوٹا نہ جائے۔ وہ اس کوشش
کامیاب بھی ہیں اور اس سے ان کی پختہ مشقی اور قادرا

ظاہر ہوتی ہے لیکن قافیہ پیمائی کے اس عمل میں ان کا جو وقت صرف ہوتا ہوگا، وہ چاہیں تو اس میں ایک اور اچھی غزل بھی کہہ سکتے ہیں۔

"سفینۂ زرگل" کی غزلوں میں کہیں کہیں زبان و بیان کی ایسی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں جن کی توقع فضا صاحب جیسے محتاط اور مشاق شاعر سے نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً ان کا ایک شعر ہے:

ہو چلے ہیں ہم نشیں حسّاس و نکتہ رس بہت
اب تو ڈرتا ہوں تغافل کو کرم بھی بولتے

مصرعِ اوّل میں 'نکتہ' کی ہائے مختفی کے ناگوار اشباع سے قطع نظر مصرعۂ ثانی میں 'بولتے' کی جگہ جو بہ طور ردیف آیا ہے 'کہتے' کا محل ہے۔ ایک اور شعر ہے:

صہبا کے دھوکے میں پھولوں نے مل کے بانٹ لیا
جو دولتِ نفسِ بے ثبات اپنی تھی

یہاں 'بانٹ لیا' صحیح نہیں 'بانٹ لی' ہونا چاہیے:

کتنا مہنگا ہے نہ پوچھو یہ قلم کا سودا
ہم کو بھی نفع کی امید سو گھر سے بھی گیا

دوسرا مصرعہ گنجلک ہو گیا ہے۔

کیا بھلا میری سیہ بختی کا جادو ٹوٹے
حسن اُن آنکھوں کے کجرے کا جلوں میں تھا بہت

'کا جلوں' ذوق پر ناگوار ہے۔

"سفینۂ زرگل" اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے خود فضا صاحب کے اہتمام میں شائع ہوئی ہے اور اس کی ترتیب، کتابت اور طباعت میں وہی سلیقہ ہے جو فضا صاحب کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ قیمت پندرہ روپے ہے۔ کتاب نیشنل اکادمی سے بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

——— مخمور سعیدی

راگ

اضطراب، یہ پارہ صفت شعور، یہ خوف
ری صدی ہے مری خود نوشت میں داخل

مظفر حنفی کی غزلوں کے مجموعے 'صریر خامہ' کے پیش لفظ میں میں نے لکھا تھا:

"مظفر حنفی خود کو طنز نگار شاعر کہنے پر مصر ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی شاعری کو رسمی طنز نگاری سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں، ان کی شاعری دراصل ہمارے دور کی سفاک حقیقتوں کا بڑا سنجیدہ اظہار ہے اور اس میں کہیں کہیں جو غیر سنجیدگی در آتی ہے وہ بھی سنجیدگی ہی کی ایک معکوس صورت ہے۔ ان غزلوں میں زندگی کی طرف شاعر کا جو رویّہ سامنے آتا ہے وہ ایک ایسے شخص کا فطری رویّہ ہے جس نے اپنی آنکھوں سے ہر خوبصورتی کو بدہئیتی میں تبدیل ہوتے دیکھا ہو اور شاید یہ آج کے ہر اُس شخص کا مقدر ہے جس نے آنکھیں کھلی رکھی ہیں۔"

"دیپک راگ" میں شامل ان کی غزلیں اور رباعیاں میرے اس خیال کی تائید مزید کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کے لہجے میں وہ کاٹ موجود ہے جو طنز نگار شاعروں کے کلام کا خاصّہ ہوا کرتی ہے لیکن ان کے ہاں یہ طنز نگاری کی شعوری کوشش سے زیادہ اس صورتِ حال کے سنجیدہ احساس کا نتیجہ ہے جس سے شاعر ہمہ وقت دوچار ہے۔ اس صورتِ حال کے ناگوار پہلو ان کے اشعار کا ہدفِ خصوصی ہیں اور ان پر وار چونکہ وہ پوری بے باکی سے کرتے ہیں اس لیے زد بھی بھرپور پڑتی ہے۔

مظفر حنفی جس عصری صورتِ حال سے دوچار ہیں، وہ اس کی ذمہ داری خود بھی قبول کرتے ہیں۔ تشکیک نئے ذہن کا خاصّہ ہے اور یہ ردِ عمل ہے اُس اندھ وشواس کا جس میں مبتلا ہو کر بہت سے سرابوں کو سمندر سمجھ لیا گیا تھا۔ اس بے یقینی کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ان تمام سماجی تصورات سے فرد کا اعتماد اٹھ گیا جو اس کی زندگی کو کوئی سمت عطا کرتے تھے۔ بے یقینی کا یہ اندھیرا حالات کی پیداوار سہی لیکن خود اعتمادی کا ساتھ نہ چھوٹے تو اس اندھیرے میں بھی روشنی کی کرن تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہ خود اعتمادی آئے کہاں سے جب ذہن اس احساس کی گرفت میں ہو:

نہ لعین ہوں نہ شہید ہوں
نہ یزید کا نہ امام کا

مری لو بلند نہ ہو سکی
مرے سر پہ بوجھ تھا شام کا

یہ احساس آج کے بہت سے ذہین افراد کا مقدر ہے اور یہ جاگ بے بسی اور تنہائی کی وہ کیفیت جسے بعض لوگ نئی نسل کی پہچان سمجھنے لگے ہیں اسی احساس کی پیدا کردہ ہے۔ مظفر حنفی یہاں راضی برضا نہیں اور وہ اس احساس کی گرفت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں:

سرچشمۂ نشاط ہے زخمی پرند کو
کہسار کی کل پہ لچکتی ہوئی کرن
ناسازگاریوں میں مظفر تری غزل
کہرے کے بیچ آنکھ جھپکتی ہوئی کرن

مظفر حنفی کو زبان پر بڑی قدرت ہے وہ بیان کے بنے بنائے اسالیب سے کام نہیں لیتے اور غزلیہ شاعری کے مروج ذخیرۂ الفاظ سے بھی دامن بچاتے ہیں اس کے باوجود ان کے اشعار میں بڑی روانی ہے اور کہیں غرابت کا احساس نہیں ہوتا نئی نئی زمینوں کی تلاش بھی انھوں نے کی ہے اور بحروں کا تنوع بھی ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری ابہام سے دور ہے اور یہ ان کے آہنگ کا قدرتی تقاضا ہے۔

مظفر حنفی بسیار گو ہیں لیکن وہ کہیں خود کو دہراتے نظر نہیں آتے جو ان کی طباعی کی دلیل ہے۔ "دیپک راگ" کی غزلوں میں ان کے فن کا کینوس بھی پھیلتا نظر آتا ہے۔

"دیپک راگ" میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں بھی شامل ہیں اور ترتیب میں انھیں اولیت دی گئی ہے لیکن میری رائے میں مظفر حنفی غزلوں میں زیادہ کامیاب ہیں۔ ان کی رباعیوں کے چاروں مصرعے تاثر کے لحاظ سے یکساں ہوتے ہیں۔ اچھی رباعی کی تعریف یہ سمجھی گئی ہے کہ پہلے تین مصرعے ابتدائیہ کا کام دیں اور اصل نکتہ آخری مصرعے میں پوری شدتِ تاثر کے ساتھ سامنے آئے۔

"دیپک راگ" میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو مظفر حنفی کے عمومی رنگ سے میل نہیں کھاتے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

اسے بھی دیکھ لیتی ہے اُسے بھی دیکھ لیتی ہے
گل و گلزار سے ٹوٹی ہوئی بس ایک لڑکی ہے

قطع نظر اس سے کہ یہ شعر شاعر کے اصل رنگ کا حامل نہیں اس میں اور بھی کوئی خوبی نظر نہیں آتی اس طرح کے اشعار غزلوں سے حذف کر دیے جاتے تو مناسب تھا۔

کتاب سلیقے سے چھپی ہے۔ ناشر: نیشنل اکاڈمی، دہلی
قیمت چھ روپے

——— مخمور سعیدی

یادوں کے سایے

دلی اور بیرونِ دلی کے ادبی حلقے، بالخصوص مشاعروں کے باذوق سامعین ممتاز میرزا صاحبہ کے نام اور ان کے رنگِ کلام سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ ان شاعرات میں ہیں جو محض تفننِ طبع کے لیے شعر نہیں کہتیں بلکہ جنھوں نے شاعری کو بطور فن اپنایا ہے۔ وہ اردو اور فارسی ادب کا اچھا مطالعہ رکھتی ہیں اور کئی برس سے خانۂ فرہنگی ایران (دلی میں سفارت خانۂ ایران کا ایک شعبہ ہے) فارسی زبان و ادب کی معلمہ ہیں۔ ایران کا ثقافتی دورہ بھی کر چکی جہاں فارسی زبان پر ان کی قدرت اور ایرانی تہذیب و ثقافت سے ان کی آگاہی کا کئی اخبارات و رسائل نے تحریری اعتراف کیا ——— "یادوں کے سایے" ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے جو نیا ساہتیہ پبلیکیشنز، نئی دلی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے کہا ہے ممتاز میرزا صاحبہ کی شاعری کا قوی ترین محرک ماضی کی وہ یادیں ہیں جن سے وہ کبھی دامن نہ چھڑا سکیں، کتاب کا نام بھی یہی اشارہ کر رہا ہے۔ یوسف حسین خاں صاحب رقمطراز ہیں:

"ممتاز میرزا نے اپنے اس غزلوں کے مجموعے کا نام "یادوں کے سایے" رکھا ہے جو نہ صرف شاعرانہ ہے بلکہ ان کے کلام کی خصوصیت کی غمازی کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان کی غزلوں میں جو تحت شعوری اور جذباتی محرک کام کرتے ہیں ان میں یادیں سب سے زیادہ شدید اور دور رس ہیں۔ ویسے اور دوسرے جذبات

محرکوں کی رنگا رنگی بھی موجود ہے مثلاً غمِ زیست، دائمی انتظار، آرزو مندی اور محرومی کا احساس۔ اگر نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو ان سب کا تعلق بھی تحت شعور کی بیتی ہوئی زندگی کی یادوں سے نظر آتا ہے، چاہے مبہم اور بطور اشارہ و رمز ہی کیوں نہ ہو۔"

ان سے زیادہ جامع لفظوں میں ممتاز میرزا صاحبہ کے رنگِ سخن کی وضاحت شاید ممکن نہ ہو۔ دوسرے مضامین جو ان کے ہاں نظر آتے ہیں وہ اردو اور فارسی غزل کی روایت سے ان کی وابستگی اور اس روایت کو برتنے کی شعوری کوشش کے نتیجے میں غالباً ان کے کلام میں راہ پا گئے ہیں، ان کا اصل رنگ وہیں چمکتا ہے جہاں وہ یادوں کے دھندلکوں میں ڈوب کر کچھ کہتی ہیں۔

میکش اکبر آبادی صاحب نے ممتاز میرزا صاحبہ کے کلام اور ان کے ترنم کی اثر انگیزی کے ذیل میں ایک ایسا واقعہ بیان کیا ہے جس کا یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

"...... نیاز فتحپوری ممتاز صاحبہ کے یہاں تشریف رکھتے تھے، غزل خوانی ہو رہی تھی۔ نیاز صاحب اپنی غزل سنا چکے (جس کی ردیف "آگئے ہے" "بدجائے ہے" تھی) تو پھر ممتاز میرزا سے فرمائش کی۔ وہ ایک غزل کے بعد دوسری غزل کی فرمائش کیے جا رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے نیاز صاحب کے متعلق میرا یہ تجربہ تھا۔ معلوم نہیں عمر نے انھیں اتنا بدل دیا تھا یا ممتاز کے شعروں اور ان کے ترنم نے ان پر اتنا غیر معمولی اثر کیا تھا، میرے خیال میں یہ دوسری وجہ ہی صحیح ہے۔"

میکش صاحب کا یہ فرمانا بھی بجا ہے کہ "ممتاز کے اشعار میں جو نرمی اور نزاکت ہے وہ یقیناً ان کی صنفی خصوصیات کی ودیعت ہے"۔ "یادوں کے سائے" کے صفحات پر ایسے شعر جگہ جگہ ملتے ہیں جن میں نسوانی احساس اپنی پوری نزاکتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ـــــ میرا یہ خیال ہے کہ اردو کی شاعرات اکثر رسمی شعر گوئی سے آگے نہیں بڑھتیں اور اپنے اشعار کو اپنے دل کی دھڑکن کا ترجمان بنانے کی بجائے انھیں ان روایتی مضامین سے بوجھل کر دیتی ہیں جن کی عام غزلیہ شاعری میں خاصی تکرار ہو چکی ہے۔ ممتاز میرزا صاحبہ کے کلام میں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے کہا ان کے ہاں اچھے اشعار قابلِ لحاظ تعداد میں ہیں اور یہ وہی شعر ہیں جن کا آہنگ ان کے دل کی دھڑکنوں کا ہمنوا ہے۔ چند اشعار سے آپ بھی لطف اندوز ہوں:

آپ سے کوئی شکایت، نہ زمانے سے گلہ
میرے حالات نے مجبور بنایا ہے مجھے

ہمارے دل کے سبھی راز فاش کرتے ہیں
جھکی جھکی سی نظر، ہونٹ کپکپائے ہوئے
گزرتے رہتے ہیں نظروں سے ساری شب ممتاز
ہزاروں قافلے یادوں کے سر جھکائے ہوئے

الجھے دھاگوں کا ہے اک ڈھیر، یہ دنیا تیری
وہ مسائل، کہ نہ حل جن کے کتابوں میں ملیں

خیال و فکر نے کیا کیا صنم تراشے تھے
تمام عمر پرستش میں کٹ گئی میری
مری حیات ادھوری رہی تمہارے بغیر
بتاؤ، تم نے بھی محسوس کی کمی میری!

وہ آغازِ الفت کا دن یاد آیا
وہ رکتے جھجکتے قدم یاد آئے

وہ راہیں جن کو سونا کر گئے وہ
انھی پہ آج تک میری نظر ہے

ممتاز میرزا صاحبہ صحت زبان و بیان کا خیال رکھتی ہیں۔ روانی اور سلاست ان کے اشعار کی خصوصیت ہے لیکن کہیں کہیں نظر رکھتی ہے:

جہاں تم ہو، وہاں ہیں لالہ و گل

جہاں ہم ہیں وہاں برق و شرر رہتے
غزل کی ردیف 'رہتے' ہی ہے لیکن یہاں 'رہیں' کا محل تھا
کتاب آفسٹ پر بہت خوشنما چھپی ہے۔ سرورق کا
ٹائیٹل اسلام کمال کو بنایا ہوا ہے اور حسن او ر معنویت دونوں
کا حامل ہے۔ کتاب کی قیمت بیس روپے ہے اور یہ
نیشنل اکاڈمی سے طلب کی جا سکتی ہے۔
——— محمد رسعیدی

چمن باگے

مصنف۔ نقوی مصطفےٰ آبادی۔ ناشر۔ سید صفدر رضا نقوی، رامپور۔ قیمت — دس روپے

پروفیسر محمود الٰہی نقوی مصطفےٰ آبادی کا اُن کی کتاب 'چمن باگے' میں تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں — — میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ نقوی صاحب نے اردو غزل میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ انھوں نے غزل کے فن کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے یا اس کے موضوعات کو غیر معمولی وقعت بخشی ہے — — انھوں نے اساتذہ اور معاصرین کی شاعری کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اسی لیے اُن کی غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ بھی پایا جاتا ہے اور نئے دور کا آہنگ بھی —— نقوی صاحب بحیثیت احوالِ واقعی ہیں فرماتے ہیں کہ انھیں دلی سے لے کر بنگلہ دیش تک کی شاعری سے خاصا لگاؤ اور تعلق رہا ہے اور جگر، حسرت، اساتذۂ لکھنؤ اور سننے کے وافر مواقع میسر آئے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہوئی غزل اُس مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں وہ آفاقی بن گئی ہے۔ وہ روایات سے انحراف کو بدعت سمجھتے ہیں نہ کفر مانتے ہیں۔ وہ غزل کی موضوعاتی اور تکنیکی وسعتوں، جدتوں اور جہتوں کی بات بھی کہتے ہیں خود اُن کے کلام میں روایت کی توسیع کا پرتو تو دکھائی دیتا ہے لیکن جدید احساس و فکر و اسلوب کی پرچھائیاں بہت کم نظر آتی ہیں:

حسرتِ لذتِ دیدار لیے پھرتی ہے
دربدر کوچۂ و بازار لیے پھرتی ہے
سخت جانی نے رکھا میری محبت کا بھرم
اُس کی شمشیر مرے سامنے پانی مانگے

وہ حسن میں ہیں محو تو ہم عشق میں بے خود
دنیائے طلسمات ادھر بھی ہے اُدھر بھی
اے دوستو بجھتے منہ نہ موڑو
میں رونقِ بزم بھی رہا ہوں

"چمن باگے" پڑھ کر لگتا ہے کہ نقوی مصطفےٰ آبادی صاحب نے اردو شاعری کو خوب پڑھا اور سنا ہے اور اس مطالعے کی روشنی میں جو غزلیں کہی ہیں ان کے اکثر اشعار قابلِ توجہ ہیں۔
——— کنور سین

گگن ہندوستانی مسلمان نمبر

مدیر: شمس کنول۔ شریک مدیر: شہناز کنول
ضخامت: تقریباً چھ سو صفحات، قیمت: پندرہ روپے
پتہ: پانچواں فلور، سوبھ پیلیس، ۱۳۲ کامیکر اسٹریٹ بمبئی نمبر ۲

اس زمانے میں جب کاغذ کی گرانی اور طباعت کی مشکل کی وجہ سے اردو کے اکثر رسالے دم توڑ رہے ہیں اتنا ضخیم نمبر نکالنا "گگن" کے ایڈیٹر شمس کنول کی اَن تھک محنت اور اولوالعزمی کا ثبوت ہے جس کے لیے وہ بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ مشتہرین بھی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اشتہار دے کر اس مشکل کام میں ان کی مدد کی۔

اس شمارے کو بجا طور پر ایک انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر مضمون پر فرداً فرداً اظہارِ خیال مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ شمس کنول نے یہ نمبر مرتب کرتے وقت کمال کشادہ دلی سے کام لیا ہے اور کوشش کی کہ ہر حلقۂ فکر کے خیالات قارئین تک پہنچ جائیں۔ جہاں انصاری اور خواجہ احمد عباس جیسے معروف کمیونسٹ کے مضامین ہیں وہاں اس ناچیز اور دیوان آنند کمار کے مضامین بھی شامل ہیں۔ جہاں انیس الرحمٰن مرحوم، حمید دلوائی اور غالی سیکولرسٹوں کے مضامین ہیں وہاں محمد مسلم صاحب اور عامر عثمانی مرحوم کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کے مسائل کا ہر رُخ قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

صفحہ ۱۵ پر بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی ایک تقر

خبرنامہ

۷ فروری ۷۶ء کو دلی کے مشہور اشاعتی ادارے سٹار پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائرکٹر جناب امرناتھ کی کوٹھی پر، واقع گریٹر کیلاش، نئی دلی، جناب کرشن موہن کے نئے شعری مجموعے "من کے منکے" کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ مجموعہ سٹار پاکٹ بیرز میں شائع ہوا ہے اور اس میں کرشن موہن صاحب کی غزلوں کے ۳۶۵ منتخب اشعار شامل ہیں۔

آغاز میں مخمور سعیدی نے اجتماع کی غرض و غایت بیان کی اور کہا کرشن موہن ان شاعروں میں ہیں جو بہت کہتے ہیں لیکن اچھا کہتے ہیں۔ اظہار کی جو سادگی اور موضوعات کا جو تنوع ان کے ہاں ملتا ہے وہ ان سے مخصوص ہے۔ صدارت کے لیے انھوں نے گوپال متل کا نام پیش کیا جس کی سب نے تائید کی۔ کتاب کا اجرا فکر تونسوی کے ہاتھوں ہوا۔ انھوں نے کہا میں کرشن موہن کو تقسیم کے پہلے سے جانتا ہوں اور اس طویل مدت میں ان کا کلام متواتر میری نظر سے گزرتا رہا ہے۔ وہ واقعی پُرگو شاعر ہیں۔ فکر تونسوی کے بعد مانی نے "جمالِ ہزار پہلو" کے عنوان سے "من کے منکے" کا دیباچہ پڑھ کر سنایا جو انہی کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"...... یہ مجموعہ زندگی کی ان گنت تصویروں کا البم ہی نہیں بلکہ اس کا ہر شعر زندگی کے آہنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ کرشن موہن نے ہر لمحے سے کچھ نور چرایا ہے، اسی لیے اس شعر شعر انتخاب میں کرن کرن ابھرتے ڈوبتے رنگوں کی مترنم مصوری ملے گی ان کے ہاں زندگی ایک اکائی کی طرح ہے لیکن اس اکائی میں سنسار کے کتنے غم، کتنی مسرتیں، کتنے راگ، کتنے ہی رنگ جھلملاتے نظر آتے ہیں اور انہی مختلف احساساتی تصویروں کی تلاش شاعر کے تخلیقی سفر کی داستانیں سناتی ہے اور یہ تلاش آپ سے بھی سوال کرے گی۔ کیا ان اشعار میں کچھ یادیں اور آرزوئیں آپ کی زندگی کا آئینہ نہیں؟"

مانی مضمون پڑھ چکے تو کرشن موہن نے کچھ تازہ نظمیں اور غزلیں اپنی بیاض سے پڑھ کر سنائیں۔ گوپال متل صاحب کی مختصر صدارتی تقریر کے بعد جس میں انھوں نے کرشن موہن کے کلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے "من کے منکے" کی اشاعت پر انھیں مبارکباد پیش کی، شعر خوانی کی محفل جمی جس میں جلسے میں شریک سبھی شعرا نے کلام سنایا۔ شعرا اور اہلِ ذوق حضرات میں، صدرِ جلسہ گوپال متل، فکر تونسوی، مہمانِ خصوصی کرشن موہن اور میزبان امرناتھ جی کے علاوہ راج نرائن راز، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، بانی، مخمور سعیدی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کنور سین، خلش دہلوی، آر۔ایل۔ ساگر، کرشن مراری، پریم گوپال متل، سلیم شیرازی، بلراج حیرت، جی۔ ڈی۔ چندن، رام پرکاش راہی، دیانند، گلشن اور کچھ دوسرے لوگ شامل تھے۔

۲۵ جنوری کی شام کو انڈین کلچرل فورم کے زیرِ انتظام ایوانِ غالب نئی دلی کے خوشنما ہال میں جناب ساحر ہوشیارپوری کے مجموعۂ کلام "جلترنگ" کا اجرا صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے مرکزی وزیر ڈاکٹر کرن سنگھ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جلسے کی صدارت پارلیمنٹ کے ممبر جناب این۔ کے۔ پی سالوے نے فرمائی اور اسٹیج سیکرٹری کے فرائض مخمور سعیدی نے انجام دیے۔ "جلترنگ" ساحر صاحب کے منتخب کلام پر مشتمل ہے اور اسے دیوناگری لپی میں اردو اور ہندی کے مشہور اشاعتی ادارے میسرز پی کے۔ پبلیکیشنز، نئی دلی نے شائع کیا ہے۔ انڈین کلچرل فورم کے صدر جناب بی۔ ڈی۔ این۔ رائے

فورم کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ادیبوں اور شاعروں کی قدر افزائی کے ساتھ ساتھ فورم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے بولنے والوں کو ایک دوسرے کی زبانوں کے ادبی سرمایے سے باخبر کیا جائے اور ان میں مشترک اقدار تلاش کی جائیں۔ "جلترنگ" ایک اردو شاعر کا کلام ہے، اسے دیوناگری لپی میں شائع کرکے میسرز پی کے پبلیکیشنز نے جو کام کیا ہے وہ ستائش کا مستحق ہے۔ شری او۔ پی۔ بہل، ایگزیکٹو کونسلر دلی میٹروپولیٹن کونسل نے مجلسِ استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور جلسے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔

"جلترنگ" کا اجرا کرتے ہوئے ڈاکٹر کرن سنگھ نے فرمایا "ساحر صاحب عام بول چال کی زبان میں شاعری کرتے ہیں اور مشکل باتوں کو بھی آسانی اور روانی کے ساتھ ادا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں جو میرے نزدیک ان کے کلام کی بڑی خوبی ہے۔ مثال میں انھوں نے ساحر صاحب کی ایک غزل کے اشعار بھی پڑھ کر سنائے انھوں نے یہ بھی کہا کہ موجودہ حالات میں یہ کام ضروری بھی ہے اور مفید بھی کہ اردو ادب کے اچھے نمونوں کو زیادہ سے زیادہ دیوناگری لپی میں منتقل کیا جائے تاکہ جو لوگ اردو شعر و ادب کے دلدادہ ہیں لیکن اردو رسم الخط نہیں جانتے وہ بھی اردو کی دین سے محروم نہ رہیں۔ صدر جلسہ جناب این۔ کے۔ پی۔ سالوے نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر صاحب کے اس خیال کی پرزور تائید کی اور ساحر صاحب کے کلام کی اس خصوصیت کو سراہا کہ وہ عام فہم زبان میں ہے اور اس سے غیر اردو داں اہلِ ذوق بھی حظ اٹھا سکتے ہیں۔

آخر میں ساحر صاحب نے جلسے کے داعیان اور حاضرینِ جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور اپنا تازہ کلام بھی سنایا۔ اس کے بعد استاد حفیظ احمد خاں، شانتی ہیرانند اور ستنکر داس گپتا نے اپنی مترنم آوازوں میں یکے بعد دیگرے ساحر صاحب کی غزلیں سازوں پر پیش کیں اور جلسہ خیر و خوبی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ جلسے کی کامیابی کا سہرا فورم کے صدر جناب راؤ کے علاوہ فورم کے جنرل سیکریٹری موہن جاودانی اور ٹریژرار جی۔ سی۔ بھردواج کی خوش انتظامی کے سر رہا۔

۲۸ جنوری ۱۹۷۶ء کو جشنِ جمہوریت کی تقریبات کے سلسلے میں جموں و کشمیر کلچرل اکاڈمی کی طرف سے اسمبلی ہال، نیو سیکریٹریٹ جموں میں ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں کشمیر اور بیرونِ کشمیر کے ممتاز شاعروں نے شرکت کی۔ مشاعرے کو کامیاب بنانے میں کلچرل اکاڈمی کے سیکریٹری جناب اختر محی الدین اور ڈپٹی سیکریٹری جناب جتندر شرما کے علاوہ جناب پریم ناتھ در، پریس سیکریٹری جناب شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر اور جناب محمد یوسف ٹینگ نے خاص دلچسپی لی۔ مشاعرے کی صدارت جناب مالک رام نے کی اور مہمان خصوصی تھے جناب شیخ محمد عبداللہ جو آخر تک مشاعرے میں موجود رہے۔ مشاعرے کے اختتام پر شیخ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ میں اس خیال میں تھا کہ تقسیم کے بعد سے اردو شاعری بوجوہ روبہ زوال رہی ہے۔ لیکن آج کے اس مشاعرے میں شرکت کرنے والے نوجوان شاعروں کا کلام سن کر مجھے محسوس ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ اس سے اردو زبان کی قوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ان نوجوان شاعروں کی لگن کا بھی جنھوں نے حالات کی ناسازگاری کی پروا نہ کرتے ہوئے اس زبان سے اپنا رشتہ استوار کیا اور اسے اپنے فنی تجربات کے اظہار کا ایک موثر اور متاثر کن ذریعہ بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ میں انھیں اس کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اس مشاعرے میں شریک ہو کر اور ان کا کلام سن کر مجھے واقعی مسرت ہوئی ہے۔

مشاعرے میں حصہ لینے والے شعرا میں میر غلام رسول نازکی، جگن ناتھ آزاد، بشیر بدر، مخمور سعیدی، زبیر رضوی، قمر رئیس، عابد مناوری، عرش صہبائی، رفعت سروش، کرشن موہن، قیصر قلندر، حکیم منظور، محمد یٰسین بسمل شاہجہانپوری، تلوک چند کوثر، شاہ جہاں بانو یاد اور کچھ دوسرے شاعروں کے نام شامل تھے۔ سرینگر سے کمال احمد صدیقی اور ڈاکٹر حامدی کاشمیری کو شرکت کرنی تھی مگر راستے کی خرابی کی وجہ سے وہ نہیں پہنچ سکے۔

۲۵ ویں اور ۲۶ ویں اکتوبر کو راجستھان ساہتیہ اکاڈمی

کی ادبی انجمن تعمیر ادب جودھپور کے زیر اہتمام ایک کل ہند سمپوزیم و مشاعرہ منعقد ہوا۔ سمپوزیم کا موضوع تھا "اردو ادب میں عصری زندگی کی جھلکیاں"۔ سمپوزیم کی صدارت ڈاکٹر وارث علوی نے کی جو احمد آباد سے تشریف لائے تھے۔ وارث علوی صاحب کے صدارتی خطبے کے علاوہ سمپوزیم میں جن حضرات نے مقالے پڑھے، ان کے اسمائے گرامی ہیں: مخمور سعیدی، کمار پاشی، صادق، ش۔ک۔ نظام۔ مقالے سامعین نے بہت توجہ اور دلچسپی سے سُنے اور ان پر خیال انگیز بحث بھی ہوئی۔

۲۶ دین کی صبح کو یوم احترام الدین احمد شاغل کا اہتمام کیا گیا۔ اس جلسے کی صدارت جناب این کلشریشٹھ نے کی، ناظم کے فرائض مخمور سعیدی نے انجام دیے اور ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی، لیاقت، اللہ رنگ فرید آفریدی اور پارس ردمانی نے مرحوم شاغل صاحب کی لسانی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

۲۶ دین کی شام کو کل ہند مشاعرہ جودھپور کے بزرگ شاعر جناب موہن لال کول کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اسٹیج سکریٹری کے فرائض جناب ش۔ک۔ نظام نے ادا کیے۔ مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعرا میں مخمور سعیدی، بشیر بدر، کمار پاشی، صادق، رشید افروز، خلیل تنویر، عابد ادیب، شاہد عزیز، صادق نور، مشکور جاوید، رام لال ندیم، نسیم پربت سری، خوشتر مکرالوی، ایم۔ اے۔ راز، اے۔ ڈی۔ راہی، حبیب کیفی کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں —— عام مشاعروں کے مقابلے میں اس مشاعرے کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس کے شرکا میں بیشتر جدید شعرا تھے جنھوں نے ادبی اہمیت کی حامل جدید انداز کی نظمیں اور غزلیں پڑھیں اور سننے والوں نے بہت شوق اور دلچسپی سے انھیں سُنا اور پسند کیا۔ مشاعرہ رات کے دو بجے اختتام پذیر ہوا۔

انگلیوں کا خون بقیہ ص۲

—— آج ساری دُنیا کا خون سفید ہے ——!"

میں کہتا ہوں —— "خون کا رنگ سفید نہیں سُرخ ہوتا ہے۔"

"میں نہیں مانتا ——!" وہ ہنستے ہوئے کہتا ہے

ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آجاتا ہے اور میں اپنی انگلیوں کے پوروں میں سمٹے ہوئے تازہ لہو کو مرمریں سطح پر نچوڑنے لگتا ہوں۔

▲▲

تبصرے بقیہ ص۳۹

افسانوں میں ہاجرہ شکور اور حبیب کیفی کے افسانے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ حبیب کیفی کم لکھتے ہیں لیکن کئی برس سے لکھ رہے ہیں اور اب ان کا فن اس منزل پر ہے کہ نئے افسانے کے ناقدین کی توجہ کھینچ سکے۔

"نخلستان" کے ایک شمارے کی قیمت تین روپے، اور سالانہ قیمت دس روپے۔ ترسیل زر کا پتہ ہے: ڈائرکٹر راجستھان ساہتیہ اکاڈمی، اودے پور، راجستھان۔

—— مخمور سعیدی


کیاایل آئی سی رقم ایک طویل عرصہ بعد ملتی ہے؟
غلط! ہم دکھائیں گے کہ کس طرح آپ
آپ کی بیوی اور بچے جلد از جلد
فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔
جانکاری کیلئے۔ ایل آئی سی کی
پالیسی دیکھئے
خوشحالی اور سلامتی
فرض کیجئے کہ آپ کی عمر ۳۰ سال ہے اور آپ نے
۲۰ سال کے لئے ۵۰۰۰ روپیوں کی پالیسی
پالیسی لی ہے تو آپ کو ماہ صرف
۳۰٫۷۵ روپئے ادا کرنے پڑیں گے اور آپ کو حسب ذیل
طریقے سے رقم ملتی رہیگی
۳۰۰۰ روپئے ۱۰ سال بعد
۳۰۰۰ روپئے اس کے ۵ سال بعد
۱۴۲۸۰ روپئے مزید ۵ سال بعد
یعنی کل ۲۰۰۰۰ روپئے
1976
1986
1991
1996
100
اگر بیمہ لینے والا اس ۲۰ سال کے دوران چل بسے تو اس
کے خاندان والوں کو ۵۰۰۰ روپئے مل جائیں گے جو
پہلے ہی حاصل کئے گئے قسطوں کے علاوہ ہوں گے۔
بونس آج کل کی شرح کے مطابق شامل کیا گیا ہے۔
یہ تو ایک مثال ہے۔ ویسے آپ اپنی حیثیت کے مطابق کم
یا زیادہ رقم کی بیمہ پالیسی لے سکتے ہیں۔
اپنی ضرورت کے وقت رقم لیجئے
پالیسی چالو رہنے کے دوران آپ اپنی موجودہ ضروریات جیسے
بچوں کی پڑھائی، شادی
یاترا، بیماری وغیرہ کی تکمیل کر سکتے ہیں
آپ جو بیمہ ادا کرتے ہیں ان
پر انکم ٹیکس کی رعایت
بھی ملتی ہے۔
ان میں سے کوئی بھی پالیسی "تنخواہ سے بچاؤ" اسکیم کے تحت لے
سکتے ہیں۔ یہ اسکیم آپ کے دفتر میں لاگو ہوگی۔ اسکے تحت آپ کے
مالکین پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ وہ آپ کی جانب سے
پریمیم ادا کریں اور ایسے پریمیم کی رقم عام ماہانہ پریمیم کے مقابلہ
میں کم ہوتی ہے۔
لائف انشورنس
کارپوریشن
آف انڈیا
بیمہ زندگی۔ سلامتی کے لئے بے مثال ہے۔
JCA/LIC/2A UR

Regd. No. D (D) 118 Phone : 271649 March 1976

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No [illegible]

TAHREEK

لومڑی ہاں میں نے وعدہ کیا تھا۔ مگر میں اس وقت یہ بھول گئی تھی کہ میں بہت بھوکی ہوں۔

خرگوش مگر میں نے آپ کے ساتھ احسان کیا ہے اس کا بدلہ مجھے یہ دے رہی ہیں!

لومڑی احسان اور بدلہ یہ سب بے وقوفی کی باتیں ہیں تم نے یہ سب کہاں سے سُنا؟

خرگوش یہ سب باتیں میری ماں نے مجھے بتائی ہیں جناب!

لومڑی کیا تم نے کبھی احسان کو دیکھا ہے؟

خرگوش نہیں محترمہ، احسان اور نیکی وغیرہ دیکھنے کی چیزیں نہیں۔ انھیں کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ آپ بھی نہیں!

لومڑی افسوس! ورنہ تمھارے بدلے ان کو کھا لیتی... خیر مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے تیار ہو جاؤ...

خرگوش جناب میں نے آپ کے ساتھ ایک بھلائی کی ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ بھلائی کر دیجیے۔ مجھے بخش دیجیے۔ مجھے نہ کھائیے۔

لومڑی نہیں میں تم کو ضرور کھاؤں گی... ہاں میں تمھارے ساتھ اتنی بھلائی کر سکتی ہوں کہ اگر تم تین جانوروں میں سے دو سے یہ کہلوا دو کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے تو میں تم کو نہیں کھاؤں گی...

خرگوش اچھا، مجھے منظور ہے... پہلے چچا ککڑوں کوں سے ہی پوچھا جائے۔
(ککڑوں کوں سے مخاطب ہو کر) چچا کیا آپ بتا سکتے ہو کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے؟

میاں ککڑوں کوں احسان کا بدلہ! میں نے اس دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے مگر احسان کا بدلہ مجھے کہیں نہیں ملا۔ اب ذرا حضرتِ انسان ہی کو لے لو۔ میری بیوی کے انڈے کھا جاتا ہے میرے بچوں کا شوربہ بنا کر پی جاتا ہے۔ اور تو اور میں جب صبح صبح زوردار بانگ دیتا ہوں تو بجائے اس کے کہ بستر سے باہر نکل آئے، مجھے بُرا کہتا ہے کہ اس مُرغے نے نیند خراب کر دی.... جہاں تک میں سمجھتا ہوں احسان کا بدلہ نہیں ہے۔

لومڑی میاں خرگوش۔ میرا خیال ہے تم کو اب چٹ کر جانا چاہیے.... احسان کا بدلہ اچھی چیز نہیں۔ اس کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔

خرگوش مگر ٹھہریے۔ ذرا اُلّو میاں سے بھی پوچھ لیا جائے ان کی عقلمندی ساری دنیا میں مشہور ہے۔
(اُلّو سے مخاطب ہوتا ہے) محترم اُلّو صاحب ذرا سنیے، ایک بات کا فیصلہ کر دیجیے۔ آپ تو عقلمندوں کے بادشاہ ہیں... آپ نے...

اُلّو میں ابھی سو رہا ہوں.... میری نیند خراب نہ کرو...

خرگوش بس میرا ایک چھوٹا سا سوال ہے۔ کیا احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے؟

اُلّو میں ابھی سو رہا ہوں۔ میری نیند خراب نہ کرو۔

لومڑی اُلّو کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز نہیں۔ فیصلہ ہو گیا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ